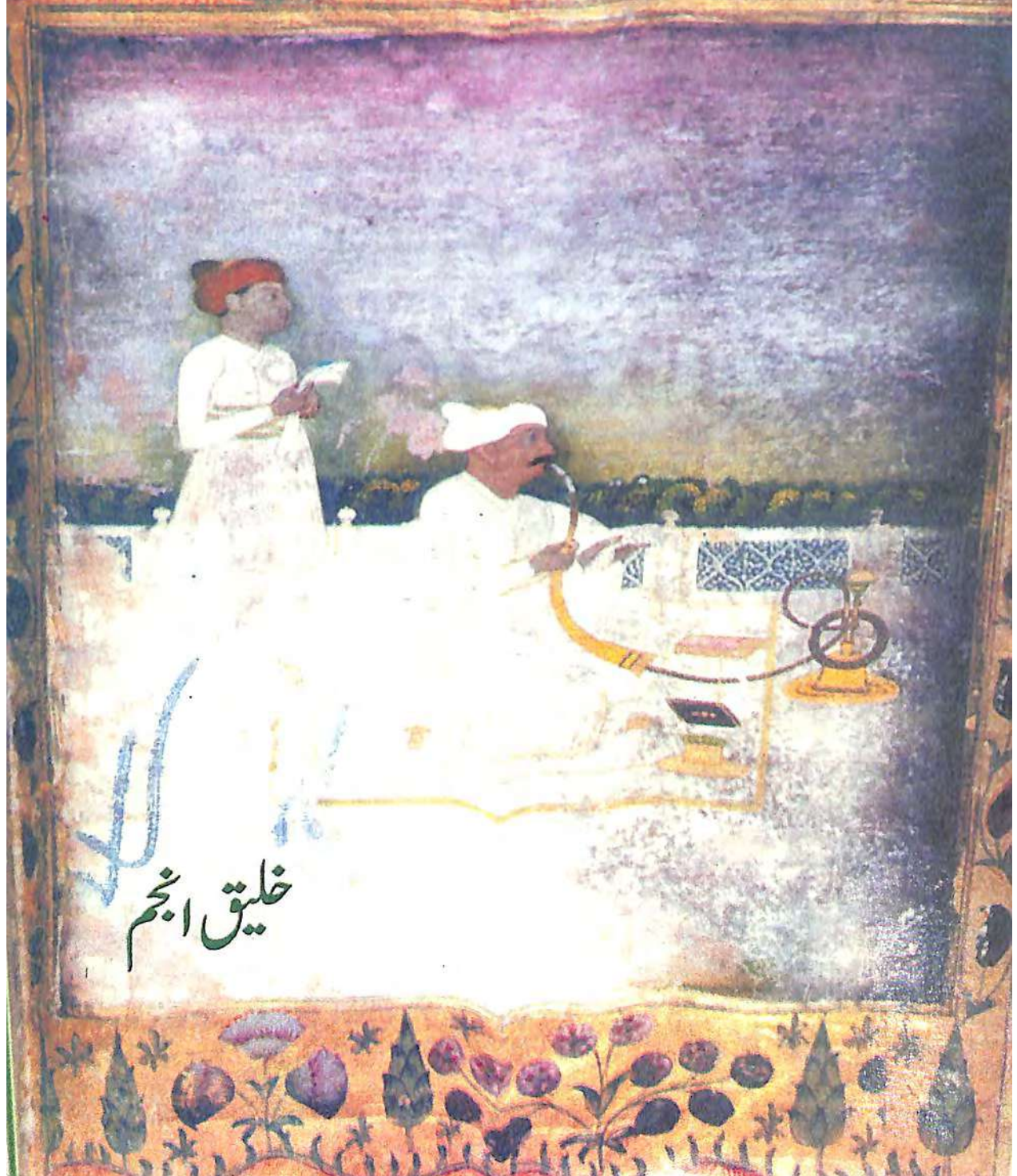


مرزا محمد رفیع سودا



مرزا محمد رفیع سودا

مرزا محمد رفیع سودا

خلیق انجم



قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل (حکومت ہند)

ویسٹ بلاک-1، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی 110066

Mirza Mohd. Rafi Sauda

By

Khaliq Anjum

© قومی کونسل برائے فردوغ اردو زبان، نئی دہلی

سنہ اشاعت : جولائی - ستمبر 2003 تک 1925

پہلا ایڈیشن : 500

قیمت : 219/=

سلسلہ مطبوعات : 1097

سرورق : محمد ساجد

کمپوزنگ : انجمن کمپیوٹر سائنسز، انجمن ترقی اردو (ہند)

ISBN : 81-7587-010-9

ناشر : ڈائریکٹر، قومی کونسل برائے فردوغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-I، آر۔ کے۔ پورم،
نئی دہلی۔ 110066

طابع : جے۔ کے۔ آفسٹ پرنٹرز، جامع مسجد، دہلی - 110006

فہرست

۶۱	آباد اجداد	۱۳	پیش لفظ--حمید اللہ بھٹ
۶۲	مرزا کے چچا	۱۵	اس کتاب کے بارے میں
۶۲	نعمت خان عالی		(آل احمد سرور)
۶۳	مرشد قلی خاں	۱۷	حرف آغاز--خلیق انجم
۶۹	مرزا شفیع	۲۱	<u>سیاسی و سماجی حالات</u>
۷۰	مرزا کا نام		مغل حکومت کا زوال
۷۰	ولادت	۳۵	اور اس کے اثرات
۷۵	ابتدائی زندگی	۳۷	زوال کے اثرات
۷۷	تعلیم و تربیت	۳۷	اقتصادی بد حالی
۷۸	ریختہ گوئی کی ابتدا	۴۱	فوجی کمزوری
۸۲	مرزا کا تخلص	۴۵	اہل ہنر کا ترک وطن
۸۲	تلمذ	۴۷	زندگی سے فرار
۸۶	ملک اشعرائی کا خطاب	۵۳	ذکر کیفیت ناگل
۸۹	میر غلام حیدر مجذوب	۵۹	<u>سوانح</u>

۱۶۸	تصورِ حُسن و عشق	۹۱	سودا کا نواسہ
۱۷۳	محبوب	۹۲	سودا کا اخلاق
۱۷۸	تھوڑے	۹۶	ظرافت
۱۸۱	واعظ و زاہد		آبِ حیات میں سودا
۱۸۲	بے ثباتی	۹۸	کے لطائف
۱۸۴	قناعت	۱۰۶	موسیقی دانی
۱۸۸	احساسِ قشنگی	۱۰۷	کتے پالنے کا شوق
۱۹۰	غم پرستی	۱۰۹	ترکِ وطن
۱۹۳	زورِ بیان	۱۱۷	سودا اودھ میں
۱۹۹	نشاط آمیزی	۱۲۴	وفات
۲۰۳	سادگی بیان	۱۳۱	<u>تفہیم</u>
۲۰۷	مشکل زمینیں	۱۳۳	ادبی پس منظر
۲۱۱	ایہام گوئی		فارسی کا عہدِ زوال
۲۱۲	مزاح و ظرافت	۱۳۳	اور اردو شاعری
۲۱۸	قطعات		شمالی ہند میں
۲۲۰	عریانیت	۱۳۹	اردو شاعری کا آغاز
۲۲۱	تمثیل نگاری	۱۵۴	سودا کی غزل گوئی
۲۲۲	خیال بندی	۱۶۲	سودا اور فارسی شاعر
۲۲۶	حسنِ تعلیل	۱۶۶	داخلیت

۲۸۳	سودا اور فدوی	۲۲۸	تشبیہات و استعارات
۲۸۷	جعفر علی حسرت اور سودا	۲۳۰	قصیدہ نگاری
۲۸۸	میر سوز اور سودا	۲۳۵	مطلع
۲۸۹	فاخر کلین اور سودا	۲۳۷	تشبیب
۲۹۶	میر غلام حسین ضاحک اور سودا	۲۴۲	گریز
۳۰۳	مذہبی جویں	۲۴۶	مدح
۳۰۷	دیگر جویں	۲۴۸	عدل و انصاف
۳۱۲	مصطفیٰ اور سودا	۲۵۲	شجاعت و بہادری
۳۱۹	مرثیہ نگاری	۲۵۴	فیاضی
۳۲۹	چہرہ	۲۵۵	مروت
۳۳۰	سراپا	۲۵۶	دعا یا حسن طلب
۳۳۱	رخصت	۲۵۷	ہجو گوئی
۳۳۲	آمد	۲۶۶	ادبی معرکے
۳۳۳	رجز	۲۶۹	سودا اور قائم
۳۳۶	شہادت	۲۷۱	سودا اور ندرت کاشمیری
۳۴۰	دعا	۲۷۳	مرزا مظہر جانجاناں
۳۴۲	شہر آشوب	۲۷۴	سودا اور بقا
۳۵۴	مثنوی نگاری	۲۷۵	میر تقی مرثیہ گو
۳۵۶	ہجو یہ	۲۷۸	میر تقی میر اور سودا

۴۱۷	نثر	۳۵۹	مدحیہ
۴۲۰	کلیات سودا	۳۶۲	اخلاقیہ
۴۲۰	نسخہ حبیب	۳۶۸	خطوط
۴۲۱	نسخہ رچرڈ جونسن	۳۶۸	تقدیری
۴۲۲	کلیات سودا کے مطبوعہ نسخے	۳۶۹	منظر نگاری
۴۲۴	نسخہ مصطفائی	۳۷۱	عشقیہ
۴۲۵	نسخہ نول کشوری	۳۸۰	واسوخت
۴۲۵	نسخہ آسی	۳۸۲	رباعیات
۴۲۸	عکس نسخہ رچرڈ جونسن	۳۸۵	عشقیہ
	نسخہ رچرڈ جونسن اور	۳۸۵	متصوفانہ
۴۳۰	نسخہ حبیب کا اشاریہ	۳۸۷	مذہبی
۴۶۸	سودا کا الحاقی کلام	۳۸۸	اخلاقی
۴۸۸	سودا کا غیر مطبوعہ کلام	۳۸۹	مدحیہ
۵۲۳	سودا کے شاگرد	۳۸۹	ہجوئیہ
۵۲۸	۱- احسن، مرزا احسن علی	۳۹۰	تعلی
۵۳۳	۲- اسد، میرامانی	۳۹۰	پہیلیاں
۵۳۷	۳- بیکل، مرزا بھوبیک		سودا تذکرہ نگاروں اور
۵۳۸	۴- جرأت، مرزا مغل	۳۹۳	نقادوں کی نظر میں
۵۳۹	۵- جینا، جینا نیگم	۴۱۵	سودا کی تصانیف

۵۹۶	۲۴- نظیر،	۵۴۰	۶- حجام، عنایت اللہ
۵۹۶	۲۵- وحشت، میر ابوالحسن	۵۴۳	۷- حسن، میر محمد حسن دہلوی
۵۹۹	۲۶- ہاتھی، میر ہاشم علی	۵۴۴	۸- راقم، بندر ابن
۶۰۱	حاصلِ سخن	۵۴۹	۹- رضا، مرزا احسن
۶۰۶	اشعارِ سودا کا انگریزی ترجمہ	۱۰- شرف، شیخ شرف	
۶۳۵	کتابیات	۵۵۳	الدین حسین
۶۴۹	اشاریہ	۵۵۴	۱۱- شیدا، میر فتح علی
	عکس	۵۵۶	۱۲- عظیم، مرزا عظیم بیگ
۲۲۸	۱- نسخہ رچرڈ جونسن کے دو صفحے	۵۶۲	۱۳- قدا، کچھی رام پنڈت
	۳- گل کرسٹ کی	۵۶۳	۱۴- قائم، قیام الدین
۶۰۷	ایک کتاب کا سرورق	۵۶۵	۱۵- قربان، میر جیون
	۴- سودا کی کہی ہوئی ایک	۵۶۷	۱۶- لطف، مرزا علی
۶۳۴	تضمین کی طرز	۵۷۳	۱۷- ماہر، فخر الدین
	یہ طرز مسٹر برڈ نے بنائی تھی۔ جس کا	۵۷۶	۱۸- مجذوب، غلام حیدر
	عکس گل کرسٹ نے اپنی کتاب میں	۵۷۹	۱۹- محبت، شیخ ولی اللہ
	دیا ہے۔	۵۸۵	۲۰- معین، شیخ محمد معین الدین
		۵۸۸	۲۱- ممتاز، حافظ فضل علی
		۵۹۴	۲۲- نالائ، میر احمد علی
		۵۹۵	۲۳- منشاء، منشی سدا سکھ

اپنی آیا
طلعت سعید
کے نام

پیش لفظ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ایک قومی مقتدرہ کی حیثیت سے کام کر رہی ہے۔ اس کی کارگزاریوں کا دائرہ کئی جہتوں کا احاطہ کرتا ہے جن میں اردو کی ان علمی و ادبی کتابوں کی مکرر اشاعت بھی شامل ہے جو اردو زبان و ادب کے ارتقا میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں اور اب دھیرے دھیرے نایاب ہوتی جا رہی ہیں۔ ہمارا یہ ادبی سرمایہ ماضی کا قیمتی ورثہ ہے۔ اس لیے اس سے واقفیت نئی نسلوں کے لیے ضروری ہے تاکہ وہ اپنی روایات کی پاسداری کریں اور اپنی جڑوں کی شناخت کر سکیں۔ قومی اردو کونسل ایک منضبط منصوبے کے تحت عہد قدیم کے شاعروں اور نثر نگاروں سے لے کر عہد جدید کے شاعروں اور نثر نگاروں تک تمام اہم اہل فکر و فن کی تصنیفات شائع کرنے کی خواہاں ہے تاکہ اردو کے اس قیمتی علمی و ادبی سرمائے کو آنے والی نسلوں تک پہنچایا جاسکے اور زمانے کی دستبرد سے بھی اسے محفوظ رکھا جاسکے۔

عہد حاضر میں اردو کے مستند کلاسیکی متون کی حصولیابی، نیز ان کی کمپوزنگ اور پروف ریڈنگ ایک بہت بڑا مسئلہ ہے، لیکن قومی اردو کونسل نے ایک حد تک اس مسئلے پر قابو پانے کی کوشش کی ہے۔ یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جسے کونسل قارئین کی خدمت میں پیش کر رہی ہے۔

اہل علم سے گزارش ہے کہ کتاب میں کوئی خامی نظر آئے تو ہمیں تحریر فرمائیں تاکہ اگلی اشاعت میں دور کی جاسکے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ

ڈائریکٹر

اس کتاب کے بارے میں

جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اردو میں تحقیق و تنقید کا معیار گر رہا ہے انھیں خلیق انجم کی اس قابل قدر تصنیف کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے۔ سودا کی عظمت تو شروع سے مسلم رہی ہے لیکن سودا کی یہ بدقسمتی اور اردو کے محققوں اور نقادوں کی یہ بدتوفیقی ہے کہ نہ تو اُن کے کلیات کا کوئی صحیح ایڈیشن اب تک شائع ہوا ہے اور نہ ہی چاند اور حال میں محمد حسن کے علاوہ کسی نے سودا کی حیات، شخصیت اور کلام کے سیر حاصل جائزے کی ضرورت سمجھی۔ شیخ چاند کی کتاب قابل قدر ہے مگر اب خاصی پرانی ہو گئی ہے۔ اس لیے جدید تحقیق کے معیار سے سودا پر ایک نئی اور سیر حاصل کتاب کی اشد ضرورت تھی۔ خلیق انجم نے اس ضرورت کو بڑی خوبی سے پورا کیا ہے۔

پہلے حصے میں جو سماجی پس منظر ہے اس میں بادشاہوں کے جشن و جلوس کی طویل داستان نہیں۔ اس زمانے کے سیاسی تغیرات، اقتصادی مسائل اور علمی رجحانات پر واضح اشارے ہیں۔ اس فراریت کا بھی بہت دل چسپ تذکرہ ہے جس کا ایک پہلو تصوف تھا اور دوسرا جنسی بے راہ روی۔ سودا کے آباؤ اجداد کے وطن، ان کی نانہال، ان کے سن ولادت، فرخ آباد کے قیام، اودھ میں ورود اور سال وفات کے متعلق جدید ترین محقق نے کتاب کی اہمیت بڑھادی ہے۔

دوسرے حصے میں تنقید ہے جس میں سودا کی قادر الکلامی، اُن کی ہمہ گیری اور ماحول کی عکاسی کو خاص طور سے ابھارا گیا ہے۔ ماحول کی ہر گردش اور وقت کی ہر کروٹ کا جس طرح سودا کے یہاں احساس ہوتا ہے اور جس طرح اس کی ذہنی تصویر بنتی ہے اس طرح ان کے کسی اور معاصر کے یہاں نہیں ملتی۔ سودا کے قصائد کی عظمت کو عام طور پر تسلیم کیا گیا ہے لیکن ان قصائد کی سماجی اور تہذیبی اہمیت پر اور زور دینے کی ضرورت تھی۔ ان کے ججویات پر گو کہیں کہیں آنکھ پٹی ہو جاتی ہے، مگر انھوں نے جس طرح ان میں اپنے دور کا سارا درد و غم محفوظ کر دیا ہے، اس پر بھی نظر ڈالنی

چاہیے۔ یہ بھی دل چسپ بات ہے کہ شہر آشوب کے پھلنے پھولنے کا یہی دور ہے اور سودا کے شہر آشوب دوسروں پر ادبی رجبے کے لحاظ سے فوقیت رکھتے ہیں۔ سودا کی غزلوں کے ساتھ اب تک انصاف نہیں ہوا ہے۔ وہ میر کے پائے کے غزل گو نہ سہی، مگر غزل کی کسی تاریخ میں ان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ان کے مرثیوں کی ادبیت کا بھی اور گہرا اعتراف ہونا چاہیے، گو ان کی مثنویاں چنداں اہمیت نہیں رکھتیں۔ مگر ان میں بھی فن کی بہت سی اصطلاحات محفوظ ہو گئی ہیں۔

خلیق انجم نے سودا کے کلام کا جس طرح جائزہ لیا ہے، مجھے یقین ہے کہ اس سے سودا کی عظمت کا نقش گہرا ہوگا اور ان کے کلام کے مطالعے کا ذوق بڑھے گا۔ اٹھارویں صدی کے آخری نصف کی تہذیب کی دھوپ چھاؤں کو سمجھنے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ تذکرہ نگاروں اور نقادوں کی رایوں کے اقتباسات کی وجہ سے یہ حصہ اور وسیع ہو گیا ہے۔

سودا کی تصانیف کے سلسلے میں کلیات کے قلمی نسخوں کا جائزہ اور خصوصاً حبیب گنج اور رچرڈ جونسن کے نسخوں کی اہمیت کا تذکرہ، مصنف کی عرق ریزی کا بین ثبوت ہے۔ ان نسخوں کے اشاریے سے کلیات کا صحیح اڈیشن مرتب کرنے میں بہت مدد ملے گی۔ سودا کے یہاں الحاقی کلام بہت ہے۔ خلیق انجم نے سوز کی ایک سو سترہ غزلوں کی نشاندہی کی ہے اور دوسرے ہم عصر شعرا کے کلام کی بھی۔ سودا کے چھبیس شاگردوں کا تذکرہ کتاب کی اہمیت کو اور بڑھاتا ہے۔ گل کرسٹ نے اپنی ہندوستانی گرامر میں سودا کے جو اشعار مثالوں کے سلسلے میں مع انگریزی ترجمے کے دیے تھے، خلیق انجم نے انھیں بھی ڈھونڈ نکالا ہے اور ایک جامع فہرست حوالوں کی کتابوں کی بھی دی ہے۔

اس علمی و تحقیقی کارنامے پر خلیق انجم مبارک باد کے مستحق ہیں۔ یہ جدید ترین تحقیقی معیاروں پر پورا اُترتا ہے اور سودا کے مطالعے کے سلسلے میں اس سے استفادہ ضروری ہے۔ سودا کے فکر و فن کی عظمت کا احساس جتنا گہرا ہوگا اتنا ہی روایت کا وہ تسلسل بھی میسر آئے گا جو ادب کی ترقی کے لیے ضروری ہے۔

آل احمد سرور

حرفِ آغاز

شیخ چاند مرحوم کی کتاب 'سودا' ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ یہ غالباً اردو کا پہلا تحقیقی مقالہ ہے جو سائنٹفک انداز میں لکھا گیا تھا۔ اس مقالے کو شائع ہوئے طویل عرصہ گزر چکا ہے۔ اس دوران ہندوستان اور غیر ممالک کی لائبریریوں سے بہت سے ایسے مخطوطات، اردو شاعروں کے کئی قدیم تذکرے اور نئے مآخذ دریافت ہوئے جن سے کلاسیکی ادب پر نئی روشنی پڑتی ہے۔ سودا کی زندگی اور فن سے متعلق بھی بہت سا نیا مواد سامنے آیا اس لیے شیخ چاند کے تحقیقی مقالے 'سودا' کی اہمیت رفتہ رفتہ کم ہوتی گئی۔ تاہم شیخ چاند کی تحقیقی صلاحیتوں کے پیش نظر میں بلا تامل کہہ سکتا ہوں کہ سودا پر شیخ چاند مرحوم کی کتاب اگر ۲۰۰۳ء میں شائع ہوتی تو یقیناً میری کتاب سے بہتر ہوتی۔

میں نے یہ کتاب لکھتے وقت قاضی عبدالودود مرحوم کے مضامین سے بہت استفادہ کیا ہے۔ کئی مقامات پر مجھے ان کی رائے یا نتائج سے اختلاف تھا، جس کا میں نے موڈبانہ طریقے سے اظہار کر دیا ہے۔

پہلا ایڈیشن شائع کرنے کے بعد سودا کے سلسلے میں جو تحقیقی مواد فراہم ہوا ہے، میں نے اس کی روشنی میں ترمیم، حذف اور اضافے کیے ہیں۔ اس طرح یہ کتاب پہلے سے کچھ بہتر ہو گئی ہے۔ سودا نے اپنی کلیات کا ایک نسخہ اودھ کے نائب ریڈیڈنٹ رچرڈ جونس کو پیش کیا تھا۔ سودا کے کلیات کے اس مخطوطے میں ایسے شواہد موجود ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ سودا نے یہ نسخہ ۱۱۹۳ھ اور ۱۱۹۵ھ کے درمیان تیار کر لیا اس کلیات میں سودا کی ایک پینٹنگ شامل ہے۔ رچرڈ جونس کا یہ نسخہ پہلے لندن کی انڈیا آفس لائبریری میں محفوظ تھا اور اب یہ انڈیا آفس لائبریری کی کتابوں کے ساتھ برٹش لائبریری میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ جب میری کتاب کا پہلا ایڈیشن شائع ہو رہا تھا تو میں نے انڈیا آفس لائبریری سے یہ پینٹنگ حاصل کی تھی۔ چوں کہ پینٹنگ

مہم تھی اس لیے دہلی کے ایک مشہور آرٹسٹ چودھری رشید صاحب سے اس پینٹنگ کی بنیاد پر سودا کا ایک پورٹریٹ بنوایا تھا۔ دوسرے اڈیشن کی اشاعت کے وقت جپ میں نے اپنے کاغذات میں سودا کی وہ پینٹنگ تلاش کی جو میں نے انڈیا آفس سے منگوائی تھی تو پوری کوشش کے باوجود مجھے نہیں ملی۔ میں نے اپنے عزیز دوست عاشور کاظمی صاحب کو برصغیر خط لکھا، ہمیشہ کی طرح انھوں نے میری مدد کی اور برٹش لائبریری سے اچھا خاصا روپیہ خرچ کر کے وہ پینٹنگ حاصل کر کے مجھے بھیج دی۔ میں ان کی محبت اور کرم فرمائی کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اب میں وہ پینٹنگ اور اس پینٹنگ کی بنیاد پر چودھری رشید صاحب کا بنایا ہوا پورٹریٹ دونوں اس کتاب میں شائع کر رہا ہوں۔

مرزا محمد رفیع سودا کا پہلا اڈیشن ۱۹۶۷ء میں پروفیسر آل احمد سرور کی کرم فرمائی سے انجمن ترقی اردو سے شائع ہوا تھا۔ چوں کہ اُس وقت بازار میں اس موضوع پر کوئی اور کتاب نہیں تھی اور پھر انجمن جیسے ممتاز ادارے نے اسے شائع کیا تھا، اس لیے کتاب ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گئی۔ اُس وقت سے اب تک میں اپنی نئی کتابوں کی تصنیف و تالیف اور دوسرے کاموں میں ایسا مصروف رہا کہ اس کتاب کا نیا اڈیشن شائع کرنے کا وقت ہی نہیں ملا۔ اب اپنے عزیز دوست اور قومی کونسل کے ڈائریکٹر ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ کے توجہ دلانے اور ان کی عنایت سے اس کتاب کا نیا اڈیشن شائع ہو رہا ہے۔ میں بھٹ صاحب کی کرم فرمائی کا شکر گزار ہوں۔ اگر وہ اس کام میں دل چسپی نہ لیتے تو نہ جانے کب تک یہ کتاب اشاعتِ ثانی سے محروم رہتی۔

مجھے فخر ہے کہ ادبی مشاغل میں مجھے اپنے دوستوں سے ہمیشہ مدد اور رہنمائی ملتی رہی ہے، ان دوستوں میں پروفیسر شاد احمد فاروقی، ڈاکٹر اسلم پرویز، پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی اور جناب رشید حسن خاں خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ میں انجمن میں اپنے ساتھیوں محمد ساجد، جاوید رحمانی، عارفہ خانم اور عبدالرشید کا تہ دل سے شکر گزار ہوں جنھوں نے بڑی محنت سے اس کتاب کو کمپوز کیا۔

خلیق انجم

سیاسی اور سماجی حالات

دورِ ساغر تھا ابھی یا ہے ابھی چشمِ پر آب
دیکھ سودا گردشِ افلاک سے کیا کیا ہوا



مرزا محمد رفیع سودا

مرزا محمد رفیع کی ولادت ۱۱۱۸ھ (۱۷۰۶ء-۱۷۰۷ء) میں ہوئی۔ اس وقت تک مغل حکومت کے زوال کے اثرات کچھ زیادہ نمایاں نہیں ہوئے تھے۔ کیوں کہ ابھی تقریباً دو صدیوں کی محنت سے حاصل کی ہوئی دولت و طاقت اور عزت و شوکت باقی تھی۔ مغل خزانے بے شمار دولت سے بھرے ہوئے تھے۔ ابھی تخت طاؤس اور کوہ نور جیسی بیش قیمت اشیاء ظالم اور جابر نادر شاہ کے ہاتھوں سے محفوظ تھیں۔ لیکن مرزا کے دیکھتے ہی دیکھتے خزانے خالی ہو گئے۔ عظیم مغل بادشاہ جن کا جاہ و جلال تاریخ میں ضرب المثل ہے۔ اُن کے وارث بے بسی کی مکمل تصویر بن گئے۔ مرزا نے اُن بادشاہوں کی آنکھوں میں سلاخیاں پھرتے دیکھیں جن کی ”خاک پا“ کو ”کحلِ جواہر“ سمجھا جاتا تھا۔ ناز و نعم میں پلے ہوئے شہزادے ایک ایک روٹی کو ترستے۔ پھولوں میں تلنے والی شہزادیاں جنہیں کبھی سورج کی کرن نے بھی نہیں دیکھا تھا۔ حملہ آوروں کے ہاتھوں بے آبرو ہوئیں اور نہ جانے کتنی بار ”عالم میں انتخاب دئی“ جس پر آسمان کو بھی رشک آتا تھا، انسان کی وحشیانہ اور بہیمانہ مظالم کا شکار ہوئی۔

جن طاقتوں نے ڈیڑھ سو سال کی لگاتار جدوجہد سے مغل حکومت کی بنیادوں کو ہلایا اور آخر کار ۱۸۵۷ء میں اس عظیم الشان عمارت کو ڈھادیا ان میں مرہٹے، جاٹ، سکھ اور انگریز سب ہی شامل تھے۔ مسلمانوں میں روہیلے، مغل دربار کے ایرانی و تورانی گروہ اور خود مختار ریاستوں نے بھی زوال کی رفتار کو تیز کیا۔ انگریزوں کے علاوہ باقی تمام طاقتیں خود مغلوں کی سیاسی اور اقتصادی پالیسی کی پیدا کی ہوئی تھیں۔ یہ طاقتیں اور فرقتے کس طرح پیدا ہوئے؟ کیوں بغاوت پر آمادہ ہوئے؟ اور کس طرح انھوں نے ہندوستان سے مغلوں کا نام و نشان تک مٹا کر رکھ دیا؟ اس کا جواب صرف یہ ہی نہیں ہے کہ اورنگ زیب کے بعد مغل تخت کے تمام وارثین نا اہل تھے۔ ڈاکٹر کالیکنکر Dr.Kalikinker

جیسے سوڑخ کی طرح یہ کہہ دینا بھی کافی نہیں کہ:

”حکمرانوں اور امیروں میں کردار، قابلیت اور دور بینی کی کمی، دربار میں ہونے والی بدتر سانشین اور گٹھ جوڑ، نادر شاہ کا حملہ اور احمد شاہ ابدالی کی لگاتار پورشوں اور ہندوستان کے مختلف علاقوں میں فتح و کامیابی کے جھنڈے گاڑتے ہوئے مرہٹوں نے ہندوستان کی اقتصادی حالت کو متاثر کرنا شروع کر دیا“۔^۱

(انگریزی سے ترجمہ)

ہندوستان کی اقتصادی حالت اس لیے خراب نہیں ہوئی تھی کہ یہ تمام واقعات رونما ہوئے تھے بلکہ اقتصادی نظام خراب ہونے کی وجہ سے ایسے واقعات ہوئے۔ اس کی تفصیل کے لیے ضروری ہوگا کہ ہم سیاست کے ساتھ ساتھ اُس دور کے زرعی مسئلے اور تجارتی نظام کا بھی مطالعہ کریں۔

مغل حکومت کے جاہ و حشم کا دار و مدار لگان کی صورت میں حاصل ہونے والی کثیر دولت پر تھا۔ اسی لیے جب اکبر کی وفات کے بعد اُس سے کم صلاحیتوں کا مالک جہانگیر سلطنت نشین ہوا تو مغل دربار کے شان و شکوہ میں ذرا بھی فرق نہ آیا بلکہ اور بھی ترقی کی۔ جہانگیر اور شاہ جہاں پر تبصرہ کرتے ہوئے شیلو انکر نے لکھا ہے۔

”اُس (اکبر) کے جانشین کم درجے کے تھے۔ جہانگیر شراب پینے کا پورا سلیقہ رکھتا تھا اور شاہ جہاں نے اپنا دربار ایسے عظیم الشان طریقے سے سجا رکھا تھا کہ اس کی دوبہری مثال نہیں ملتی۔ پھر بھی ان دونوں کے عہد میں حکومت برابر ظاہری طاقت اور شان و شکوہ میں

1. K. K. Datta, Survey of India 's Social life etc. Calcutta. 1961. P-113.

۲ میں نے ڈاکٹر عرفان حبیب کی The Agrarian System of Mughal India سے خاص طور پر استفادہ کیا ہے۔

3. Thompson & Garratt, Rise and Fulfilment of British Rule in India Allahabad, 1962, P-12.

ترقی کرتی رہی۔ انھوں نے دل کھول کر فنونِ لطیفہ اور خاص طور پر موسیقی، مصوری، شاعری اور فنِ تعمیر کی سرپرستی کی۔ جس کی وجہ سے ہماری تہذیب کا نشاۃ ثانیہ ہوا اور یہ عہد ہندوستان کی تاریخ کا روشن ترین باب بنا۔^۱

(انگریزی سے ترجمہ)

۱۔ جہانگیر کے متعلق تھامس روئے لکھا تھا:

”جہانگیر کی عظمت خود اس کی ذات میں نہیں تھی بلکہ پڑوسیوں (ریاستوں) کی کمزوری میں تھی۔ جہانگیر کی حیثیت ایک پختہ عمر مچھلی کی تھی اور وہ چھوٹی چھوٹی مچھلیاں تھیں جنہیں بڑی مچھلی کھا جاتی ہے۔“

(انگریزی سے ترجمہ)

جہانگیر اور شاہجہاں کے دربار کو رونق بخشنے والے غریب کاشتکار تھے۔ اُن سے اتنا لگان وصول کیا جاتا تھا کہ وہ بہ مشکل تمام پیٹ بھر سکتے تھے۔ امرا و رؤسا کو تنخواہ کی بجائے اکثر جاگیریں ملتی۔ بادشاہوں کی یہ بنیادی پالیسی تھی کہ کوئی علاقہ کسی جاگیردار کے پاس زیادہ عرصے نہ رہے۔ اس لیے وہ اُس علاقے کی فلاح اور بہبودی کی طرف کبھی توجہ نہیں کرتے۔ بقول برنیر اُن کے سوچنے کا انداز یہ تھا کہ ”ہمیں ایک لمحے میں (اس علاقے سے) محروم کیا جاسکتا ہے۔ پھر ہماری محنتوں کا پھل ہمیں ملے گا اور نہ ہماری اولاد کو۔ ہمیں چاہیے کہ اس زمین سے جتنی دولت کھینچ سکتے ہیں، کھینچ لیں۔ چاہے کاشتکار فاتے مرے یا فرار ہو جائیں اور جب ہمیں اس علاقے کو چھوڑنے کا حکم ملے تو ہم اسے ایک اجاڑ جنگل کی حالت میں چھوڑیں۔“^۲

(انگریزی سے ترجمہ)

جاگیردار کے علاوہ عامل، قانون گو، چودھری اور دوسرے سرکاری ملازمین غیر قانونی طریقے سے اپنا اپنا حصہ لیتے تھے۔ ظلم اور تشدد کا نتیجہ یہ ہوا کہ کاشتکار زمینیں چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ اس کی ابتدا عہد اکبر ہی میں ہو گئی تھی۔ عبدالقادر بدایونی لکھتے ہیں۔

1. K. S. Shelvankar, The Problem of India, New York, 1940, P-16.

2. F. Bernier, Travels in the Moghal Empire, 2Ed. London, 1916, P-227.

”کروڑیوں کے ظلم کی وجہ سے اکثر علاقے ویران ہو گئے اور کاشتکار (رعایا) بیوی بچوں کو فروخت کر کے مختلف اطراف میں چلے گئے۔“ ۱۔ (فارسی سے ترجمہ)

عہد جہانگیر کے ایک سیاح میزیک نے لکھا ہے کہ کاشت کاروں کے پیروں میں بھاری بیڑیاں ڈال کر مختلف میلوں اور بازاروں سے لے جایا جاتا تھا۔ ان کی بدنصیب بیویاں گود میں بچوں کو لیے روتی پٹتی پیچھے پیچھے چلتی تھیں۔ ۲۔ (انگریزی سے ترجمہ)

برہمچریا عہد شاہجہاں کے آخر میں (۱۶۵۶ء) ہندوستان آیا تھا اور ۱۶۶۵ء تک وہ یہیں رہا۔ غریب کاشتکاروں پر ظلم و ستم کا ذکر اُس نے بھی کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔ ”..... قابل کاشت زمینوں کا اچھا خاصا کاشت نہ ہونے کی وجہ سے بیکار پڑا ہے۔ ان کاشتکاروں میں بہت سے لوگ گورنروں کے ظلم کاشتکار ہو کر برباد ہو گئے۔ جب یہ غریب لوگ اپنے لالچی آقاؤں کے تقاضے پورے نہ کر سکے تو انھیں نہ صرف بنیادی ضرورتوں کے سامان سے محروم کر دیا گیا بلکہ ان کے بچے بھی چھین لیے گئے جنھیں غلام بنا کر لے جایا گیا۔ اس لیے ایسا ہوتا ہے کہ بہت سے کاشت کار اتنے شدید ظلم سے تنگ آ کر گاؤں سے چلے جاتے ہیں اور شہروں اور کیسوں میں زندہ رہنے کے قابل برداشت ذرائع ڈھونڈتے ہیں۔ یہ لوگ وہاں قلی، سٹے یا سائیس بن جاتے ہیں۔“ ۳۔

اورنگ زیب کے زمانے میں اس قسم کے واقعات زیادہ ہونے لگے۔ ایک دیوان محمد ہاشم کاشت کاروں پر بہت زیادہ ظلم کرتا تھا۔ خان دوراں نے اس کی شکایت کرتے ہوئے بادشاہ کو لکھا۔ ”خالصہ کے علاقے ویران ہو گئے ہیں اور حالات بہت خراب ہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ محمد ہاشم نے بہت لگان مقرر کر دیا ہے۔“ (انگریزی سے ترجمہ) خان دوراں نے آگے چل کر لکھا ہے ”کاشت کاروں کے مصائب لکھنا ناممکن ہے۔ اُن میں کچھ لوگ لگان نہ دے سکے تو انھیں اتنا مارا پیٹا کہ وہ مر گئے۔ بہت سے

۱۔ عبدالقادر بدایونی، منتخب التواریخ، مکتبہ، ۱۸۶۳ء، ۲، ص ۱۸۹۔

1. F. S. Manrique, Travels, 1629-43, Vol-II, London, 1927, P-272.

2. Bernier, P-205.

کاشت کار قید میں ہیں۔ ان کی بیویوں اور بچوں کو فروخت کر دیا گیا ہے۔“^۱
(انگریزی سے ترجمہ)

حکمرانوں کے اس ظلم اور ستم سے تنگ آ کر کاشت کاروں نے بغاوتیں شروع کر دیں۔ وہ لگان دینے سے انکار کر دیتے۔ شاہی فوجیں باغیوں کی سرکوبی کو جانتیں۔ چوں کہ یہ بغاوتیں بہت چھوٹے پیمانے پر ہوتی تھیں۔ اس لیے باغیوں پر قابو پانا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ عہد اورنگ زیب کے بارے میں منوچی نے لکھا ہے۔ ”گاؤں والوں کو شکست ہونے پر جو کوئی ہاتھ آتا ہے اُسے قتل کر دیا جاتا ہے۔ ان کی بیویاں، لڑکے، لڑکیاں اور مویشیوں کو لے جایا جاتا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ خوب صورت لڑکیوں کو باغی کی حیثیت سے بادشاہ کی خدمت میں پیش کر دیا جاتا ہے۔ کچھ وہ (جاگیردار) اپنے لیے رکھتے ہیں اور باقی فروخت کر دی جاتی ہیں۔“^۲ (انگریزی سے ترجمہ) اس پر تحقیق کی ضرورت ہے کہ خوب صورت لڑکیاں اورنگ زیب کی خدمت میں پیش کر دی جاتی تھیں۔

زمینداروں کو اپنی زمینداری بڑھانے کا موقع چاہیے تھا۔ کاشت کاروں کی بغاوت سے انھوں نے پورا فائدہ اٹھایا۔ کاشتکاروں کو فن سپہ گری کی تربیت دی اور انھیں ضروری ہتھیاروں سے مسلح کیا۔

یوں تو بغاوتیں جہانگیر کے زمانے سے ہو رہی تھیں لیکن اورنگ زیب کے زمانے میں ان کی تعداد بڑھ گئی۔ نیز پہلے سے کہیں زیادہ منظم ہونے لگیں۔

جاٹ، مرہٹے اور سکھ اسی قسم کے زمیندار اور کاشت کار تھے جنھوں نے ابتدا میں لگان دینے سے انکار کیا۔ حکومت کے خلاف بغاوتیں کیں اور آخر کار اتنی طاقت حاصل کر لی کہ ان سب کی آزاد حکومتیں قائم ہو گئیں۔

عہد مغلیہ کے صوبہ آگرہ میں وسطی دوا آبہ کا علاقہ بھی شامل تھا۔ اس کے بارے میں

1. J. N. Sarkar, Studies in Auangzib's Reign, Calcutta, pp.243-244.

2. N. Manucci, Storia Do Mogor, Vol.-11, London, 1907, P-451.

ابوالفضل نے لکھا ہے۔ ”آب و ہوا کی خصوصیت کی وجہ سے اس علاقے کے لوگ سرکشی، مردانگی اور جانبازی کے لیے تمام ہندوستان میں مشہور ہیں۔“^۱

(فارسی سے ترجمہ)

اس سرکشی کے پیش نظر بقول شاہ ولی اللہ ”زمانہ شاہ جہاں میں اس قوم کو حکم تھا کہ گھوڑوں پر سوار نہ ہوں، بندوق اپنے پاس نہ رکھیں اور اپنے لیے گڑھی نہ بنائیں۔“^۲

سکھ پنجاب کے جاٹ تھے۔ ان کا پیشہ بھی کاشت کاری تھا۔ مغل حکمرانوں کے ظلم و ستم نے انھیں بھی بغاوت پر مجبور کیا اور یہ کاشت کار ایک بڑی فوج کی صورت اختیار کر گئے۔ حکومت پوری کوشش کے باوجود ان کی سرکوبی نہ کر سکی۔ مرہٹے بھی دکن کے کاشت کار تھے۔ شیواجی احمد نگر کے ایک امیر کالا کا تھا۔ ابتدا میں اس کا مقصد صرف اپنی زمیں داری کو بڑھانا تھا۔ جاگیرداروں نے دکن میں ایسے حالات پیدا کر دیے تھے کہ اکثر کاشت کار شیواجی کے ساتھ ہو گئے۔ مغل شہنشاہ کے پاس جب یہ شکایت آئی کہ شاہی علاقے کے کاشت کار مرہٹوں کے ساتھ مل گئے ہیں تو حکم دیا گیا کہ تمام گاؤں کے ہتھیار اور گھوڑے وغیرہ ضبط کر لیے جائیں اور ایسا ہی کیا گیا۔ بعد میں جن کسانوں کو ہتھیار مل سکے وہ مرہٹوں کے ساتھ ہو گئے۔ سہ بھیم سین دکن کے زمیں داروں کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ فوجداروں کے ایجنٹ، دییش منگھ اور زمیں داروں کا ظلم حد سے بڑھ گیا تھا۔ یہ لوگ ہر ممکن بہانے سے ان غریب کاشت کاروں سے پیسہ وصول کرتے تھے۔ زمیں داروں پر ”پیشکش پادشاہی“ مقرر تھی۔ یہ لوگ اپنی جیب سے ایک پیسہ نہیں دیتے بلکہ انھوں نے آدی مقرر کر رکھے تھے۔ جو کاشت کاروں سے روپیہ وصول کرتے تھے۔ ان غریب انسانوں پر ظلم کی کوئی حد نہیں تھی۔ پھر ان پر جزیہ لگایا گیا اور جزیہ وصول کرنے والے مقرر کیے گئے۔ ان زمیں داروں کے ظلم و ستم کے متعلق کوئی کیا لکھ سکتا ہے۔^۳ اسی لیے بیشتر کاشت کار باغی مرہٹہ زمیں داروں کے ساتھ ہو گئے۔

^۱ ابوالفضل، اکبر نامہ، کلکتہ، ۱۸۸۶ء، ص ۳، ۲۳۱

^۲ شاہ ولی اللہ، شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات، مترجمہ علی احمد نظامی، دہلی، ۱۹۵۰ء، ص ۱۰۱

^۳ دلکش، بھیم سین (قلمی) ورق ۱۲۸ ب۔ ۱۱۳۰ الف۔

یع دلکش، ورق ۱۲۸ ب۔ ۱۱۳۰ الف۔

روہیلوں نے مغل حکومت کی بربادی میں نمایاں حصہ لیا۔ روہ کے ایک بزرگ شاہ عالم خاں کا غلام داؤد خاں اٹھارویں صدی کے اوائل میں گھوڑوں کی خرید و فروخت کے لیے ہندوستان آیا تھا۔ اس وقت مغل حکومت کی شکست و ریخت ہو رہی تھی۔ ہر طرف لوٹ مار مچی ہوئی تھی۔ داؤد خاں نے یہ حالات دیکھ کر واپس جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور بہت جلد کٹھیر کے مقام پر اچھی خاصی جمعیت اکٹھا کر لی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس جمعیت نے اتنی طاقت حاصل کر لی کہ شاہ آباد، مراد آباد، سنہل اور دوسرے پرگنوں پر اس کا قبضہ ہو گیا۔ نواب علی محمد خاں اور حافظ رحمت خاں بہت بڑے اور بہادر روہیلہ سردار تھے۔ شجاع الدولہ نے ۱۷۷۴ء میں کڑاں میرپور کے قریب ایک جنگ میں حافظ رحمت خاں کو قتل کر کے روہیلہ طاقت کو ختم کر دیا مگر اب بہت دیر ہو چکی تھی۔

سب سے بڑی طاقت انگریز تھے جنہوں نے آخر کار مغل حکومت پر قبضہ کر لیا۔

مغل بادشاہوں میں غالباً اکبر پہلا بادشاہ ہے جس نے نقد کی صورت میں لگان وصول کرنا شروع کیا۔ جب کاشت کار کو پیداوار فروخت کر کے لگان ادا کرنا پڑا تو پھر اُس نے ایسی چیزوں کی کاشت شروع کی، جس سے زیادہ فائدہ ہو سکے۔ ایسی کاشت کے لیے خود حکومت بھی ہمت افزائی کرتی تھی جس میں زیادہ فائدہ ہو۔

سری رام شرما لکھتے ہیں کہ شیر شاہ اکبر کے زمانے میں ”حکومت ایسی کاشت کرنے والوں کی ہمت افزائی کرتی تھی جس سے اچھی آمدنی ہو اور اس سلسلے میں وہ کاشت کاروں کو کچھ روپیہ بھی قرض دیتی جس کی ادائیگی ایک سال میں کرنی ہوتی۔^۱ جتنا کے پاس اور وسط ہند میں نیل کی بہت زیادہ کاشت کی جاتی۔ روٹی اور سلک کے کارخانوں کی مانگ پوری کرنے کے لیے یہ دونوں اشیاء ہندوستان کے بعض علاقوں میں بہت زیادہ مقدار میں پیدا کی جاتیں۔^۲ تجارت کے فائدے نے حکمران طبقے کو بھی اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ نیل کے پورے کاروبار پر شاہ جہاں کا قبضہ تھا۔ اس نے منوہر داس نامی ایک

1. S.R. Sharma, Mughal Government and Administration, Bombay, 1951, pp. 83-84

2. R.C. Majumdar, An Advance History of India, London, 1960, p-571

فحص کو اس کی اجازت دی تھی کہ وہ شاہی خزانے سے روپیہ قرض لے کر نیل کا کاروبار کرے اور نفع میں سے اپنا حصہ لے کر باقی خزانے میں داخل کر دے۔^۱

نور جہاں نے بھی نیل اور زردوزی کے کپڑوں کی تجارت میں حصہ لیا تھا۔^۲ شاہ جہاں کا خسر آصف الدولہ بہت بڑا تاجر تھا۔ شاہ جہاں کی لڑکی جہاں آرا بھی تجارت کرتی تھی۔^۳

اس قسم کی چیزوں کی پیداوار اتنی بڑھ گئی کہ ہندوستان کے امرا و رؤسا اور تاجروں کی مانگ پوری کرنے کے بعد بھی بہت مال بچ رہتا۔ اس لیے اُن تاجروں کو بھی مال دیا جانے لگا جو ایشیا کے مختلف ممالک اور یورپ سے ہندوستان آتے تھے۔ باہر کے تاجروں کی مانگ بہت بڑھ گئی۔ اس زمانے میں کپڑے کی صنعت نے بہت زیادہ ترقی کی۔ کپڑا بنانے کے بڑے بڑے مرکز تمام ہندوستان میں پھیلے ہوئے تھے۔..... اڑیسہ سے لے کر مشرقی بنگال تک تمام ملک کپڑا بنانے کا بہت بڑا کارخانہ معلوم ہوتا تھا۔ بہت باریک ملم بنانے میں ڈھا کہ بہت مشہور تھا۔ جہانگیر کے زمانے میں پیلسیرٹ (Pelseart) لکھتا ہے کہ ”مشرقی بنگال (چپور اور سونر گاؤں) میں سب لوگ کپڑا بناتے ہیں اور بہت اچھا مال تیار کرتے ہیں۔ سلک تیار کرنے کا سب سے بڑا مرکز بنگال تھا اور یہیں سے ہندوستان کے دوسرے علاقوں اور یورپ کے تاجروں کو مال سپلائی ہوتا تھا۔“^۴

ہندوستان نے دست کاری میں بھی بہت ترقی کی تھی۔ روئی اور سلک سے تیار کیے ہوئے مال کے علاوہ بہت سی چیزیں ہندوستان سے باہر بھیجی جاتی تھیں۔ مغلوں کے پاس جہاز رانی کے وہ ذرائع نہیں تھے جن سے انھیں دوسرے ملکوں سے تجارت کرنے میں سہولت ہوتی۔ اس وقت بحر اوقیانوس بہت خطرناک راستہ تھا۔ اکثر تجارتی جہاز لوٹ لیے جاتے

1. The Commercial Policy of Mughals. p.195.
2. The Commercial Policy of Mughals .p.195
3. Ibid. P-165.
4. An Advance History of India, pp-572-574.

تھے اور تاجروں کو بڑے بڑے لڑنے والے جہازوں سے آمدورفت کرنی ہوتی تھی۔ ہندوستان نے جہاز رانی کے فن میں بالکل ترقی نہیں کی تھی۔ اس لیے ہندوستانی تاجر باہر سے آنے والے تاجروں کو غنیمت جانتے تھے۔ ابتدا میں یہ تاجر عام طور پر عرب تھے اور پھر سولھویں صدی کی ابتدا میں پرتگالی آئے۔ سترھویں صدی کے آغاز میں ڈچ تاجر آئے اور ۱۶۰۸ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان آئی۔ شروع میں اس کمپنی کا مقصد صرف تجارت رہا۔ لیکن آہستہ آہستہ ملک گیری کی ہوس نے انھیں سیاست میں حصہ لینے پر مجبور کر دیا اور تقریباً ایک صدی میں بنگال کا بہت بڑا حصہ اُن کے قبضے میں آ گیا۔ ۱۷۵۷ء اور ۱۸۵۷ء کے درمیانی زمانے میں بنگال، شمالی ہند، پنجاب اور کرناٹک میں ان کی فتوحات بڑھتی ہی گئیں۔

اورنگ زیب کی وفات کے بعد دہلی دربار میں ایرانی اور تورانی گروہوں کی آویزش سیاسی اقتدار کی جنگ ہے۔ ان امرا کی آمدنی کا ذریعہ زمینوں سے حاصل کیا ہوا لگان ہوتا جو بہت کم رہ گیا تھا۔ اس لیے اب ان کی نظریں خالصہ کی زمین اور شاہی خزانے پر تھیں۔

یہ بجائے کہ اورنگ زیب کے بعد جتنے بادشاہ تخت نشین ہوئے۔ وہ اورنگ زیب سے کم صلاحیتیں رکھتے تھے۔ لیکن یہ کہنا ٹھیک نہ ہوگا کہ وہ سب نااہل اور شاہی کاروبار سے بالکل بے بہرہ تھے۔ اُن میں ملکی انتظام کی صلاحیتیں نہیں تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مغل بادشاہوں کی زرعی اور اقتصادی پالیسی نے جن طاقتوں کو جنم دیا تھا انھوں نے اورنگ زیب کی زندگی ہی میں ایوان حکومت کی بنیادیں کھوکھلی کرنی شروع کر دی تھیں۔ اورنگ زیب کی زندگی ہی میں مرہٹوں نے اتنی طاقت حاصل کر لی تھی کہ تقریباً چالیس سال تک وہ دکن میں اُن سے نبرد آزما رہا۔ ادھر شمالی ہند میں اورنگ زیب کی عدم موجودگی کا

سے بال کرشن نے اس عہد کی جہاز رانی کے متعلق لکھا ہے: ”یورپین سمندر کے بادشاہ تھے۔ وہ کسی بھی بندرگاہ کا راستہ بند کر سکتے تھے۔ کسی بھی جہاز پر قبضہ کر سکتے تھے۔ وہ ایسا بھی کر سکتے تھے کہ ایشیا کے سوداگر اپنی بندرگاہ سے باہر نہ آسکیں۔ اس لیے انھوں نے آہستہ آہستہ ہندوستانیوں کے ہاتھ سے غیر ملکی اور سمندری تجارت چھین لی۔“ (انگریزی سے ترجمہ)

سب سے بڑا فائدہ جاٹوں نے اٹھایا۔ ”انھوں نے جاٹ کاشت کار کو تلواریں چلاتا سکھائی اور بندوقیں فراہم کیں۔“ لے بقول جادو ناتھ سرکار مغل حکومت کا زوال اور نگ زیب کی زندگی ہی میں شروع ہو گیا تھا۔ لیکن اس نے حکمت عملی اور تدبیر سے کام لے کر نمایاں نہیں ہونے دیا۔ اور نگ زیب کی وفات کے بعد دس سال کے عرصے میں تخت کی وراثت پر سات بار لڑائی ہوئی جس سے زوال کی رفتار تیز ہو گئی۔

سادات بارہہ کے دو بھائی سید عبداللہ خاں اور سید حسین علی خاں نے اتنا اقتدار حاصل کیا کہ بادشاہ گر کہلائے جانے لگے۔ مغل دربار میں ایرانی اور تورانی گروہوں کی اقتدار کی جنگ بھی زوال کی رفتار کو تیز کرنے کی ذمہ دار ہے۔ ایک طرف مغل حکومت کی دشمن طاقتیں کام کر رہی تھیں اور دوسری طرف خود حکومت میں اندرونی انتشار تھا جس کی وجہ سے مغل حکومت بالکل بے بس اور لاچار ہو گئی۔

عوام کو مغل حکومت کی مجبوری کا مکمل احساس نادر شاہ کے حملے کے وقت ہوا۔ نادر شاہ نے دہلی آکر جو قتل و غارت گری، لوٹ مار اور انسانیت سوز بہیمانہ حرکتیں کی ہیں، وہ ناقابل بیان ہیں۔ رضا لاہوری رام پور میں ایک قلمی کتاب ”قصہ حقیقت برآمدن نادر شاہ بہ شاہجہاں آباد“ ہے۔ اندرونی شہادتوں سے پتا چلتا ہے کہ کتاب کا مولف اس طوفانِ حشر خیز میں خود موجود تھا۔ افسوس ہے کہ نسخے کے ناقص الطرفین ہونے کی وجہ سے مولف

1. J.N. Sarkar, History of Aurangzib, vol. V. Calcutta, p.240

2. Sarkar, Fall of Mughal Empire, vol. I, Calcutta, p.1,

سے اگرچہ ان دونوں کے اقتدار کا زمانہ (۱۷۱۳ء۔ ۱۷۲۵ء) تک بہت مختصر ہے لیکن اسی زمانے میں انھوں نے جہاندار شاہ کو شکست دے کر فرخ سیر کو تخت نشین کیا۔ فرخ سیر کو گرفتار کر کے اندھا کیا اور کچھ دن بعد قتل کر دیا اور رفیع الدراجات کو تخت پر بٹھایا۔ رفیع الدراجات کا ایک مہینہ کچھ دن میں انتقال ہو گیا تو ان بھائیوں نے رفیع الدولہ کو تخت کا وارث مقرر کیا۔ یہ بادشاہ بھی دو ڈھائی مہینے سے زیادہ زندہ نہ رہا۔ محمد شاہ کو تخت پر بٹھایا گیا۔ اسی بادشاہ کے عہد میں بعض امرائے سازش کر کے سید حسین علی خاں کو قتل کر دیا اور دوسرا بھائی شاہی فوج کے مقابلے میں شکست کھا کر گرفتار ہوا۔ گویا سات سال کی مدت میں ان بھائیوں نے چار بادشاہوں کو تخت نشین کیا۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔

Satish Chandra Parties and Politics at the Mughal Court, Aligarh, 1959,

کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔ دہلی پر نادر شاہ کے حملے کا ذکر کرتے ہوئے مولف لکھتا ہے:

”گھڑی دن باقی تھا۔ شہر کے لوگوں نے مشہور کر دیا کہ نادر شاہ کا انتقال ہو گیا۔ تمام غارت گر اور حرام زادے جمع ہو گئے۔ پندرہ تاریخ کو ہر طرف یورش کر دی۔ بندوق اور جزائل سے تمام رات قتل و غارت گری کی۔ ایرانی (نادر شاہ کے سپاہی) کو چوں اور گلیوں میں مارے مارے پھرتے تھے اور امان مانگتے تھے۔ آخر الامر صبح ہوئی۔ اس خبر سے بادشاہ غصے میں دیوانہ ہو گیا۔ نادر شاہ نے بیردن شہر سے اپنی فوجیں طلب کیں اور خود قلعہ سے باہر آ کر مسجد روشن الدولہ چاندنی چوک میں بیٹھ گیا۔ قتل عام اور اہل شہر کے گرفتار کرنے کا حکم دے دیا۔ چنانچہ قزلباشوں نے شریفوں کی حویلیوں پر یورش کر دی۔ وہاں کے رہنے والوں کو قتل کیا..... چوک سعد اللہ خاں، چاندنی چوک، دیبھ گڑھ اور نئے شاہ جہاں آباد کو غارت اور برباد کر دیا اور شہر کے بہت سے لوگوں کو قتل کر دیا۔ سات آٹھ ہزار انسانوں کا خون ہوا اور شاہ جہاں آباد اس طرح برباد ہوا کہ دہلی دروازے سے نکاس تک ویران ہو گیا اور کوئی عمارت نظر نہ آتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہاں برسوں سے آبادی نہیں ہے..... پردہ نشین عورتوں نے ناموس کی خاطر کنوؤں میں چھلانگ لگا دی اور بہت سی عورتیں مر گئیں۔“۔^۱

(فارسی سے ترجمہ)

مرزا رفیع نے دہلی کی بربادی اور تباہی کا مرثیہ بڑی درد مندی کے ساتھ کہا ہے۔ ایسے ہی

^۱ قصہ حقیقت برآمدن نادر شاہ بہ شاہ جہاں آباد (قلمی) رام پور

(ب) اس حملے کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ دولت یار جنگ، داستان ترک تازان ہند، بمبئی ۱۳۱۰ھ، ص ۲۹-۱۶۱۔ غلام حسین طباطبائی، سیر المتاخرین، لکھنؤ، ۱۸۹۷ء، ص ۴۷۹-۴۸۶۔ مغل حکومت کا زوال، ۱۱ ص ۳۱-۳۲ (انگریزی) نادر شاہ کی تاریخ (انگریزی) (ج) حمزہ فریزر کا بیان ہے کہ تقریباً دس ہزار عورتوں نے کنوؤں میں چھلانگ لگا دی، جن میں سے کچھ دو تین دن بعد زندہ نکال لی گئیں۔ نادر شاہ کی تاریخ، ص ۱۸۱ (انگریزی)

کسی عبرت ناک واقعے سے متاثر ہو کر انھوں نے یہ درد انگیز اشعار کہے ہوں گے:

باغِ دلی میں جو اک روز ہوا میرا گزر
نہ وہ گل ہی نظر آیا نہ وہ گلشن نہ بہار
نفل بے بار پڑے، سوکھی پڑی ہیں روشیں
خاک اُڑتی ہے ہر اک طرف پڑے ہیں خس و خوار
دیکھتا کیا ہوں مگر سوکھی سی اک شاخ اوپر
عندلیب ایک ہے بے بال و پر و دل افکار
بدمِ سرد و بھدِ حسرت و صد سوزِ جگر
دیکھ کر سوئے چمن کہتی ہے یہ نالہ زار
حیف در چشمِ زدن صحبتِ یار آخر شد
روئے گل سیرِ ندیم و بہار آخر شد

نادر شاہ کے بعد احمد شاہ ابدالی نے اپنے پانچویں حملے میں نادر شاہ کی تاریخِ دہرادی۔ دہلی کے گلی کوچوں میں ایک بار پھر لاشوں کے ڈھیر لگ گئے اور ساری دہلی خاک و خون میں نہا گئی۔ خوب چند ذکا لکھتے ہیں کہ ”اس ہنگامہ قتل و غارت گری میں میرے بزرگوں نے عاقبتِ اندیشی سے کام لیتے ہوئے مستورات کو جان سے مار دیا اور خوف و ہراس کی وجہ سے خود کنوؤں میں چھلانگ لگا دی“۔^۱ (فارسی سے ترجمہ)

بیرونی حملہ آوروں کے علاوہ خود ہندوستان میں ایسی طاقتیں ابھر رہی تھیں جو مغل حکومت کے لیے مستقل خطرہ تھیں۔ مرہٹے وسطِ ہند سے پھیل کر مغرب میں سندھ اور مشرق میں بہار اور اڑیسہ تک قابض ہو چکے تھے۔ شمالی ہند میں روہیلوں کی طاقت زور پکڑ گئی تھی۔ آگرہ جاٹوں کے قبضے میں آچکا تھا اور اکثر ایسا ہوتا تھا کہ وہ لوٹ مار کرتے ہوئے دہلی تک آ جاتے تھے۔ ایک دفعہ لال قلعہ میں داخل ہو کر بیشتر قیمتی پتھر اکھاڑ کر لے گئے اور شاہی فوج کچھ نہیں کر سکی۔

۱۔ خوب چند ذکا، مہاراشٹرا، ص ۱۳۶-۱۳۷ (مائیکرو فلم دلی یونیورسٹی لائبریری)

مغل حکومت کا زوال اور اس کے اثرات

اس بات کا تذکرہ پہلے کیا جا چکا ہے کہ مغل حکومت بعض وجوہ سے اندرونی طور پر کمزور ہو گئی تھی۔ ایک وقت وہ بھی تھا جب ملک کے کسی بھی علاقے میں مغل حکومت سے سرکشی کی ہمت کسی میں نہیں تھی۔ لیکن اب حالت یہ تھی کہ ہندوستان کے مختلف علاقوں سے مرہٹوں، اردوہیلوں اور سکھوں کی بغاوت یا انگریزوں کی ریشہ دوانیوں کا جو طوفان بھی اٹھتا، اس کا رخ دہلی کے لال قلعے کی طرف ہوتا تھا۔ اس کا نتیجہ سیاسی انتشار، سماجی شکست و ریخت، معاشی ابتری اور مذہبی بے راہ روی اور فوجی کمزوری کی شکل میں سامنے آتا تھا جس نے زوال کی رفتار کو اور تیز کر دیا۔

اٹھارویں صدی کے جن شاعروں نے مغل حکومت کے زوال کے ان آثار کا ماتم دردناک لفظوں میں کیا ہے، ان میں سودا، میر اور حاتم خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس عہد کے شعرا میں خواجہ میر درد ایسے ہیں، جنہوں نے تصوف اور روحانیت کا سہارا لے کر گرد و پیش کی المناک زندگی سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور بہت کم اپنی شاعری کی عشق و محبت کی دنیا سے باہر آئے۔

قلعے کا حشر یہ ہو گیا تھا کہ وہاں پھلوں کے درختوں کے بجائے گھاس پھوس نظر آتی تھی۔ مرتضیٰ حسین بکرامی، جو عالمگیر ثانی کے عہد میں دہلی میں موجود تھے، لال قلعے کے بارے میں لکھتے ہیں:

”شاہی قلعہ اور اس کی اندرونی عمارات میں پھل پھول کے درختوں کی جگہ گھاس اور کانٹے دار پودوں کا جنگل پیدا ہو گیا ہے۔ بادشاہ کی نشست کے لیے ایک معمولی کرسی بمشابہ تخت دیکھنے میں آتی ہے۔“^۱

۱۔ مرتضیٰ حسین اللہ یار عثمانی بکرامی، حدیثہ الاقالم، لکھنؤ، ۱۸۷۹ء، ص ۴۳ بحوالہ پروفیسر ظہیر ملک، سودا کے شہر آشوب اور سید فواد خاں کی جھوٹا تاریخی مطالعہ، مشمولہ مرزا محمد رفیع سودا، مرتبہ پروفیسر عزیز احمد، نئی دہلی، ۲۰۰۱ء، ص ۱۷۸

سودا نے جو بھجی اور شہر آشوب لکھے ہیں، وہ مغلوں کی عظیم الشان حکومت کے زوال اور ہندوستان کے سب سے بڑے سیاسی، تہذیبی، علمی اور ادبی مرکز دہلی کے اُجڑنے کے دردناک مرچے ہیں۔ انھوں نے دہلی کے نجیبوں اور اہل اقتدار کی بربادی اور تباہی کا ماتم کیا ہے۔

مرکزی حکومت کی زمینوں اور جاگیرداروں کی جاگیروں پر باغیوں کا قبضہ ہو گیا تھا۔ دہلی کے امرا و رؤسا معاشی بد حالی کا شکار تھے۔ سودا نے ایک شہر آشوب میں دولت مند طبقے کی مفلسی، شاندار عمارتوں کی خستہ حالی اور نجیب زادیوں کی بد حالی کا بہت دردناک انداز میں ذکر کیا ہے۔ سودا لکھتے ہیں:

سپاہی رکھتے تھے نوکر امیر دولت مند
سو آمد اُن کی تو جاگیر سے ہوئی ہے بند
کیا ہے ملک کو مدت سے سرکشوں نے پسند
جو ایک شخص ہے بائیس صوبوں کا خاوند
رہی نہ اس کے تصرف میں فوجداری کول

خراب ہیں وہ عمارات کیا کہوں تجھ پاس
کہ جس کے دیکھے سے جاتی رہی تھی بھوک اور پیاس
اور اب جو دیکھو تو دل ہووے زندگی سے اداس
بجائے گل چمن میں کمر کمر ہے گھاس
کہیں ستون پڑا ہے، کہیں ڈھیر مرغول

جہاں آباد تو کب اس ستم گے قابل تھا
مگر کہو کسی عاشق کا یہ مگر دل تھا
کہ یوں اٹھا دیا گویا کہ نقشِ باطل تھا
عجب طرح کا یہ بحر جہاں میں ساحل تھا
کہ جس کی خاک سے لیتی تھی غلّی موتی رول

نجیب زاد یوں کا ان دنوں ہے یہ معمول
 وہ برقع سر پہ ہے جس کا قدم تلک ہے طول
 ہے ان کی گود میں لڑکا گلاب کا سا پھول
 اور ان کے حسن طلب کا ہر ایک سے یہ اصول
 کہ خاک پاک کی تسبیح ہے جو لیے مول

زوال کے اثرات

کسی شخصی حکومت کے بدلنے کا عوام پر بہت کم اثر ہوتا ہے لیکن مغل حکومت کا زوال عوام کا زوال تھا۔ زوال کی مسموم ہواؤں نے نہ صرف اس ہرے بھرے درخت کے سبز پتوں کا منہ زرد کر دیا تھا بلکہ اس کی جڑوں تک میں زہریلے اثرات پھیلا دیے تھے۔ جو مصیبت مغل بادشاہوں پر آئی تھی اس کا امر اور دوسا سے لے کر عوام تک سب پر برابر اثر پڑا تھا۔

چنانچہ اس کا اثر ہندوستان کے تہذیب و تمدن کے تمام شعبوں پر بالواسطہ طور بھی پڑا اور بلاواسطہ طور پر بھی۔ شاعر جو کہ ملک کے فکری اور جذباتی رجحانات کا آئینہ دار ہوتا ہے، ان حالات میں چوٹ کھائے بغیر کیسے رہ سکتا تھا۔ اس سیاسی و سماجی اور معاشی طوائف الملوکی نے اس کا روزگار ہی نہیں چھینا، اس کے قلب و ذہن کو بھی جھنجھوڑ دیا۔ دراصل سودا کی زندگی کے واقعات اور ان کا کلام بڑھتے ہوئے اس ماڈی و روحانی خلفشار کو ہمارے سامنے عیاں کر دیتے ہیں۔ چنانچہ ان حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے سودا کے کلام کا جائزہ دل چسپ بھی ہوگا اور مفید بھی۔

اقتصادی بد حالی

مرہٹے، جاٹ، سکھ اور روہیلے اچھے خاصے علاقوں پر قابض ہو گئے۔ دکن اور بعض

نہ صرف خاص میں آمد نہ خالصہ جاری
سپاہی تا صدی سیموں کو بیکاری
اب آگے دفتر تن کی میں کیا کہوں خواری
سوال دھتلی پھاڑ کر کے پنساری
کسی کو آنولہ دے باندھ کر کسی کو کنول

نادر شاہ کی لوٹ مار تاریخ میں یادگار ہے۔ کروڑوں روپے کی مالیت کے سونے چاندی کے برتن، جواہرات اور دوسرا سامان اس کے ہاتھ آیا۔ تخت طاؤس اور کوہ نور جیسی نادر اور بیش بہا اشیاء بھی اس کے خزانے میں منتقل ہو گئیں۔ اس کی لوٹ مار صرف شاہی خزانے تک محدود نہیں تھی بلکہ اس نے امرا و رؤسا کا کچا حویلیوں کو بھی خالی کر دیا۔ سرہنری ٹارنس^۱ اور جیمز فریزر^۲ نے پورے سامان کی تفصیل دی ہے۔

اس واقعے کے تقریباً دس سال بعد احمد شاہ ابدالی نے دہلی کے گلی کوچوں میں پھر نادر شاہ کی تاریخ دہرائی۔ ایک بار پھر شاہی خزانہ خالی ہو گیا اور امر اور وساک کی ذاتی دولت چھن گئی۔

[illegible]

۱. تاریخ تاجری (فارسی) ص ۲۵۲-۲۵۵

۲۔ تدرشاہ کی تاریخ (انگریزی) ص ۲۲۰-۲۲۱

دلی بارہا ان حملہ آوروں کے ہاتھوں تباہ و برباد ہوئی۔ میر نے ایک دفعہ دلی کے ویران ہونے کا نقشہ ان درد انگیز الفاظ میں کھینچا ہے:

”ایک روز میں شہر کے تازہ ویرانے کی سیر کو گیا۔ ہر قدم پر روتا اور
عبرت پکڑتا تھا۔ جتنا آگے گیا، اتنی ہی ویرانی بڑھی۔ میں مکانوں
کو نہ پہچان پایا، شہر نہ نظر آیا۔ عمارتوں کے آثار نہ دکھائی
دیے۔ (وہاں) رہنے والوں کی کچھ خبر نہ ملی۔

از ہر کہ خن کردم، گفتند کہ این جا نیست

از ہر کہ نشان جستم، گفتند کہ پیدا نیست

مکان گر گئے، دیواریں ٹوٹ گئیں۔ خانقاہوں میں صوفی رہے اور نہ خرابات میں ع
خوار۔ دُور تک ویرانہ ہی ویرانہ تھا۔

ہر کجا افتاده دیدم خشت در ویرانہ

بود فرد دفتر احوال صاحب خانہ ل

(فارسی سے ترجمہ)

مرزا دلی کی بربادی پر اس طرح ماتم کرتے ہیں:

جہاں آباد تو کب اس ستم کے قابل تھا

مگر کبھو کسی عاشق کا یہ نگر دل تھا

کہ یوں اٹھا دیا گویا کہ نقشِ باطل تھا

عجب طرح کا یہ بحر جہاں میں ساحل تھا

کہ جس کی خاک سے لیتی تھی خلق موتی رول

لوگ در بدر مارے مارے پھرتے تھے لیکن ایسی کوئی صورت نہیں نکلتی تھی جس سے پیٹ کی آگ کو ٹھنڈا کیا جاسکے۔ اگر گھوڑا لے کر کسی کی نوکری کر دو تو تنخواہ غائب اور بقول مرزا:

گھوڑا لے اگر نوکری کرتے ہیں سو کی
تنخواہ کا پھر عالم بالا پہ نشاں ہے
گزرے ہے حدا یوں علف و دانہ کی خاطر
شمشیر جو گھر میں تو سپر پیسے کے یاں ہے
مرزا اس اقتصادی بحران کے اسباب سے بخوبی واقف تھے۔

سپاہی رکھتے تھے نوکر امیر دولت مند
سوا آمد ان کی تو جاگیر سے ہوئی ہے بند
کیا ہے ملک کو مدت سے سرکشوں نے پسند
جو ایک شخص ہے بائیس صوبے کا خاوند
رعی نہ اس کے تصرف میں فوجداری کول
میر نے بھی بادشاہ و وزیر کے تلاش ہونے کا ماتم کیا ہے:

مشکل اپنی ہوئی جو بود و باش
آئے لشکر میں ہم برائے تلاش
آن کے دیکھی یاں کی طرف معاش
ہے لب نان پہ سو جگہ پر خاش
نے دم آب ہے نہ چچہ آش

زندگانی ہوئی ہے سب پہ وبال
کنجڑے جھبیں ہیں روتے ہیں بقال
پوچھ مت کچھ سپاہیوں کا حال
ایک تلوار بیچے ہے اک ڈھال
بادشاہ و وزیر سب تلاش

عوام کی مالی حالت کتنی خراب تھی۔ اس کا اندازہ بہت مشکل ہے۔ خود بادشاہ مفلسی کا شکار تھا۔ شاہ ولی اللہ نے شاہی ملازمین کے متعلق لکھا ہے۔ ”جب خزانہ بادشاہ نہیں رہا نقدی بھی موقوف ہو گئی۔ آخر کار سب ملازمین تتر بتر ہو گئے اور کاسہ گدائی اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ سلطنت کا بجز نام اور کچھ باقی نہیں رہا۔“۔ سلطنت سے متعلق تقریباً یہی الفاظ سید غلام حسین خاں طباطبائی کے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔ ”محمد شاہ کی وفات کے بعد سلطنت کا صرف نام باقی رہ گیا ہے اور کچھ نہیں۔“۔ ۱

فوجی کمزوری

اس اقتصادی بد حالی کا اثر براہ راست فوج پر پڑا۔ ایران، خراسان، ترکستان اور افغانستان سے آنے والے سپاہیوں کی بھرتی بند ہو چکی تھی۔ راجپوت اور مرہٹے جو کبھی مغل فوج کی طاقت کا بہت بڑا حصہ تھے۔ اب مغلوں کے سب سے بڑے دشمن بن چکے تھے۔ شاہی خزانے میں روپیہ نہ ہونے کی وجہ سے رہی سہی فوج بھی بے بس ولاچار ہو گئی تھی۔ مہینوں اور بعض اوقات برسوں تنخواہ نہ ملنے کی وجہ سے سپاہیوں کے دلوں نے سرد پڑ گئے تھے۔ بادشاہ اپنے افلاس کی وجہ سے تنخواہیں دینے سے معذور تھا۔ احمد شاہ کے زمانے میں محلات شاہی کے ساز و سامان کی فہرست بنا کر دوکان داروں کو دے دی گئی تھی تاکہ اس کو فروخت کر کے سپاہیوں کی تنخواہیں ادا کر دی جائیں۔ ۲ بقول صاحب

۱۔ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات، ص ۱۰۴

۲۔ سیر المصطفیٰ، ۳، ۸۷۰

۳۔ شاکر خاں پانی پتی، تذکرہ شاکر خاں (قلمی)، ص ۳۴، بحوالہ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات، ص ۱۲۲

”تاریخ عالم گیر ثانی“ فوجیوں نے تنگ آکر اپنے گھوڑے بیچ دیے تھے۔ پیدل فوج کے پاس وردیاں نہ رہی تھیں۔ جانوروں کو چارہ نہ ملتا تھا اس وجہ سے وہ مرنے لگے تھے۔ فوجی اپنے گھروں سے باہر نہ نکلتے تھے۔ بعض اوقات وہ شاہی سواری کی ہمراہی میں بھی نہ ہوتے۔

ایسے واقعات بھی ہوتے تھے کہ تنخواہ نہ ملنے پر سپاہی اپنے آقا کو سر بازار بے عزت کر دیتے۔ عماد الملک کے سپاہی پانی پت کی سڑکوں پر اُسے گھینٹتے پھرے اور ذلیل و خوار کیا۔ ہمارے شہر آشوبوں میں اس فوجی کمزوری کا طرح طرح سے مضحکہ اڑایا گیا ہے۔ شہزادے بھوک سے تنگ آکر گھر سے باہر نکل آتے تھے۔ بقول مرزا :

چا رکھی ہے سلاطینوں نے یہ توبہ دھاڑ
کوئی تو گھر سے نکل آئے ہیں گریباں پھاڑ
کوئی در اپنے پہ آدے دے مارتا ہے کواڑ
کوئی کہے جو ہم ایسے ہیں چھائے ہیگی پہاڑ

تو چاہیے کہ ہمیں سب کو زہر دیجیے گھول

نجیب زادیاں جنھوں نے کبھی گھر سے باہر قدم نہیں نکالا تھا، در در بھیک مانگتی پھرتی تھیں۔ مرزا نے اس دردناک حقیقت کو بھی شہر آشوب میں بیان کیا ہے:

نجیب زادیوں کا ان دنوں ہے یہ معمول
وہ برقع سر پہ ہے جس کا قدم تلک ہے طول
ہے ان کی گود میں لڑکا گلاب کا سا پھول
اور ان کے حسن طلب کا ہر ایک سے یہ اصول
کہ خاک پاک کی تسبیح ہے جو لیجیے مول

اٹھارویں صدی میں ہندوستان کی معاشی بد حالی، سیاسی ابتری اور بد نظمی پر جتنے شہر آشوب کہے گئے ہیں، اتنے کبھی کسی دور میں نہیں کہے گئے۔ مرزا کے استاد شاہ حاتم نے اپنے شہر آشوب میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ شرفا نگے اور بھوکے ہیں اور رزالے خوب عیش کر رہے ہیں۔ ایک بند ملاحظہ ہو۔

جہاں میں صاحبِ سخا نہ گھاس والے ہیں
جنھوں کے محل تھے ان کو کھنڈر کے لالے ہیں
کئی جو ہم نے (کہ) ٹکڑے کھلا کے پالے ہیں
سواب دماغ میں وہ رانی خاں کے سالے ہیں
وہ ہیں سلام طلب ہم سے جب ہوئے دوچار

شا کر ناجی کہتے ہیں:

لڑے ہوئے نہ برس بیس اون کو بیٹے تھے
دعا کے زور سے دائی ددوں کی چیتے تھے
شرابیں گھر کی نکالے مزے سے پیتے تھے
نگار و نقش میں ظاہر گویا کہ چیتے تھے
گلے میں ہیکلیں بازو اوپر طلا کی نال

قضا سے بچ گیا مرنا نہیں تو ٹھانا تھا
کہ میں نشان کے ہاتھی اوپر نشانا تھا
نہ پانی پینے کو پایا وہاں نہ کھانا تھا
ملے تھی وہاں جو لشکر تمام چھانا تھا

نہ ظرف و مطبخ و دوکاں نہ غلہ و بقال
وہ لوگ جن کی تلواریں لاکھوں قسمتوں کا فیصلہ کرتی تھیں۔ مجبور اور لاچار تھے۔ مفلسی نے
یہ حال کر دیا تھا کہ اُن کے پاس پورے ہتھیار بھی نہیں تھے۔ بقول مرزا :

یہ جتنے نقدی و جاگیر کے تھے منصب دار
تلاش کر کے ڈپٹے انھوں نے ہو ناچار
عدان قرض میں بیویں کے دی سپر تلوار
گھروں سے اب جو نکلتے ہیں لیکے وہ ہتھیار
بقول کے بیچ تو سوتا ہے ہاتھ میں بکبول
یہ تو اُن لوگوں کا حال تھا جو کبھی صاحب اقتدار تھے۔ بقول مرزا عام سپاہی کی حالت اور
نہ کی تھی۔ حالات نے انھیں اتنا بد دل بنا دیا تھا کہ لڑائی کے نام سے کانپتے تھے۔

پڑے جو کام انھیں تب نکل کے کھائی سے
رکھیں وہ فوج جو موتے بھری لڑائی سے
پیادے ہیں سوڈریں سرمنڈاتے نائی سے
سوار گر پڑیں سوتے میں چار پائی سے
کرے جو خواب میں گھوڑا کسی کے نیچے الول

اس فوجی کمزوری نے بادشاہ کی عزت و ناموس کو خاک میں ملا دیا۔ قاتم نے ایک
شہر آشوب میں عالم گیر ثانی اور اس کے دادا جہاندار شاہ کو کھلم کھلا گالیاں دیں اور عالم
گیر ثانی اس کا کچھ نہ کر سکا۔

۱۔ شہر آشوب کا ایک بند ملاحظہ ہو:

دادا ترا جو لال کنور کا تھا جلا کہتا تھا کشتیوں کے ڈبونے کو بر ملا
اس خاندان میں حق کا جاری تھا سلسلہ دوں دوش کس طرح سے میں حیرے تیں بھلا
آخر گدھا پن ان کا ترا عذر خواہ ہے

شاہ عالم بے بسی اور لا چاری کی مکمل تصویر تھا۔ جس امیر کا اقتدار ہوتا وہ اپنی من مانی کرتا اور بادشاہ محض کٹھ پتلی کی طرح اس کے ہاتھوں میں ناچتا۔ کنور پریم کشور فراتی کا بیان ہے کہ قلعہ میں بادشاہ کے روبرو ”توتو“ ”میں میں“ کی نوبت پہنچ جاتی تھی۔ حد تو یہ ہے کہ چوکیدار اور فراش تک بادشاہ کی پرواہ نہ کرتے تھے۔ ایک دفعہ اندراؤ نے بادشاہ سے اجازت لیے بغیر مرہٹہ سردار پٹیل پر کچھ نقدی نچھاور کر دی۔ تمام فراش چوکیدار نقدی لوٹنے پر ٹوٹ پڑے۔ انھیں بادشاہ کی موجودگی کا احساس تک نہ ہوا۔^۱ بادشاہ سر دربار خود بھی گالیاں دیتا اور اس کے جواب میں فحش اور واہیات کلمات سنتا۔ فراتی نے ایک ایسا واقعہ بھی لکھا ہے۔^۲

اہل ہنر کا ترک وطن

جاگیرداری دور میں اہل ہنر کی سرپرستی جاگیردار طبقہ کرتا ہے۔ مگر اس عہد میں یہ طبقہ بہت زبوں حال تھا۔ اس لیے اہل ہنر در بدر مارے مارے پھرتے تھے۔ عرض ہنر میں فائدہ خاک نہیں تھا۔ بقول مرزا، شاعر جو مستغنی الاحوال کہلاتے تھے وہ بھی فکر و تردد میں گھر گئے۔

شاعر جو سُنے جاتے ہیں مستغنی الاحوال
دیکھے جو کوئی فکر و تردد کو تو یاں ہے
مشتاقِ ملاقات انھوں کا کس و ناکس
ملنا انھیں ان سے جو فلاں ابن فلاں ہے
گر عید کا مسجد میں پڑھے جا کے دو گانہ
نیت قطعہ تہنیت خانِ زماں ہے

۱ کنور پریم کشور فراتی، وقائع عالم شاہی، رام پور، ۱۹۳۹ء، ص ۱۳۳

۲ ایضاً، ص ۱۴۱

تاریخ تولد کی رہے آٹھ پہر فکر
گر رحم میں بیگم کے سنے نطفہ خاں ہے
اسقاط حمل ہو تو کہیں مرثیہ ایسا
پھر کوئی نہ پوچھے میاں مسکین کہاں ہے

الد دول کے در پہ جہہ سائی کے باوجود دولت حاصل کرنے میں شاعر ناکام رہتے
تھے۔ جب بے زری انتہا کو پہنچ گئی تو بقول مرزا:

غرض مال ہے اس گفتگو سے یہ میرا
کہ بے زری نے جب ایسا گھر آن کر گھیرا
تو کوئی قصد کرے نوکری کا بہتیرا
نہیں یہ فائدہ کچھ تا وہ چھوڑ کر ڈیرا

کرنے نہ عزم سوئے اصفہان و استنبول

گارساں دہاسی نے تذکرہ مجمع الانتخاب کے حوالے سے سودا کی والدہ کو عالی کی بہن
بتایا ہے، جو صریحاً غلط ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے لکھا ہے:

”ایک ایسے معاشرے میں جہاں خون کا رشتہ بڑی اہمیت
رکھتا تھا۔ نعمت خاں عالی کا نواسہ کوئی ایسی غیر اہم بات نہیں جس
کا ذکر سودا کے معاصر تذکرہ نگار نہ کرتے۔ سودا کے اس شعر سے
بھی نعمت خاں عالی سے قرابت داری کی تردید ہوتی ہے:

کم ہے ناصر علی سے نعمت خاں

اس سے مرغوب تر ہے اس کا خیال

ہندوستان میں دکن، فرخ آباد اور اودھ وہ علاقے تھے جہاں شاعروں کا استقبال ہوتا تھا۔ یہاں دولت کی فراوانی تھی۔ بقول شاہ ولی اللہ سعادت خاں ایرانی اور اس کے بعد اس کا داماد صفدر جنگ صوبہ اودھ پر قابض تھے۔ دو کروڑ اس صوبے سے وصول کرتے تھے۔ ایک کروڑ خرچ کرتے تھے اور ایک کروڑ جمع کرتے تھے۔ لے ”منتخب روزگار“ ترک وطن کر کے ان مقامات پر چلے گئے۔ جہاں متاع ہنر کی قیمت سونے چاندی کے سکوں میں ملتی تھی۔ خان آرزو، عارف علی خاں عاجز، قیام الدین قائم، احسن اللہ خاں بیان، محمد فقیہ صاحب دردمند، ہدایت اللہ ہدایت، قلندر بخش جرات، مصطفیٰ، میر قمر الدین منت، ہیبت قلی خاں حسرت وغیرہ وہ شاعر ہیں جنہیں حالات سے مجبور ہو کر دہلی کو خیر باد کہنا پڑا۔

مرزا رفیع در بدر مارے پھرنے کو برا سمجھتے تھے۔ ان کی ایک رباعی ہے۔

سودا بچے دنیا تو بہر سو کب تک
آوارہ ازیں کوچہ بہ آں کو کب تک
حاصل یہی اس سے ہے کہ دنیا ہوئے
بالفرض ہوا یوں بھی تو پھر تو کب تک

لیکن دہلی کے ناگفتہ بہ حالات میں ان کے لیے بھی ترک وطن کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا اور انھیں بھی ”آوارہ ازیں کوچہ بہ آں کو“ ہونا پڑا۔

زندگی سے فرار

دور زوال میں مغل حکومت کی حالت ایک ایسے مریض کی تھی جو جانکنی کے عالم میں

۱۔ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات، ص ۱۰۴

۲۔ دلی سے جانے والے شاعروں کی یہ فہرست قطعی نامکمل ہے۔ نیز ان کے زمانہ رخصت کے تقدیم و تاخیر کا بھی خیال نہیں رکھا گیا۔ مرزا مظہر جانجاناں جیسے صوفی منش انسان بھی روز روز کی قتل و غارت گری سے تنگ آ کر ترک وطن کا ارادہ کر چکے تھے۔ مگر کچھ خانگی مجبوریوں نے باز رکھا۔ ملاحظہ ہو۔

مرزا مظہر جانجاناں، مرزا مظہر جانجاناں کے خطوط، مرتبہ دہتر جمعہ ظیق انجم، دہلی، ۱۹۶۲ء، ص ۱۴۹

ہو، مگر جسے موت نہ آتی ہو۔ یہ تکلیف بادشاہ، امراء اور عوام تک سب ہی کی زندگی کو اجیرن بنائے ہوئے تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کی گردن پر ایک تنگی نکوار لگی ہوئی ہے جو کسی وقت بھی ان کے سر کو جسم سے علاحدہ کر سکتی ہے۔ عظمت ماضی کا احساس ان کے زخموں پر تک تو چمڑک سکتا تھا، سکون نہیں پہنچا سکتا تھا۔ جاگیر طبقہ کے دست و بازو شل ہو چکے تھے۔ اس لیے سماج کے تمام افراد کے سامنے ایک ہی راستہ تھا اور وہ تھا ”فرار“ زندگی اور اس کے تلخ حقائق سے فرار۔

فرار کی دو نمایاں صورتیں تھیں۔ مذہب کا سہارا لے کر انفرادی نجات کی کوشش کی جائے اور مادی دنیا کی ناکامی کے احساس کو مٹانے کے لیے عالم آخرت کے لیے جدوجہد کی جائے، دوسرا راستہ تھا دین و دنیا سے بے نیاز ہو کر راض و رنگ و بو میں ڈوب جانا:

انچہ در جملہ آفاق دریں جا حاضر

شاہد و شمع و شراب و شکر و نائے و سرود

اس دور میں فرار کی یہ دونوں صورتیں نمایاں نظر آتی ہیں۔ اس موضوع پر اسلم پرویز کا ایک شعر ہے:

عبادت ہو کہ میخواری فرار زندگانی ہے

یہ وہ کرتے ہیں اسلم جن سے غم کھایا نہیں جاتا

تصوف کو اس عہد میں جتنی مقبولیت رہی ہے۔ شاید اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی۔

سعادت یار خاں رنگین کے شعر آشوب کا ابتدائی اس ذہنی فرار پر بخوبی روشنی ڈالتا ہے۔

سنو بیان اک میرا یارو منصف ہو تو سن کر رو دو

ایک دن مجھ کو سوچ یہ آیا یعنی زمانے نے ہے ستایا

اس دنیا میں آئے ہیں جب سے چین نہیں ہے مطلق تب سے

دولت اپنے پاس نہیں ہے کچھ آمد کی آس نہیں ہے
 فکرِ معیشت نے ہے مارا کیجیے کس صورت سے گزارا
 ہوا بہت سا جب میں مضطر تب یہ کہا دل نے گھگھیا کر
 کیوں رے دل کیا مرضی ہے تیری فکر تجھے کچھ ہے بھی میری
 چیز بڑی دنیا میں ہے دولت دن اس کے ہوتی ہے ذلت
 کھیتی کر یا کر تو تجارت نوکری کر یا باندھ کے ہمت
 سن کر دل نے یوں کہا مجھ کو خاص میں کہتا ہوں تجھ کو
 ہووے اگر امدادِ الہی سب سے بہتر یادِ الہی
 صبر کی داد خدا ہی دے گا دل کو مراد خدا ہی دے گا

یہ اشعار بتا رہے ہیں کہ عوام تلاشِ معاش میں سرگرداں رہتے تھے اور جب ناکامی ہوتی تھی تو تجارت، کھیتی اور نوکری کا خیال چھوڑ کر یادِ الہی میں مصروف ہو جاتے۔ خانقاہوں میں صبر و قناعت کی تعلیم دی جاتی تھی۔ انھیں سمجھایا جاتا تھا کہ دنیا قبحہ خانہ ہے جس سے ہر انسان کو دامن بچا کر نکل جانا چاہیے۔ اردو شاعری تصوف کی مقبولیت سے بہت زیادہ متاثر ہوئی۔ تصوف کے فلسفیانہ مسائل، مذہبی رواداری، پاکیزگی خیال، عشقِ حقیقی اور افلاطونی عشق کا تصور، خودداری، عظمتِ انسانی کا احساس، بے ثباتی دنیا اور صبر و قناعت اسی راستے سے اردو شاعری میں آئے ہیں۔ جس کا اثر مرزا کی شاعری پر بھی بہت نمایاں ہے۔

اس دور میں مرزا مظہر جانجاناں، شاہ ولی اللہ، مولانا فخر الدین اور خواجہ میر درد جیسی قابلِ احترام ہستیاں بھی تھیں۔ یہ تمام حضرات اس زوال کو روکنے کی پوری جدوجہد کر رہے تھے۔ ان کے اندازِ فکر سے اختلاف ممکن ہے لیکن ان کے خلوص، ایمان داری اور

صدقات پر شبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔

فرار کا دوسرا راستہ عیش و عشرت تھا۔ مادی مشکلات میں جنسی آسودگی کچھ دیر کے لیے انسان کو سب کچھ فراموش کرا دیتی ہے۔ جب مغل بادشاہ حالات کی تاب نہ لا سکے تو غرقِ مئے ناب ہو گئے۔

جہاندار شاہ کی تفریح اور عیاشی کے لیے مہینے میں تین دفعہ سارے شہر میں چراغاں ہوتا تھا۔ لال کنور جیسی بازاری عورتوں کو قلعہ اور ملک کی سیاست میں پورا پورا دخل تھا۔ صرف اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے جہاندار شاہ نے جتنا میں آدمیوں سے بھری ہوئی ایک کشتی کو ڈبوئے کا حکم دیا۔ قائم نے جس کا اپنے شہر آشوب میں ذکر کیا ہے۔ محمد شاہ کے زمانے میں یہ عیاشی انتہا کو پہنچ گئی۔ انجمن ترقی اردو علی گڑھ کے کتب خانے میں ایک ناقص الاؤل بیاض ہے۔ اس کے مصنف کا نام معلوم نہ ہو سکا۔ لیکن اس کی تصنیف غالباً عہد محمد شاہ ہی میں ہوئی ہے۔ مصنف نے محمد شاہ کی عیاشی کے بارے میں لکھا ہے:

”حضرت سبحانی (محمد شاہ) مقدمات سلطانی سے بے خبر قلعہ دار الخلافہ شاہ جہاں آباد کو فوجِ عظیم سمجھتے ہیں۔ سمت برج اور انگوری باغ وغیرہ کی سیر کو غنیمت جانتے ہیں۔ ہمیشہ شراب خوری، بیچہ بازی اور زنا کاری میں مشغول رہتے۔ اپنے ساتھ برہنہ ہونے کی حد تک چست اور تنگ لباس سے آراستہ عورتیں رکھتے (کذا) شہر کے لوگوں نے خدا کو فراموش کر دیا ہے۔ خواص و عوام نے عورتوں کا لباس اختیار کر لیا ہے۔ روزے نماز کے بدلے حرام کاری، شراب خوری اور اغلام میں مطلق العنان ہو گئے ہیں۔“

محمد شاہ نے بھی ایک بازاری رقاصہ اودھم بائی کو ملکہ بنالیا تھا جس نے بہت جلد اتنا اقتدار حاصل کر لیا کہ ہر فرمان پر اس کی مہر لگنے لگی۔ بقول سرکار جس زمانے میں سپاہی اپنی تنخواہوں کے لیے روزِ بغاوت کرتے تھے اور حکومتِ قلعہ کے سونے چاندی کے برتن

فروخت کرنے کے بعد بھی اس قابل نہیں تھی کہ دو لاکھ روپے ہی ادا کر دیتی۔ اودھم بائی نے جنوری ۱۷۵۴ء میں اپنا یومِ پیدائش منایا اور اس پر دو کروڑ روپیہ خرچ ہوا۔

نواب درگاہ قلی خاں ۱۱۵۱ء میں دہلی آئے تھے اور تین سال تک ان کا یہاں قیام رہا۔ انھوں نے اس زمانے کے حالات لکھے ہیں۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ امیر زادوں نے عیش و عشرت کو بحیثیت فن ترقی دی تھی۔ ان کے دن رات شراب، مردوں اور عورتوں میں گزرتے تھے۔ فدوی خاں کے لڑکے اعظم خاں کا ذکر کرتے ہوئے نواب صاحب نے لکھا ہے:

”یہ خانبہاں بہادر عالم گیری کے بھتیجے ہیں۔ امراے عظیم الشان میں ہیں۔ مزاج میں رنگینی اور موسیقی میں مہارت حاصل ہے، اس لیے ہندوستان کے موسیقار ان کی تعریف کرتے ہیں۔ ان کی طبیعت امر پسند ہے اور مزاج سادہ رویوں کی محبت میں گرفتار ہے اُن کی جاگیروں کی آمدنی اس فرقے پر خرچ ہوتی ہے اور تمام دنیا کی دولت ان مردوں کے قدموں پر نثار۔“

جہاں کہیں کسی امر کی خبر ملتی ہے، دل کی ہاتھوں مجبور ہو کر اُس پر اپنی رفاقت کی کند ڈالتے ہیں اور جہاں کہیں سے کسی سادہ رو کا پیغام ملتا ہے اُسے اپنے احسان کے جال میں پھانس لیتے ہیں۔ اس گروہ کے بہت سے لڑکوں نے اُن کی حسن سعی سے مناصب مناسب پر امتیاز حاصل کیا ہے اور (اب بھی) اُن کے دوست ہیں۔ بعضے خانگی مراعات پر اکتفا کر کے محفلِ نشاط میں رونق افروز ہیں۔ (یہ امر) بڑی شان و شوکت سے ناقابلِ بیان تجل کے ساتھ تیز رفتار گھوڑوں پر سوار ہوتے ہیں۔ غرض جہاں کہیں سبز رنگ نظر آئے، وہ اعظم خاں سے منسوب ہے اور جہاں کہیں کوئی نوخط نظر آئے، تو پتا چلتا ہے کہ اسی عظیم الشان سے وابستہ ہے۔ ان لکڑیوں کے حسن کے پرتو سے (اعظم خاں) بڑھاپے کو

جوانی میں بدلے ہوئے ہیں اور اس خیال سے کہ عمر عزیز بہت کم باقی ہے۔ نفسانی لذتوں کے حصول میں عجلت سے کام لے رہے ہیں۔“

”مرزا منو اس زمانے کے امیر زادوں میں ہیں اور امر دہرستی کے فن میں یگانہ روزگار ہیں اکثر امیر زادے اس علم کے اہم نکات انہی سے سیکھتے ہیں، وہ اُن (اعظم خاں) کی شاگردی پر فخر کرتے ہیں۔ (مرزا منو) اس محفل کے منتظم اور اس بزمِ غلمان کے مہتمم ہیں۔ ان کا گھر بہشتِ خداداد ہے اور اُن کا کاشانہ خانہ جمع پریزاد ہے۔ ہر وہ فوجیہ رنگیں، جس کا اس محفل سے تعلق نہیں ہے، وہ فردِ باطل ہے اور جس سانولے سلوانے کا اس مجلس سے ربط نہیں ہے، وہ ناقابلِ اعتبار ہے۔ اُن کی مجلس میں حسین امردوں کی پرکھ ہوتی ہے اور اُن کی محفلِ مگرخوں کی کسوٹی ہے۔ اگر حسن کے سونے چاندی کا سکھ ان کی محفل کی دارا ضرب میں نہ ڈھلے تو کھرا نہیں ہوتا۔ کیا ہوا اگر وہ (حسین) سونا چاندی ہے۔ جب حسن کی چاندی اس محفل کی بھٹی میں نہ پچھلے، چاندی نہیں ہے۔ کیا ہوا اگر چاندی خالص ہے۔ رباعی: (ترجمہ)

دوستو اب قمار خانے میں ایسے کچھ ہی رند باقی ہیں،

جو کم عیار لوگوں سے نہیں ملتے۔

رند بہت کم ہیں اور کوئی نہیں جانتا کہ بہت کم ہیں

(یہ رند) دو عالم کے نقد و ادھار (اس دنیا کے نقد

اور آخرت کے ادھار) پرہتے ہیں۔“

کسل سنگھ بادشاہی ہزار یوں میں تھے۔ انھوں نے ماڈی عیش و عشرت کے لیے جو سامان فراہم کیے تھے، اس کی تفصیل نواب صاحب نے ان الفاظ میں بیان کی ہے:

۱۔ درگاہ قلی خاں، مرقع دہلی، مرتبہ و مترجمہ ظیق انجم، نئی دہلی، ۱۹۹۳ء، ص ۱۳۷-۱۳۸

۲۔ مرقع دہلی، مرتبہ و مترجمہ ظیق انجم، ص ۱۳۸

”کسل سنگھ بادشاہ کے ہزاری منصب داروں میں ہیں۔ ہم سردوں میں اپنی دولت و ثروت پر فخر کرتے ہیں۔ کسل پورہ بڑی خوب صورتی اور تکلف کے ساتھ آباد کیا ہے۔ ہر طرح کی طوائفوں اور رنڈیوں کو لا کر آباد کیا ہے۔ جرائم پیشہ لوگوں اور نشہ آور اشیا کے فروخت کرنے والوں کو اپنی سرپرستی میں وہاں لا کر رکھا ہے۔ اگرچہ وہاں بہت بھیڑ رہتی ہے، لیکن محاسب اس علاقے کے قریب سے بھی نہیں گزرتا، اس کی کیا مجال کہ احتساب کرے۔ ہر راستے پر رنگ برنگے لباس پہنے عورتیں خود کو مردوں کے سامنے پیش کرتی ہیں اور ہر گلی کوچے کے موڑ پر دلال لوگوں کو دعوت دیتے ہیں۔ کسل پورے کی ہوا شہوت انگیز اور فضا باہ انگیز ہے۔ خاص طور سے شام کو بہت مجمع اور عجیب ہنگامہ ہوتا ہے۔ ہر گھر میں رقص ہوتا ہے اور ہر مکان میں سرود اہل ہوس بغیر کسی مزاحمت اور ممانعت کے وہاں آتے ہیں اور دامن شہوت کو خیارک اور سوزاک (جیسی بیماریوں سے) بھرتے ہیں اور پھر باقی زندگی حسرت و یاس میں گزارتے ہیں۔ غرض عجب مقام اور طرز تماشا ہے۔“

ذکر کیفیت ناگل

”خواجہ بسنت اسد خانی کی سرائے کے قریب ایک احاطہ ہے بہت خوب صورت اور صاف ستھرا۔ اس میں ناگل نامی ایک صاحب کمال مدفون ہیں۔ ہر مہینے کی ستائیس تاریخ کو عاشق مزاج عورتیں خوب سج دھج کر جوق در جوق زیارت کے لیے وہاں آتی ہیں۔ حقیقت میں اُن کا مقصد کچھ اور ہوتا ہے۔ جن مردوں سے اُن کا تعلق ہوتا ہے، اُن سے مل کر داد عیش دیتی ہیں۔ بہت سے مجر داور پردیسی لوگ خوب بن سنور کر، اس امید میں

کہ شاید انھیں کوئی قبول کر لے، اُس جلوہ گاہ میں خود کو پیش کرتے ہیں۔ مصرع:
دیکھیے دوست کسے چاہے گا اور کس پر توجہ کرے گا

کہا جاتا ہے کہ اس مقام کی خصوصیت یہ ہے کہ اگر پردہ سی اس تفریح گاہ میں آجائے تو فوراً اُسے اپنا جزا مل جاتا تھا۔ اگرچہ یہ تماشا گاہ بہت وسیع ہے، پھر بھی تماشا کی اتنی کثرت سے ہوتے ہیں کہ تل دھرنے کو جگہ نہیں رہتی۔ لوگ وہاں صبح آتے ہیں اور شام کو واپس جاتے ہیں۔ سڑک کے کنارے جو باغ ہیں، واپسی میں اُن کی سیر کرتے ہوئے جاتے ہیں۔ غرض عیش و عشرت کے سامان فراہم کیے ہیں اور خوب چیزیں اختراع کی ہیں۔ خدا تمام دوستوں کو نصیب کرے۔

سب سے خطرناک بات یہ تھی کہ ”فرار“ کے یہ دونوں راستے ایک دوسرے میں ضم ہو گئے۔ اس عہد میں تصوف کے جس فلسفے کو مقبولیت تھی۔ وہ وحدت الوجود کا فلسفہ تھا۔ یعنی ہر چیز خدا ہے۔ یہ فلسفہ مذہب کی ظاہری رسوم، دیر و حرم کی تفریق وغیرہ کو تسلیم نہیں کرتا۔ سانچ پر اس فلسفے کے مثبت اثرات یہ ہوئے کہ عوام میں مذہبی رواداری پیدا ہو گئی۔ مندر اور مسجد کا فرق ختم ہو گیا۔ لیکن نقصان یہ ہوا کہ عام سماجی زندگی میں بے اعتدالیاں پیدا ہو گئیں۔ جب یہ تسلیم کر لیا جائے کہ انسان بھی خدا ہے تو پھر یہ مضحکہ خیز بات ہے کہ خدا خدا کی عبادت کرے۔ ایسی صورت میں کوئی گناہ گناہ نہیں رہتا۔ کیوں کہ گناہ کا مرتکب خود خدا ہے۔ جب خدا ہی مرتکب ہے تو پھر کیسے ممکن ہے کہ خدا خود اپنی ذات کو سزا دے۔

اسی فلسفے نے حرم اور میکدے کی سرحد ختم کر دی۔ لوگ خدا اور اپنے نفس دونوں کو خوش رکھنے کی کوشش کرتے۔ صوفی انفرادی نجات حاصل کرنے میں کوشاں ہو گئے۔ عوام ان کی خدمت میں نجات کا راستہ دیکھنے لگے۔ بادشاہ اور امراء در و سا جو دنیا بھر کی عیاشیاں کرتے۔ صوفیوں کی بہت عزت کرتے اس طرح ایک طرف تو عوام میں تصوف کی مقبولیت بڑھتی گئی اور دوسری طرف خود بادشاہ کو ڈنی فرار حاصل ہوتا۔ بادشاہ دعا گوئی

کے صلے میں مدد معاش کے طور پر جاگیریں عنایت کرتے اور مختلف انعام و اکرام سے نوازتے۔ اس لیے بعض عیار و مکار لوگوں نے تصوف کو ذریعہ معاش بنالیا۔ عالم گیر ثانی کو صوفیوں سے بڑی عقیدت تھی۔ احمد علی سندیلوی نے لکھا ہے کہ عالم گیر ثانی مرزا مظہر سے ملاقات کے لیے گیا تھا۔^۱

سعادت خاں ناصر کا بیان ہے کہ شاہ عالم خواجہ میر درد کے ہاں حاضر ہوا تھا۔^۲ عالم گیر ثانی کا قتل بھی اس بہانے سے کیا گیا تھا۔ اس سے کہا گیا کہ فیروز شاہ کوئلہ میں کوئی برگزیدہ بزرگ آئے ہوئے ہیں۔ جب بادشاہ وہاں پہنچا تو دشمنوں نے قتل کر دیا۔ صاحب ”سیر المتاخرین“ لکھتے ہیں۔ ”آخری عمر میں (محمد شاہ) فقیروں کی صحبت میں خوش رہتے اور انھیں کے ساتھ بیٹھتے اٹھتے۔“^۳ درویشوں اور فقیروں سے محمد شاہ کی عقیدت کا یہ عالم تھا کہ اس نے شاہ مبارک کو برہان الطریقت، شاہ بدایا کو برہان الحقیقت اور شاہ رمز کو فصیح البیان کے خطابات دیے تھے۔^۴ محمد شاہ نے قمر الدین خاں وزیر کی معرفت مرزا مظہر سے کہلوایا تھا کہ ”اللہ تعالیٰ نے ہم کو ملک عطا کیا ہے جو کچھ آپ کو پسند آئے بطور ہدیہ قبول فرمائیے۔“^۵ مرزا مظہر نے اس پیش کش کو قبول نہیں کیا۔

چوں کہ اُس سماج میں صوفیاء کی بہت عزت ہوتی تھی۔ اس لیے تصوف سماجی عزت و وقار حاصل کرنے کا بھی بہترین ذریعہ بن گیا اور بد سے بد کردار لوگوں نے اس مسلک کو اختیار کر کے پیسہ کمانے کا ایک بڑا موثر ذریعہ بنالیا۔ انھیں علمائے سونے الجواز قطرة الحقیقت کے فلسفے کا ناجائز فائدہ اٹھا کر ”امرد پرستی“ جیسے غیر فطری فعل کو جنسی آسودگی کا ذریعہ بنالیا۔ انھیں حرم اور میکدہ دونوں سے خلوص تھا۔ ان کی راتیں میخانوں اور دن خانقاہوں میں گزرتے تھے۔ بزرگوں کے مزاروں کو باقاعدہ دکانیں بنالیا گیا۔

۱۔ احمد علی سندیلوی، مخزن الغرائب (قلمی)، ورق ۳۲۰ ب

۲۔ سعادت خاں ناصر لکھنوی، تذکرہ خوش معرکہ زیبا (قلمی)۔ نیز ملاحظہ ہو، قدرت اللہ شوق رام پوری،

تکملۃ اشعرا (قلمی) ص ۲۲۷

۳۔ سیر المتاخرین، ص ۳، ۸۷۰

۴۔

۵۔ شاہ غلام علی، مقامات مظہری، دہلی، ۱۳۰۹ھ، ص ۳۸-۳۹

شاید آج بھی پیرس کے ٹائیٹ کلبوں میں وہ شرمناک جنسی مناظر نظر نہ آتے ہوں گے جو اس دور کے عرسوں میں عام تھے۔ نواب درگاہ قلی خاں نے ایسے بہت سے عرسوں کا ذکر کیا ہے۔ دہلی میں سرائے خواجہ بسنت اسد خانی کے قریب کسی ناگل نامی بزرگ کا مزار تھا۔ اس پر ہر مہینہ عرس ہوتا تھا۔ نواب صاحب اس کے بارے میں فرماتے ہیں:

”ہر مہینے کی ساتویں تاریخ کو عاشق مزاج بدکردار عورتیں پوری جج دھج کے ساتھ جوق در جوق زیارت کے لیے آتی ہیں۔ دراصل ان کے آنے کا مقصد کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ یہاں آکر لطف اٹھاتی ہیں۔ اُن مردوں کے ساتھ دوا عیش دیتی ہیں جن سے ان کا تعلق ہوتا ہے۔ اکثر اہل تجرید اور غریب پیشگاہ اس امید میں کہ شاید اُن پر بھی کسی کی نگاہ انتخاب پڑ جائے اور انھیں بھی کوئی قبول کر لے۔ خوب بن ٹھن کروہاں آتے ہیں۔ اُس جگہ کے خواص کا بیان ہے کہ اگر کوئی پردیسی یہاں آئے تو اسے فوراً اپنا جوڑا مل جاتا ہے۔“

مذہب اور جنسی لذتوں کی بگڑی ہوئی مکمل شکل غلہ منزل (بہادر شاہ اول) کے عرس میں ملتی ہے۔

”۲۳ ماہ محرم کو غلہ منزل کا عرس ہوتا ہے۔ ان کی قبر حضرت قطب الاقطاب کے جوار میں ہے۔ مہر پر در جو غلہ منزل کی زوجہ ہیں حیات خاں ناظر کی مدد سے ایک ماہ پہلے ہی چراغاں بندی کی تزئین و ترتیب کی طرف متوجہ ہو جاتی ہیں، چراغاں طرح طرح سے اور عجیب عجیب شکلوں میں ہوتا ہے..... ہر گوشہ و کنار میں تھجکی آگیں بنگلے وادی ایمن سے سبقت لے جاتے ہیں۔ عاشق (معاشران) ہر گوشہ و کنار میں اپنے محبوبوں کو بغل میں لیے، عیاش لوگ نفسانی خواہشات میں ڈوبے ہوئے کوچہ بازار میں رقص

کرتے ہوئے، مے خوار محتسب سے بے خوف یہ مستوں کی
تلاش میں، شہوت طلب کسی بھی مزاحمت سے بے خوف شاہد پرستی
میں مصروف، زاہدوں کی توبہ توڑنے والے نوخط امردوں کے
ہجوم (نظر آتے ہیں)۔^۱

ان تمام سماجی حالات سے اردو شاعری بھی متاثر ہوئی۔ میر، مرزا اور حد تو یہ ہے کہ مرزا
منظہر جیسے ثقہ بزرگوں کے کلام میں امردوں کے نام ملتے ہیں۔ میر کے ذہن پر تصوف کی
گرفت مضبوط تھی۔ غالباً اس لیے کہ ان کی پرورش متصوفانہ ماحول میں ہوئی تھی۔ مرزا
تصوف سے صرف ایک حد تک متاثر ہیں۔ اُن پر ان سماجی حالات کا اثر نسبتاً زیادہ ہے
اور شاید اسی لیے اردو شاعری میں خارجیت کی ابتدا ان ہی سے ہوتی ہے۔ دہلی اور لکھنؤ
کے سماجی حالات تقریباً ایک ہی تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ لکھنؤ والوں پر تصوف کا کوئی
نمایاں اثر نہیں تھا۔ دبستانِ دلی کے لب و لہجہ میں جوشائستگی ہے وہ تصوف کی دین
ہے۔ اگرچہ اکثر وہ شائستگی کی حدوں سے باہر بھی آ جاتے ہیں۔

دبستانِ لکھنؤ کی شاعری میں عشق و محبت اور معاملہ بندی کے مضامین زیادہ ہیں۔ یہ
مضامین حقیقی زندگی کے آئینہ دار ہیں۔ تصوف کے فلسفوں سے خلط ملط نہیں ہیں۔

ان سیاسی اور سماجی حالات کی روشنی میں مرزا کی زندگی اور ان کے فن کو بہتر طور پر سمجھا
جاسکتا ہے۔ مرزا ایسے بااقتدار لوگوں سے متوسل رہے تھے، جو صاحبِ حل و عقد تھے
جس کی وجہ سے انھیں اپنے عہد کے سیاسی و سماجی حالات کو زیادہ بہتر سمجھنے کا موقع
ملا۔ ان کے شہر آشوب اس حقیقت کا ثبوت ہیں کہ ان میں بھرپور سیاسی شعور تھا۔ انھوں
نے امراء و رؤسا، مختلف طبقوں اور پیشہ وروں کا مضحکہ اڑایا ہے۔ ان شہر آشوبوں اور
ہجوموں میں وہ ہنسی ہے، جو انتہائے غم پر آ جانے کا نام ہے۔

سوانح

سیر کی یوں کوچہ ہستی کی ہم
 نئے میں سے جوں نالہ گزر کر گیا

آبا و اجداد

اکثر تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ مرزا کے آبا و اجداد کا بل سے ہندوستان آئے تھے۔^۱ لیکن یہ درست نہیں۔ کیوں کہ نقش علی نے ان کا وطن اصلی بخارا بتایا ہے۔^۲ نقش علی کے مرزا سے ذاتی تعلقات تھے۔ اس لیے ان کا بیان زیادہ قرین قیاس ہے۔ بھگوان داس ہندی نے بھی یہی لکھا ہے کہ اُن کے اجداد بخارا سے ہندوستان آئے اور دہلی میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔^۳ بعض معاصرین کے بیانات کے علاوہ خود مرزا کے کلام میں بھی اس کی شہادت موجود ہے کہ وہ بخارا کے تھے۔ نیز یہ کہ وہ کا بل کے مغلوں کو بُری نظر سے دیکھتے تھے۔ میر علی ہاتف نے حکیم آفتاب کی جھوکی تھی۔ مرزا نے حکیم صاحب کی فرمائش پر اس جھوکا جواب دیا۔ جو کلیات سودا میں موجود ہے اور جس کا ایک بند یہ بھی ہے:

شیرازی تھا نہ باپ ترا اور نہ آملی

وہ خرس گر مغل کوئی ہوگا تو کاہلی

کونان کو کونون کہنے پہ تیری زباں جھکی

۱۔ ان میں چند قابل ذکر تذکروں کے نام یہ ہیں: حکیم قدرت اللہ قاسم، مجموعہ نغز، مرتبہ محمود شیرانی لاہور، ۱۹۳۳ء، جلد ۱، ص ۳۰۴۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، گلشن بے خار، لکھنؤ، ۱۸۷۴ء، ص ۹۹۔ ایف فیلین و مولوی کریم الدین، طبقات شعراے ہند، دہلی، ۱۸۴۸ء، ص ۱۰۴۔ مولوی عبدالغفور نساج، سخن شعرا، لکھنؤ، ۱۸۷۴ء، ص ۲۲۳۔ شیخ چاند، سودا، اورنگ آباد، ۱۹۳۶ء، ص ۳۵۔ لالہ سری رام، شمع خانہ جاوید، جلد ۴، دہلی، ۱۹۲۶ء، ص ۳۱۷۔ مفتی صدر الدین آزرودہ، تذکرہ آزرودہ (قلمی) کیمرج انگلینڈ، ص ۲۸۔
۲۔ نقش علی، بارغ معانی (قلمی)، خدا بخش، ورق ۶۲ ب۔
۳۔ بھگوان داس ہندی، سفینہ ہندی، مرتبہ محمد عطاء الرحمن عطا کا کوئی، پٹنہ، ۱۹۵۸ء، ص ۱۰۵۔

ہرگز کے نگہیت آغا علی قلی
زیر گفتگو عبث دل خود شاد کردہ

اگر مرزا خود کامل کے ہوتے تو کامل کے مغلوں کو اس انداز میں ہرگز برا بھلا نہ کہتے۔ اس لیے ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ ان کے آباؤ اجداد بخارا ہی سے آئے تھے۔^۱

مرزا کے چچا

ان کا نام نہیں معلوم ہو سکا۔ تذکرہ قائم سے صرف اتنا پتا چلتا ہے کہ یہ بہادر شاہ اول کی فوج کے ساتھ دکن گئے تھے اور ان کے ساتھ مرزا ابوطالب نامی فارسی شاعر دہلی آئے تھے۔^۲ البتہ مرزا کے ننھیال سے متعلق دو اہم نام ملتے ہیں۔

نعت خاں عالی

غالباً شاہ کمال پہلے تذکرہ نگار ہیں جنہوں نے مرزا کو ”پیر دستر نعت خاں عالی“ لکھا ہے۔^۳ گویا کمال کے بیان کے مطابق نعت خاں عالی مرزا کے سگے نانا تھے۔ دتاسی کو نہ جانے کیا غلط فہمی ہوئی۔ اس نے کمال کے حوالے ہی سے لکھا ہے کہ مرزا کی والدہ نعت خاں عالی کی بہن تھیں۔^۴ قصائد سودا کے ایک قلمی نسخے کا آغاز ان الفاظ سے

۱۔ شاید آزاد پہلے تذکرہ نگار ہیں جنہوں نے لکھا ہے کہ ”بزرگوں کا پیشہ بہ گری تھا۔ مرزا شفیع (والد مرزا) بطریق تجارت وارد ہندوستان ہوئے۔ محمد حسین آزاد، آب حیات، لاہور، ۱۹۱۳ء، ص ۱۳۸۔ ممکن ہے آزاد سے پہلے بھی کسی اور نے لکھا ہو مگر وہ میری نظر سے نہیں گزرا۔ البتہ اکثر تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ ”یکے از اجدادش (مرزا شفیع نہیں) بہ ہندوستان آمدہ“ بعد کے تذکرہ نگاروں نے آزاد کا بیان دہرایا ہے۔ مثلاً سودا، ص ۳۵۔ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی، دلی کا دبستان شاعری، علی گڑھ، ۱۹۴۳ء، ص ۱۵۰۔ اثر کا کوردی، نیرنگ سودا، ص ۲۱۔
۲۔ شیخ محمد قیام الدین قائم، مخزن ثکات، مرتبہ مولوی عبدالحمق، لورنگ آباد، ۱۹۲۹ء، ص ۱۰۔
۳۔ شاہ کمال الدین کمال، مجمع الانتخاب (قلمی)، ۱، نمبر، ورق ۳۶۲ ب۔ شیخ چاند نے بھی کمال کے بیان کو تسلیم کیا ہے۔ سودا، ص ۳۵۔

۴۔ گارماں دتاسی، تاریخ ادبیات، ۳، ص ۶۷، بحوالہ محاصر، حصہ ۲

ہوتا ہے۔ قصائد مرزا محمد رفیع سودا۔ دختر زادہ نعت خاں عالی۔ سعادت خاں ناصر لکھنوی نے لکھا ہے کہ ”مادر گرامی ان کی دختر خجہ اختر خاندان نعت خاں عالی سے ہے۔“ ہمارے خیال سے یہ درست نہیں کہ سودا کی والدہ عالی کی بہن یا بیٹی تھیں۔ اگر ایسا ہوتا تو اکثر تذکرہ نگار اس کا ذکر ضرور کرتے۔ خاص طور پر میر، قائم اور گردیزی۔ کیوں کہ یہ سب لوگ سودا کو بہت قریب سے جانتے تھے اور نعت خاں عالی کا بھانجا یا نواسہ ہونا سودا کے لیے باعث عزت تھا۔

گارساں دتاسی نے تذکرہ مجمع الانتخاب کے حوالے سے سودا کی والدہ کو عالی کی بہن

۱۔ قصائد سودا (قلمی) آصفیہ، نمبر ۱۱۸

۲۔ نعت خاں عالی کا اصل نام مرزا محمد تھا۔ ان کے اسلاف شیراز میں پیشہ طبابت میں شہرت رکھتے تھے۔ خود ان کے والد فتح الدین بھی حکیم تھے۔ حکیم فتح الدین کے بھتیجے حکیم حسن خاں شاہ عالم اول کی شہزادگی کے زمانے میں ان کے مصاحب تھے۔ حکیم حسن خاں کے لڑکے اور عالی کے چچا زاد بھائی حکیم حاذق کو عہد عالم گیری کے سال آخر میں حکیم الملک کا خطاب ملا اور محمد شاہ کے عہد میں شیخ ہزاری منصب پر فائز ہوئے اور حکیم الملوک

خطاب پایا

۳۔ آزاد بگڑائی کا بیان ہے کہ عالی ہندوستان میں پیدا ہوئے لیکن صغریٰ میں اپنے والد کے ساتھ شیراز چلے گئے تھے، جہاں کسب کمال کیا تھا اور پھر عہد اورنگ زیب کے وسط میں ہندوستان آئے اور اورنگ زیب کی ملازمت اختیار کر لی۔ اورنگ زیب نے پانصدی منصب، نعت خاں خطاب اور خدمت خان سالاری عنایت کی۔ اورنگ زیب کے دور آخر میں جواہر کی وارثی اور مقرب خاں خطاب ملا۔ بادشاہ کے انتقال کے جب محمد اعظم شاہ، شاہ عالم کے مقابلے کے لیے آیا تو یہ شاہ عالم کے ہم رکاب تھے۔ محمد اعظم شاہ کے مارے جانے پر انھوں نے شاہ عالم کی ملازمت کر لی۔ اسی کے عہد میں سہ ہزاری منصب پایا اور دانش مند خاں کے خطاب سے نوازے گئے۔

چچو گوئی میں کمال رکھتے تھے اور حج بھی کیا تھا۔ اس لیے بقول خوش گو فارسی کے مشہور شاعر بیدل انھیں حاجی بھوی کہا کرتے تھے۔ خوش گو کا بیان یہ بھی ہے کہ عالی کے علم و فضل اور قوت گویائی کا یہ عالم تھا کہ پورے ہندوستان میں کسی کو ان سے بحث کرنے کی مجال نہیں تھی۔

بقول خوش گو ۱۱۲۳ھ میں اور بقول آزاد بگڑائی ۱۱۲۱ھ میں انتقال کیا۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ ہندوستان داس خوش گو، سفینہ خوش گو، مرتبہ شاہ محمد عطاء الرحمن عطا کا کوئی، پٹنہ ۱۹۵۹ء، ص ۵۹-۶۱۔ میر غلام علی آزاد بگڑائی، سرو آزاد، مرتبہ عبداللہ خاں، حیدر آباد ۱۹۱۳ء، ص ۱۳۶-۱۳۹۔ میر غلام علی آزاد بگڑائی، خزائنہ عامرہ، کان پور، ۱۸۷۱ء، ص ۳۳۳۔

۴۔ تاریخ ادبیات (جلد سوم) ص ۶۷

بتایا ہے، جو مصری غلط ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے لکھا ہے:

”ایک ایسے معاشرے میں جہاں خون کا رشتہ بڑی اہمیت رکھتا تھا، نعت خاں عالی کا نواسہ ہونا کوئی ایسی غیر اہم بات نہیں جس کا ذکر سودا کے معاصر تذکرہ نگار نہ کرتے۔ سودا کے اس شعر سے بھی نعت خاں عالی سے قرابت داری کی تردید ہوتی ہے۔“

کم ہے ناصر علی سے نعت خاں

اس سے مرغوب تر ہے اُس کا خیال

البتہ یہ ممکن ہے کہ سودا کی والدہ خاندان عالی سے ہوں۔ یعنی اُن کا عالی سے کوئی دور کا رشتہ ہو۔

مرشد قلی خاں

خدا بخش لاہوری پٹنہ میں ”ذکر مغنیان ہندوستان بہشت نشان“ کا ایک قلمی نسخہ ہے۔ اس کے مصنف مرزا کے ایک ہم عصر لطف علی خاں صادق کے لڑکے عنایت خاں راج ہیں۔ یہ کتاب غالباً واحد ذریعہ ہے جس سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کے نانا مرشد قلی خاں خراسانی تھے۔ قاضی عبدالودود صاحب نے اس فارسی کتاب کا ایک اقتباس دیا ہے۔ یہ اقتباس کافی طویل ہے، لیکن چون کہ اس سے مرشد قلی خاں کے حالات زندگی اور بعض دل چسپ واقعات پر روشنی پڑتی ہے۔ اس لیے یہاں مکمل اقتباس کا اردو ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے:

”ایک دن اعلیٰ حضرت (شاہ جہاں) نے امیر الامرا علی مردان

خاں سے پوچھا کہ اے یار وفادار ہم تمہاری رائے کو مستقیم جانتے

ہیں۔ ہمارے بعد تمہارے خیال سے کس شہزادے کو حکومت کا

دارث ہونا چاہیے۔ انھوں نے دیکھا کہ بادشاہ کی خاطر اقدس

داراشکوہ کی کامیابی چاہتی ہے۔ اگر موافق مزاج بات کہوں تو خلاف واقعہ ہوگا اور جب دوسرے شہزادے سنیں گے تو ناخوش ہوں گے اور اگر کسی دوسرے (شہزادے) کا نام زبان پر آگیا تو سوائے اس شہزادے کے جس کا نام لوں۔ بادشاہ، داراشکوہ اور باقی تمام شہزادوں کی ناراضگی کا سبب ہوگا۔ (علی مردان خاں نے) عرض کیا۔ جس شہزادے کے ساتھ بھی مرشد قلی خاں ہو (اُسے حکومت ملنی چاہیے..... خاں مذکور (مرشد قلی خاں) کمال جوہر و شجاعت رکھتا تھا۔ وہ شاہ عباس ثانی کے امرا کے رشتہ داروں میں تھا اور ان سرداروں میں ممتاز تھا جو علی مردان خاں کے ساتھ صاحب قران (شاہ جہاں) کے ملازم ہوئے تھے۔ آنحضرت (شاہ جہاں) کو امیر الامرا کی فہم و ادراک پر بڑا اعتماد تھا۔ بادشاہ نے نصیحت فرمائی کہ مرشد قلی خاں کی دلجوئی کی جائے اور انھیں داراشکوہ کے ہمراہان میں منسلک کر دیا۔ لیکن چوں کہ وہ شہزادہ نازپرور آنحضرت کی قدر نہیں جانتا تھا اور اپنے باپ..... کے ملازموں کے ساتھ تفقہ و دلدادگی کی بجائے تحکمانہ انداز سے پیش آتا تھا۔ اس لیے تھوڑے ہی زمانے میں انھوں نے شہزادے سے قطع تعلق کر لیا اور امیر الامرا کے پاس دوبارہ گئے۔ اسی دوران میں جب شاہزادہ اورنگ زیب (کرم خوردہ..... کذا) کو صوبجات دکن کی نظامت ملی تو وہ امیر الامرا کے گھرانے کی عیادت کو گیا اور خلوت میں کہا میں آپ سے ایک تحفے کا طلب گار ہوں۔ اگر آپ قبول فرمائیں تو میں آپ سے عرض کروں۔ امیر الامرا نے عرض کیا۔ آپ پر سے میرے جان و مال نثار ہیں۔ اورنگ زیب نے کہا۔ مرشد قلی خاں کو ہمیں دے دیجیے۔ یاروفادار نے جواب دیا۔ اگر حضور (شاہ جہاں) رخصت دے دیں تو وہ جان و مال سے حاضر ہیں۔ انھوں (اورنگ زیب) نے فیہ مافیہ پر نظر کرتے

ہوئے کہا کہ اس سلسلے میں ہمارا عرض کرنا درست نہیں..... جس طرح بھی ہو حضور سے رخصت دلانے کی ذمہ داری آپ اپنے سر لیں۔ اورنگ زیب کا اصرار اس حد تک پہنچا کہ امیر الامرا نے ہر ممکن کوشش کرنے کا وعدہ کیا۔ کچھ عرصے بعد جب وہ تندرست ہوئے تو دربار آئے۔ کئی دفعہ تمہید اٹھانے کے بعد مدعا عرض کیا۔ مگر بادشاہ نے یہ بات سن کر ٹال دی۔ اس سے یار وفادار کو سخت پریشانی ہوئی۔ ساتھ بیٹھنے والوں میں سے کسی نے پریشانی کی وجہ دریافت کی۔ امیر الامرا نے سارا واقعہ بیان کر دیا۔ وہ سوال کرنے والا خوشحال کلاونت کا ہم سایہ تھا اور اس سے بڑے اچھے تعلقات رکھتا تھا۔ دربار کا ذکر کرتے ہوئے اس شخص نے (کلاونت کو) یہ واقعہ بھی سنایا۔ خوشحال خاں نے کہا کہ اگر امیر الامرا مجھے ایک لاکھ روپیہ عنایت فرمائیں تو شاید مرشد قلی خاں کی رخصت کی کوئی صورت نکل آئے۔ اس عزیز نے دوسرے دن خوشحال خاں کا یہ مقولہ انھیں (امیر الامرا) کو سنایا۔ انھوں نے کہا کہ ایک لاکھ روپیہ دینا معمولی بات ہے مگر میں اسے عار سمجھتا ہوں کہ میری درخواست تو منظور نہ ہو اور کلاونت کے ذریعہ میں اپنا کام نکالوں۔ اس شخص نے امیر الامرا کی یہ بات خوشحال خاں سے کہی۔ اس نے جواب دیا کہ لطف تو یہی ہے کہ درخواست خود امیر الامرا کریں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ (درخواست اس وقت پیش کی جائے) جب یہ کمینہ اشارہ کرے۔

چند روز بعد نوروز کی تقریب میں جشن ہوا اور مغنیان مذکور..... نے راگنی ٹوڈی تان سین سے گانے کی ابتدا کی اور طبع مبارک کے پسندیدہ دھرپداں انداز میں گائے کہ مزاج مقدس پوری طرح متاثر ہو گئے..... اس وقت خوشحال خاں نے امیر الامرا کو اشارہ کیا

اور انھوں نے مرشد قلی خاں کے رخصت کی درخواست پیش کر دی..... عرضی پر دستخط کر دیے گئے اور امیر الامرا نے سیاہہ خلعت خانے کو بھیج دیا۔ دوسرے دن دیوان میں مرشد قلی خاں کو خلعت خانہ سیاہہ کے ساتھ دو دروغاؤں نے بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا تاکہ خلعت رخصت عنایت ہو..... بادشاہ نے کہا ہم نے مرشد قلی خاں کو رخصت کی ہرگز اجازت نہیں دی۔ یاروفا دار نے..... عرضی..... پیش کی..... اس وقت آنحضرت نے کہا کہ دستخط کرتے وقت درخواست پر ہماری توجہ نہیں تھی چوں کہ اظہار غفلت مناسب نہیں تھا اس لیے بہر حال خلعت رخصت کا حکم ہو گیا۔ اورنگ زیب خان مذکور کی رفاقت کو فوز عظیم جانتا تھا اور بہت بڑی عنایت سمجھتا تھا۔ یہاں تک کہ دوسری لڑائی (۱۰۶۸ھ میں جسونت سنگھ نے دارا شکوہ کی حمایت میں اورنگ زیب سے جنگ کی تھی) میں دارا شکوہ نے انھیں جان سے مار دیا۔ اکثر اوقات شاہ جہاں یاروفا دار (مرشد قلی خاں) کی تعریف کرتے تھے اور ان کے قتل پر اظہار افسوس کرتے۔ اسماعیل قلی خاں صاحب جو ۱۱۷۰ھ میں عظیم آباد میں مقیم ہیں۔ وہ مرشد قلی خاں کے پوتے ہیں اور مرزا..... رفیع ان کے نواسے۔ ۱

بقول قاضی عبدالودودؒ ان میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جن کی دوسرے ذرائع سے تصدیق نہیں ہوتی اور بعض تو صریحاً غلط ہیں۔ خان رائج نے مرشد قلی خاں کے حالات اسماعیل قلی خاں سے سنے ہوں گے۔ ضروری نہیں کہ رائج نے اسماعیل قلی خاں اور سودا کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ غلط ہو۔ ممکن ہے خان رائج کے خود سودا سے بھی تعلقات رہے ہوں۔

مرشد قلی خاں اپنے زمانے کے مشہور اور نامور امیروں میں تھے۔ وہ ابتدا میں علی مردان

۱. عنایت خان رائج، ذکر مغلیان ہندوستان بہشت نشان (قلی)، پٹنہ، بحوالہ معاصر، حصہ ۲، ص ۱۱۱-۱۱۲

۲. معاصر، حصہ ۲، ص ۱۱۲

خاں زیک حاکم قندھار کے ملازم تھے۔ جب علی مرداں خاں نے قندھار کا قلعہ شاہ جہاں کے حوالے کر کے اپنی فوج کے ساتھ اس کی ملازمت اختیار کی تو مرشد قلی خاں بھی اس کے ہمراہ تھے۔ یہ اپنی خداداد صلاحیتوں کی وجہ سے بہت جلد بادشاہ کو عزیز ہو گئے۔ جلوس شاہ جہانی کے انیسویں سال خنجر خاں کی جگہ پر کاغذہ کی فوجداری پر مقرر کیے گئے جب اورنگ زیب ملخ اور بدخشاں کی صوبہ داری پر نامزد ہوا تو مرشد قلی خاں کو بخشی گیری فوج پر متعین کیا گیا۔ جلوس کے بائیسویں سال میں جاں نثار خاں کی جگہ آختہ بیگی کا عہدہ ملا اور چوبیسویں سال میں لاہور کے صوبہ دار مقرر ہوئے۔

جلوس کے چھبیسویں سال میں جب شہزادہ اورنگ زیب نے صوبہ دکن کے انتظام کی طرف توجہ کی اور ہزارہ پانصدی اور پانصد سوار کے منصب پر فائز ہوا اور بالا گھاٹ کی خدمت دیوانی ملی تو مرشد قلی خاں بھی ساتھ تھے اور دستوری کے عہدے پر سرفراز تھے۔ ان کی خدمات کے اعتراف میں اورنگ زیب کی سفارش پر پانصدی منصب اور خطاب خانی ملا۔ انیسویں سال میں منصب میں پانصد سوار کی افزونی ہوئی اور ملتقت خاں کے بدلے انھیں پایاں گھاٹ کی خدمت دیوان پر سرفراز کیا گیا۔ جب دارا شکوہ نے شاہ جہاں پر اتنا قابو پایا کہ کاروبار حکومت میں صرف اس کا نام باقی رہ گیا تو اورنگ زیب اس طرف متوجہ ہوا۔ بہت کم وقت میں اس نے ایک شاندار لشکر تیار کر لیا اور ایک اچھے قسم کا توپ خانہ ترتیب دیا۔ اس صوبہ میں شاہ جہاں کے جتنے ملازم تھے۔ سب اورنگ زیب کے ساتھ ہو گئے۔ مرشد قلی خاں بھی اورنگ زیب کے ملازم ہو گئے۔

یہاں مرشد قلی خاں کی وفاداری کا وہ واقعہ نقل کرنا بے موقع نہ ہوگا جو حمید الدین خاں نے بیان کیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مرشد قلی خاں کو اورنگ زیب کے مزاج میں کتنا دخل تھا۔ جب اورنگ زیب کو دکن کی صوبہ داری ملی اور وہ اورنگ آباد کے لیے روانہ ہوا تو راستے میں برہان پور میں قیام کیا۔ یہاں اتفاقاً اس کی نظر اپنے خالو سیف خاں کی ایک حرم زین آبادی (جس کا اصل نام ہیر لہائی تھا) پر پڑ گئی۔ جس نے اورنگ زیب کے ہوش و حواس چھین لیے۔ اورنگ زیب نے مرشد قلی خاں سے (جن سے محرمیت خاص حاصل تھی) دل کا حال بیان کیا۔ مرشد قلی خاں نے عرض کیا۔ میں سیف

خاں کو قتل کر دیتا ہوں۔ میدان صاف ہو جائے گا۔ میرا جو حشر ہوگا وہ دیکھا جائے گا۔ اورنگ زیب نے جواب دیا کہ تمھاری جاں نثاری کا میں قائل ہوں۔ مگر میں خالو کو قتل کرنا نہیں چاہتا۔ تم جا کر اُن سے سارا واقعہ کہہ دو۔ جب سیف خاں نے یہ بات سنی تو اپنی بیوی کی معرفت کہلا بھیجا کہ اورنگ زیب اپنی حرم چتربائی میرے پاس بھیج دیں۔ میں زین آبادی کو دے دوں گا۔ اورنگ زیب نے شرط منظور کر لی اور وہ حرم اورنگ زیب کے پاس آ گئی۔

مرشد قلی خاں نے اورنگ زیب کی وفاداری ہی میں جان دی۔ ۱۰ رجب ۱۰۶۸ھ کو جب رایات پادشاہی نے آب نربدا پار کیا تو داراشکوہ کے حامی مہاراجہ جسونت سنگھ سے لڑائی کرنی پڑی۔ اس وقت مکند سنگھ ہاؤس، رتن رائی، دیال داس جھالہ جیسے بہادر اور دلیر راجپوت مہاراجہ جسونت کے ساتھ تھے۔ مہاراجہ نے پہلے اورنگ زیب کے توپ خانے پر حملہ کیا جو مرشد قلی خاں کے اہتمام میں تھا۔ انھوں نے جان پر کھیل کر دشمنوں کا مقابلہ کیا، اپنی جگہ سے نہ ہٹے اور مقابلہ کرتے ہوئے جان دے دی۔ مولف ماث الامرا ان کے بہت مداح ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ مرشد قلی خاں جو شش بہادری اور شہ سپہ گری کے وصف کے باوجود اعلیٰ درجہ کی انتظامی صلاحیتیں رکھتے تھے۔ بڑے دیانت دار اور خدا ترس تھے۔ دیوانی دکن کے زمانے میں عوام کی فلاح و بہبودی کے لیے بہت کوشاں رہے۔ زمین کاشت کاروں میں تقسیم کر دی تھی، جس میں کاشت کار کو پیداوار کا چوتھا حصہ داخل سرکار کرنا ہوتا تھا۔ انھوں نے زمین سے متعلق ایک دستور العمل بنایا، جس پر مدتوں عمل ہوا۔

مرزا شفیع

مرزا کے والد مرزا شفیع کے متعلق ہماری معلومات بہت محدود ہیں۔ چوں کہ مرزا کے

۱۔ حمید الدین خاں نجمی، عالم گیری، احکام عالمگیری، مرتبہ جادو ناتھ سرکار، کلکتہ ۱۹۱۲ء، ص ۶-۸
 ۲۔ مرشد قلی خاں کے تفصیلی حالات کے لیے ملاحظہ ہوں۔ محمد ہاشم خانی خاں، منتخب الدہاب، مرتبہ مولوی کبیر الدین احمد، کلکتہ ۱۸۷۴ء، ص ۳۱-۳۳۔ نواب مصمم الدولہ شاہ نواز خاں، ماث الامرا، ۳، مرتبہ مولوی مرزا اشرف علی، کلکتہ ۱۸۹۱ء، ص ۳۹۳-۳۹۶۔ مثنیٰ محمد کاظم، عالم گیر نامہ، مرتبہ مولوی خادم حسین د مولوی عبدالحی، کلکتہ ۱۸۶۸ء، ص ۳۳-۵۴۔

اجداد ہندوستان آکر دہلی میں آباد ہوئے تھے۔ اس لیے قیاس ہے کہ مرزا شفیع بھی دہلی میں پیدا ہوئے۔ یہ بتانا بھی بہت مشکل ہے کہ مرزا کے اجداد ہندوستان سپاہی کی حیثیت سے آئے تھے یا تاجر کی؟ اور مرزا شفیع کے والد کا پیشہ کیا تھا؟ بہر حال مرزا شفیع ایک تاجر تھے۔ قائم نے ان کے متعلق لکھا ہے کہ عمل تجارت میں مشہور تھے اور یہ بھی قائم کا بیان ہے کہ انھوں نے جوڑ کہ چھوڑا تھا۔ مرزا نے بہت جلد دوست نوازی میں ختم کر دیا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ مرزا شفیع کی مالی حالت اچھی خاصی تھی۔

مرزا کا نام

میر نے مرزا کا نام مرزارفع لکھا ہے۔^۱ لیکن اشپرنگر نے گرویزی کے حوالے سے مرزارفع الدین بتایا ہے۔^۲ جب کہ گرویزی خود مرزارفع الدین لکھتے ہیں۔^۳ لیکن عبرت الغافلین کے دیباچے میں سودا اپنا نام صرف محمد رفیع لکھتے ہیں۔^۴ ان کا نام وہی ہے جو گرویزی نے لکھا ہے یعنی ”مرزا محمد رفیع“۔

مرزا کی ولادت

مرزا کے سن ولادت کا تعین کرنا بہت مشکل ہے۔ ہمارے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں جس سے اس امر پر براہ راست روشنی پڑتی ہو۔ اس لیے تذکرہ نگاروں نے محض قیاس سے کام لیا ہے جو بیشتر غلط ہے۔ مثلاً مولانا محمد حسین آزاد نے اُن کا سن پیدائش ۱۱۲۵ھ لکھا ہے۔^۱ یہ سن پیدائش قرار دینے کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ میر اور سودا ہم عصر اور ایک دوسرے کے حریف تھے۔ آزاد نے اُن کی ادبی جھمکوں کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ چوں کہ

۱۔ مخزنِ نکات، ص ۳۵۔

۲۔ میر تقی میر، نکات اشعار، مرتبہ مولوی عبدالحق، اورنگ آباد، ۱۹۳۵ء، ص ۳۱۔

۳۔ اشپرنگر، یادگار شعرا، مترجمہ فضل احمد، الدہ آباد، ۱۹۴۳ء، ص ۱۱۱۔

۴۔ سید رفیع علی حسینی گرویزی، تذکرہ رستخار گویان، مرتبہ عبدالحق، اورنگ آباد، ۱۹۳۳ء، ص ۶۷۔

۵۔ کلیات سودا، مرتبہ آسی، ص ۳۷۷۔

۶۔ آبِ حیات، ص ۱۴۸۔

آزاد کے نزدیک میر کا سن پیدائش ۱۱۲۵ھ ہے اس لیے ممکن ہے کہ انھوں نے میر کے حریف سودا کو ہم عصر ثابت کرنے کے لیے یہ سن ولادت قرار دے دیا ہو۔ ۱۔ ناصر لکھنوی نے لکھا ہے کہ ایک فقیر نے پیش گوئی کی تھی کہ:

”انشاء اللہ تعالیٰ شہرت تیری چار داگ ہندوستان میں بے حد
و حساب اور عمر تخلص کے ہم عدد ہوگی“۔ ۲۔

مرزا کے تخلص ”سودا“ سے ۱۷ برآمد ہوتا ہے۔ اس طرح ان کا سن ولادت ۱۱۲۳ھ قرار پاتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آزاد کا مآخذ یہ تذکرہ رہا ہو۔

شیخ چاند نے مرزا کا سن ولادت ۱۱۰۶ھ قرار دیا ہے۔ وہ قیام الدین قائم کے حوالے سے لکھتے ہیں:

”قائم نے لکھا ہے کہ بہادر شاہ کے زمانے (۱۱۱۹ھ تا ۱۱۲۳ھ) میں مرزا رفیع، بہادر شاہ کی فوج کے ساتھ دکن گئے تھے۔ اگر اس بیان کو صحیح تسلیم کریں تو اس زمانے میں اس کی عمر فوجی ملازمت کے لیے کم از کم ۱۸ سال ہوگی اور اس لحاظ سے سن ولادت ۱۱۰۶ھ سے قبل ہو سکتا ہے“۔ ۳۔

شیخ چاند کے اس معروضے کی بنیاد قائم کے اس بیان پر ہے کہ:

”مرزا ابوطالب المتخلص بہ طالب مردے بود ہفتاد سالہ از
متوطنان قبضہ بلندہ کہ در نواح اورنگ آباد است۔ در لشکر بہادر
شاہ سابقہ آشنائے باعموے بزرگوار حضرت مرزا رفیع صاحب بہم
رساند، ہمراہ لشکر ظفر اثر بہ رفاقت ایشان برائے کار جاگیر خود بہ

۱۔ بہت سے تذکرہ نگاروں نے مرزا کا سن ولادت ۱۱۲۵ھ لکھا ہے۔ مثلاً دکنی کا دبستان شاعری، ص ۱۵۰۔
حکیم سید عبدالحی، گل رعنا، اعظم گڑھ، ۱۳۳۰ھ، ص ۱۳۳۔ جگ ناتھ پرشاد، نگار خان لکھنؤ، ۱۳۳۶ھ، ص ۲۱۲۔
ان کا مآخذ آپ حیات ہی معلوم ہوتا ہے۔
۲۔ تذکرہ خوش معرکہ زیبا (قلبی) لکھنؤ
۳۔ سودا، ص ۳۵

دارالخلافہ شاہجہاں آباد رسیدہ تادمے کہ اقامت نمود ہم خانہ
ایشاں بود“۔^۱

شیخ چاند نے اس عبارت کا مطلب یہ لیا ہے کہ مرزا ابوطالب قائم کے چچا یعنی مرزا رفیع کے آشنا تھے اور جب مرزا بہادر شاہ اول کی فوج کے ساتھ دہلی آئے تو ابوطالب بھی ساتھ تھے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ قائم کی مراد مرزا کے چچا سے ہے خود مرزا سے نہیں۔ کیوں کہ پورے تذکرے میں قائم نے کہیں بھی مرزا کو چچا نہیں لکھا۔ مرزا ابوطالب ہی کے ذکر میں قائم نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

”بعضے ازیں احوال و اشعار کہ سابق مرقوم شدہ، زبانی مرزا
ابوطالب مسطور بہ مرزا صاحب رسیدہ بود از ایشاں علی سبیل ذکر و
مذکور بہ فقیر معلوم گردیدہ“۔^۲

امکان اس بات کا ہے کہ ابوطالب، مرزا کے سن شعور تک دہلی میں رہے ہوں کیوں کہ اگر ہم قائم کے بیانات کا مطلب وہی لیں جو شیخ چاند نے لیا ہے تو مرزا کا سن پیدائش ۱۱۰۶ھ قرار پاتا ہے جو کسی طرح بھی درست نہیں۔

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مرزا کی ولادت ۱۱۰۰ھ سے قبل ہوئی۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ آزاد لاہریؒ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں کلیات سودا کا ایک نادر قلمی نسخہ ہے اور اس پر کسی کچھی نرائن کی مہر اور (۱۱۱۶ھ/۱۷۰۴ء) لکھا ہوا ہے۔ گویا یہ کلیات ۱۱۱۶ھ کے قریبی زمانے میں لکھا گیا۔

اگر شیخ چاند کا بتایا ہوا سن ولادت یعنی ۱۱۰۶ھ تسلیم کر لیا جائے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک دس سال کا بچہ اتنا بڑا شاعر ہو جائے کہ اس کا کلیات مرتب ہو جائے۔ ہاں ایک سولہ سال کے لڑکے سے یہ توقع کی جاسکتی ہے۔^۳

۱۔ مخزن ثکات، ص ۹

۲۔ مخزن ثکات، ص ۱۰

۳۔ صدیقی صاحب کے اصل الفاظ یہ ہیں:

”ہمارا خیال ہے کہ ولادت ۱۱۰۰ھ/۱۶۸۸ء سے قبل ہوئی ہوگی اور اگر یہ بھی مان لیں کہ دیوان ۱۱۱۶ھ/۱۷۰۴ء میں ہی کچھی نرائن کے قبضہ میں آیا تو اس وقت سودا کی عمر پندرہ سولہ سال کی ہو چکی ہوگی اور اس مدت میں سودا جیسے قادر الکلام شاعر کا صاحب دیوان ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں۔“

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی لکھنؤ کا دبستان شاعری، علی گڑھ، ۱۹۳۴ء، ص ۸۸

شیخ چاند اور ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے قرار دیے ہوئے سنین کا مطلب یہ ہوگا کہ مرزا اپنے استاد شیخ حاتم (سن ولادت ۱۱۱۰ھ^۱) مرزا مظہر (سن ولادت ۱۱۱۰ھ^۲) سے عمر میں بڑے تھے اور خان آرزو (سن ولادت ۱۰۹۹ھ) کے ہم عمر تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو تذکرہ نگار اس کا ضرور ذکر کرتے۔ اس کے برعکس خان آرزو، مرزا مظہر اور حاتم وغیرہ کے مقابلے میں مرزا کے ساتھ ان کا جو رویہ ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سب لوگ مرزا کو ان تمام لوگوں کا نہ صرف خورد بلکہ عقیدت مند سمجھتے تھے۔

اگر ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کا یہ بیان کہ مرزا کا کلیات ۱۱۱۶ھ سے قبل مرتب ہو چکا تھا، تسلیم کر لیں تو ہمیں شمالی ہند کی تاریخ ادب اردو میں بہت سی بنیادی تبدیلیاں کرنی ہوں گی اور بہت سے نظریات کو بدلنا ہوگا۔۔۔ امتیاز علی خاں صاحب عرچی نے مجھے بتایا تھا کہ اگر خوردین کی مدد سے کلیات سودا کا نسخہ پڑھا جائے تو یہ مہر صاف پڑھی جاتی ہے اور وہ ۱۱۱۶ھ نہیں بلکہ ۱۱۷۶ھ ہے۔ میں نے خود بھی اس امر کی تصدیق کی ہے۔ اس لیے صدیقی صاحب کا قرار دیا ہوا سن ولادت بھی درست نہیں۔

قاضی عبدالودود نے اس سلسلے میں بہت سے مقالے لکھے ہیں اور سب سے آخری مقالے میں مرزا کا سن ولادت ۱۱۲۸ھ تسلیم کیا ہے۔^۳ قاضی صاحب کی دلیل یہ ہے کہ میر سوز اپنے ایک معاصر شاہ کمال الدین کمال سے کہا کرتے تھے کہ مرزا مجھ سے عمر میں ایک سال چھوٹے ہیں۔ میر سوز کی وفات ۱۲۱۳ھ میں ہوئی تھی۔ جرأت نے مادہ تاریخ یہ نکالا تھا۔

داغ اب سوز کا لگا دل کو

۱۲۱۳ھ

اور ایک یا اس سے زیادہ تذکروں میں مرقوم ہے کہ وفات کے وقت میر سوز کی عمر اسی سے متجاوز تھی۔ اگر اس وقت میر سوز کی عمر پچاس سال مان لی جائے تو زمانہ ولادت

۱۔ سید محی الدین قادری زور، سرگزشت حاتم، حیدرآباد، ۱۹۴۴ء، ص ۲۱

۲۔ مرزا مظہر جانجاناں کے مخطوط، ص ۱۳

۳۔ سب رس، نومبر ۱۹۶۰ء، ص ۸

۱۱۲۷ھ کے لگ بھگ قرار پاتا ہے۔ اس طرح مرزا کا سن ولادت ۱۱۲۸ھ ہوگا۔

لیکن اس سن کو تسلیم کرنے میں وقت یہ ہے کہ ہمیں یہ مفروضہ قائم کرنا پڑتا ہے کہ وفات کے وقت میرسوز کی عمر پچاسی سال ہوگی۔ اگر کسی تذکرہ نگار نے یہ لکھا ہے کہ میرسوز اسی سے تجاوز کر گئے تھے تو ہم یہ کیوں نہ فرض کریں کہ میرسوز کی عمر اکیاسی یا بیاسی سال ہوگی جو زیادہ قریب قیاس ہے۔ اس طرح مرزا کا سن ولادت ۱۱۳۱ھ کے قریب ہوگا۔ یہاں سودا کے ایک شاگرد شیدا کا ایک شعر قابل غور ہے جو میر تقی میر کی ججو میں کہا گیا تھا۔

جن روزوں پہ حاصل تھا سخن کا اسے کمال

تھی میر کی تب مبتدیانہ بھی نہ تقریر

اس شعر سے اندازہ ہوتا ہے کہ مرزا عمر میں میر سے کافی بڑے تھے۔ میر کی ولادت ۱۱۳۵ھ میں ہوئی۔ اس شعر میں عمر کے جس تفاوت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ صرف چار سال یا قاضی صاحب کے بتائے ہوئے سن ولادت کے مطابق صرف آٹھ سال قریب قیاس نہیں۔

اس سلسلے میں دو تذکرے بہت اہم ہیں جو مرزا کی ولادت پر روشنی ڈالتے ہیں اور سن ولادت کے تعین میں ہماری مدد کرتے ہیں۔ ایک تو نقش علی کا ”باغ معانی“ اور دوسرا میر حسن کا ”تذکرہ شعرائے اردو“۔ نقش علی مرزا سے براہ راست تعلقات کے مدعی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

”بامولف اس اجزا (نقش علی) اشفاق بسیار ظاہری نماید“۔^۱

اس بیان کی روشنی میں کوئی وجہ نہیں کہ ہم نقش علی کے بیان پر شبہ کریں۔ وہ لکھتے ہیں کہ مرزا کی عمر پچپن سال کو پہنچ چکی ہے۔^۲ نقش علی نے بقول قاضی عبدالودود مرزا کا ترجمہ ۱۱۷۴ھ کے لگ بھگ لکھا ہے۔^۳ جس سے مرزا کا سن ولادت ۱۱۱۸ھ نکلتا ہے۔

۱ ڈاکٹر خواجہ احمد قاروقی، میر تقی میر، جلی نمبر ۷، ۱۹۵۷ء، ص ۶۱

۲ باغ معانی (قلمی) ورق ۶۲ ب

۳ باغ معانی (قلمی) ورق ۶۲ ب

۴ سب کس، نومبر ۱۹۶۰ء، ص ۷

اس کی تصدیق میر حسن کے بیان سے بھی ہوتی ہے۔ مرزا ۱۱۸۵ھ میں فرخ آباد سے فیض آباد گئے تھے۔ میر حسن نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ مرزا آج کل نواب شجاع الدولہ بہادر کی سرکار میں وسیلہ فن شاعری سے سرفراز ہیں۔^۱ نواب شجاع الدولہ کا انتقال آخر ذی قعدہ ۱۱۸۸ھ میں ہوا۔ ظاہر ہے کہ میر حسن نے مرزا کا ترجمہ ۱۱۸۵ھ اور ۱۱۸۸ھ کے درمیان لکھا ہے۔ جب مرزا فیض آباد آئے تھے۔ میر حسن اکثر ان سے ملاقات کرتے تھے، جس کا ذکر انھوں نے خود تذکرے میں کیا ہے۔ اس کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ مرزا کا ترجمہ لکھتے ہوئے انھوں نے مرزا سے ان کی عمر دریافت نہ کی ہو۔ انھوں نے لکھا ہے کہ مرزا کا سن شریف ستر سال کو پہنچ گیا ہے۔ چوں کہ یہ عبارت ۱۱۸۵ھ اور ۱۱۸۸ھ کے درمیان لکھی گئی ہے۔ اس لیے مرزا کا سن ولادت ۱۱۱۵ھ^۲ اور ۱۱۱۸ھ کے درمیان قرار پاتا ہے۔ اگر ہم ۱۱۱۸ھ تسلیم کریں تو نقش علی کے بیان کی بھی تصدیق ہو جاتی ہے۔ اس لیے ۱۱۱۸ھ ہی قرار دینا مناسب ہے۔

مرزا کی ابتدائی زندگی

مرزا کے بچپن کے حالات کا ہمیں کچھ علم نہیں۔ اُن کا کلام دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے دور کے مروجہ علوم ضرور حاصل کیے تھے۔ فارسی زبان پر انھیں اچھی خاصی قدرت تھی۔ بعض تذکرہ نگاروں کے بیان کے مطابق انھوں نے ادبی زندگی کا آغاز ہی فارسی شعر گوئی سے کیا تھا۔

۱۔ میر حسن، تذکرہ شعرائے اردو، مرتبہ مولانا محمد حبیب الرحمن خاں شیروانی، دہلی، ۱۹۴۰ء، ص ۸۳
 ۲۔ (۱) کلب علی خاں فائق نے مرزا کا سن ولادت ۱۱۱۸ھ۔ ۱۱۲۰ھ کے درمیان بتایا ہے۔ سودا کی صحیح عمر، معارف جولائی ۱۹۵۲ء، ص ۶۳۔ ۷۵
 (ب) پہلے خود قاضی صاحب بھی مرزا کے سن ولادت کو ۱۱۱۵ھ اور ۱۱۱۸ھ کے درمیان قرار دیتے تھے۔ سب رس، نومبر ۱۹۶۰ء، ص ۷

(ج) بعض تذکرہ نگاروں نے یہ بھی لکھا ہے کہ مرزا نے ۶۰ سال کی عمر میں دہلی چھوڑی۔ یہ صحیح نہیں۔ اُس وقت مرزا کی عمر لگ بھگ ۵۵ سال تھی۔ ان تذکروں میں قابل ذکر یہ ہیں:
 مردان علی خاں جلا، گلشن سخن (قلمی)، رام پور، ورق ۵۶ ب
 مرزا علی لطف، گلشن ہند، مرتبہ مولوی شبلی اور مولوی عبدالحق، لاہور، ۱۹۰۶ء، ص ۱۰۳۔

مرزا کی والدہ کے بارے میں تو کچھ پتا نہیں چلتا۔ البتہ قائم کے بیان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے والد کا جب انتقال ہوا ہے تو وہ سن شعور کو پہنچ چکے تھے۔ قائم نے لکھا ہے:

”اُن (مرزا) کے والد مرزا شفیق نام مغل زاد عمل تجارت میں مشہور تھے۔ ان کی وفات کے بعد ترکہ میں جو کچھ دولت مرزا کے ہاتھ آئی۔ اسے شاعر مزاجی کی وجہ سے قلیل مدت میں دوستوں میں اڑا دیا اور مصاحبت اختیار کر لی۔“

(فارسی سے ترجمہ)

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا کو جو کچھ ترکہ میں ملا تھا۔ انھوں نے دوستوں میں اڑا دیا اور مصاحب ہو گئے۔ میر نے نوکر پیشہ لکھا ہے۔ جس سے بظاہر مراد مصاحبت ہی ہے اور کم از کم سپہ گری تو ہرگز نہیں۔ قائم نے مرزا کے ہم عصر تذکرہ نگاروں میں صرف گردیزی نے انھیں سپاہی پیشہ لکھا ہے جس کا کوئی اور ثبوت نہیں ملتا۔

شیخ چاند نے گردیزی کے بیان کو صحیح تسلیم کیا ہے اور مزید ثبوت کے طور پر مرزا کے یہ دو اشعار بھی نقل کیے ہیں۔

کہی جاتی نہیں وہ مجھ سے جو اس ظالم نے
جس طرح کی مری اوقات میں ڈالی بل چل

۱۔ مخزن ثکات ص ۳۵

۲۔ ثکات اشعار، ص ۳۱

۳۔ خواجہ خان حمید اورنگ آبادی نے انھیں منصب دار لکھا ہے جو کی طرح درست نہیں۔ خواجہ خاں حمید اورنگ آبادی، گلشن گفتار، مرتبہ سید محمد حیدر آبادی، ۱۳۳۹ء، ص ۳۷

۴۔ سید فتح علی حسینی گردیزی، تذکرہ رنڈہ گویاں، مرتبہ مولوی عبدالحق، ص ۶۷

بعد کے تذکروں میں شاہ محمد حمزہ نے بھی انھیں سپاہی پیشہ لکھا ہے۔ فص الکلمات (قلمی) رام پور، ورق ۴۱۷ ب۔ دراصل فص الکلمات میں جن شعرا کا ذکر ہے وہ گردیزی کے تذکرے کی نقل ہے۔ کہیں کہیں شاہ حمزہ نے اضافہ کیا ہے۔ (خ۔ ۱)

لا بٹھایا مجھے گھریار چھڑا لشکر میں
پال بے چوب تلے اپنے بغیر از پرتل

یہ اشعار ایک قصیدے کے ہیں جو مرزا نے حضرت علیؑ کی شان میں کہا تھا۔ شیخ چاند کا خیال ہے کہ مرزا نے اوائل جوانی ہی میں پیشہ سپہ گری ترک کر کے مصاحبت اختیار کر لی تھی۔ ان کے خیال سے یہ قصیدہ نوعمری اور نوشہی کے زمانے کا ہے۔ لیکن اس قصیدے میں جو فنی مہارت، زبان و بیان پر قدرت اور پختگی نظر آتی ہے، اسے دیکھ کر ہرگز یہ یقین نہیں کیا جاسکتا کہ یہ مرزا کا ابتدائی کلام ہے۔ مزید برآں قصیدے میں مرزا نے جو تعلیٰ کی ہے وہ بھی ایک خاص عمر پہنچ کر اور ایک ادبی مقام حاصل کرنے کے بعد ہی ممکن ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اور میرا سخن آفاق میں تا یوم قیام
رہے گا سبز بہر مجموع و ہریک دنگل
تا ابد طرز سخن کی ہے مری رنگینی
جلوہ رنگ چمن جاویدا اک آن میں ڈھل
ہو جہاں کے شعرا کا مرے آگے سرسبز
نہ قصیدہ نہ مخمس نہ رباعی نہ غزل

میرے خیال سے یہ قصیدہ اُس وقت کہا گیا ہے جب مرزا عماد الملک کے ساتھ ترک وطن کر کے دہلی سے نکلے تھے، جس کی تفصیل آگے بیان کی جائے گی۔

تعلیم و تربیت

مرزا کی ابتدائی تعلیم و تربیت کے بارے میں ہماری معلومات بہت محدود ہیں۔ صرف ان کے کلام سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اپنے دور کے مزوجہ علوم اور خاص طور پر فارسی کا اچھا مطالعہ کیا تھا۔ سری رام کا بیان ہے کہ مرزا کو ترکی، فارسی اور

عربی ہر علم میں دستگاہ تھی۔^۱۔ اوّل تو سری رام کے بیان کی تصدیق کسی اور ذریعے سے نہیں ہوئی اور دوسرے مرزا کے کلام سے یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ انھیں ترکی اور عربی میں بھی مہارت تھی۔

مولانا محمد حسین آزاد لکھتے ہیں ”(مرزا نے) دہلی میں پرورش پائی۔ کابلی دروازہ کے علاقہ میں ان کا گھر تھا۔ ایک بڑے پھاٹک میں نشست رہتی تھی۔ وہ دروازہ تباہی دہلی میں تباہ ہوا۔ شیخ ابراہیم ذوق علیہ الرحمۃ اکثر ادھر ٹہلتے ہوئے جاتے تھے۔ میں (آزاد) ہم رکاب ہوتا تھا۔ مرزا کے وقت کے حالات کا ذکر کر کے قدرتِ خدا کو یاد کیا کرتے تھے۔“^۲

ریختہ گوئی کی ابتدا

مرزا کو ریختہ گو شاعر کی حیثیت سے ۱۱۵۴ھ کے لگ بھگ مقبولیت حاصل ہوئی شروع ہوئی۔ رسالہ عبرت الغافلین اور سنبلی ہدایت ۱۱۸۸ھ اور ۱۱۹۵ھ کے درمیانی زمانے کی تصنیفات ہیں۔ عبرت الغافلین میں مرزا نے لکھا ہے کہ بندے نے پینتالیس سال فن ریختہ میں ضائع کیے ہیں۔^۳ سنبلی ہدایت میں مرزا لکھتے ہیں کہ ”مخفی نہ رہے کہ عرصہ چالیس برس کا بسر ہوا ہے کہ گھر سخن عاصی زیب گوش اہل ہنر ہوا ہے۔“۔ لگے مرزا کے بیانات سے صرف یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے ۱۱۴۰ھ اور ۱۱۵۰ھ کے درمیان ریختہ گوئی کا آغاز کیا اور قاضی ذکر شاعروں میں وہ ۱۱۵۴ھ کے قریب شمار ہونے لگے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ حاتم نے جس شاعر کی زمین میں غزل کہی ہے، اس کا نام بھی لکھ دیا ہے۔ دیوان زادہ حاتم میں ۱۱۳۱ھ سے ۱۱۶۹ھ تک کی غزلیں موجود ہیں۔ حاتم نے مرزا کی

۱۔ خم خانہ جاوید، ص ۴، ص ۳۶۴

۲۔ آب حیات، ص ۱۴۸

۳۔ مرزا کے اصل الفاظ یہ ہیں..... چنانچہ بندہ ہم از چہل و پنج سال اوقات خود را در فن ریختہ ضائع

ساختہ است۔ کلیات سودا، مرجع آسی، ص ۴۴۴

۴۔ کلیات سودا، آسی، ص ۴۴۴

سات زمینوں میں غزلیں کہی ہیں۔ پہلی تین غزلیں ۱۱۵۳ھ، ۱۱۵۹ھ، اور ۱۱۶۱ھ کی ہیں۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ مرزا ۱۱۵۳ھ کے لگ بھگ نمایاں ہونے شروع ہوئے تھے۔

اس سے پہلے وہ فارسی میں شعر کہا کرتے تھے۔ صاحب ”نشر عشق“ کا بیان ہے۔ ”ابتدا میں موزونیت طبع کی وجہ سے فارسی گوئی شروع کی اور سراج الدین علی خاں آرزو سے اصلاح لی۔ خان آرزو نے کہا کہ کلام فارسی کا درجہ بہت بلند ہے اور ہماری تمھاری زبان ہندی ہے۔ ہر چند اہل ہند نے فارسی دانی کو مدارج ارفاع تک پہنچا دیا۔ لیکن استادان سلف و ایران (کہ یہ ان کی زبان ہے) کے سامنے وہی حیثیت ہے جو چراغ کی آفتاب کے سامنے ہوتی ہے۔ ابھی تک ریختہ گوئی میں کسی نے شہرت نہیں پائی۔ لہذا اگر تم اس زمانے میں مشقِ سخن کرو تو فیضِ طبیعت سے شاید اس فن کے امام ہو جاؤ۔ چوں کہ مستحسن مشورہ تھا۔ ان کو (مرزا) پسند آیا اور اس دن سے ریختہ میں شعر گوئی کی ابتدا کی۔ اور تھوڑے زمانے میں مشقِ سخن کے بعد ریختہ گو شعرا کے استاد ہو گئے۔ زبانِ دانی ریختہ کے بانی مہانی قرار پائے اور ہندوستان کے تمام ریختہ گو شعرا انھیں اس فن کا امام اور پیغمبر سمجھتے تھے۔“ (فارسی سے ترجمہ)

مرزا کا ایک قطعہ ہے جس سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ ابتدا میں وہ فارسی میں شعر کہتے تھے۔ لیکن بعد میں کسی فارسی داں نے ریختہ گوئی کا مشورہ دیا۔ قطعہ میں فارسی داں کا نام لیا گیا۔ لیکن صاحب ”نشر عشق“ کے بیان اور مرزا اور خان آرزو کے

۱۔ سرگزشتِ حاتم، ص ۱۱۷

۲۔ (۱) حسین قلی خاں عاشقِ عظیم آبادی ”نشر عشق“ (قلمی)، رام پور، ص ۶۶۵

(ب) محمد حسین آزاد کا بیان ہے کہ (مرزا) خان آرزو کے شاگرد نہ تھے۔ مگر ان کی صحبت سے بہت فائدے حاصل کیے۔ چنانچہ پہلے فارسی شعر کہا کرتے تھے۔ خان آرزو نے کہا مرزا فارسی اب تمھاری زبانِ مادری نہیں۔ اس میں ایسے نہیں ہو سکتے کہ تمھارا کلام اہل زبان کے مقابل میں قابلِ تعریف ہو۔ طبع موزوں ہے شعر سے نہایت مناسبت رکھتی ہے۔ تم اردو کہا کرو تو یکتائے زمانہ ہو گے۔ مرزا بھی سمجھ گئے اور دیرینہ سال استاد کی فیضیت پر عمل کیا۔ آبِ حیات، ص ۱۴۹۔

۳۔ کلیاتِ سودا، مرتبہ آسی میں اس قطعہ کا عنوان ”قطعہ ہجو مرزا فاخر کیں“ ہے جو درست نہیں۔ لیکن بہت سے غیر مطبوعہ نسخوں میں اس قطعہ کا کوئی عنوان نہیں دیا گیا۔

تعلقات، نیز خان آرزو کی ریختہ گو شعرا کی سرپرستی کے پیش نظر یہی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ فارسی داں خان آرزو ہی تھے۔ شیخ چاند اس سے اختلاف کرتے ہیں۔ اس قطعہ میں مرزا نے خسرو، فیضی، آرزو اور فقیر جیسے فارسی شاعروں کے نام لیے ہیں۔ شیخ چاند کی دلیل یہ ہے کہ ”خان آرزو کا مشورہ نہیں تھا۔ اگر وہ مشورہ دیتے تو اس طرح فخریہ مسلم الثبوت اساتذہ میں اپنا شمار نہ کرتے۔“۔ ہمارے خیال سے یہ دلیل مناسب نہیں ہے کیوں کہ یہ قطعہ مرزا کا کہا ہوا ہے آرزو کا نہیں۔ دوسرے یہ قطعی ناممکن ہے کہ جو کچھ مرزا اور اس فارسی داں کے درمیان گفتگو ہوئی۔ اسے مرزا نے ہو بہو نقل کر دیا ہو۔ کیوں کہ شعری ضرورتوں کی وجہ سے یہ ممکن نہیں۔ چوں کہ وہ فارسی داں خان آرزو ہیں اور آرزو کا نام قطعہ میں بحیثیت استاد فن آگیا تھا۔ اس لیے مرزا کو آرزو کا نام پوشیدہ رکھنا پڑا۔ ورنہ بظاہر کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ مرزا عنوان ہی میں فارسی داں کا نام نہ بتاتے۔ اب وہ قطعہ ملاحظہ فرمائیے:

میں ایک فارسی داں سے کہا کہ اب مجھ کو
 ہوئی ہے بندش اشعارِ فرس ذہن نشیں
 جو آپ کیجیے اصلاحِ شعری میرے
 نہ پائیے غلطی تو محاورہ میں کہیں
 ہے اور زیرِ فلک ذاتِ میرزا فائز
 سلامت ان کو رکھے حق سدا بروے زمیں
 سو کب انھوں کو ہے اصلاح کا سو کی دماغ
 قبول کب کرے ان کی متابعت رنگیں
 کہایہ بعدِ تامل کہ دوں جواب تجھے
 جو میری بات کا اے مار تجکو ہووے یقین

جو چاہے یہ کہہ ہند کا زباں داں شعر
 تو بہتر اس کے لیے ریتے کا ہے آئیں
 وگرنہ کہہ کے وہ کیوں شعر فارسی ناحق
 ہمیشہ فارسی داں کا ہو موردِ نفیر
 کوئی زبان ہو لازم ہے خوبی مضمون
 زبانِ فرس پہ کچھ منحصر خن تو نہیں
 اگر نہیں ہے تو چشمِ دل سے کر کے نظر
 زباں کا مرتبہ سعدی سے لیکے تا بہ حزین
 کہاں تک اُن کی زباں تو درست بولے گا
 زبانِ اپنی میں تو باندھ معنی رنگیں
 دیارِ ہند میں دوچار ایسے ہو گزرے
 جنہوں نے باز رکھا مضحکہ سے اپنے تئیں
 چنانچہ خسرو و فیضی و آرزو و فقیر
 خن انہوں کا مغل کے لیے ہے قابلِ تحسین
 سوائے ان کے کوئی اور بھی ہو پر شاعر
 سواہِ ہند میں وہ ہی ہیں باہرہ نمکین
 ایسے مشوروں اور ریتے کوئی کی مقبولیت نے مرزا کی توجہ اس طرف مبذول کرائی۔

مرزا کا تخلص

اشر مگر نے قائم کے حوالے سے لکھا ہے کہ مرزا نے تخلص سودا اپنے والد کے پیشے کے اعتبار سے رکھا تھا۔^۱ لیکن قائم نے کہیں اس قسم کا ذکر نہیں کیا۔ محمد حسین آزاد لکھتے ہیں: ”بعض کا قول ہے کہ باپ کی سوداگری سودا کے لیے وجہ تخلص ہوئی۔ لیکن بات یہ ہے کہ ایشیا کے شاعر ہر ملک میں عشق کا دم بھرتے ہیں اور سودا اور دیوانگی عشق کے ہم زاد ہیں۔ اس لیے وہ بھی ان لوگوں کے لیے باعثِ فخر ہے۔ چنانچہ اس لحاظ سے سودا تخلص کیا۔“^۲ سعادت خاں ناصر نے اس سلسلے میں ایک قصہ بیان کیا ہے کہ ”ایک فقیر روشن ضمیر نظر توجہ کی مرزا موصوف کے حال پر مبذول رکھتے تھے۔ بعد وفات اُن کے پدر بزرگوار اس کو ہر یتیم سے فرمانے لگے۔ یہ وقت ہے کہ استدعا حاجت مندی کی درگاہ قاضی حاجات میں مقبول اور مستجاب ہو جو چاہو سو مانگو اس نے عرض کی آپ کی دولت سے استغنا تمام رکھتا ہوں اور اگر آپ بہ ضد ہیں تو دولتِ سخن، کہ عبارت اس سے شعر گوئی ہے، عنایت فرمائیے۔ اس مستجاب الدعوات نے قسم فرمایا اور دیوانہ لاؤ بآبی کے تخلص کے واسطے صرف سودا زبان پر لایا بعد اس عنایت بے غایت کے کہا۔ ”انشاء اللہ تعالیٰ شہرت تیری چہار دانگ ہندوستان میں بے حد و حساب اور عمر تخلص کے ہم عدد ہوگی۔“^۳ ہمارے پاس اور کوئی ذریعہ نہیں جس سے ناصر کے بیان کی تصدیق ہو سکے۔

سودا کا تلمذ

شیخ چاند مرحوم نے سودا کے صرف ایک استاد شاہ حاتم کا ذکر کیا ہے۔ حالاں کہ ان کے ہم عصر تذکرہ نگاروں کے بیانات سے چار استادوں کے نام ملتے ہیں۔ سب سے پہلا

۱ یادگار شعرا، ص ۱۱۱

۲ آبِ حیات، ص ۱۳۹

۳ تذکرہ خوش معرکہ ذیبا (قلمی)

نام خان آرزو کا ہے۔ قاسم نے لکھا ہے کہ سودا خان آرزو کے شاگرد تھے۔ لیکن اپنے کچھ اشعار شاہ حاتم کو بھی سناتے تھے۔ لے کریم الدین نے بھی انھیں شاگرد خان آرزو لکھا ہے۔ لے ہمارے خیال سے سودا کو خان آرزو سے باقاعدہ تلمذ تو نہیں تھا۔ البتہ ان کی صحبت سے فیض ضرور اٹھایا تھا۔ ورنہ کوئی وجہ نہیں تھی کہ میر تقی میر اپنے تذکرے نکات الشعرا میں اس کا ذکر نہیں کرتے۔ جب کہ انھیں آرزو کے شاگردوں کی فہرست بڑھانی منظور تھی۔ اس کے ثبوت موجود ہیں کہ سودا خان آرزو کے مشاعروں میں شریک ہوتے تھے۔ قدرت اللہ قاسم نے خان آرزو کے ترجمے میں لکھا ہے کہ ایک دن خان آرزو کے گھر پر مجلس مشاعرہ منعقد تھی۔ سودا نے حاجی محمد جان قدسی کی غزل کا ترجمہ کیا تھا اور بڑے شہوہ سے پڑھ رہے تھے۔ اتفاق سے اہل محفل میں کسی کو اندازہ نہ ہوا کہ قدسی کی غزل کا ترجمہ ہے یا شاید اس خیال سے خاموش رہے کہ مترجم (سودا) معمولی سی بات پر ہجو گوئی پر اتر آتے تھے۔ خان آرزو نے البتہ بہت تعریف کی اور دوران تو صیف انھوں نے فی البدیہہ ایک شعر کہا۔

۱۔ سراج الدین علی خان آرزو کا سلسلہ نسب شیخ کمال الدین خواہر زادہ شیخ نصیر الدین تک پہنچتا ہے اور والدہ کی طرف سے شیخ محمد غوث کو الیاری شطاری عطاری پر تہی ہوتا ہے۔ آرزو ۱۱۱۰ھ میں پیدا ہوئے (سرو آزاد، ص ۲۲۷) محمد محمد فرخ میر کے اوائل میں گوالیار میں کسی خدمت پر مامور ہوئے۔ ۱۱۳۲ھ میں دہلی آئے۔ دہلی میں آندرام ظفیر کے توسط سے دربار شاہی میں رسائی ہوئی اور منصب و جاگیر عنایت ہوئے۔ اسحاق خاں شہسوی ہی ان کے مربی تھے۔ اسحاق خاں کی وفات کے بعد ان کے بیٹے غم الدولہ ان کا خیال رکھتے۔ ڈیڑھ سو روپے ماہوار وظیفہ باندھ دیا۔ غم الدولہ کے انتقال کے بعد ان کے چھوٹے بھائی سالار جنگ کے ساتھ آرزو چلے گئے، جہاں شجاع الدولہ کے دربار سے منسلک ہو گئے۔ نواب نے تین سو روپے ماہوار کا وظیفہ باندھ دیا۔ ۲۳ ربیع الاول ۱۱۶۹ھ کو انتقال ہوا۔ لاش دہلی لاکر مدفون کی گئی۔ آرزو فارسی کے زبردست عالم اور شاعر تھے۔ عربی اور ہندی میں بھی دستگاہ رکھتے تھے۔ بعض تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ وہ مسکرت کے بھی ماہر تھے۔ فارسی میں ان کی متعدد تصنیفات ہیں۔ بقول قاسم انھوں نے بابائے فارسی اور کمال خجندیہ کے دواوین کے جواب کہے تھے۔ اس کے علاوہ ان کا ضخیم کلیات موجود ہے۔ نثر میں سراج اللغات، چراغ ہدایت نوادر الالفاظ، سوہب عظمیٰ، عطیہ کبریٰ، داوختن، مجمع لطائف، تنبیہ القائلین اور خیالیں تصنیفات ملتی ہیں۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہوں:

سرو آزاد، ص ۲۲۷-۲۳۱۔ خزائن عامرہ، ص ۱۱۶-۱۱۹۔ نکات الشعرا، ص ۳۰۳۔ تذکرہ شعرائے اردو، ص ۵۔
اورینٹل کالج میگزین، نومبر ۱۹۳۳ء، ص ۲-۲۵
۲۔ مجموعہ فنون، ص ۳۰۴
۳۔ طبقات شعرا، ص ۱۰۴

شعر سودا حدیثِ قدسی ہے
لکھ رکھیں چاہیے فلک پہ ملک

سودا نے فارسی داں سے متعلق جو قطعہ لکھا ہے۔ اس سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ خان آرزو کے باقاعدہ شاگرد نہیں تھے۔

سودا کے استادوں میں دوسرا نام سلمان قلی خاں دودادؒ کا ہے۔ خود دوداد کے لڑکے

مجموعہ نغز، ۱، ص ۲۵-۲۶
آزاد نے بھی یہ واقعہ نقل کیا ہے لیکن قدرے ترمیم کے ساتھ۔ بظاہر ان کا مآخذ مجموعہ نغزی ہی ہے۔ انھوں نے فارسی شعر اور اس کا ترجمہ بھی دیا ہے۔ فارسی کا شعر ہے۔

آلودہ قطراتِ عرق دیدہ جبین را اختر ز فلک می نگرد روئے زمیں را
سودا نے اس کا ترجمہ کیا تھا:

آلودہ قطراتِ عرق دیکھ جبین کو اختر پڑے جھانگیں ہیں فلک پر سے زمیں کو

آب حیات، ص ۱۷۲-۱۷۳

فارسی شعر دیوانِ قدسی میں نہیں ہے۔ البتہ مجالسِ رنگین میں ہے۔ رنگین نے دوا ایسے فارسی شعر نقل کیے ہیں، جن کا سودا نے اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ آزاد نے بھی وہی دونوں شعر اور ان کے تراجم نقل کیے ہیں۔ قیاس یہ ہے کہ آزاد نے یہ دونوں شعر مجالسِ رنگین سے لیے ہیں۔

(سعادت یار خاں، رنگین، مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب، لکھنؤ، ۱۹۲۹ء، ص ۸-۹) اور پہلا شعر خواہ خواہ قدسی سے منسوب کر دیا ہے۔

ج۔ محضی اور قدرت اللہ قاسم نے ان کا نام سلیمان قلی خاں لکھا ہے، لیکن ان کے لڑکے مظہر علی خاں دلاسلان لکھتے ہیں۔ اس لیے یہی ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔ دلا نے ڈاکٹر ولیم ہنری فرمائش پر ۱۲۲۳ھ ۱۸۰۹ء میں اقبال نامہ جہانگیری کا اردو ترجمہ ”جہاں گیر شاعری“ کے نام سے کیا تھا۔ اس کتاب کی ابتدا میں انھوں نے اپنے خاندانی حالات بھی لکھے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں میں سلمان قلی خاں دوداد کا چھوٹا بیٹا اور آقا محمد حسین اصفہانی کا پوتا ہوں۔ سید آقا محمد حسین اصفہان سے ہندوستان آئے تھے اور نواب سعید الدین خاں بہادر میر آتش کی وساطت سے محمد شاہ کے ملازم ہوئے۔ اپنی لیاقت اور قابلیت کی وجہ سے بادشاہ کے مزاج میں اتنا دخل پایا کہ بہت جلد بائیس خدمتوں پر مامور ہو گئے۔ علی قلی خاں کا خطاب محمد شاہ نے دیا تھا۔ اُن کی وفات کے بعد محمد شاہ نے سلمان قلی خاں دوداد کو منسلک پاشی کے عہدے پر سرفراز کیا۔ شاہ عالم کے دور میں دوداد نے نواب سوئی خاں کی ملازمت اختیار کر لی۔ بقول محضی انھیں تین سو روپے ماہوار ملتے تھے۔ قاضی عبدالودود نے کلیاتِ دلا کے حوالے سے لکھا ہے کہ دوداد کا انتقال ۱۱۸۱ھ میں ہوا۔ تاریخِ وفات اس شعر سے نکلتی ہے:

سالِ تاریخِ ہاتف از سر آہ

گفت ماداے اور ریاضی جتاں

(معاصر، حصہ ۲، ص ۲۲)

تفصیل کے لیے ملاحظہ ہوں: محمد متیق صدیقی، گل کرست اور اس کا عہد، علی گڑھ، ۱۹۶۲ء، ص ۳۰۶-۳۰۸۔
غلام مصطفیٰ، معتمد شریا، مرتبہ مولانا عبدالحق، دہلی، ۱۹۳۳ء، ص ۵۹-۶۰۔ مجموعہ نغز، ۲، ص ۳۱۲

منظہر علی خاں ولّا نے سودا کو شاگرد و داد لکھا ہے۔^۱
 غالباً ریختہ گوئی کے ابتدائی زمانے میں سودا کو سلمان قلی خاں و داد سے تلمذ تھا۔ بعد میں
 شاہ حاتم سے رجوع کیا۔ مولانا محمد حسین^۲ آزاد اور مولانا عبدالحی نے بھی و داد سے
 سودا کے تلمذ کا ذکر کیا ہے۔^۳
 سودا کے تیسرے استاد شاہ حاتم تھے۔ یہ واحد استاد ہیں جن سے سودا کے تلمذ میں شک
 و شبہ کی گنجائش نہیں۔ کیوں کہ اکثر معاصر تذکرہ نگاروں کے بیانات سے اس امر کی
 تصدیق ہوتی ہے۔

قدرت اللہ قاسم نے لکھا ہے کہ حاتم کو سودا کی استادی پر بہت ناز تھا۔ انھوں نے ہدایت
 اللہ خاں ہدایت کے حوالے سے لکھا ہے کہ اکثر شاہ حاتم یہ مصرع پڑھا کرتے تھے۔

رتبہ شاگردی من نیست استاد مرا

اور کہا کرتے تھے کہ یہ مصرع میری استادی اور مرزا کی شاگردی کے متعلق کہا گیا ہے۔^۴
 قدرت اللہ قاسم نے اس سلسلے میں نظام الدین احمد صالح^۵ کا بھی نام لیا ہے۔ ان کا

۱۔ گل کرست اور اس کا عہد، ص ۳۰۷

۲۔ آب حیات، ص ۱۳۹

۳۔ گل رعنا، ص ۱۳۳

۴۔ مجموعہ نغز، ص ۱۸۰

۵۔ نظام الدین احمد صالح بگرام کے رہنے والے تھے۔ شاہ حمزہ اور آزاد بگرامی کا بیان ہے کہ نام سے سید
 ولادت نکلتا ہے جو ۱۱۳۹ھ ہے۔ کریم الدین نے لکھا ہے کہ نام سے سن ولادت نکلتا ہے جو ۱۱۰۸ھ ہے۔ اگر
 نظام الدین احمد پڑھا جائے تو ۱۱۰۸ھ ورنہ ۱۱۳۹ھ نکلتا ہے۔ غالباً کریم الدین کا بیان درست ہے کیوں کہ اگر
 وہ ۱۱۳۹ھ میں پیدا ہوتے تو شاید سودا ان کا تلمذ اختیار نہ کرتے۔ صالح نے میر نواز علی سے تعلیم و تربیت
 پائی اور انھیں سے مشق سخن کی۔ متعلق کہتے ہیں میں نے انھیں لکھنؤ میں دیکھا ہے۔ بعد میں وہ کلکتہ چلے گئے
 تھے۔ علی ابراہیم خاں نے لکھا ہے آج کل کہ جلوس شاہ عالم کا بائیسواں سال ہے (۱۱۹۶ھ) مرشد آباد اور کلکتہ
 میں بسر کرتے ہیں۔ فارسی دیوان مرتب ہو چکا تھا۔ غالباً مرشد آباد یا کلکتہ میں انتقال کیا۔ صاحب معدن
 الجواہر ان کا سن وفات "الف و قائمیا و علی عشر" بتاتے ہیں۔

تفصیل کے لیے ملاحظہ ہوں: علی ابراہیم خاں خلیل، تذکرۃ ابراہیم، مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور، علی
 گڑھ، ۱۹۳۴ء، ص ۱۶۹۔ خوب چند ذکا، عیار اشتر (ناٹیکر فلم) دی پیوٹی ورٹی لائبریری، ورق ۱۲۲۔ یہ
 عقد ثبا، ص ۳۸۔ سرو آزاد، ص ۳۳۸۔ فص الکلمات (قلمی) ورق ۲۱۸ ب۔ محمد مہدی داصف،
 معدن الجواہر، قلمی، آصفیہ، ورق ۱۸۸ الف۔ مجموعہ نغز، ۱، ص ۳۵۷

بیان ہے کہ جن دنوں سودا کو فارسی گوئی کا شوق تھا۔ وہ صالح سے اصلاح لیتے تھے۔ علی ابراہیم خاں نے صرف اتنا لکھا ہے کہ صالح مہمان سودا میں ہیں۔^۱

سودا کے تلمذ سے متعلق دودل چمپ لطفی بھی سن لیجیے۔ عنایت اللہ فتوت نے انھیں محمد میر میر کا شاگرد لکھا ہے اور ثبوت کے طور پر مرزا کا یہ شعر نقل کیا ہے۔

سودا تو اس غزل کو غزل در غزل ہی کہہ

ہوتا ہے تجھے میر سے استاد کی طرح^۲

ناصر نذیر فراق جو درد کے خاندان سے ہیں۔ اپنے بزرگوں کی عظمت میں اضافہ کرنے کے لیے لکھتے ہیں۔ ”مشاعرے آپ (درد) کی بارہ درری میں طرفہ شان و شوکت سے ہوتے تھے۔۔۔۔۔ سودا، میر اور میر سوز وغیرہ استاد آتے اور بڑے ادب کے ساتھ غزل پڑھتے۔ اب مشاعرہ ختم ہو جاتا اور آپ اور یہ تینوں باکمال اور لائق شاگرد رہ جاتے تو اردو زبان کی درستی اور اصلاح کے دفتر کھولے جاتے۔“^۳

ملک الشعرا کا خطاب

ضیفیم^۴، عبدالغفور نساخ^۵ اور جگ ناتھ پرشاد^۶ وغیرہ کا بیان ہے کہ سودا کو نواب آصف الدولہ نے ملک الشعرا کا خطاب دیا تھا۔ مگر یہ صریحاً غلط ہے۔ کیوں کہ میر تقی میر اور قیام الدین قائم نے بہت پہلے انھیں ملک الشعرا لکھا تھا۔

محمد انوار حسین تسلیم سہوانی نے ”کلیات سودا“ مطبوعہ نول کشور ۱۲۸۹ھ کے اختتام پر ایک روایت بیان کی ہے کہ ایک دفعہ سودا شیخ علی حزیں سے ملنے گئے اور حزیں کو اپنا

^۱ گلزار ابراہیم، ص ۱۶۹

^۲ عنایت اللہ فتوت، ریاض حسنی (قلمی)، سینٹرل، ص ۱۲۳

^۳ سید ناصر نذیر فراق، میخانہ درد، دہلی، ۱۳۳۳، ص ۱۵۳

^۴ محمد عبداللہ خاں ضیفیم، یادگار ضیفیم (قلمی) ادارۃ ادبیات اردو، ص ۲۲۵

^۵ سخن شعرا، ص ۲۲۳

^۶ گلزار سخن، ص ۲۱۲

کلام سنایا۔ اُس میں یہ شعر بھی تھا:

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں

ترپھے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

شیخ حزیں نے دریافت کیا کہ ترپھے ہے کیا معنی ہیں؟ سودا نے بتایا ”می تپد“۔ شیخ جھوم اٹھے۔ پھر شعر پڑھوایا اور کہا مرزا رفیع قیامت کردی، یک مرغ قبلہ نما باقی بود آرا ہم نہ گزشتی، کھڑے ہو کر حزیں نے سودا کو گلے سے لگایا اور ”ملک الشعرا“ کے خطاب سے نوازا۔ شیخ چاند نے اس روایت کو تسلیم کیا ہے۔ حالاں کہ شیخ حزیں جیسے بد دماغ اور متعصب ایرانی سے اس انعام و اکرام کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ پھر سودا کا یہ شعر اتنا معمولی ہے کہ ہرگز حزیں جیسے عالم و فاضل شخص کو اتنا متاثر نہیں کر سکتا۔ محمد حسین آزاد لکھتے ہیں کہ ”بعض اشخاص کی روایت ہے کہ شیخ نے کہا۔ درپوچ گویا ہند بد نیستی“۔ صاحب بوستان اودھ کا بیان ذرا اور مختلف ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔ ”شیخ بیتاب شد و گفت کہ مرزا درپوچ گوئی بہ از خاقانی است“۔ ان مختلف روایات کی روشنی میں یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ حزیں نے انھیں ملک الشعرا کا خطاب دیا تھا۔

ابتدائی تذکرہ نگاروں میں صرف میر تقی میر اور قیام الدین قاسم نے انھیں ملک الشعرا لکھا ہے۔ میر نے تو صرف اتنا لکھا ہے کہ سودا ملک الشعرا کے لائق ہیں۔ سب جس کا سیدھا سادہ مطلب یہی نکلتا ہے کہ سودا ہم عصر شعرا میں سب سے زیادہ ممتاز ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ خطاب میر کی ادبی سازش کا ایک حصہ ہو۔ یعنی جس وقت میر نکات الشعرا تالیف کر رہے تھے۔ مرزا مظہر گروہ شمالی ہند کی اردو شاعری پر چھایا ہوا تھا اور آرزو گروہ کو ایہام گوئی کی وجہ سے شکست ہو رہی تھی۔ مرزا مظہر گروہ میں انعام اللہ خاں یقین خاص طور پر بہت نمایاں تھے۔ تقریباً دس برس تک شمالی ہند سے لے کر جنوبی ہند تک جو مقبولیت اور شہرت یقین کو ملی وہ میر اور سودا کو کافی بعد میں نصیب ہوئی۔ تذکرے کی

تالیف کے وقت نوجوان شعرا میں یقین ملک الشعرائی کے مستحق ہو سکتے تھے۔ چوں کہ میر نے یقین کے خلاف ہر ممکن حربہ استعمال کیا ہے۔ لے اس لیے سودا کو ملک الشعرا کہہ کر بالواسطہ یقین سے بہتر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ کچھی نرائن شفیق نے کسی کی دو رباعیاں نقل کی ہیں، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ کافی عرصے تک بعض اہل ذوق صرف سودا اور یقین کو اردو کے بہترین شاعر سمجھتے تھے اور بعض کا تو یہ خیال تھا کہ سودا بھی یقین کے گرد پاؤں نہیں پہنچتے۔ پہلی رباعی ہے۔

جس طرح سے لاتے ہیں مضامین متیں
اشعار میں ریختہ کے سودا و یقین

ایسا کوئی نہیں ہند میں، ہر چند کہ ہیں
سجاد و کلیم و میر و درد و تمکین

دوسری رباعی ملاحظہ ہو:

اگر ہزار برس تک یہ میرزا سودا
کرے جو فکر تنوع یقین کا از دل و جاں
کہے گا معنی باریک و خوب شیریں تر
دلے نزاکت و یہ لطف و یہ قبول کہاں لے

بہر حال سودا کو یقین پر ترجیح دینے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ رہے قائم تو چوں کہ انھیں سودا سے تلمذ تھا۔ اس لیے انھوں نے استاد سے عقیدت اور محبت کی وجہ سے لکھ دیا کہ ”بالفعل خطاب ملک الشعراے کہ مہین پایہ سخنوراں است اعزاز و امتیاز دار“۔ لیکن قائم نے بھی یہ نہیں بتایا کہ یہ خطاب کس نے دیا تھا۔ صاحب تذکرہ مسرت افزا نے لکھا ہے کہ ”زباں آوران کامل اورا بہ استادی یادی کنند و شعراے ہند

۱۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: خلیق انجم، معارضہ مظہر و آرزو، نقوش (لاہور) مئی ۱۹۶۱ء

۲۔ کچھی نرائن شفیق، چشتان شعرا، مرتبہ عبدالحق، اورنگ آباد، ۱۹۲۸ء، ص ۱۶۲

۳۔ مخزن ثکات، ص ۳۵

بہ آئین خود ملک اشعرا قرار دادہ اند۔^۱ لے گویا سودا کو کسی نے باقاعدہ یہ خطاب نہیں دیا تھا۔ صرف ہندوستان کے شاعروں نے اپنے قاعدے کے مطابق انھیں ملک اشعرا قرار دے دیا تھا۔ مصحفی کا بیان بھی قابل غور ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔ ”بعضے اور راویوں فن بہ ملک اشعرائی پرستش می کنند، بعضے بہ سبب دریافت اغلاط صریح و توارد صاف در بعضے اشعارش بہ جہل و سرقتہ اش نیز نسبت می دهند“^۲۔ مصحفی کے بیان کے مطابق کچھ لوگ انھیں ملک اشعرا تسلیم کرتے تھے اور بعض کے نزدیک وہ جاہل اور سارق تھے۔ غرض یہ ہے کہ مصحفی کے بیان سے بھی اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ یہ خطاب کسی کا دیا ہوا نہیں تھا۔ مزید ثبوت یہ ہے کہ ۱۱۶۶ھ میں تذکرہ گردیزی تالیف ہوا۔ اس میں ملک اشعرائی کا کوئی ذکر نہیں۔ قدرت اللہ قاسم، مردان علی خاں بتلا، ابراہیم علی خاں اور میر حسن وغیرہ نے بھی اس کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ اگر یہ حقیقت ہوتی تو یہ خطاب اتنا بڑا اعزاز تھا کہ ہر تذکرہ نگار اور خاص طور پر میر حسن اور قاسم ضرور اس کا ذکر کرتے۔ کیوں کہ یہ دونوں سودا کے بہت مداح ہیں۔

ان تمام دلیلوں سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ سودا کو کسی بادشاہ نے خطاب نہیں دیا۔ یہ صرف میر کا ایک ہتھیار تھا جو انعام اللہ خاں یقین کے خلاف استعمال کیا گیا۔

میر غلام حیدر مجذوب

بعض تذکرہ نگاروں نے انھیں سودا کا بیٹا لکھا ہے اور بعض نے متنبی بتایا ہے۔ قیام الدین قاسم کی غالباً قدیم ترین روایت ہے۔ چوں کہ وہ سودا کے شاگرد رہے تھے اس لیے انھیں ایک عرصے تک سودا سے قریب رہنے کا اتفاق ہوا تھا۔ انھوں نے ان کا پورا

۱۔ ابوالحسن امیر الدین، تذکرہ مسرت افزا (قلی)، پٹنہ، ورق، ۶۱، الف

۲۔ غلام ہمدانی مصحفی، تذکرہ ہندی، دہلی، ۱۹۳۳ء، ص ۱۲۵

ب: شورش لکھتے ہیں: اگر ملک اشعراے ریختہ گویاں خیال کنم رواست و گر پہلوان اشعرا گویم

بیاست۔ دو تذکرے (شورش)، ص ۳۷۹

اس عبارت میں ”خیال کنم“ قابل غور ہے۔

نام غلام حیدر اور حیدر بخش لکھا ہے انھیں سودا کا لڑکا بتایا ہے۔^۱ میر حسن جو مدعی ہیں کہ لکھنؤ میں (تذکرہ شعرائے اُردو لکھنے سے قبل) وہ سودا کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ انھوں نے بھی مجذوب کو خلیفہ سودا بتایا ہے۔^۲ ابوالحسن امیر الدین تذکرہ مسرت افزائے میں اور علی لطف گلشن ہند^۳ میں انھیں ”خلیفہ سودا“ اور ”سودا کا بیٹا“ لکھتے ہیں جس سے قائم کے بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔ مگر اس کے برعکس مردان علی خاں بتلایہ مصحفی کے اور شاہ کمال^۴ انھیں ”پسر خواندہ“ لکھتے ہیں بلکہ قدرت اللہ شوق تو یہ بھی اضافہ کرتے ہیں کہ ”مجذوب دہلی کے رہنے والے خوب صورت اور وجیہہ نو جوان ہیں۔ مرزا رفیع کے منظور نظر اور تربیت کردہ ہیں۔ سودا نے انھیں بچپن ہی سے اپنے لڑکے کی طرح پالا ہے۔“^۵

خود مجذوب کا دعویٰ ہے:

خاطر میں کون لائے میرا سخن کہ مجھ کو
سودا کا سن کے بیٹا مجذوب جانتے ہیں
میر کے ایک شعر سے بھی مجذوب کے بیان کی تصدیق ہوتی ہے:
اے میر سمجھو مت مجذوب کو اوروں سا
ہے وہ خلیفہ سودا اور اہل ہنر بھی ہے

۱ غالباً بعد میں انھوں نے مجذوب شخص اختیار کیا۔

۲ مخزن نکات، ص ۷۱

۳ تذکرہ شعرائے اُردو، ۱۷۰

۴ تذکرہ مسرت افزا، (قلمی) ورق ۶۱ الف

۵ گلشن ہند، ص ۲۲۶

۶ گلشن سخن (قلمی) ورق ۹۳ الف

۷ تذکرہ ہندی، ص ۲۰۲

۸ مجمع الاسباب (قلمی) ورق ۷۳ ب

۹ قدرت اللہ شوق، طبقات الشعراء (قلمی)، آصفیہ، ورق ۱۶۶ ب

ان مختلف بیانات کی روشنی میں کوئی قطعی فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے۔ البتہ قیاس یہی ہے کہ وہ سودا کے لڑکے تھے اور بعد کے کچھ تذکرہ نگاروں کو غلط فہمی ہوئی۔

محبذب غالباً سودا کے ساتھ ہی دہلی سے گئے۔ لکھنؤ میں ان کے قیام کی شہادتیں موجود ہیں۔ لیکن فرخ آباد کے متعلق کوئی شہادت نہیں ملتی۔

مصطفیٰ نے لکھا ہے کہ ”محبذب خوش خلق اور باحیا انسان ہیں۔ میں نے انھیں لکھنؤ میں دیکھا تھا۔ بڑے تپاک سے ملے۔“^۱

میر حسن نے ان کی دیر آشنائی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔ ”اگرچہ محبذب دیر آشتا ہیں لیکن جس سے ملتے ہیں خوب ملتے ہیں۔ سخن دانی کے باوجود فطرتاً خاموش طبیعت ہیں اور بہت کم گو ہیں۔“^۲

گلشن ہند میں علی لطف نے محبذب کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

”آشنا پرستی اور یک رنگی کے ساتھ موصوف درِ دل اور گدازِ طبیعت میں مشہور و معروف، نظم ریختہ میں صاحبِ دیوان ہیں۔ دودِ دیوان جواب میں میر تقی میر کے انھوں نے کہے اور مقدور بھر سرانجام جواب سے غافل نہیں رہے۔ غرض بالفعل کہ ۱۲۱۵ھ میں ساتھ عسرت معاش کے لکھنؤ میں جیتے ہیں۔“^۳

محبذب کو اپنے والد سودا ہی سے تلمذ تھا جس کا ذکر کئی تذکرہ نگاروں نے کیا ہے۔ ان کا دیوان دست برد زمانہ کی نذر ہو گیا اور شاید اب اس کا کوئی نسخہ دنیا میں موجود نہیں۔

سودا کا نواسہ

مولانا محمد حسین آزاد غالباً واحد تذکرہ نگار ہیں جنھوں نے سودا کے ایک نواسے کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔ ”اُن (سودا) کے بعد کمال بھی خاندان سے نیست و نابود ہو گیا۔“

۱۔ تذکرہ ہندی، ص ۲

۲۔ تذکرہ شعراے اردو، ص ۱۷۰

۳۔ گلشن ہند، ص ۲۲۶

راقم آثم ۱۸۵۸ء میں لکھنؤ گیا۔ بڑی تلاش کے بعد ایک شخص ملے کہ ان کے نواسے کہلاتے تھے۔ پڑھے لکھے بھی نہ تھے اور نہایت آشفۃ حال تھے۔“ ۱۔
کسی اور تذکرہ نگار نے سودا کے نواسے کا ذکر نہیں کیا ہے۔ اس لیے ممکن ہے کہ مولانا آزاد کو غلط فہمی ہوئی ہو۔

اخلاق

سودا کے عہد میں علم مجلسی باقاعدہ ایک فن تھا۔ مروجہ علوم کے ساتھ ساتھ اس فن پر بھی پوری توجہ دی جاتی اور شعر و شاعری علم مجلسی کا ایک حصہ تھی۔ لوگ اپنے بچوں کی تربیت کے لیے گھر پر استاد رکھتے تھے جو انھیں آداب مجلس سے واقف کرتے اور ان کی طبیعتوں میں شعر و شاعری سے ایک لگاؤ پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

شگفتہ مزاجی، برجستگی، شعر و شاعری سے لگاؤ، محفل میں نشست و برخاست کے آداب و سلیقہ اور بڑوں کا ادب و احترام وغیرہ وہ خصوصیات تھیں جو ہر مہذب انسان کے لیے ضروری تھیں۔

معاصر تذکرہ نگار شاہد ہیں کہ سودا ان تمام خوبیوں کا مجموعہ تھے۔ میر کو ان سے بہت قریب رہنے کا اتفاق ہوا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

”جوانے است خوش خلق، خوش خوی، گرم جوش، یار باش،
شگفتہ روئے“ ۲۔

”باغ معانی“ کے مولف نقیض علی نے سودا کے اخلاق و کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

”(سودا) شاعری سے قطع نظر اکثر خوبیوں سے آراستہ ہیں اور
بہت سے اوصاف حمیدہ سے متصف ہیں۔ حسن اخلاق اور تازہ

۱۔ آب حیات، ص ۱۵۲۔ ذکا نے سلمان نامی ایک شاعر کو ”میر خوانہ سودا“ لکھا ہے (عیار اشعرا)، ص ۳۱۰
۲۔ نکات اشعرا، ص ۳۱

روئی میں طاق اور شیوہ کو چک دلی اور تواضع میں شہرہ آفاق ہیں
اور دوستی کا لحاظ کرنے میں عدیم المثال ہیں اگرچہ ان کی عمر بچپن
سال کو پہنچ چکی ہے لیکن ان کی طبع جواں رشکِ نوبہار اختلاط
پھول سے زیادہ شگفتہ“ یہ (فارسی سے ترجمہ)

حکیم احد علی خاں یکتا کے بیان سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے کہ سودا کو آدابِ مجلس پر
پوری دسترس تھی۔ وہ تالیفِ قلوب کے فن سے بخوبی واقف تھے۔ بادشاہوں اور
سلاطین کی صحبتوں میں رہنے کا انھیں قرینہ آتا تھا۔ یکتا لکھتے ہیں:

”.....ان کمالات اور اوصاف کے متعلق کیا کہوں جو وہ بے بدل
(سودا) اپنی ذات میں رکھتے تھے۔ ملوک و سلاطین کی صحبت کے
آداب..... تہذیب و اخلاق، تالیفِ قلوب اور علمِ مجلس وغیرہ،
کیا ہنر تھا جو اس ذاتِ کامل الصفات میں نہیں تھا۔“

(فارسی سے ترجمہ)

میر حسن نے بھی ان کی خوش اخلاقی اور یارِ باشی کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”مردے ست از مستمات روزگار، خوش خلق و نیک خود یار

باش.....“

سودا کثیر الاحباب تھے۔ ان کے شاگردوں کی تعداد بھی بہت کافی تھی۔ میر اور میر حسن
دونوں نے لکھا ہے کہ وہ ”یارِ باش“ تھے۔ خان آرزو، خواجہ میر درد اور میر تقی میر کے
مشاعروں میں وہ شریک ہوتے تھے۔ چوں کہ شوخ مزاج تھے۔ طبیعت میں ظرافت
کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اس لیے محفلوں کی جان ہوتے ہوں گے۔ اگرچہ سودا
صاحبِ کمال تھے اور بہت کم خوش نصیب فن کاروں کو اتنی شہرت اور مقبولیت ملی تھی جتنی

۱۔ بارغِ معانی (قلمی) ورق ۶۲ ب

۲۔ دستور الفصاحت (متن) ص ۱۷

۳۔ تذکرہ شعراءِ اردو، ص ۸۳

قسام ازل نے سودا کو دی تھی۔ لیکن اس غیر معمولی مقبولیت سے سودا میں خود پرستی اور بے جا انا نہیں پیدا ہوئی۔ جن لوگوں کو سودا سے ملاقات کا شرف حاصل ہے۔ ان کی خوش اخلاقی کے مداح اور ان کی کرم فرمائی کے شکر گزار ہیں۔ میر حسن لکھتے ہیں:

”اکثر فقیر در خدمت آں بزرگوار می رسد، بسیار کرم می فرماید“۔^۱

نقش علی کو سودا کی خدمت میں حاضر ہونے کی سعادت نصیب ہوئی تھی۔ وہ سودا کے کردار کی بے انتہا تعریف کر کے لکھتے ہیں:

”بامولف ایں اجزا اشفاق بسیار بظاہری نماید“۔^۲

سودا مردم بیزار اور گوشہ نشین نہیں تھے۔ ان کی آمد و رفت صرف دولت مندوں کی محفلوں تک محدود نہیں تھی بلکہ وہ اپنے چھوٹوں سے بھی ملنے جاتے تھے۔ لالہ کھیم نرائن رند نے چہار باغ کے دیباچہ میں لکھا ہے:

”مرزا محمد رفیع متخلص بہ سودا، میر محمد تقی صاحب رفقاے جد مرحوم نے بھی اس خاکسار کے کلبہ احزاں کو نور قدم سے منور کیا“۔^۳

سودا ان دوستوں کا بھی خیال رکھتے تھے۔ جو ان سے سینکڑوں میل دور تھے۔ کچھی نرائن شفیق نے لکھا ہے کہ سودا نے فرخ آباد سے غرہ ربیع الاخر ۱۱۸۳ھ میں اولاد محمد خاں ذکا کے نام ایک خط لکھا تھا، جس میں اپنے ہاتھ سے کچھ فارسی اور ریختہ اشعار بھی نقل کیے تھے۔^۴

سودا کو اپنے شاگردوں سے کتنی محبت تھی اور شاگردوں کو ان سے کتنی عقیدت تھی۔ اس کا اندازہ ان ہجوؤں سے ہوتا ہے جو سودا کے شاگردوں نے اپنے استاد کے حریفوں کی کہی ہیں۔

۱ تذکرہ شعراء اردو، ص ۸۳

۲ باغ معانی (قلمی) ورق ۶۲ ب

۳ نیاز دور (لکھنؤ) نومبر ۱۹۶۱ء، ص ۱۱

۴ گل رعنا (قلمی)، ص ۶۱۲

سودا نے ہجو گوئی کو ایک فن کی صورت دی۔ یہی فن ان کے کردار کی سب سے بڑی کمزوری بن گیا۔ لیکن اس کے شواہد موجود ہیں کہ وہ تمام اختلافات کے باوجود بزرگ شاعروں کا ادب کرتے تھے۔ ان میں خاکساری اور انکسار بھی تھا۔ ”عبرۃ الغافلین“ کے دیباچے میں انھوں نے مرزا فاخر کیس کا بڑے احترام سے ذکر کیا ہے بلکہ اپنی خاکساری کا بھی اظہار کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”ایک دن اُن (اشرف علی خاں صاحب تذکرہ) کے دل میں یہ آیا کہ وہ قلم خوردہ اشعار (جنھیں فاخر کیس نے قلم زد کر دیا تھا یا ان پر اصلاح دی) انصاف کے لیے اس ضعیف العباد کے پاس لائیں۔ بندہ خاکسار محمد رفیع متخلص بہ سودا نے التماس کیا کہ یہ احقر زبان فارسی کے امور سے زیادہ تعلق نہیں رکھتا..... میرے ریختہ کے کچھ قصیدوں اور غزلوں کو جو حسن قبول ملا ہے۔ یہ صرف خدا کی قدرت ہے..... مرزا فاخر نے البتہ یہ کام سوچ سمجھ کر ہی کیا ہوگا۔ ان کے کمالات میں ہرگز شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ اگر آپ کا مزاج ایسا ہی انصاف طلب ہے تو یہ نسخہ فن فارسی کے سخنوران کے پاس لے جائیے اور انصاف طلب کیجیے۔“
(فارسی سے ترجمہ)

اشرف علی خاں کے اصرار پر سودا کو مرزا فاخر کی ان اصلاحوں اور قطع و برید کا جواب دینا پڑا۔ مگر ”عبرۃ الغافلین“ کے دیباچے اور پورے رسالے میں کسی ایک مقام پر بھی سودا نے تہذیب کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ اکثر تذکرہ نگار شہادت دیتے ہیں کہ سودا ہجو گوئی میں بہت کم پہل کرتے تھے۔ لیکن جب ایک دفعہ شروع ہو جاتے تھے تو پھر شرم و حیا کی آنکھیں بند ہو جاتی تھیں اور غالباً یہ ہجو گوئی محض شعر و شاعری تک محدود رہتی تھی۔ ذاتی تعلقات پر اس کا بہت کم اثر ہوتا تھا۔ چنانچہ انھوں نے میر کی ہجو کبھی تھی۔ جب کہ اُن سے بہت اچھے تعلقات تھے (جیسا کہ نکات الشعرا سے معلوم ہوتا ہے) بعض

اشعار میں سودا نے میر کو بُرا بھلا کہا۔ ایک بھو میں ثابت کیا کہ میر ”شیخ“ ہیں ”سید“ نہیں۔ لیکن ترک وطن کے بعد جن لوگوں کی یاد نے مرزا کو پریشان رکھا، اُن میں میر کا نام سر فہرست ہے۔

علی الخصوص تغافل کو میر صاحب کے

کہوں میں کس سے کہ باوصف اتحاد تمام

لکھا نہ پرچہ کاغذ بھی اتنی مدت میں

کہ بے قراوں میں تا ہوئے موجب آرام

ظاہر ہے کہ یہ اشعار اس دور کے ہیں جب سودا اور میر کے تمام ادبی معرکے ختم ہو چکے تھے اور غالباً ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئے تھے۔

سودا کے سب سے اہم ادبی معرکے میر ضاحک کے ساتھ ہوئے۔ جتنی فحاشیت اور ابتذال ان بھوؤں میں ہے، اُس کی دوسری مثال مشکل ہے۔ لیکن جب ضاحک کے لڑکے ان کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں تو سودا پر ضاحک سے ادبی معرکوں کا کوئی اثر نہیں تھا۔

اگر ادبی معرکوں کو نظر انداز کر دیا جائے تو ہمیں سودا کے وسعت اخلاق، سلامتی طبع، بزرگوں کا احترام، چھوٹوں سے مروت و اخلاق، خاکساری و انکساری کا قائل ہونا پڑے گا۔

ظرافت

سودا بہت ظریف، شگفتہ مزاج اور زندہ دل انسان تھے۔ تذکروں میں ان سے متعلق جتنے لطائف ملتے ہیں، ان سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ جب تک سودا دہلی میں رہے۔ ان کی ظرافت تہذیب کے دائرے سے باہر نہ گئی لیکن اودھ کے مخصوص ماحول اور خاص طور پر نواب آصف الدولہ کے مزاج نے ان کی ظرافت میں ابتذال اور فحاشیت

پیدا کر دی۔

قیام الدین قائم نے 'مخزن نکات' میں لکھا ہے۔ سودا خود کہا کرتے تھے کہ ایک دن وہ اور خاکسار، مرتضیٰ قلی کے ہاں موجود تھے۔ چوں کہ میر تقی میر اور خاکسار کے تعلقات بہت خراب تھے۔ اس لیے خاکسار نے بے موقع میر کا شکوہ و شکایت شروع کیا اور حاضرین مجلس سے درخواست کی کہ وہ میر تقی میر کی جھوکیں۔ یہ بات اہل محفل میں کسی کو پسند نہیں آئی۔ لیکن سودا نے خاکسار کا لحاظ کرتے ہوئے اسی وقت یہ مطلع کہا اور اُن کے حوالے کر دیا۔

میر کا مکھڑا بے نتھا گل زنبق کا سا ہے (۱)

پیٹ بھی اس کا جو میں دیکھا سو کچھ بھنھنق سا ہے

مطلع سننے ہی حاضرین مجلس کا ہنسنے پھٹنے بُرا حال ہو گیا اور خود خاکسار بھی ہنس رہے تھے۔ جب اس بات کو اچھا خاصا وقت گزر گیا اور خاکسار نے دیکھا کہ لوگ ہنسا بند نہیں کرتے تو خود اپنے پیٹ پر نگاہ ڈالی اور ایک دم کھڑے ہو گئے۔ مرزا سودا اور اُن کے دوستوں کو سخت بُرا بھلا کہا۔ ہر چند لوگوں نے ان کی منت سماجت کی مگر کوئی فائدہ نہ ہوا اس دن سے سودا اور خاکسار کی ملاقات ترک ہو گئی۔

میر تقی میر نے 'نکات اشعرا' میں خود اپنے مشاعرے کا ایک لطیفہ لکھا ہے۔ میر صاحب کے ہاں ہر مہینے کی پندرہ تاریخ کو مشاعرہ ہوتا تھا۔ ایک دفعہ اتفاقاً یہ تاریخ ہولی کے زمانے میں پڑی۔ فضل علی دانا اور مرزا رفیع سودا دونوں مشاعرے میں موجود تھے۔ لیکن دانا کا کچھ عجب لباس تھا۔ وہ سیاہ رنگ کی یک تہی پہنے ہوئے تھے جس کا دامن زانو تک تھا۔ اس لباس پر اس کا سیاہ رنگ اور سیاہ داڑھی، کچھ عجب منظر ہو گیا۔ سودا نے جب انہیں دیکھا تو ان کی رگِ ظرافت پھڑک اُٹھی۔ بے ساختہ ایک مصرع کہا:

یارو ہولی کا رچھ آیا

۱۔ یہ شعرا کی طرح نقل ہوا ہے۔ مخزن نکات، ص ۵۲

۲۔ مخزن نکات، ص ۵۲

”ریچھ“ میں لطف یہ تھا کہ ہولی کے موقع پر بچے ایک دوسرے کی خوشی کی خاطر ریچھ، بندر، گھوڑا اور شتر وغیرہ بنتے تھے۔^۱

قدرت اللہ قاسم نے شیخ قائم علی قاسم کے متعلق بھی ایک لطیفہ لکھا ہے۔ یہ بزرگ معلم اور اٹا دہ کے رہنے والے تھے۔ نواب احمد خاں بنگش کے عہد میں جب سودا فرخ آباد میں تھے تو یہ انعام اللہ خاں یقین کے صاحب زادے مقبول نبی خاں مقبول کی وساطت سے سودا کی خدمت میں پہنچے۔ چند غزلیں سودا کو سنائیں۔ چوں کہ اس وقت قائم علی کا تخلص امیدوار تھا۔ اس لیے سودا نے فی البدیہہ ایک شعر پڑھا۔

ہے فیض سے کسی کے یہ نخل ان کا باردار

اس واسطے کیا ہے تخلص امیدوار

یہ بے چارے اس ارادے سے گئے تھے کہ سودا کا تلمذ اختیار کریں گے۔ مگر اس شعر سے شرمندہ ہو کر واپس آ گئے۔ انھوں نے اپنا تخلص بدل کر قائم تو کر لیا لیکن پھر کسی کی شاگردی کا خیال نہیں کیا۔^۲

آبِ حیات میں سودا کے لطیفے

سودا کے ترجمے میں آزاد نے جو واقعات بیان کیے ہیں۔ انھیں دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک تو وہ جن کی بنیاد کسی تذکرہ نویس کے معمولی سے بیان پر ہے اور جنھیں آزاد کے قلم نے کچھ سے کچھ کر دیا ہے۔ دوسرے وہ جن کے مآخذ کا ہمیں کوئی علم نہیں اور جو ممکن ہے محض اختراعی ہوں۔ یہ حقیقت ہے کہ سودا عام زندگی میں بھی ظریف الطبع اور بلا کے ہنسوتے تھے۔ لیکن اس سلسلے میں آزاد نے بہت سے ایسے واقعات بھی بیان کیے ہیں جن میں بعض تو صریحاً نہیں مانے جاسکتے اور بعض اُس وقت تک نہیں تسلیم کیے جاسکتے جب تک کسی اور ذریعے سے تصدیق نہیں ہوتی۔ آزاد نے سودا اور شاہ عالم کے

^۱ نکات اشعار، ص ۱۲۸-۱۲۹

^۲ مجموعہ نغز، ۱، ص ۸۱

تعلقات کے بارے میں لکھا ہے:

”جب کلام کا شہرہ عالم گیر ہوا تو شاہ عالم بادشاہ اپنا کلام اصلاح کے لیے دینے لگے اور فرمائش کرنے لگے۔ ایک دن کسی غزل کے لیے تقاضا کیا۔ انھوں نے عذر بیان کیا۔ حضور نے فرمایا۔ بھئی مرزا گئے غزلیں روز کہہ لیتے ہو؟ مرزا نے کہا پیر و مرشد جب طبیعت لگ جاتی ہے، دو چار شعر کہہ لیتا ہوں۔ حضور نے فرمایا۔ بھئی ہم تو پانچاںہ میں بیٹھے بیٹھے چار غزلیں کہہ لیتے ہیں۔ ہاتھ باندھ کر عرض کی۔ حضور ویسی بو بھی آتی ہے۔ یہ کہہ کر چلے آئے۔ بادشاہ نے پھر کئی دفعہ بلا بھیجا اور کہا کہ ہماری غزلیں بناؤ۔ ہم تمہیں ملک اشعرا کر دیں گے۔ یہ نہ گئے اور کہا کہ حضور کی ملک اشعرائی سے کیا ہوتا ہے۔ کرے گا تو میرا کلام ملک اشعرا کرے گا۔ پھر ایک بڑا مخمس شہر آشوب لکھا۔

کہا میں آج یہ سودا سے کیوں ہے ڈانواں ڈول“۔

آزاد کے اس بیان میں کئی باتیں قابل غور ہیں۔ سب سے پہلے تو ہمیں یہ طے کرنا ہوگا کہ کیا شاہ عالم کو سودا سے تلمذ تھا؟ ہمارے خیال سے ایسا نہیں تھا کیوں کہ شاہ عالم تقریباً ۱۱۷۲ھ میں نواب عماد الملک کے خوف سے دہلی سے فرار ہو گئے تھے اور ۱۱۷۴ھ میں سودا نے ترک وطن کیا۔ اس کے بعد کوئی مقام ایسا نہیں ہے جہاں شاہ عالم اور سودا ایک ساتھ رہے ہوں۔ اگر یہ تلمذ اس زمانے سے قبل تھا تو کوئی وجہ نہیں کہ میر، گردیزی، قائم اور شفیق اس کا ذکر نہیں کرتے۔ ان سب کے تذکرے قریبی زمانے میں لکھے گئے تھے۔ اب صرف اس کا امکان باقی ہے کہ شاہ عالم کو خط و کتابت کے ذریعے تلمذ رہا ہو۔ لیکن اسے تسلیم نہ کرنے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ کسی تذکرہ نگار نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ حالاں کہ سودا کے لیے یہ بہت بڑا اعزاز تھا۔ آزاد نے مخمس شہر آشوب کے متعلق بھی جو کچھ لکھا ہے وہ درست نہیں۔ کیوں کہ ۱۱۸۶ھ میں جب شاہ

عالم دہلی کے قلعہ میں واپس آئے تو سودا فرخ آباد میں تھے اور اس سے قبل شاہ عالم بحیثیت شہنشاہ کے دہلی میں کبھی نہیں رہے۔ ہمارے خیال سے یہ محسوس ۱۱۷۲ھ (سودا کے ترکہ وطن) سے قبل کا ہے۔

محمد حسین آزاد نے سودا اور میر جعفر زٹلی کے متعلق بھی ایک لطیفہ بیان کیا ہے:

”جب مرزا رفیع لڑکے تھے۔ اس وقت میر جعفر زٹلی کا بڑھا پاتھا۔
اگلے وقتوں کے لوگ رنگین جڑیں جن پر نقاشی کا کام ہوتا تھا۔ اکثر
ہاتھ میں رکھا کرتے تھے۔ ایک دن شام کے قریب میر موصوف
ایک سبز رنگ جڑیب ٹیکتے ٹھیلنے کو باہر نکلے۔ مرزا بغل میں کتابوں
کا جزدان لیے سامنے سے آتے تھے۔ اس زمانے میں ادب کی
بڑی پابندی تھی۔ بزرگوں کو سلام کرنا اور ان کی زبان سے دعا لینے
کو بڑی نعمت سمجھتے تھے۔ مرزا نے جھک کر سلام کیا۔ انھوں نے
خوش ہو کر دعا دی۔ چوں کہ بچپن ہی میں مرزا کی موزونی طبع کا
چرچا تھا۔ میر صاحب کچھ باتیں کرنے لگے۔ مرزا ساتھ ہو لیے۔
انھوں نے نوخیز طبیعت کے بڑھانے کے لیے کہا کہ مرزا بھلا ایک
مصرع پر مصرع تو لگاؤ۔ ع

لالہ در باغ داغ چوں دارد؟

مرزا نے سوچ کر جواب دیا ع

عمر کو تاست غم فزوں دارد

میر صاحب نے فرمایا۔ واہ مرزا دن بھر کے بھوکے تھے ”وہ“
کھا گئے۔

۱۔ قاضی عبدالودود نے لکھا ہے کہ یہ محسوس مجدد عالمگیر ثانی میں تصنیف ہوا (سب رس، نمبر ۶۰، ص ۹)
مگر قاضی صاحب نے کوئی ثبوت پیش نہیں کیا۔

مرزا نے پھر کہا ع

از غم عشق سینہ خوں دارد

میر صاحب نے فرمایا۔ واہ بھئی دل خون ہوتا ہے۔ جگر خون ہوتا ہے بھلا سینہ کیا خون ہوگا۔ سینہ پر خون ہوتا ہے۔ مرزا نے ذرا پھر فکر کیا اور کہا ع

چہ کند سوزش دروں دارد

میر صاحب نے کہا کہ ہاں مصرع تو ٹھیک ہے لیکن ذرا طبیعت پر زور دے کر کہو۔ مرزا دق ہو گئے تھے۔ جھٹ کہہ دیا ع

یک عصا سبز زیر..... دارد

میر جعفر مرحوم ہنس پڑے اور جریب اٹھا کر کہا۔ ”کیوں! یہ ہم سے بھی۔ دیکھ، کہوں گا تیرے باپ سے۔ بازی بازی بریش بابا ہم بازی“ مرزا لڑکے تو تھے ہی بھاگ گئے۔ ۱

آزادی کی قوت، اختراع اور انشا پر دازی کے ثبوت میں یہی لطیفہ کافی ہے۔ اس کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں۔ شورش عظیم آبادی نے میر جعفر کے ترجمے میں لکھا ہے۔ ”لوگ کہتے ہیں کہ نواب ذوالفقار خاں بہادر کے انتقال کے بعد ایک دن انھوں نے (جعفر نے) یہ شعر کہا۔

سکہ زد بر گندم و موٹھ و مٹر

بادشا ہے تمہ گش فرخ سیر

اس خبر سے بادشاہ کو غصہ آ گیا اور انھیں (جعفر) جنت بھیج دیا۔ ۲

۱۔ آب حیات، ص ۱۷۴-۱۷۵

۲۔ دو تذکرے (شورش)، ص ۱۶۳

شورش کے اس بیان کا مطلب یہ ہے کہ جعفر زلی عہد فرخ سیر میں قتل کیے گئے۔

فرخ سیر ۱۱۲۳ھ میں تخت نشین ہوا۔ اس وقت سودا کی عمر صرف چھ سال تھی۔ ۸ ربیع الثانی ۱۱۳۱ھ کو فرخ سیر کو تخت سے اتار کر اندھا کر دیا گیا۔ اُس وقت بھی سودا کی عمر صرف تیرہ سال تھی۔ علاوہ ازیں میر حسن نے یہ لطیفہ مرزا بیدل اور جعفر زلی سے متعلق بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

”ایک دن (جعفر) مرزا بیدل کے پاس گئے۔ مرزا ایک مصرع پر فکر کر رہے تھے۔ ملتفت نہ ہوئے۔ (جعفر نے) پوچھا صاحب و قبلہ آپ نے کون سا مصرع کہا ہے؟ کہا! ہاں یہ مصرع ہے ع

لالہ بر سینہ داغ چوں دارد

میر مسطور نے کہا۔ اس میں کیا تاثر ہے۔

چو بکے سبز زبر دارد“۔

آزاد لکھتے ہیں:

خان آرزو کے مکان پر مشاعرہ ہوتا تھا۔ سودا ان دنوں نوجوان تھے۔ مطلع پڑھا۔

آلودہ قطرات عرق دیکھ جبیں کو
اختر پڑے جھانکیں ہیں فلک پر سے زمیں کو

۱۔ (۱) تذکرہ شعراء اردو، ص ۴

(ب) قاضی عبدالودود لکھتے ہیں۔ ”انشا نورتن مطبوع نول کشور ص ۱۰۶ میں ہے کہ اکبر نے لالہ

بر سینہ داغ کہا۔ امیر خسرو نے یہ مصرع لکھا

عمر کوتاہ غم فردوں دارد

لطائف عجیبہ مصطفیٰ بشیر الدین احمد دہلوی مرحوم کی کسی جلد میں اس پر یہ اضافہ کیا گیا ہے کہ میر بل نے تیسرا مصرع..... چو بکے سبز..... داغ کہا۔ ممکن ہے یک عصا..... داغ کی جگہ ہو۔ کتاب اس وقت پیش نظر نہیں۔

نوائے ادب (اپریل ۱۹۵۶ء) ص ۱۲۔

یا تو لاعلمی سے یا ان کی آتش زبانی کے ڈر سے کوئی نہ بولا۔ مگر
خان آرزو جن کی دایہ قابلیت کے دودھ سے مظہر، سودا، میر، درد
وغیرہ نوجوانوں نے پرورش پائی ہے۔ انھوں نے فوراً یہ شعر پڑھا
کہ قدسی کے مطلع پر اشارہ ہے۔

شعر سودا حدیث قدسی ہے
چاپے لکھ رکھیں فلک پہ ملک
(قدسی کا مطلع ہے)

آلودہ قطرات عرق دیدہ جبیں را
اختر ز فلک می نگرند روئے زمیں را

سودا بے اختیار اٹھ کھڑے ہوئے۔ خاں صاحب کے گلے سے
لپٹ گئے اور اس شکر یہ کے ساتھ خوشی ظاہر کی گویا حقیقتاً خاں
صاحب نے ان کے کلام کو مثل حدیث قدسی تسلیم کیا ہے۔^۱

یہ واقعہ آزاد نے مجموعہ نغز سے لیا ہے مگر قاسم نے صرف اتنا لکھا ہے کہ سودا نے حاجی محمد
جان قدسی کی ایک غزل کا اردو میں ترجمہ کیا اور (خان آرزو کے مشاعرے میں) بڑے
شد و مد سے پڑھ رہے تھے۔ اتفاقاً اہل محفل میں سے کسی کا اُس طرف دھیان نہیں گیا
اور اگر گیا بھی ہوگا تو خاموش رہے ہوں گے۔ کیوں کہ معمولی سی بات پر (سودا) ہر کسی
کی بے محابا جھجک دیا کرتے تھے۔ خان آرزو نے بہت تعریف کی اور دوران تو صیف یہ
شعر فی البدیہہ کہا۔ شعر سودا..... الخ۔ “شعر آلودہ قطرات..... الخ اور اس کا ترجمہ
آزاد کا اپنا اضافہ ہے۔ یہ شعر قدسی کا نہیں ہے۔ مجالس رنگین میں رنگین نے یہ فارسی
شعر اور سودا کا اردو ترجمہ دیا ہے مگر یہ نہیں بتایا کہ فارسی شعر کس کا ہے۔ سچ آزاد نے

۱۔ آب حیات، ص ۱۷۲-۱۷۳

۲۔ مجموعہ نغز، ۱، ص ۲۶

۳۔ مجالس رنگین، ص ۸

ان دونوں کو ملا دیا ہے۔

آزاد نے انشا اور سودا کے متعلق لکھا ہے۔ ”سید انشا کا عالم نوجوانی تھا۔ مشاعرے میں غزل پڑھی:

جھڑکی سہی ادا سہی چین جہیں سہی

سب کچھ سہی پر ایک نہیں کی نہیں سہی

جب یہ شعر پڑھا :

گر ناز نہیں کہے سے برا مانتے ہو آپ

میری طرف تو دیکھیے میں ناز نہیں سہی

سودا کا عالم پیری تھا۔ مشاعرے میں موجود تھے مسکرا کر بولے۔ دریں چہ شک۔“ اس لطیفے کی کسی اور ذریعے سے تصدیق نہیں ہوتی۔ اگر آزاد کے ذہن کی اختراع نہیں تو یہ واقعہ فیض آباد میں پیش آیا ہوگا۔ کیوں کہ انشا کے والد شجاع الدولہ کے دربار سے متوسل تھے۔ سودا ۱۱۸۵ھ میں فیض آباد پہنچے ہیں۔ انشا ۱۱۸۸ھ (وفات شجاع الدولہ) میں فیض آباد سے چلے گئے۔ اس لیے یہ واقعہ ۱۱۸۵ھ اور ۱۱۸۸ھ کے درمیان کا ہوگا۔

آزاد نے درد اور سودا کے بارے میں ایک لطیفہ لکھا ہے:

”ان (درد) کے ہاں ایک صحبت خاص ہوتی تھی۔ اس میں خواجہ

میر درد صاحب نالہ عندلیب یعنی اپنے والد کی تصنیفات اور اپنا

کلام کچھ کچھ بیان کرتے تھے۔ ایک دن مرزا رفیع سے سر راہ

ملاقات ہوئی۔ خواجہ صاحب نے تشریف لانے کے لیے فرمائش

کی۔ مرزا نے کہا۔ صاحب مجھے نہیں بھاتا کہ سو کوئے کا نہیں

کائیں کریں اور بیچ میں ایک پڑا بیٹھ کر چوں چوں کرے۔ اس

۱۔ انشا کے قیام فیض آباد کے سلسلے میں ملاحظہ ہو

اعلم پرویز، انشاء اللہ خاں انشا، دہلی، ۱۹۶۱ء، ص ۲۳۔ ۲۶

زمانہ کے بزرگ ایسے صاحب کمالوں کی بات کا تحمل اور برداشت
کرنا لازمہ بزرگی سمجھتے تھے۔ آپ مسکرا کر چپ ہو رہے۔

مرزاے موصوف نے ایک قصیدہ نواب احمد علی خاں کی تعریف میں کہا ہے اور تمہید میں
اکثر شعرا کا ذکر انھیں شوخیوں کے ساتھ کیا ہے جو ان کے معمولی انداز ہیں۔ چناں چہ
اسی کے ضمن میں کہتے ہیں۔

درد کس کس طرح ہلاتے ہیں
کر کے آوازِ مغنی و حزیں
اور جو احمق ان کے سامع ہیں
دمبدم ان کو یوں کریں تحسین
جیسے سُبحانِ مَنْ یَرانی پر
لڑکے مکتب کے سب کہیں آمیں
کوئی پوچھے ذرا کہ عالم میں
فخر کس چیز کا ہے ان کے تئیں
شعر و تقطیع ان کے دیواں کی
جمع ہووے تو جیسے نقشِ نگین
اس میں بھی دیکھیے تو آخر کار
یا تو ارد ہوا ہے یا تفصیل
اتنی کچھ شاعری پہ کرتے ہیں
میخ در..... آسمان و زمیں؎

یہ اشعار نواب احمد علی خاں کی شان میں کہے گئے ایک قصیدے کے ہیں۔ ان سے قبل ایک شعر یہ بھی ہے :

یعنی سودا و میر و قائم و درد

لے ہدایت سے تا کلیم و حزیں

جب اس شعر میں درد کا نام آچکا ہے تو بظاہر دوبارہ نام آنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوئی۔ کلیات سودا مطبوعہ نول کشور میں وہ شعر جس میں درد کا لفظ آیا ہے اس طرح ہے۔

درد کس کس طرح ملاتے ہیں

کر کے آواز منحنی و حزیں

جس کا مطلب صاف یہی ہے کہ شعر میں سوز و گداز نہیں ہوتا۔ آواز کو منحنی اور حزیں بنا کر درد پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض قلمی نسخوں میں ”ملاتے“ کی جگہ ”ہلاتے“ ہے۔ جو بظاہر کاتب کا سہو ہے۔ میرا خیال ہے کہ آزاد نے اس سہو سے فائدہ اٹھا کر ایک دل چسپ لطیفہ بنالیا ہے۔

موسیقی دانی

بعض معاصر تذکرہ نگاروں نے سودا کی موسیقی دانی کا بھی ذکر کیا ہے۔ میر حسن نے لکھا ہے:

در علم موسیقی نیز ماہر ست۔

عشقی لکھتے ہیں کہ انھیں علم موسیقی اور ستار نوازی میں معقول دستگاہ تھی۔ ان کے اصل الفاظ یہ ہیں:

در علم موسیقی و ستار نوازی دستگا ہے معقولے داشت۔^۱

مصطفیٰ لکھتے ہیں کہ:

”بہ سبب آگاہی علم موسیقی مرثیہ و سلام کہ گفتہ بر سوز نہادن آں نیز
قادر“۔^۲

حکیم سید احمد علی خاں یتیم لکھتے ہیں کہ سودا علم موسیقی سے آگاہ ہیں اور اپنے کہے ہوئے
مرثیوں اور سلاموں کی طرح خود بناتے ہیں۔^۳

کتے پالنے کا شوق

سودا کو کتے پالنے کا بہت شوق تھا اور غالباً یہ شوق آخری عمر تک قائم رہا۔ جب عہد نواب
شجاع الدولہ میں مصطفیٰ اُن سے ملنے گئے تو ان کا یہ شوق بدستور تھا۔ چنانچہ مصطفیٰ لکھتے
ہیں۔ ”فقیر عہد نواب شجاع الدولہ بہادر میں اس بزرگ (یعنی سودا) کی خدمت
میں حاضر ہوا۔ انھیں ابریشم پشم کے کتے پالنے کا بہت شوق تھا۔“۔^۴

کلیات میر میں ایک جھو ”جو عاقل نام نا کسے کہ بہ سگان انے تمام داشت“۔ کے نام
سے ہے۔ یہ جھو غالباً سودا پر کہی گئی ہے۔ کیوں کہ کلیات سودا میں اس کا جواب ہے۔ میر
نے اپنی جھو میں لکھا ہے کہ سودا کتوں کے پیچھے دیوانے رہتے ہیں۔

کتوں کے ساتھ کھانے لگا کتوں سے معاش

چھڑی کی طرح شام و سحر کتوں کی تلاش

پاکیزگی و لطافت وہ برطرف (کذا)

کتا بغل میں مارے لگا پھرنے ہر طرف

۱۔ دو تذکرے (تذکرہ عشقی)، ص ۳۸۰

۲۔ تذکرہ ہندی، ص ۱۲۶

۳۔ دستور القصاحت، ص ۱۷

۴۔ تذکرہ ہندی، ص ۱۲۵-۱۲۶

سودا کو کتنے اتنے عزیز تھے کہ اگر کوئی ان کتوں کو کچھ کہتا تو انہیں سخت ناگوار ہوتا۔

دنگارو کتنے کو تو لہو اپنا وہ پیے

ہے اس کی استخاں شکنی کتوں کے لیے

وہ کتوں کی تلاش میں اس طرح مارے مارے پھرتے کہ دین اور دنیا سے بے خبر ہو گئے تھے۔

کتوں کی جستجو میں ہوا روڑا باٹ کا

دھوبی کا سکتا ہے کہ نہ گھر کا نہ گھاٹ کا

انہوں نے دہلی میں تین کتیاں پالی تھیں، جن سے انہیں بے انتہا محبت تھی۔ ان کتوں کی خاطر ہمسایوں کی گالیاں بھی کھانا پڑیں۔ جب یہ کتیاں مریں تو سودا کو بہت افسوس ہوا۔

دلی میں تین کتیاں کہیں لے کے پالیاں

ہمسایوں کی جنھوں کے لیے کھائیں گالیاں

وہ مر گئیں تو دیر رہا روتا غم زدہ

پستی کے پیچھے پھر نہ ہسٹا تک ستم زدہ

لوگی کا گرم غم جو رہا سوکھ بخ ہوا

برنی کی تعزیت میں سگ روئے بخ ہوا

ظاہر ہے کہ میر نے مبالغے سے کام لیا ہے۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ سودا کو کتوں سے بہت محبت تھی۔ اپنے اس شوق کا ذکر انہوں نے ہجو فن دی میں بھی کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

سن بے آلو پہنچ کے بگا لے

مادہ سگ آپ کو تو بنوالے
 میرے تئیں گو ہے بسکہ ذوق بہ سگ
 سگ بہت خوب میں نے ہیں پالے
 میر کی ہجو کا جواب دس بندوں کی ایک محس میں دیا ہے جس کے دو بند یہ ہیں:
 اکثر تو مرے خبث میں کہتا ہے یہی بات
 کتوں میں فلانے کی شب و روز ہے اوقات
 خود اس کی نجاست کا نہیں کتے پہ اثبات
 لازم ہے مسلمان نہ کرے اس سے ملاقات
 یہ چاہیے محبت سے رکھے ایسے کے اکراہ
 کتے سے شب و روز جو رکھتا ہوں میں محبت
 دیتا ہے مجھے یاد وفا اور قناعت
 دنیا کے وہ جیفے کو سمجھتا ہے نجاست
 اک پارچہ نان پر مرے ساتھ رفاقت
 کس طرح بتا اس کی مرے دل میں نہ ہو چاہ

ترک وطن

نادر شاہ کے حملے نے دہلی کو اس طرح تباہ و برباد کیا کہ بعض لوگوں نے دہلی کو ہمیشہ کے
 لیے خیر باد کہہ دیا۔ لیکن سودا ثابت قدم رہے کیوں کہ ان کے سرپرست اور مربی دہلی
 میں موجود تھے۔

سودا کے علاوہ کچھ اور اہل ہنر بھی دہلی سے نہ گئے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ شجاع الدولہ کے مسند نشین ہونے تک پورے ہندوستان میں فرخ آباد کے علاوہ کوئی دوسرا مقام ایسا نہیں تھا، جہاں اہل فن کو پناہ مل سکتی تھی۔ برہان الملک کا نادر شاہی حملے کے دوران انتقال ہو چکا تھا۔ ان کے وارث صفدر جنگ کو دشمنوں نے جین سے نہ بیٹھنے دیا۔ شجاع الدولہ کے حالات البتہ کچھ بہتر تھے۔ مگر ابتدائی دور حکومت میں وہ بھی ملکی سیاست میں اتنا مصروف رہے کہ انھیں ”طاؤس و رباب“ کی فرصت نہیں ملی۔ اس وقت مشہور و معروف شاعروں میں خان آرزو ایسے شاعر تھے جنھیں شجاع الدولہ کی سرکار سے تین سو روپے ماہوار ملتے تھے۔ وفات سے کچھ سال قبل جب شجاع الدولہ کے اکثر دشمن تہ خاک ہو چکے تھے اور انگریزوں کی دوستی حاصل ہو گئی تھی۔ اُس وقت شجاع الدولہ نے فیض آباد میں مستقل قیام کا ارادہ کیا۔ شہر کی تعمیر میں دل چسپی لی اور بزم آرائیوں کے سامان کیے۔ فیض آباد اور بعد میں لکھنؤ ادبی مرکز بن گیا۔ جہاں ہندوستان کے اکثر نامور شاعر اور ادیب اپنی متاع ہنر کا صلہ پانے کے لیے پہنچے۔

اودھ کے باقاعدہ ادبی مرکز بننے سے پہلے فرخ آباد ایک ایسا مقام تھا جہاں نواب احمد خاں بخش کے دیوان مہربان خاں رند کی فیاضیوں نے کچھ شاعروں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ ان میں مرزا رفیع سودا اور میر سوز جیسے نامور شعرا بھی تھے۔

دہلی میں احمد شاہ ابدالی کے حملے (۱۷۵۷ء مطابق ۱۷۵۶ء) نے ایک عظیم سیاسی انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ ابدالی نے نادر شاہ کی تاریخ دہرادی۔ اس لیے اکثر لوگ ہراساں و پریشان دہلی سے نکل کر شہر شہر مارے پھر رہے تھے لیکن سودا اب بھی دہلی ہی میں رہے۔ ان کے مرئی عماد الملک کا ستارہ گردش میں ضرور تھا۔ لیکن ابھی تک ان کا سیاسی اقتدار برقرار تھا۔ احمد شاہ ابدالی نے انھیں درانی فوج اور دوشیزادوں مرزا ہدایت بخش اور مرزا بابر کے ساتھ روانہ کیا تھا تا کہ وہ صوبہ اودھ سے روپیہ وصول کریں۔ عماد الملک پہلے فرخ آباد میں وارد ہوئے۔ جہاں نواب احمد خاں بخش نے ان کا استقبال کیا اور نذر گزرائی۔ قائم نے لکھا ہے کہ مرزا رفیع سودا، وزیر المملکت نواب غازی الدین خاں عماد الملک کے ساتھ فرخ آباد پہنچے۔ نواب مہربان خاں رند نے عماد الملک سے

درخواست کی اور سودا کو اپنی رفاقت میں لے لیا۔ ۱۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ سودا ۱۱۷۰ھ میں فرخ آباد وارد ہوئے۔ لیکن صاحبِ نثر عشق کا بیان ذرا مختلف ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ احمد شاہ ابدالی کے دوبارہ دہلی آنے پر جو تباہی و بربادی ہوئی، اس سے پریشان ہو کر سودا نے ترک وطن کیا اور فرخ آباد آ گئے۔ ۲۔

ابدالی کے دوبارہ دہلی آنے کی مختصر داستان یہ ہے کہ ۱۱۷۰ھ میں ابدالی نے عماد الملک کو امیر الامرائی کے منصب پر فائز کیا۔ جب عماد الملک ابدالی کے حکم سے اودھ کی طرف گئے تو عالم گیر ثانی اور نجیب الدولہ کے بہکانے پر یہ منصب نجیب الدولہ کو عنایت کر دیا گیا۔ عماد الملک نے سورج مل جاٹ کی مدد سے دہلی پر حملہ کر دیا۔ نجیب الدولہ کو بے سروسامانی کی وجہ سے صلح کرنی پڑی اور اپنے علاقے کی طرف چلے گئے۔ عماد الملک نے ۱۱۷۳ھ میں عالم گیر شانی اور نواب انتظام الدولہ کو قتل کر دیا۔ شاہ جہاں ثانی کو تخت نشین کیا۔ احمد شاہ ابدالی نے یہ خبر سن کر پھر دہلی کا رخ کیا۔ عماد الملک نے دہلی سے فرار ہو کر سورج مل جاٹ کے قلعوں میں پناہ لی، جس کا ذکر صاحبِ مقالات اشعرا نے بھی کیا ہے۔ ۳۔

اس کا امکان بہت کم ہے کہ سودا ۱۱۷۴ھ کے بعد بھی دہلی میں رہے ہوں۔ کیوں کہ جمادی الآخر ۱۱۷۴ھ جنوری ۱۷۶۱ء (پانی پت کی لڑائی) کے بعد احمد شاہ ابدالی نے نجیب الدولہ کو امیر الامرائی کے منصب پر سرفراز کیا تھا اور اس کے بعد لگ بھگ دس سال تک نجیب الدولہ کی حیثیت ایک ڈکٹیٹر کی رہی۔ نجیب الدولہ عماد الملک کے جانی دشمن تھے۔ اس لیے بظاہر یہ ممکن نظر نہیں آتا کہ نجیب الدولہ کے عہد میں سودا جو عماد الملک کے خیر خواہ تھے، دہلی میں رہے ہوں گے۔ زیادہ امکان یہی ہے کہ وہ ۱۱۷۴ھ کے لگ بھگ دہلی سے نکل کر عماد الملک کے پاس پہنچ گئے اور عماد الملک کے ساتھ ۱۱۷۴ھ-۱۱۷۶ھ

۱۔ مخزنِ نکات، ص ۵۵۔

۲۔ نثر عشق (قلمی)، ص ۶۶۶۔

۳۔ قیام الدین حیرت، مقالات اشعرا (قلمی)، رام پور، ورق ۱۰ ب

کے درمیانی زمانے میں فرخ آباد گئے۔ ۱۔ بہر حال ۱۱۷۶ھ میں سودا فرخ آباد میں موجود تھے۔ کیوں کہ انھوں نے مہرباں خاں رند کی شادی کا جو قطعہ تہنیت کہا ہے اس کا مادہ تاریخ ہے:

ہوا ہے وصل ماہ و مشتری کا

اس مادہ سے ۱۱۷۶ھ برآمد ہوتے ہیں۔ امتیاز علی خاں صاحب عرقی کا خیال ہے کہ سودا ۱۱۷۶ھ میں فرخ آباد پہنچے۔ ۲۔

صاحب خزانہ عامرہ کا بیان ہے کہ عماد الملک ۱۱۷۶ھ تک سورج مل کے ساتھ مقیم رہے۔ ۳۔ تاریخ فرخ آباد سے اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ تقریباً اسی سال عماد الملک فرخ آباد پہنچے۔ ۴۔ نواب احمد خاں بخش نے ان کے لیے اچھی خاصی جاگیر مقرر کر دی تاکہ ان کا گزر ہو سکے۔ تاریخ فرخ آباد ہی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب شاہ عالم بادشاہ الہ آباد سے دہلی کی طرف جانے لگے تو عماد الملک وہیں موجود تھے۔ انھیں جب یہ خبر ملی کہ شاہ عالم فرخ آباد کے قریب سے گزر رہے تو وہ فرخ آباد سے روانہ ہو گئے۔ کیوں کہ انھیں خوف تھا کہ شاہ عالم اپنے والد عالم گیر ثانی کا بدلہ نہ چکالیں۔ شاہ عالم کا یہ سفر ۱۱۸۴ھ میں ہوا تھا جس کا مطلب ہے کہ عماد الملک ۱۱۷۶ھ-۱۱۸۴ھ تک

۱۔ (الف) شیخ چاند نے فرخ آباد میں سودا کا سال درود ۱۱۷۶ھ بتایا ہے جو کسی طرح بھی ممکن نہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ جب احمد شاہ دہلوی کے مشورے سے ۱۱۷۶ھ میں عماد الملک دو ہزار روپے کے ساتھ فرخ آباد گئے تو سودا بھی ہمراہ تھے۔ سودا، ص ۵۰۔

(ب) ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی نے لکھا ہے کہ ”شاہ عالم بادشاہ کے زمانے میں ان کی شاعری عروج پر تھی۔ کئی روایات کے ہیں ان کی قدر ہوتی تھی۔ خصوصاً بسنت خاں خولجی سرا و مہرباں خاں زیادہ مہربان تھے۔ جب احمد شاہ ابدالی اور مرہٹوں کے حملوں سے دہلی تباہ و برباد ہو گئی تو سودا نے باہر کا رخ کیا۔ دہلی کا دبستان شاعری، ص ۱۵۰-۱۵۱۔ شاہ عالم اگرچہ ۱۱۷۴ھ میں تخت نشین ہوئے تھے لیکن تقریباً دس سال تک وہ الہ آباد میں رہے۔ اس لیے ڈاکٹر صاحب کا بیان درست نہیں۔ بسنت خاں محمد شاہی دور کا امیر تھا اور مہربان خاں رند وہی ہے جو نواب احمد خاں بخش کا دیوان تھا۔ بظاہر یہ غلط فہمی آزاد کی پیدا کردہ ہے۔

۲۔ حکیم سید احمد علی خاں یکتا، دستور القصاصت، مرتبہ امتیاز علی خاں عرقی، حواشی، ص ۵۷-۵۸۔

۳۔ خزانہ عامرہ، ص ۱۵۳۔

۴۔ میر ولی اللہ، تاریخ فرخ آباد (قلی)، رام پور۔

فرخ آباد میں رہے۔ اب سوال یہ ہے کہ سودا کب ان کے ساتھ فرخ آباد آئے۔ ۱۱۷۰ھ میں سودا کے آنے کا کوئی سوال نہیں۔ احمد شاہ ابدالی دوسری بار ۱۱۷۴ھ میں دہلی آیا تھا۔ ہمارا خیال ہے کہ سودا نے اُس سال ترک وطن کیا ہے اور عماد الملک کے پاس سورج مل جاٹ کے قلعوں میں پہنچ گئے۔ مرزا مظہر جانجانا نے کئی خطوط عماد الملک اور ان کے کسی عہدے دار غلام عسکری خاں کو لکھے ہیں، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ عماد الملک خاموش نہیں بیٹھے تھے۔ وہ دہلی پر حملہ کرنے اور منصب امیر الامرائی حاصل کرنے کے لیے برابر کوششیں کر رہے تھے۔ اس سلسلے میں وہ روہیلوں، مرہٹوں اور جاٹوں سے مدد حاصل کرنا چاہتے تھے۔ وہ فرخ آباد بھی گئے تھے۔ تاکہ نواب احمد خاں بنگلش سے مدد چاہیں۔ سودا اُن کے ساتھ تھے اور مہربان خاں رند کی فرمائش پر وہیں مقیم ہو گئے۔

فرخ آباد میں سودا نواب مہربان خاں رند کی سرکار سے منسلک رہے اور نواب احمد خاں بنگلش سے کوئی قابل ذکر تعلق نہیں رہا۔ کلیات سودا میں چند قطعات ہیں جو نواب احمد خاں کی سالگرہ اور غسلِ صحت کے موقعوں پر کہے گئے ہیں۔ ان میں کم سے کم دو اشعار اور زیادہ سے زیادہ پانچ اشعار کے قطعات ہیں، جن سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ سودا کے نواب احمد خاں سے براہ راست تعلقات نہیں تھے۔ ورنہ یہ قطعات اتنے مختصر نہ ہوتے۔ غالباً نواب مہربان خاں رند کے تعلق سے یہ اشعار کہے گئے ہیں۔ بعض تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ سودا نواب احمد خاں بنگلش کی سرکار میں ملازم تھے۔ مگر یہ درست نہیں۔

بعض تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ نواب مہربان خاں رند کو سودا سے تلمذ تھا۔ مگر یہ بھی درست نہیں۔ سودا اس کے دربار سے ضرور متوسل تھے۔ لیکن اس کے استاد میر سوز تھے۔

فرخ آباد کے دورانِ قیام میں محمد یار خاں امیر نے سودا کو بلایا۔

بقول مصحح ”جن دنوں حکیم کبیر سنبھلی کے ترغیب دلانے پر ہندی شاعری نے نواب محمد یار خاں امیر کے دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچا تو انھوں نے میر سوز اور مرزا رفیع سودا کو خط

لکھا: مثلاً: سعادت خاں ناصر لکھتے ہیں: ”بعد برہی سلطنت شاہ جہاں فرخ آباد تشریف لائے اور نواب احمد بنگلش کی سرکار میں نوکر رہے۔“ تذکرہ خوش معرکہ زیبا (قلی)۔ جتلا نے بھی یہی لکھا ہے کہ چندے..... نزد نواب احمد خاں بنگلش گزرا بعد بنگلش جن (قلی) درق ۵۶ ب

لکھ کر طلب کیا۔ چوں کہ ان دنوں یہ دونوں بزرگ مہرباں خاں رند کی سرکار میں صیغہ شاعری میں عز و امتیاز رکھتے تھے۔ اس لیے ان کا فرخ آباد سے ٹائڈہ (کہ نواب کی بود و باش کا موضع تھا) آنا نہ ہو سکا۔ آخر میاں محمد قاسم کہ ان دنوں بسولی میں تھے حسب الاشارہ ٹائڈہ آئے اور والا جناب کی ملازمت حاصل کی، یہ (فارسی سے ترجمہ) [تذکرہ ہندی، ص ۱۳]

فرخ آباد کے سیاسی حالات خراب ہونے پر سودا کو مجبوراً فیض آباد جانا پڑا۔ یہ یقینی امر ہے کہ سودا ۱۱۸۳ھ تک فرخ آباد میں تھے۔ کیوں کہ کچھی زائن شفیق لکھتے ہیں کہ سودا نے غزہ ربیع الآخر کا لکھا ہوا ایک خط اور اپنے ہاتھ سے لکھے ہوئے کچھ اُردو اور فارسی اشعار دکن میں میرا دلاد محمد خاں ذکا بلگرامی کو فرخ آباد سے بھیجے تھے۔^۲

مردان علی خاں جٹلا لکھتے ہیں کہ نواب احمد خاں بنگش کی وفات کے بعد سودا فیض آباد چلے گئے۔ نواب کا انتقال ۲۸ ربیع الاول ۱۱۸۵ھ کو ہوا جس کی وجہ سے غالباً رند کے حالات خراب ہو گئے اور سودا کو ۱۱۸۵ھ کے اواخر میں فیض آباد آنا پڑا۔ سودا نے مہربان خاں رند کے دیوان و اشعار کی مدح میں ایک مثنوی کہی ہے، جس میں چند اشعار ایسے بھی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ سودا نواب احمد خاں بنگش کی زندگی ہی میں فرخ آباد سے چلے گئے۔ وہ اشعار یہ ہیں:

لیکن اس نظم سے نہ سمجھو تو
کچھ صلہ سے غرض ہے سودا کو

اس سے رکھتا ہے یہ دلی مجبور
مہرباں دوستی تری منظور

۲ قاضی عبدالودود لکھتے ہیں: ”احمد خاں بنگش سے متعلق سودا کی نظمیں ہیں۔ مگر فرخ آباد میں مہربان خاں رند سے توسل رکھتے تھے۔ میرے علم میں کوئی ایسا شخص نہیں، جسے ریختہ گو کی حیثیت سے احمد خاں بنگش نے فرخ آباد آنے کی دعوت دی ہو۔“ قاضی عبدالودود، دلی کا دبستان شاعری، ہماری زبان، علی گڑھ، ۸ مارچ

۱۹۵۹ء، ص ۲

۳ کچھی زائن شفیق، گل رستا (کلمی)، ص ۶۱۲۔

کرچکا میں دعا پہ ختم کلام
پہونچے رخصت کا میرے منجھو سلام

حشر تک زیر سایہ نواب
رہو جوں آفتاب عالم تاب لے

ان اشعار کی روشنی میں شیخ چاند نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ سودا نواب کی زندگی ہی میں فرخ آباد سے چلے گئے تھے اور چوں کہ ۱۱۸۳ھ میں ان کا فرخ آباد ہونا ثابت ہے اس لیے وہ ۱۱۸۳ھ اور ۱۱۸۵ھ کے درمیان فیض آباد پہنچے۔ ہمارے خیال سے بظاہر کوئی ایسی وجہ سمجھ میں نہیں آتی جس سے جتلا کا بتایا ہوا سن غلط ثابت ہو۔
مولانا عبدالحی نے بھی یہی لکھا ہے کہ ”۱۱۸۵ھ میں نواب احمد خاں کا انتقال ہو گیا۔ یہ برداشتہ خاطر ہو کر فیض آباد چلے آئے۔“

۱۔ ہمارا خیال ہے کہ نواب کی زندگی میں سودا نے فرخ آباد سے جانے کا ارادہ کیا ہوگا مگر بعد میں ملتوی کر دیا۔

۲۔ سودا، ص ۵۶

۳۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی تحقیق ہے۔ ”اب عام طور سے یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ سودا ۱۱۷۳ھ اور ۱۱۷۵ھ کے درمیان فیض آباد پہنچے۔“ لکھنؤ کا دبستان شاعری، ص ۸۹

۴۔ (۱) گل رعنا، ص ۱۳۵

(ب) محمد حسین آزاد نے لکھا ہے کہ ”..... کئی برس کے بعد وہ قدردان مرگئے زمانے بدل گئے۔ سودا بہت گھبرائے۔ اس عہد میں ایسے جاہی زدوں کے لیے دو ٹھکانے تھے۔ لکھنؤ یا حیدر آباد، لکھنؤ پاس تھا اور فیض و سخاوت کی گنگا بہہ رہی تھی۔ اس لیے جو دلتی سے لکھا تھا، ادھر ہی رخ کرتا تھا اور اتنا کچھ پاتا تھا کہ پھر دوسری طرف خیال نہ جاتا تھا۔ اس وقت حاکم بلکہ وہاں کے حکوم بھی جو یائے کمال تھے۔ کتبہ کو کتاب کے مولوں خریدتے تھے۔ غرض ۶۰ یا ۶۶ برس کی عمر میں دلتی سے نکل کر چند روز فرخ آباد میں نواب بخش کے پاس رہے۔ اس کی تعریف میں بھی کئی قصیدے موجود ہیں۔ وہاں سے ۱۱۸۵ھ میں لکھنؤ پہنچے۔ آب حیات، ص ۱۵۰-۱۵۱۔ یہاں آزاد کو کئی غلط فہمیاں ہیں۔ سودا جب دلتی سے نکلے ہیں تو ان کی عمر تقریباً ۵۵ سال تھی۔ وہ فرخ آباد میں چند روز نہیں تقریباً دس سال رہے تھے اور ۱۱۸۵ھ میں لکھنؤ نہیں فیض آباد پہنچے تھے۔ کیوں کہ ان دنوں اودھ کا دارالحکومت فیض آباد تھا۔

سعادت خاں ناصر نے سودا کے فیض آباد جانے سے متعلق ایک دل چسپ داستان بیان کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ”جب نواب شجاع الدولہ بہادر نے سنا کہ مرزا رفیع فرخ آباد آیا ہے۔ شقہ خاص اس کی طلب میں قلمی فرمایا۔ سبحان اللہ کیا وضع داری تھی کہ نواب کے شقہ کے جواب میں یہ ربائی لکھی :

سودا بچے دنیا تو بہ ہر سو کب تک
آوارہ ازیں کوچہ بایں کو کب تک
حاصل یہی اس سے ناکہ دنیا ہووے
بالفرض ہوا یوں بھی تو پھر تو کب تک

حضور پر نور اس ربائی سے خیلے گراں خاطر ہوئے۔ میر غلام حسین تخلص ضاحک کہ منکب مجلس تھے واسطے رفیع ملال یوں بول اُٹھے۔ اگر وہ حضور پر نور کے شقہ سے نہیں آتا ہے۔ غلام بے طلب کھینچ لاتا ہے۔ قصیدہ سالگرہ کا نواب عماد الملک غازی الدین خاں کی تعریف میں سودا کا کہا ہوا تھا۔ تمام اسی مصنف کی مذمت میں الٹا۔ چنانچہ یہ شعر:

پاؤں کھڈی پہ رکھو ہاتھ میں لو آئینہ
..... ناک پہ دھر کر عینک

جب وہ مزخرفات سودا نے سنی بہ حکم آنکھ دیوانہ راہ ہوئے (کذا) روانہ لکھنؤ کو ہوا۔ میر سابق الذکر نے کہ دلیری و شوخ چہشی ان پر ختم تھی۔ بے سابقہ معرفت مرزا کی ملاقات کو قدم رنجہ کیا۔ اسی فردوسی سے غبار عناد کا سودا کے دل سے مطلق صاف ہو گیا۔ موافق قاعدہ ہندوستان عطر و پان کے واسطے اندر تشریف لے گئے۔ اس عرصے میں کہ برآمد ہوں اس شھنول نے قلمدان کھولا اور یہ مطلع ایک پرچے میں لکھ دیا:

رستم سے تو کہہ پیارے سر تیغ تلے دھر دے
پیارے یہ ہمیں سے ہو ہر کارے دھر مردے

اس کے برابر یہ مطلع لکھ دیا:

سودا نے اٹھا چوڑا جب پاد دیا پڑے

یہ ان ہی سے ہوتا ہے ہر کارے و ہر مردے

بعد دو چار گھڑی کے جب وہ صحبت برہم ہوئی۔ سودا نے قلم دان کھولا اور وہ مطلع پڑھا یقین کلی ہوا کہ یہ سیدنا سید اور مردنا معتمد ہے۔ بے اختیار یہ شعر زبان پر گزرا:

ریم سوزاک پدر ہے تو شریر

رحم مادر سے پلٹ نکلا ہے میر“ لے

سودا اودھ میں

۱۱۸۵ھ میں جب سودا اودھ پہنچے تو نواب شجاع الدولہ کا زمانہ تھا اور اودھ کے دارالخلافہ فیض آباد میں قیام کیا اور نواب شجاع الدولہ کی سرکار میں معقول تنخواہ پر ملازم ہو گئے۔ مصطفیٰ نے لکھا ہے کہ نواب ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ نواب شجاع الدولہ کی وفات کے بعد نواب آصف الدولہ مسند نشین ہوئے تو سودا ان کی سرکار سے متوسل ہو گئے۔ (جمادی الاول ۱۱۸۹ھ) جنوری ۱۷۷۵ء کے آس پاس آصف الدولہ نے فیض آباد کو خیر باد کہہ کر لکھنؤ کو اپنا مسکن بنایا تو سودا بھی لکھنؤ آ گئے۔ غالباً لکھنؤ میں سودا کی مالی حالت اچھی نہیں رہی۔ اگرچہ کچھ تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ آصف الدولہ کی سرکار سے انھیں چھ ہزار روپیہ سالانہ کی جاگیر مقرر ہوئی تھی۔ علی لطف لکھتے ہیں:

۱۔ (الف) تذکرہ خوش معرکہ زیبا (قلبی)

(ب) ناصر کا یہ بیان کہ شجاع الدولہ نے جب سنا کہ سودا فرخ آباد آئے ہیں تو انھیں بلایا۔ جب نہیں آئے تو ضائع نے جھگڑ کر فیض آباد آنے پر مجبور کر دیا۔ درست نہیں۔ سودا فرخ آباد میں تقریباً دس سال

رہے ہیں۔

۲۔ تذکرہ خوش معرکہ زیبا (قلبی)

۳۔ مصطفیٰ کے اصل الفاظ یہ ہیں۔ ”غرضیکہ شخص جامع الکدالات بود ہر جا کہ می رفت عزت و حرمت تمام می یافت۔ نواب مرحوم و مغفور نیز بود اپنا اور سرکار خود بسیار قیمت می دانستہ۔“ تذکرہ ہندی، ص ۱۲۶۔

”جب کہ بعد خراب اور ویران ہونے شاہ جہاں آباد کے نقل و حرکت کا اتفاق میرزا نے مذکور کو اس سے ہوا۔ تو اور شہروں کی سیر کرتے ہوئے آخر بلدہ لکھنؤ میں طور سکونت کا اختیار کیا۔ نواب آصف الدولہ مرحوم نے بہت قدر و منزلت کی اور چھ ہزار سالانہ کی جاگیر مقرر کر دی۔“ ۱۔

علی لطف شاید پہلے تذکرہ نگار ہیں جنہوں نے چھ ہزار کی جاگیر کا ذکر کیا ہے۔ لیکن اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ سودا کے متعلق ان کی معلومات بہت محدود تھیں۔ سودا پہلی بار لکھنؤ نہیں فیض آباد پہنچے تھے۔ وہ آصف الدولہ کی بجائے نواب شجاع الدولہ کے عہد میں آئے تھے۔ ان غلط فہمیوں کے پیش نظر سودا کی آمدنی سے متعلق بھی ان کا بیان قابل یقین نہیں۔ اشپرنگر نے بھی یہی لکھا ہے کہ سودا کو آصف الدولہ نے چھ ہزار سالانہ کا وظیفہ دیا تھا۔ ۲ لیکن اشپرنگر کا مآخذ بھی کلکتہ ہند ہے۔ اس لیے قابل اعتماد نہیں۔ آزاد نے آمدنی سے متعلق ایک دل چسپ واقعہ بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

”لکھنؤ میں مرزا قاضی زبان فارسی کے مشہور شاعر تھے۔ ان سے اور مرزا رفیع سے بگڑی اور جھگڑے نے ایسا طول کھینچا کہ نواب آصف الدولہ کے دربار تک نوبت پہنچی۔ انجام یہ ہوا کہ علاوہ انعام و اکرام کے چھ ہزار سالانہ وظیفہ ہو گیا اور نواب نہایت شفقت کی نظر فرمانے لگے۔“ ۳۔

اس سلسلے میں بھگوان داس ہندی کا بیان سب سے زیادہ قابل قبول معلوم ہوتا ہے۔ کیوں کہ لکھنؤ میں سودا سے ان کی ملاقات بھی ہوئی تھی۔ وہ لکھتے ہیں کہ نواب شجاع الدولہ نے سودا کے دوسو روپے ماہوار مقرر کیے اور خلعت عطا کی۔ جب نواب شجاع الدولہ کا انتقال ہو گیا تو آصف الدولہ کی سرکار سے دوسو روپے ماہانہ ملنے شروع

۱۔ گلشن ہند، ص ۱۳۲۔

۲۔ یادگار شعراء ص ۱۱۱

۳۔ آب حیات ص ۱۵۱

ہو گئے۔ یہ بات اس لیے بھی قریب بہ یقین ہے کہ میر تقی میر کو بھی آصف الدولہ کے دربار سے دوسو روپے ماہانہ ملتے تھے۔ بظاہر اس کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ سودا کو پانچ سو روپے ماہوار ملیں اور میر کو صرف دو سو۔

اگرچہ سودا کا ماہانہ مقرر تھا لیکن آصف الدولہ کے عہد میں اس کا حاصل کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ ان کے عہد میں ملازموں کو مہینوں اور بعض اوقات برسوں تنخواہوں سے محروم رکھا جاتا تھا۔ آصف الدولہ کی لاپرواہی اور نااہل لوگوں کے اقتدار نے صوبے کی آمدنی کو بہت محدود کر دیا تھا جو تھوڑی بہت آمدنی تھی وہ آصف الدولہ کی عیاشیوں کے لیے بھی کافی نہیں تھی۔ سودا براہ راست درخواست کرتے ہوئے شرماتے تھے۔ اودھ آنے سے قبل کے قسیدوں میں انھوں نے اپنا دامن نہیں پھیلایا۔ ہاں نواب عماد الملک سے ایک طویل قسیدے کے دو اشعار میں یہ درخواست کی تھی۔

اس کے مصرف کے جو دیہات ہیں بس اُن میں سے
اپنے مداح کو بھی کردے مقرر صحتک
تو ہی اب دل میں کر آپ عرض مری کا انصاف
جائے کس در پہ کہو پہونچ کے ایسے در تک

لیکن ایک قسیدے میں سودا نے آصف الدولہ کو اپنا حال ذرا تفصیلی بتایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔ مجھے اپنی تنخواہ لینے کے لیے ایک ایک آدمی کی خوشامد کرنی پڑتی ہے۔ مجھے تنخواہ دینے کی بجائے مصرف مطبخ میں سے صحتک طعام مقرر کر دیجیے تاکہ ہر روز کی جھک جھک سے نجات پالوں۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

اس نظم سے غرض ہے مجھے عرض مدعا
مقصد مرا قلیل ہے پہونچے بانصرام

اپنی تری جناب میں اتنی ہی عرض ہے
 کس کس کا ملتی ہوں کہا کر ترا غلام
 انصاف ہے کہ ہو وہ عطا اس جناب کی
 اور ان کی میں سماجت و منت کروں مدام
 دیہات جو ہیں مصرفِ مطبخ کے اوس میں سے
 اس نقدی کے عوض ہو مجھے صحتک طعام
 اے منج بخش خلق مرا ہے جو مدعا
 کرنا روا حضور ترے کس قدر ہے کام

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ آصف الدولہ نے سودا کی اس درخواست پر توجہ نہیں کی اور سودا کو
 مجبوراً اراکینِ حکومت کی خوشامد کرنی پڑی۔ سرفراز الدولہ حسن رضا خاں بہادر ایک اُن
 پڑھ شخص تھے جنہیں جان برستو کی عنایت سے آصف الدولہ کی نیابت عطا ہوئی تھی۔^۱
 وہ کافی عرصے تک حکومت کے سیاہ و سفید کے مالک رہے۔ سودا نے ان کا بھی قصیدہ لکھا،
 جس میں انھوں نے اپنی مالی بد حالی کا ذکر شاعرانہ مبالغہ کے ساتھ کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

دیا ہے قوتِ اعضا نے دل کو میرے جواب
 سببِ ضیفی کے طاقت ہوئی ہے میری طاق
 پہ گری میں تو گزرا شباب کا عالم
 نہیں وہ عمر کہ اب آؤں میں بکار سیاق
 جو باءِ حوں اس پہ کرا ب تو بندھے اس طرح (؟)^۲

۱۔ نجم الغنی، تاریخ اودھ، ص ۳۰، ۱۳۰۔

۲۔ یہ مصرع غالب اس طرح ہوگا: جو باءِ حوں اس پہ کرا ب تو اس طرح باءِ حوں

کہ جوں کمار کا قبضہ بندھے مقابل فاق
 جو دست و پائیں نہ اس کے رہی ذرا طاقت
 لیا میں فینِ سخن کھول کر کمر سے یراق
 سواب میں تنگی زباں سے لڑوں ہوں بخت کے ساتھ
 ہوں فقیاب مدد کی جو ہو دے تیری وفاق
 سلامتی میں تو اپنے روا نہ رکھ مجھ پر
 ذلیل و خوار نہ ہوں میں بہ چشمِ اہل نفاق
 پھرا کروں میں لیے مشیتِ استخوان اپنے
 میانہ میں چنے عتال زیرِ کہنہ رواق
 سواب تو اس سے بھی نوبت گزر گئی ہے مگر
 گلے میں کرتہ پافکش ہاتھ میں ہو چماق
 سپردِ تنجو ہے سرِ رشتہ سب کی حرمت کا
 کیا ہے اتنی وہ مخلوق کا ہے جو خلاق
 سو طالبِ اتنے میں حرمت کا اب نہیں جس سے
 کروں معاش بسر اپنا میں بہ طعم و طراق
 عوض میں دے مجھے اس نقدی کے تو ایسا گانوں
 بسر ہو عمر مری جس سے زیرِ کہنہ رواق
 نہ ایسا گانوں کہ جس سے بروے دستر خوان
 ہزار طرح کی نعمت ہو نان و خشک زقاق

نہ شکل نور علی خاں ہوں کھا کے میں فریبہ

نہ سوکھ کر ہوں طرح میرزا رفیع کے قاق

ان اقتباسات کی روشنی میں یہی قیاس کیا جاسکتا ہے کہ دورِ آصف الدولہ میں ان کی مالی حالت زیادہ اچھی نہیں تھی انھیں اپنی تنخواہ حاصل کرنے کے لیے آصف الدولہ اور ان کے ملازمین کی خوشامد کرنی پڑتی تھی۔

قیام اودھ کے دوران سودا نے بعض لوگوں کی مدد میں قصائد یا قطعات لکھے اور مرزا فاخر کیس کی جہو میں ایک مثنوی کہی۔ ان تخلیقات کی پوری تفصیل ڈاکٹر کاظم علی خاں نے اپنے مقالوں میں دی ہیں جو حسب ذیل ہیں:

قصائد در مدح نواب شجاع الدولہ = ۶ (کلیات سودا، حصہ ۱، ص ۱۷۰ تا ۱۸۴)

قطعات در مدح نواب شجاع الدولہ = ۷ (کلیات سودا، حصہ ۲، الہ آباد، ۱۹۷۱ء، ص ۱۶۲ تا ۱۶۹)

قصائد در مدح نواب آصف الدولہ = ۶ (کلیات سودا، حصہ ۱، ص ۱۸۴ تا ۱۹۴)

قصائد در مدح رچرڈ جانسن اسٹنٹ ریزنڈنٹ اودھ = ۲ (کلیات سودا، نسخہ رچرڈ جانسن بہ حوالہ ڈاکٹر خلیق انجم، مرزا محمد رفیع سودا، ص ۵۲۹ تا ۵۳۶)

قطعات در مدح آصف الدولہ = ۶ (کلیات سودا، حصہ ۲، ص ۱۶۳ تا ۱۷۵)

قصائد در مدح سرفراز الدولہ حسن رضا خاں = ۲ (کلیات سودا، حصہ ۱، ص ۱۹۶ تا ۲۰۱)

مثنوی در ہجو مرزا فاخر کیس = ۱ (بہ حوالہ ڈاکٹر خلیق انجم، مرزا محمد رفیع سودا، ص ۵۳۶ تا ۵۴۰)

قطعہ در مدح راجا ٹکلیٹ رائے (زمانہ تخلیق ۱۱۹۳ء) = ۱ (کلیات سودا، حصہ ۲، ص ۱۷۴)

میزان = ۳۷

ان تین درجن سے زائد ادب پاروں کے علاوہ سودا کی بعض ایسی اور منظومات کا بھی پتہ چلتا ہے جو ان کے قیام اودھ کے دوران کہی گئی تھیں مثلاً:

مثنوی در تعریف شکار آصف الدولہ (کلیات سودا، حصہ ۱ ص ۲۶۵ تا ۲۶۶) میں کہا گیا تھا۔ ڈاکٹر گیان چند جین نے مثنوی عشق شیشہ گر بہ زر گر پسر کو بھی سودا کے قیام لکھنؤ ہی کی پیداوار قرار دیا ہے (اردو مثنوی شمالی ہند میں، ص ۱۸۶) ملحوظ رہے کہ یہ سودا کی طویل ترین مثنوی ہے۔

بقول ڈاکٹر کاظم علی خاں ”لکھنؤ میں سودا کے جن شاعروں سے معرکے ہوئے تھے، اُن میں فردوسی، جعفری علی حسرت، بھا، میرزا ہد اور مرزا فاخر کیس کے نام شامل ہیں۔ لکھنؤ میں سودا کی کلیات کے کئی نسخے شائع ہوئے تھے، جن کی تفصیل ڈاکٹر کاظم علی خاں نے اپنے مقالے میں دی ہے۔ ان ہی نسخوں میں ایک نسخہ جانسن ہے جو برٹش لائبریری (لندن) میں موجود ہے۔ اس نسخے کا سودا کے مستند ترین کلیات میں شمار ہوتا ہے۔“

کاظم علی خاں صاحب نے لکھا ہے کہ یہ بتانا تقریباً ناممکن ہے کہ سودا لکھنؤ کے کس محلے میں رہتے تھے۔ لیکن آصف الدولہ کے زمانے کے ایک قدیم محلے جنگلی گنج میں ایک ایسی مسجد ہے جو کسی زمانے میں مرزا سودا کی مسجد کے نام سے موسوم تھی۔ مگر ۱۳۶۹ھ (۱۹۴۸-۱۹۴۹ء تک) میں اس مسجد کو شہید کر کے دوبارہ تعمیر کیا گیا اور اب یہ مسجد رحمانی کے نام سے مشہور ہے۔

کاظم علی خاں صاحب نے سید آغا مہدی لکھنوی کی ”تاریخ لکھنؤ“ (کراچی، ۱۹۷۶ء ص ۲۷۵-۲۷۶) کا یہ اقتباس نقل کیا ہے۔

”مولانا آغا مہدی نے مسجد مرزا سودا کے ذکر میں یہ بھی بتایا ہے کہ صحن مسجد میں داہنے ہاتھ کی طرف بہت پرانی عمارت کے آثار ہیں جو ممکن ہے کہ سودا کے رہنے کا مکان ہو۔“ مولانا آغا مہدی کا بیان ہے کہ

”مسجد میں کتابوں کی الماری پر ایک بورڈ لگا ہوا تھا جس پر یہ عبارت درج تھی:

باب المسجد رحمانی و مدرسہ رحمانیہ ۱۳۶۹ھ

سابق مسجد مرزا سودا

امین آباد

جنگلی گنج

کاظم صاحب کا یہ بیان درست معلوم ہوتا ہے کہ مرزا سودا کی مسجد میں گنبد اور مینار نہ ہونے کی وجہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مسجد اپنی نوعیت کے اعتبار سے مسجد خانہ رہی ہوگی اور سودا کا مکان اس مسجد سے متصل ہوگا۔

وفات

مصطفیٰ کے ایک شاگرد میر بہادر علی دہلوی نے اپنی ایک تصنیف ”قصر اللطائف“ میں لکھا ہے کہ ”چوں کہ ان دنوں (آصف الدولہ کا) مزاج عہد صاحب زادگی سے ہزل کی طرف بہت راغب تھا اور کوئی بھی کلمہ خواہ ان کا ہو یا کسی دوسرے کا انھیں بہت خوش کرتا تھا اور وہ (بات کہنے والے کو) بے انتہا انعام و اکرام سے نوازتے تھے۔ ان حالات کے پیش نظر مرزا رفیع سودا نے نواب کے مسند نشین ہونے پر یہ مادہ تاریخ کہا (..... نواب) (نواب سے پہلے ایک فحش لفظ ہے لیکن اس سے مسند نشینی کی تاریخ نہیں نکلتی) وہ جو شل مشہور ہے کہ سلاطین و امرا کبھی سلام کرنے سے غصہ ہو جاتے ہیں اور کبھی دشمنی کرنے پر بھی خلعت سے نوازتے ہیں نواب مدوح اس تاریخ کو سن کر برہم ہو گئے اور سودا کی بے عزتی کا حکم دیا۔ چنانچہ مشہور ہے کہ سودا اسی شرم و غیرت کی وجہ سے چند روز ہی میں جہان فانی سے سدھار گئے اور چوں کہ زیادہ آم کھانا ان کی موت کا بہانہ بن گیا تھا۔ اس لیے ایک شخص نے ہندی میں تاریخ وفات کہی۔

انبہ کھاتے کھاتے سودا کی جان نکلی

ایک عزیز نے اسی مضمون کو فارسی میں کہا ہے۔

آہ سودا انبہ خورد و مرد^۱

مولف نے نواب کی برہمی کا جو ذکر کیا ہے۔ وہ واقعہ خلاف قیاس ہے کیوں کہ نواب ۱۱۸۸ھ میں مسند نشین ہوئے تھے اور سودا کا انتقال ۱۱۹۵ھ میں ہوا۔ سات سال کو چند روز نہیں کہا جاسکتا۔ دوسرے سودا کلیات میں بہت سے قصیدے آصف الدولہ کی مدح

۱۔ میر بہادر علی دہلوی کی یہ پوری عبارت ثار احمد فاروقی کے ایک مقالے ”میر بہادر علی دہلوی“ نقوش، اکتوبر ۱۹۵۸ء ص ۲۳۳ سے لی گئی ہے۔

میں ہیں اور اس بات کا ثبوت ہیں کہ نواب کی مسند نشینی کے بعد بھی سودا کے نواب سے تعلقات بحال رہے۔ البتہ مولف نے جو تاریخ وفات پیش کی ہے۔ وہ درست معلوم ہوتی ہے۔ کیوں کہ اس تاریخ سے ۱۱۹۵ھ لکھا ہے اور یہی سال وفات ہے۔ اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ سودا آم کھانے سے مرے۔

شاہ کمال الدین کمال نے سودا کی وفات کے واقعہ کو دوسرے انداز میں پیش کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔ ”میر چھو“ نامی ایک شخص تھے۔ مہوا ان کی چوتھی اسی مخرگی کی وجہ سے آصف الدولہ کی سرکار میں ممتاز تھے۔ ایک دن نواب نے مرزا رفیع سودا سے فرمائش کی کہ ایک غزل بر زمین مہوا کہیں۔ سودا گھر آئے اور غزل مہوا کو اس طور سے کہا کہ مہوا کی جگہ لفظ ”دوہی“ بھی چسپاں ہوتا تھا۔ وہ غزل نواب کو بھجوا دی۔ اس کے بعد سودا کی کمر میں درد شروع ہوا۔ قصہ کوتاہ دو تین گھڑی میں اسی درد میں انتقال فرما گئے۔

پچھی نرائن شفیق نے سودا کی وفات پر جو قطعہ تاریخ کہا تھا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۱۹۵ھ کو سودا کا انتقال ہوا۔ شفیق نے قطعہ کہا:

لکھنؤ بیچ میرزاے رفیع چوتھی رجب کی جان میں گزرے
جب کہ..... گیا ہوئی تاریخ ہائے سودا جہان میں گزرے

۱۔ غالباً یہ وہی مرزا چچ ہیں جو نواب آصف الدولہ کے ماموں زاد بھائی اور نواب سالار جنگ کے لڑکے تھے غم انہی نے ان کا ذکر کیا ہے۔ تاریخ اودھ، ۳، ص ۱۲۲۔
۲۔ اس غزل کا مطلع ہے:

جگ میں تخم شراب ہے وہی ہرزہ کوئی کا باب ہے وہی
یہ غزلیات سودا میں بھی موجود ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ کلیات میں یہ شعر زادہ ہے:
بہونے کوئی جو اس کو گیتوں میں ان کی خاطر کباب ہے وہی
کمال نے مقطع اس طرح نقل کیا ہے۔
میر چھو جو گالی دیں سودا پاس اپنے جواب ہے مہوا

کلیات میں مہوا کی جگہ ”دوہی“ ہے۔

۳۔ مجمع الاسحاب، ورق ۳۶۵ ب۔ ۳۶۶ الف۔

۴۔ سودا ص ۶۶

لیکن شاہ محمد حمزہ لکھتے ہیں کہ سودا کا انتقال ماہ جمادی الثانی ۱۱۹۵ھ میں ہوا۔^۱ یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ ان دونوں میں سے کس کی بتائی ہوئی تاریخ وفات ٹھیک ہے۔^۲ جتلا لکھتے ہیں کہ حالت نزاع میں سودا کی زبان سے یہ مطلع نکلا

آج سودا جہاں سے اٹھتا ہے

شور و غل ہر مکاں سے اٹھتا ہے

حسین قلی خاں عاشقی^۳ اور علی لطف^۴ نے لکھا ہے کہ سودا کو امام باڑہ امام باقر میں مدفون کیا گیا۔ علی لطف لکھتے ہیں کہ سودا کے لوح خزار پر فخر الدین ماہر کا یہ قطعہ تاریخ کندہ ہے:

خلد کو جب حضرت سودا گئے

فکر میں تاریخ کے ماہر ہوا

بولے منصف دور کر پائے عناد

شاعران ہند کا سرور گیا

۱۱۹۵ھ

مصطفیٰ لکھتے ہیں کہ محرم کے مہینے میں ایک بزرگ کی ایما پر مجھے سودا کے مزار کی زیارت کا اتفاق ہوا۔ لوح قبر پر میر فخر الدین ماہر کا قطعہ تاریخ دیکھا۔ چوں کہ اس تاریخ کا

^۱ فص الکلمات (قلمی)، ورق ۴۱۷ ب

^۲ حصن البین میں سن وفات ۱۱۹۶ھ دیا گیا ہے (بحوالہ دستور النفاحت ص ۱۶) لیکن یہ درست نہیں۔ صاحب تذکرہ خوش معرکہ زیبا نے لکھا ہے کہ مرزا رفیع کو قلعہ سودا ایک فقیر نے دیا تھا۔ اور یہ دعا دی تھی کہ تیری عمر قلعہ کے ہم عدد ہوگی۔ سودا سے اکہتر سال برآمد ہوتے ہیں۔ جب کہ ہمارے حساب سے سودا نے تقریباً ستر سال کی عمر میں وفات پائی۔

^۳ غلام محی الدین جتلا، طبقات سخن (انگریز قلم)

^۴ نثر عشق (قلمی) راجپور، ص ۲۶۶

^۵ گلشن ہند، ص ۱۰۴

تقیہ تاریخ گوئی کے قانون کے خلاف تھا، اس لیے اسی روز تاجپد فیض ربانی سے مولف کے خاتمہ خیال سحرکار سے بے کم و کاست ایک قطعہ تاریخ ٹپک پڑا۔

مرزا رفیع آنکھ ز اشعار ہندیش
ہر گوشہ بود در ہمہ ہندوستان غلو
ناگہ چو در نوشت بساط حیات را
گردید مدفنش ز قضا خاک لکھنؤ
تاریخ راجستش بدر آورد مصحفی
سودا کہا و آہ سخن دلفریب اول

۱۱۹۵ھ

سودا کے شاگرد قیام الدین قائم نے ان اشعار میں تاریخ وفات کہی:

آہ! مرزا رفیع دنیا سے
جا کے جنت میں جب مقیم ہوا
دردِ فرقت سے اوس کے مثلِ قلم
اہلِ معنی کا دل دو نیم ہوا
سالِ تاریخ کی تھی مجھ کو تلاش
کیوں کہ بس حادثہ عظیم ہوا
اس میں چرخِ خرد نے از سرِ یاس
یہ کہا ”اب سخن یتیم ہوا“

۱۱۹۵ھ

عاشقی نے اس شعر کے دونوں مصرعوں سے سالِ وفات نکالا۔

پرس از من کہ اردو حال چوشت
نہ سودا ماند نہ لطفِ سخن سودا

شیخ امام بخش ناسخ لکھنوی نے تاریخ وفات کہی۔

کفتم سالِ وفاتِ ناسخ

شاعر ہندوستان داویلا

۱۱۹۵ھ

عبدالمغفور ناسخ نے گنج تواریخ میں سودا کی تاریخ وفات اس شعر سے نکالی ہے۔

پے ترحیل سودا بے تردد

گو ناسخ سودا جوہر فضل

۱۱۹۵ھ

ایک طویل عرصے تک سودا کا حراز میں اس طرح دہا رہا کہ اوپر کی سطح پر قبر کا نشان بھی باقی نہیں تھا۔ ۱۱ فروری ۱۸۶۹ء کو جب اسی جگہ کی گھائی کی گئی تو ایک قبر کا تعویذ برآمد ہوا، جس پر سب مرمر کی لوح لکھ گئی۔ اس لوح پر یہ عبارت کندہ تھی:

۱۔ نضر عشق (قلمی)، رام پور، ۱۲۶

۲۔ مہدی علی خاں، تاریخ لطیف (قلمی) رام پور۔ بقول ناصر لکھنوی شیخ ناسخ مغفور نے اس کی یہ تاریخ کہی۔

مضمون تازہ جستن شعر لطیف گفتن باخویش مدد الہا مرزا رفیع السودا
تاریخ رطلت او کفتم بہ تربت او امروز فرد الہا مرزا رفیع السودا

۱۱۹۵ھ

تذکرہ خوش معرکہ زیبا (قلمی) لکھنؤ

۳۔ مولوی عبدالمغفور ناسخ، گنج تواریخ لکھنؤ، ۱۸۷۵ء، ص ۲۵۔

تاریخ انتقال

سرور شاعران ہند

میرزا محمد رفیع المتخلص بہ سودا

مصرعہ تاریخ: سودا کجاو آں سخن دلفریب او (مصحفی)

۱۱۹۵ھ

اس امام باڑے کی تفصیل بیان کرتے ہوئے کاظم علی خاں نے یہ بتایا ہے کہ آغا باقر کا یہ امام باڑہ نواب شجاع الدولہ کے عہد میں تعمیر ہوا تھا۔ اس عزا خانے میں بہت سی مشہور شخصیتیں مدفون ہوئی تھیں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد برطانوی حکومت نے لکھنؤ کی بہت سی عمارتوں کے ساتھ اس امام باڑے کی عمارت کو بھی گرا دیا، جس کی وجہ سے یہاں کی قبریں لمبے میں دب گئیں۔ بعد میں جب امام باڑہ سرکاری قبضے سے واپس ملا تو کسی وجہ سے چار دیواری کے باہر ترکاری منڈی میں شامل ہو گیا۔ ۱۱ فروری ۱۹۶۹ء کو جب وہاں کی زمین کھودی گئی تو سودا کی قبر باہر نکلی۔ برسوں کی مقدسے بازی کے بعد سودا کی قبر امام باڑے کی حدود میں شامل کی گئی۔ سودا کی قبر پر سینٹ کا نیا فرش بنایا گیا اور پرانی قبر پر سنگ مرمر کی جولوج لگی ہوئی تھی، وہ اس نئے فرش میں لگادی گئی۔^۱

مولانا محمد حسین آزاد نے لکھا ہے کہ ”جب شاہ حاتم نے سودا کے انتقال کی خبر سنی تو بے اختیار ہو کر کہا:

”ہائے ہمارا پہلوانِ سخن مر گیا“

تنقید

اپنے منہ کے نہ کہا کن نے سخن کو گوہر
لعل سودا ہی کو پر ہم نے اُگلے دیکھا

ادبی پس منظر

سودا میدانِ ادب میں اُس وقت آئے ہیں جب شمالی ہند میں اردو شاعری کے باقاعدہ آغاز کو لگ بھگ نصف صدی گزر چکی تھی۔ شاعروں کی پوری ایک نسل یعنی خان آرزو اور اُن کے تلامذہ کا عہد تقریباً ختم ہو چکا تھا اور دوسری نسل کے شاعروں میں مرزا مظہر کے شاگرد آسمانِ ادب پر چھائے ہوئے تھے۔ سودا کی زندگی کا اچھا خاصہ حصہ پہلی نسل کے اساتذہ سخن کی صحبت میں گزرا۔ جہاں اُن کی ذہنی ساخت و پرداخت ہوئی۔ دورہ ایہام گویان (خان آرزو اور ان کے تلامذہ) ختم ہو گیا اور بساطِ ادب پر نئے مہرے آئے۔ یہ نووارد ایہام گوئی کے خلاف تھے۔ فطری طور پر سودا نہ صرف اس نئی تحریک سے متاثر ہوئے بلکہ انھوں نے ”سادہ گوئی“ کو رواج اور فروغ دینے میں کسی سے کم حصہ نہیں لیا۔ اس باب میں اُن ادبی عناصر اور تحریکوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ جنھوں نے سودا کے ذہن و شخصیت اور شاعرانہ صلاحیتوں کو متاثر کیا تھا۔

فارسی کا عہدِ زوال اور اردو شاعری

ہندوستان میں فارسی شاعری کا زوال اور نگِ زیب کے عہد میں شروع ہوا۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ طویل عرصے تک دکن میں قیام اور مرہٹوں سے اورنگِ زیب کی آویزش نے فنونِ لطیفہ کو درباری سرپرستی سے محروم رکھا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اورنگِ زیب کے عقائد نے بھی اسے فنونِ لطیفہ کی پرورش سے باز رکھا۔ لیکن فی الواقع یہ

۱۔ خانی خان نے منتخب المہاب میں لکھا ہے کہ اورنگِ زیب نے اپنے جلوس کے گیارہویں سال میں دوبار میں موسیقی بالکل بند کر دی اور صرف ”نوبت“ باقی رہ گئی۔ تمام موسیقار جن کو دربار میں بڑی عزت اور احترام سے دیکھا جاتا تھا بے روزگار ہو گئے۔ چنانچہ ایک جمعہ کو تقریباً بہت سے موسیقار روتے پٹتے ایک جنازہ لیے جا رہے تھے۔ اورنگِ زیب نے اس ماتم اور گریہ و زاری کی وجہ معلوم کرائی۔ انھوں نے جواب دیا۔ اورنگِ زیب کے احکامات کی وجہ سے موسیقی کا انتقال ہو گیا ہے اور اسے قبر میں دفن کرنے جا رہے ہیں۔ اورنگِ زیب نے جواب دیا۔ ان سے کہو کہ ”چنانچہ خاکِ ہسارِ نکہ باز صد اعدا از دہر نپاید“۔ (منتخب المہاب، ص ۲۱۲-۲۱۳)۔

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ عالم گیر نامہ۔ ص ۳۵۴-۳۹۱۔ محمد ساقی مستعد خاں، آثارِ عالم گیری، مرتبہ آغا احمد علی، کلکتہ، ۱۸۷۱ء، ص ۸۱-۸۵

دونوں ہی اسباب تھے جنہوں نے اورنگ زیب کے دور حکومت میں شعر و شاعری، موسیقی، مقوری اور دوسرے فنون لطیفہ کو افسردہ رکھا۔ وہ شاعری میں بھی صرف ایسے اشعار کو پسند کرتا تھا جن میں معارف و حکم کے مضامین باندھے گئے ہوں یا جن میں کوئی اچھا اخلاقی نکتہ ہو۔ اس پر اس کے رقعات گواہ ہیں جن میں اس نے اپنے ہی اشعار لکھے ہیں۔ مغل بادشاہوں کی فارسی نوازی نے ہندوستان میں کئی عظیم شاعر، ادیب اور انشا پرداز پیدا کیے تھے بلکہ فنون لطیفہ کی سرپرستی اور ادب نوازی میں مغل دربار کا یہ حال تھا کہ ولایت زادے ہزاروں میل کا سفر طے کر کے اور صفوی دربار چھوڑ کر ہندوستان آتے تھے۔

جاگیرداری دور میں سماجی عزت حاصل کرنے کا بڑا ذریعہ دربار میں رسائی تھا۔ ہر دور کے کچھ مروج علوم ہوتے ہیں جنہیں علوم حاضرہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مغل دربار کی شان و شوکت کا جب شباب تھا تو علوم معقول و منقول کی تکمیل کرنا ہی علم و فضل کا آخری درجہ سمجھا جاتا تھا اور اس کے ساتھ جہان منطق، فلسفہ، ہیئت، اقلیدس اور طب وغیرہ کی دید و دانش ضروری تھی وہیں سخن نہیں اور سخن سنجی بھی شرفاء کے محبوب مشاغل تھے۔

چوں کہ دہلی کی مقامی زبان میں اتنی صلاحیت نہیں تھی کہ دربار کے تکلفات و آداب گفتگو کے بوجھ کی تحمل ہو سکتی اس لیے اہل قلم جو عام طور پر دربار میں رسائی چاہتے تھے فارسی کا سہارا لیتے اور شاید یہی ہندوستان میں فارسی کی مقبولیت کا سبب ہے۔ اس طرح فارسی اردو کے راستے میں ایک بہت بڑا پتھر بن گئی۔ اس کی مقبولیت اردو کو ادبی حیثیت حاصل کرنے نہیں دیتی تھی۔

اورنگ زیب کی وفات کے بعد مغل حکومت کی شکست و ریخت شروع ہو گئی۔ مغل بادشاہ زوال کے طوفان میں گھر گئے۔ انھیں مصائب و آلام سے نظریں چرانے کے واسطے نظیری اور عربی کی نہیں، گویوں اور رقاصوں کی ضرورت تھی۔ حزیں جیسا عظیم المرتبت شاعر ہندوستان آیا اور مغل دربار اس کی قدر و منزلت سے قاصر رہا۔ خان آرزو جیسا شاعر اور عالم جسے امام المتاخرین کہا جاتا ہے مغل دربار سے کوئی فیض نہ حاصل کر سکا۔ مغل دربار کے اس رویے سے فارسی کا زوال شروع ہوا۔ لیکن اس زوال نے اردو کے لیے فضا کو

سازگار بنادیا، انسان میں فطری خواہش ہوتی ہے کہ وہ مادری زبان میں اپنے جذبات کا اظہار اور احساسات کی ترجمانی کرے۔ اقتصادی ضرورتیں اور تمنائے جاہ و منصب اس فطری خواہش کو دبائے ہوئے تھیں لیکن اب اہل علم و ادب سے بے نیاز ہو چکے تھے۔ انھیں دربار سے ”سٹاکس کی تمنا تھی اور نہ ”صلے کی پروا“ اس لیے یہ حضرات اردو کی طرف متوجہ ہوئے۔

ایک اہم بات یہ تھی کہ عوام فارسی سے نا آشنا تھے۔ انھیں شعر و شاعری سے محروم رہنا پڑتا تھا۔ شاعر اپنی قوم، وطن، مذہب اور فرقے کے جذبات کی ترجمانی کرتا ہے۔ دربار نے ان کے جذبات کے ترجمان چھین رکھے تھے۔ اب شاعر اپنے حقیقی سامعین یعنی عوام کی طرف متوجہ ہوئے اور اب انھیں پسند کرنے اور داد دینے والا ایک محدود طبقہ نہیں بلکہ پورا شہر اور پھر شمالی ہند سے جنوبی ہند تک ہندوستان کا ایک بہت بڑا حصہ تھا۔

بعض محققین کا خیال ہے کہ فارسی زبان کے سلسلے میں ہند ایرانی نزاع اردو شاعری کی مقبولیت کا سبب بنا۔ ان کا خیال ہے کہ ہندوستانی شعرا فارسی میں اپنی پوری زندگی صرف کر دیتے تھے لیکن ایرانیوں کے معیار تک نہیں پہنچ پاتے تھے۔ ”استعمال ہند“ پر ہمیشہ اہل ایران کو اعتراض رہا۔ آج بھی ہندوستانی شعرا کی فارسی شاعری اہل ایران کی نظر میں سبک ہندی کے کہلائی ہے۔ حالاں کہ یہ بات کتنی عجیب معلوم ہوتی ہے کہ انیسویں صدی کے آغاز تک کسی ایرانی نے فارسی میں تحقیق کی کوشش نہیں کی، نہ کوئی مستند لغت تیار کی۔ اس کی بہ نسبت فارسی کی بہترین لغات اور قواعد سے متعلق کتابیں ہندوستان میں مدون ہوئیں جن میں ”مصطلحات“، ”غیات اللغات“ اور ”بہارِ غم“ تک کتنے نام آجاتے ہیں۔ اس پر بھی مستزاد یہ ہے کہ ہندوستان میں فارسی کی بہترین لغات اور

۱۔ اس سبک ہندی کی خصوصیات یہ ہیں:

”دقیق مضامین۔ دقیق معانی۔ پیچیدگی خیال۔ باریک اندیشی۔ نازک کاری مشکل پسندی۔ نکتہ آفرینی۔ دور دراز تشبیہات و استعارات کا کثرت سے استعمال۔ صحت و زبان کو قربان کر کے نئے مضامین و جدید مطالب کی بندش۔ قصص اور تکلف میں افراط استحکام زبان و افکار کی طرف سے بے پروائی۔“

سید حسن، ایرانِ امروز میں غالب شاعری، اردو سے معنی، غالب نمبر، دہلی، ۱۹۶۰ء، ص ۶۹۔

عروض و معانی کی کتابیں بیشتر اس زمانے میں لکھی گئیں۔ جسے ہم فارسی کے زوال کا زمانہ کہہ کر تعبیر کرتے ہیں۔

مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ایرانیوں میں ہمیشہ لسانی تعصب رہا ہے۔ انھوں نے کبھی ہندوستانیوں کی فارسی شاعری کو نہیں سراہا۔ نہ کبھی زبان و قواعد کی تحقیق کے سلسلے میں ان کی خدمات کا اعتراف کیا۔

ممکن ہے ایران کا ذی علم طبقہ ہندوستانیوں کی ان خدمات کو جو انھوں نے فارسی زبان و ادب کے لیے انجام دیں، نظر تحسین سے نہ دیکھتا ہو لیکن ہندوستان میں کبھی ایسا تھا اور نہ ہے۔ بقول ڈاکٹر منوہر سہائے انور:

”یہ درست ہے کہ ہندوستانی سخن طراز درو بست الفاظ، اسلوب بیان اور پرواز خیال میں ایرانی شعرا کی تقلید کو سرمایہ افتخار سمجھتے تھے مگر اس میں بھی کلام نہیں کہ ایرانیوں سے غلطی سرزد نہ ہوتا ان کا جزو ایمان تھا۔ عہد عالم گیری تک جو اعتراضات ہوئے وہ ایرانی شعرا کے جتنے جتنے اشعار کی حدود سے آگے نہیں بڑھے یعنی یہ کبھی نہیں دیکھا گیا کہ کسی ہندوستانی صاحب قلم نے کسی جلیل القدر ایرانی شاعر کے کل کلام کو مورد اعتراض بنانا چاہا ہو“۔^۱

عہد محمد شاہی میں جب خان آرزو نے حزیں کے دیوان چہارم کے چار سو اشعار کو غلط ٹھہرایا تو خان آرزو کا ساتھ دینے والے اہل قلم کی ایک محدود تعداد تھی بلکہ بعض ہندوستانیوں نے تو خان آرزو پر تنقید کی بوجھار کر دی۔ مطلع السعدین میں وارستہ مل نے حزیں کی موافقت میں آرزو پر اعتراضات کیے ہیں۔^۲ ۱۲۶۷ھ میں امام بخش صہبائی

۱۔ معارضہ حزیں و آرزو۔ منوہر سہائے انور۔ معاصر، حصہ اول، ص ۳۰۔

۲۔ غالب ایک خط میں لکھتے ہیں:

”وارستہ مل یا لکھنوی نے خان آرزو کی تحقیق پر سو جگہ اعتراض کیا ہے اور ہر اعتراض

بجا ہے۔ یائیں ہم وہ جہاں اپنے قیاس پر جاتا ہے، منہ کی کھاتا ہے۔“

خط بنام سردار، خطوط غالب مرتبہ غلام رسول مہر، ۲، ص ۲۳۹۔

جب ”قول فیصل“ پر تبصرہ کرتے ہیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ حزیں کی ایرانیّت سے مرعوب ہیں۔ حاکم نے آرزو کے بیشتر اعتراضات کو غلط ثابت کیا ہے۔ علی لطف بھی حزیں کا ساتھ دیتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ ۱۹۰۹ء میں خان بہادر رضا علی وحشت کلکوی نے (مخزن میں) حزیں پر مضمون لکھا تو آرزو کے بہت سے اعتراضات رد کیے۔^۱

ان لوگوں کی تعداد بہت کم ہے جو آرزو کے ہم نوا رہے ہیں۔ گویا ہندوستان کے فارسی شعرا اہل علم ایرانیوں سے ہمیشہ مرعوب رہے اور ان کو صاحب زبان تسلیم کر کے بطور سند پیش کرتے رہے۔ غالب کو قتل پر یہ اعتراض تھا کہ وہ ہندی نژاد اہل زبان نہیں تھا۔ غالب اپنے ایک اور ترک نسل سے ہونے کے ناطے اور اپنے استاد عبدالصمد کے ذریعے اپنا شمار اہل زبان میں کرتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ غالب کے اجداد کو سرزمین ہندوستان میں آباد ہوئے ایک صدی گزر چکی تھی اور ملا عبدالصمد کا دنیا میں جسمانی وجود ہونا آج تک ایک دل چسپ بحث بنا ہوا ہے۔^۲

غالب ہندوستانی شعرا میں خسرو کے علاوہ کسی کو مستند شاعر نہیں مانتے۔ چودھری عبدالغفور سرور کے نام ایک خط میں صاحب عالم کو لکھتے ہیں:

”میں اہل زبان کا پیرو اور ہندیوں میں سوائے امیر خسرو دہلوی کے سب کا منکر ہوں۔“^۳

ایک اور مشکل یہ ہے کہ اگر فارسی دشمنی کو اردو کی مقبولیت کا سبب تسلیم کر لیا جائے تو دکن میں اردو کی مقبولیت کا کیا جواز پیش کیا جائے گا۔ دکن میں شمالی ہند سے بہت پہلے دکنی

۱۔ حزیں اور آرزو کے اس معارضہ کے متعلق تمام معلومات معرکہ قتل و غالب۔ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی سے لی گئیں (احوال غالب۔ ص ۱۹۸-۱۹۹)

۲۔ قاضی عبدالودود کا خیال ہے کہ عبدالصمد کا خارجی وجود ثابت نہیں۔ یہ غالب کے ذہن کی اختراع تھی۔ ملاحظہ ہو۔ ہر مزدّم عبدالصمد۔ احوال غالب ص ۲۳۳-۲۶۵۔ اس مقالے کا جواب مالک رام نے نوائے ادب (جنوری ۵۲ء) میں دیا ہے۔ جس میں عبدالصمد کا خارجی وجود ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

۳۔ خطوط غالب، مرتبہ غلام رسول مہر، لاہور، بار دوم، ص ۴۰۰۔

شاعری کا عام رواج ہو گیا تھا اور ہند اور ایرانی نزاع پہلی بار کھل کر خان آرزو اور حزیں کے ہاتھوں سامنے آئی۔

ہمارے خیال سے دکن میں اس کی وجہ ہند ایرانی نزاع کے بجائے بادشاہوں اور صوفیاء کی سرپرستی ہے۔ قطب شاہی اور عادل شاہی بادشاہوں میں اکثر نے خود بھی مقامی زبان میں شاعری کی اور ایسے دوسرے شعرا کی بھی سرپرستی کی جو مقامی زبان میں اظہار خیال کرتے رہے۔

کلیات سودا میں ایک قطعہ ہے جس میں سودا نے ایک فارسی داں کا قول نقل کیا ہے۔ کسی فارسی داں نے اور ہمارے خیال سے خان آرزو نے سودا کو یہ مشورہ دیا تھا کہ فارسی میں شعر کہنا آسان کام نہیں ہے۔ یہ اہل ہند کی زبان نہیں ہے۔ اس لیے ہندو زاد اپنی پوری کوششوں کے باوجود سعدی اور حزیں نہیں ہو سکتا۔ ہندوستان میں صرف خسرو، فیضی، آرزو اور فقیر جیسے چند فارسی گو شاعر گزرے ہیں۔ جنہوں نے خود کو مضحکہ سے باز رکھا ہے۔ اس سے بہتر ہے کہ انسان اپنی مادری زبان میں طبع آزمائی کرے۔ اصل چیز فارسی یا اردو زبان نہیں بلکہ ”خوبی مضامین“ ہے۔ جن کا بیان کرنا اہل ہند کے لیے اردو میں آسان ہے۔ یہ پورا قطعہ ”مرزا کی ریختہ گوئی کی ابتدا“ کے تحت نقل کیا جا چکا ہے۔ یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ فارسی داں کے بیان سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ فارسی دشمنی کی ترغیب دے رہا ہے۔ اسے فارسی سے محبت ہے۔ ایرانی شاعروں میں وہ سعدی اور حزیں کا احترام کرتا ہے۔ ہندو زاد فارسی شاعروں میں بھی کچھ کی عظمت کا قائل ہے اور وہ صرف یہ کہنا چاہتا ہے کہ غیر ملکی زبان سے بہتر مادری زبان ہے اور خواہ مخواہ اپنا مذاق اڑوانا اچھا نہیں۔

اس لیے آخر میں کہنا پڑے گا کہ اردو کی مقبولیت میں فارسی دشمنی کو دخل نہیں تھا۔ یہ وقت کی آواز اور تاریخی ضرورت تھی۔

شمالی ہند میں اردو شاعری کا آغاز

سودا کی ریختہ گوئی یا فن ریختہ کی تربیت و تکمیل اور تعمیر و ترویج میں ان کے حصے کا منصفانہ جائزہ لینے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اردو شاعری کے تاریخی ارتقا کو اور اس عہد کے لسانی پس منظر کو سامنے رکھیں۔ اس سلسلے میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اگرچہ شمالی ہندوستان میں ریختہ کا باقاعدہ آغاز دیوان ولی کے دہلی آنے پر ہوا۔ لیکن ایسا نہیں تھا کہ اس سے پہلے یہاں ریختہ گوئی غیر معروف اور اجنبی رہی ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ عہد محمد شاہی تک فارسی ہی شرفا کی زبان تھی اور اس میں تمام علوم و معارف کے سنجینے پوشیدہ تھے اور فارسی کے بُرے یا بھلے جیسے شاعر تھے ان کا مرکز شمالی ہند ہی بنا ہوا تھا اور اس دورِ زوال میں بھی وہ اپنی فارسی شاعری کی آبرو بنائے اور اس کی بات رکھنے پر نکلے ہوئے تھے۔ لیکن اس متاعِ ہنر کی قیمت دینے والا کوئی نہیں تھا۔ ادبی حیثیت سے اہل ایران کے آگے ان کی کوئی قدر و منزلت نہیں تھی۔ مالی حیثیت سے وہ زبوں و خوار تھے کیوں کہ دربار نے ان کی سرپرستی کرنی چھوڑ دی تھی۔ عہدِ عالمگیری میں ولی دہلی آئے اور ان کی وفات (۱۱۱۹ھ) کے بعد ان کا دیوان دہلی پہنچا تو اس نے گویا ایک تاریخی ضرورت کی تکمیل کردی اور وہ تکلف دور ہو گیا جواب تک اردو شاعری کے امکانات سے برتا جا رہا تھا۔ اب ریختہ گوئی کا فن بے اعتبار نہیں رہا اور پچاس برس کے اندر ایک ایسا ذہنی ماحول پیدا ہو گیا کہ ریختہ میں شاعری کرنے والے احساسِ کمتری میں مبتلا نہیں رہے۔ محقق نے عقدِ ثریا کے دیباچے میں لکھا ہے:

”ہمیں شعرِ ریختہ کہ در زمانہ ما بہ سبب فصاحت و بلاغت ایشان

۱۔ میر نے نکات اشعار میں ولی کے بارے میں لکھا ہے:

”میں نے یہ کہ در شاہجہاں آباد دہلی نیز آمدہ بود بخدمت میاں گلشن صاحب رفت۔

وا از اشعار خود پارہ خواند۔ میاں صاحب فرمود۔ ایں ہمہ مضامین فارسی کہ بیکار

افادہ اند، در محض خود بیکار ہر۔ از تو کہ محاسبہ خواہ گرفت۔“

(نکات اشعار، ص ۸۹-۹۰)

زبان از قاری در پلہ کم ہم نیست“۔^۱

اور اپنے اشعار میں بھی جابجا اس کا اظہار و اعتراف کیا ہے:

کیا ریختہ کم ہے مصحفی کا
بو آتی ہے اس میں قاری کی

~~~~~

مصحفی قاری کو طاق پہ رکھ

اب ہے اشعار ہندوی کا رواج

اور اس میں شک نہیں کہ شعرا میں ذہنی تبدیلی اگر کچھ لوگوں کی انفرادی کوششوں کا نتیجہ سمجھی جائے تو سودا بھی ان لوگوں میں تھے، جنہوں نے ریختہ کو مقبول بنانے میں اور ریختہ گوئی کی طرف سے احساس کمتری دور کرنے میں نمایاں حصہ لیا۔

اس باب میں ہم نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ شمالی ہندوستان میں ریختہ کے نمونے تیرھویں صدی عیسوی سے ملتے ہیں۔ لیکن باقاعدہ ریختہ گوئی کا زمانہ آغاز اور اس کا ایک ادبی و شعری تحریک کی شکل میں اٹھان دلی کے دیوان ریختہ کے آنے پر ہوا۔ دلی ۱۱۱۲ھ میں دہلی آئے تھے۔ لیکن ہمیں تیرھویں صدی عیسوی سے مقامی زبان میں اشعار ملتے لگتے ہیں جن کی تخلیق صوفیائے کرام کی مرہون منت ہے۔ ان میں حضرت بابا فرید گنج شکر، حضرت گیسو دراز اور سعدی کا کوروی کے اکثر اشعار تذکروں میں نقل ہوئے ہیں۔ میر حسن نے عہد جہانگیر کے ایک شاعر خاکی کا ذکر کیا ہے۔<sup>۲</sup>

۱۔ مصحفی ان کی آمد کے بارے میں قاتم نے لکھا ہے۔

”دلی..... دس چل و چہار از جلوس عالم گیر بادشاہ ہمراہ ابو المعانی نام سید  
پرسے کہ دیش فریفتہ اویو بہ جہاں آباد آمد۔“

(نثر نکات، ص ۱۰)

ثریا ص ۲۔

۲۔ تذکرہ میر حسن، ص ۱۷۶۔

یقیناً اس زمانے میں اور لوگوں نے بھی اس زبان میں طبع آزمائی کی ہوگی مگر ان کا کلام دست برد زمانہ کی نذر ہو گیا۔ امیر خسرو کی چند غزلیں اور دوسری اصناف کے اشعار ملتے ہیں، جن میں فارسی اور اردو کی آمیزش ہے۔ لیکن ان میں بہت سے اشعار الحاقی ثابت ہوئے ہیں اور انھیں قدیم تر سند کے بغیر امیر خسرو کی تصنیف قبول نہیں کیا جاسکتا۔ غزل جس کا مطلع یہ ہے، چندر بھان برہمن کے نام سے منسوب ہے۔

”خدا نے کس شہر اندر بہمن کو لائے ڈالا ہے  
نہ دلبر ہے نہ ساقی ہے نہ شیشہ ہے نہ پیالا ہے“

اس غزل کی زبان سے شبہ ہوتا ہے کہ یہ عہد شاہ جہاں کے چندر بھانؔ برہمن کی نہیں ہو سکتی۔ اس کا مصنف کوئی بھی ہو۔ قوی امکان ہے کہ اس کی تصنیف دلی کی آمد سے قبل ہوئی ہوگی۔ چند ایسے شاعروں کے نام بھی مل جاتے ہیں جو صرف ہزلیات کے شاعر

۱۔ علامہ کیفی نے ”کیفیہ“ میں پوری غزل نقل کی ہے۔ باقی اشعار یہ ہیں:

پیلا کے ناؤں کی سرن کیا چاہوں کروں کیسے  
نہ صبح ہے نہ سرن ہے نہ کھنکھن ہے نہ مالا ہے  
پیلا کے ناؤں عاشق کوں قتل با عجب دیکھے ہوں؟  
نہ برہمی ہے نہ کرہمی ہے نہ خنجر ہے نہ بھالا ہے  
خوہاں کی بارغ میں رونق ہووے تو کس طرح یاراں  
نہ دونا ہے نہ مروا ہے نہ سوکن ہے نہ لالا ہے  
برہمن واسطے ایشان کے پھرتا ہے بکیا سمن  
نہ گنگا ہے نہ جمن ہے نہ ندی ہے نہ ٹالا ہے

برج موہن ودنا تریہ پتلی، کیفیہ، دہلی، ۱۹۴۲ء۔

۲۔ چندر بھان برہمن کے آباء واجداد کشمیر سے آگرہ آئے تھے۔ برہمن کے والد پنڈت دھرم داس مسکرت اور فارسی دونوں کے ماہر تھے۔ برہمن ۹۸۲ھ میں آگرے یا لاہور میں پیدا ہوئے۔ تعلیم سے فراغت پا کر شاہجہاں کے دفتر میں خاص قشی ہوئے اور پھر داراشکوہ نے اپنا میر قشی مقرر کر دیا۔ داراشکوہ کو ان سے بہت محبت تھی۔ اس کے قتل کے بعد برہمن تارک الدنیا ہو گئے اور بنارس چلے گئے۔ وہیں ۱۰۷۳ھ میں انتقال کیا۔ ایک دیوان فارسی اور فحشات برہمن ان سے یادگار ہیں۔ (پنڈت برج کشن کول بے خبر وغیرہ، بہار گلشن کشمیر، ۱۔ الہ آباد ۱۹۳۱ء، ص ۱۱۲-۱۳۰) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ چند بھان لاہوری۔ مرزا سلطان احمد، زمانہ

(کانپور) مئی و جون ۱۹۴۱ء

ہیں اور ریختہ محض تقنی طبع کے لیے کہتے تھے۔ جعفر زبلیؒ۔ میر عبد الجلیل اہلؒ اور محمد عطاء اللہ سکو غیرہ کا شمار ان شعرا میں ہوتا ہے۔  
میر نے ریختہ گوئی کی مختلف قسمیں بتائی ہیں۔

۱۔ اول آں کہ یک مصرعش فارسی و یک ہندی۔

۲۔ دوم آں کہ نصف مصرعش ہندی و نصف فارسی۔

۳۔ سوم آں کہ حرف و فعل پارسی بہ کاری برند۔

دلی کی آمد سے قبل کچھ کے علاوہ ہزال اور دوسرے شعرا ان اقسام میں شعر کہتے تھے لیکن

۱۔ ”میر جعفر..... جعفر تخلص لقب زبلی۔ ساکن شاہجاں آباد..... استعداد درست داشت دریں فن کامل وقت خود گردید۔ ہمہ نجیب و شریف از ملاحظہ میگردند خدمت می نمودند..... می گویند کہ روزے بعد انتقال ثواب ذوالفقار خاں بہادر ایں شعر فرمودہ۔“

سکہ زو بر گندم و موٹھ و مٹر بادشاہ ہے قلمہ کش فرخ میر  
ازیں خبر حراج بادشاہ بر ہم گشت۔ ایشان را بہ جنت فرستاد۔“

دو تذکرے (شورش) ص ۱۶۱-۱۶۳

۲۔ ”اہل تخلص میر عبد الجلیل مرحوم است۔ دے از سادات زید یہ باگرای الاصل از اولاد امجاد سید ابوالفرح واسطی بود۔ در شعر عربی و فارسی کہ بسبب رتبہ فضیلت بسیار باستانت مشکلی گفت و بیشتر قصائد دریں ہر دو لسان از ویادگار است۔ اسطی تخلص می کرد..... دو شعش با کھائے حضرت دلی.....“

(مجموعہ نفوس۔ جلد اول، ص ۴۲)

۳۔ ”خواجہ عطاء اللہ عطا تخلص۔ فتنے در عہد عالمگیر بود۔ ادب اش وضع موافق طور خود شعر بلندی گفت ہندی و فارسی ہر دو.....“

(تذکرہ میر حسن، ص ۱۰۶)

قاضی صاحب نے تذکرہ ہمیشہ بہار کے حوالے سے ان کا سن وفات ۱۱۳۵ھ لکھا ہے۔

(معاصر۔ حصہ ۱۵، ص ۲۳)

۴۔ نکات اشعار، ص ۱۷۹

دلی کے دہلی آنے کے بعد ایک مصرع تو کجا فارسی کے حرف و فعل بھی لانا معیوب سمجھا جانے لگا۔

آبرو لکھتے ہیں:

جو کہ لاوے ریختے میں فارسی کے فعل و حرف  
لغو ہیں افعال اس کے ریختے میں حرف ہے

شمالی ہند والوں کے ذہن میں یہ بات آہی نہیں سکتی تھی کہ اردو میں بھی سنجیدگی سے اظہار خیال کیا جاسکتا ہے۔ دلی کا جو کلام دہلی میں آیا تھا وہ پونے تین صدی کی دہنی کاوش کی خداد پر اتر ا ہوا تھا یعنی دکنی میں سنہ ۸۲۵ھ سے قبل شاعری کا آغاز ہو چکا تھا۔ خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ سے لے کر محمد قلی قطب شاہ، ملا وجہی، خواصی، ابن انشا اور پھر دلی تک دکنی شاعروں کو تقریباً پونے تین صدیاں گزر چکی تھیں۔ دکنی میں تصوف، مذہب، فلسفہ حیات و ممات، حسن و عشق، عام زندگی کے واقعات غرض ہر طرح کے مضامین کا ڈھیر لگ چکا تھا۔ دلی جس دکنی کو لے کر آئے تھے وہ دکنی عناصر زیادہ ہونے کے باوجود بھی منجھی ہوئی، صاف اور سادہ زبان تھی۔ اس میں دکنی محاورے اور الفاظ ضرور تھے۔ مگر وہ شمالی ہند والوں کی زبان سے زیادہ دور نہیں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ دلی کا کلام سننے ہی پہلی بار دہلی والوں کو یہ احساس ہوا کہ اردو شاعری کو بھی ادبی حیثیت دی جاسکتی ہے۔ ریختہ گوئی کا باقاعدہ آغاز کب ہوا۔ اس کے لیے کسی سن کا تعین نہیں کیا جاسکتا۔ مصحفی نے حاتم کے ترجمے میں لکھا ہے:

”روزے پیش فقیر نقل می کرد کہ در سن دوم فردوس آرام گاہ دیوان  
دلی در شاہ جہاں آباد آمدہ و اشعارش بر زبان خورد و بزرگ جاری  
گشتہ۔ بادوسہ کس کہ مراد از ناجی و مضمون و آبرو باشد۔ بنائے  
شعر ہندی را بہ ایہام گوئی نہادہ.....“ ۲

۱۔ تفسیر الدین ہاشمی نے حضرت گیسو دراز کو دکن کا پہلا دکنی شاعر تسلیم کیا ہے۔ دکن میں اردو، ص ۲۱۔  
۲۔ تذکرہ ہندی، ص ۸۰۔

مصطفیٰ کے بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ شمالی ہند میں اردو شاعری کا باقاعدہ آغاز فردوس آرام گاہ (۱۱۳۲-۱۱۳۳ھ) میں ہوا لیکن جیسا کہ ہم پہلے بحث کر آئے ہیں اردو شاعری کا آغاز اس زمانے سے بہت قبل ہو چکا تھا۔ بقول قاضی عبدالودود:

”تذکرہ ہندی کی عبارت سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہوگا کہ ریختہ گوئی کی ابتداء ۲۰ فردوس آرام گاہ ہجری میں ہوئی۔ مصطفیٰ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ حاتم کے قول کے مطابق دیوان دلی کے دہلی آنے کے بعد انھوں نے ناجی وغیرہ کے ساتھ اردو میں ایہام گوئی کی بنیاد رکھی..... میرا خیال ہے کہ حاتم نے مصطفیٰ سے جو کچھ کہا تھا اس سے یہ مقصود نہ تھا کہ کسی زمانے کا تعین کی جائے ان کی غرض اصلی یہ تھی کہ وہ آبرو وغیرہ کے ساتھ دہلی میں ریختہ گوئی کے بانیوں میں محسوب کیے جائیں“ ۱۔

مرزا مظہر کی ایک مشہور غزل ہے جس کا مطلع ہے:

ہمارے ساتھ سے یہ دل بھی بھاگا لیکے جاں اپنا

ہم اس کو جانتے تھے دوست اپنا مہرباں اپنا

حاتم نے بھی اس زمین میں غزل کہی ہے جو دیوان زادہ قلمی نسخہ رام پور میں موجود ہے۔ حاتم نے عنوان میں لکھا ہے کہ غزل مرزا مظہر کی زمین میں ۱۱۳۰ھ میں کہی گئی۔ گویا مرزا نے یہ غزل ۱۱۳۰ھ سے بھی پہلے کہی تھی اور ظاہر ہے کہ اس وقت تک دلی کا دیوان دہلی نہیں آیا تھا۔ حاتم نے مضمون کی زمین میں یہ غزل

ع۔ تاریک گھر ہمارا آکر کرے اجالا ۲

۱۔ عیارستان، قاضی عبدالودود، پٹنہ، ۱۹۵۷ء، ص ۱

میر نے بھی حاتم کے بارے میں طعنا لکھا ہے ”ی گوید سن بامیاں آبرو ہم طرح بودم“۔ (نکات اشعار، ص ۷۵) اگر یہ طعنہ ہوتا تو میر حاتم کا قول نقل کرنے کی بجائے خود ہی لکھتے کہ حاتم۔ آبرو کے ہم طرح رہے ہیں۔  
۲۔ سرگزشت حاتم، ص ۱۱۰۔



۱۱۳۱ھ میں کہی تھی۔ حاتم کی ایک اور غزل ہے:

ع۔ تاباں ہے اس نگہ سے مرے دل میں نور آج

یہ غزل بھی دلی کی زمین میں ۱۱۳۱ھ میں کہی گئی تھی۔ لے قاضی عبدالودود لکھتے ہیں:

”دیوان زادہ کے نسخہ لندن میں جس کی نقل حال میں ڈاکٹر شادانی نے مجھے دکھائی ہے۔ ۱۱۲۹ھ میں کہی ہوئی دو غزلیں ہیں جن میں سے ایک دلی اور دوسری مضمون کی زمین میں ہے۔“ لے

عبدالقادر بیدل کے بارے میں قیام الدین قاتم لکھتے ہیں:

”بالجملہ بمن تغول زبان ایشان سخن این بابا چنان حسن قبول یافت کہ ہر بیت دیوانش روشن تر از مطلع آفتاب گردیدہ۔ درینختہ راقمے بہ فصاحت و بلاغت می گفت کہ اکثر استادان آن وقت زراہ ہوش شعر رینختہ موزوں می نمودند۔ چنان چہ قدوة السالکین و زبدۃ الفاضلین مرزا عبدالقادر بیدل رضی اللہ عنہ نیز درین زبان غزلے گفتہ۔“ لے

بیدل کا انتقال ۱۱۳۳ھ میں ہو گیا تھا۔ لے ظاہر ہے کہ یہ غزل اس سے قبل کہی گئی ہوگی۔ ۱۱۲۷ھ میں فائز دہلوی نے اپنا کلیات مرتب کر لیا تھا۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ اس کلیات میں دیوان اردو بھی شامل تھا تو غالباً شمالی ہندوستان میں نواب صدرالدین محمد خاں فائز دہلوی پہلے شاعر ہیں جنہوں نے اردو میں دیوان مرتب کیا اور ۱۱۳۲ھ میں نظر ثانی کی۔ لے

ان تمام شواہد سے یہ ضرور اندازہ ہوتا ہے کہ دہلی میں دیوان دلی کی آمد سے قبل ان کا

۱۔ عیارستان، ص ۱۱۰

۲۔ مخزنِ نکات، ص ۱۰

۳۔ صدیق حسن خاں، شمعِ انجمن، بھوپال، ۱۲۹۳ھ، ص ۸۳۔

۴۔ مسعود حسن رضوی ادیب، فائز دہلوی اور اس کا دیوان، دہلی، ۱۹۳۶ء، ص ۲۶۔

کچھ کلام پہنچ چکا تھا جسے بہت زیادہ مقبولیت ہوئی اور جسے دیکھ کر شمالی ہند والوں نے بھی اس زبان میں طبع آزمائی شروع کر دی۔

اردو شاعری کے آغاز سے لے کر بہت بعد تک اچھی خاصی تعداد ان فارسی گو شعرا کی بھی ہے جنہوں نے ریختہ کی مقبولیت دیکھ کر منہ کا مزہ بدلنے کے لیے اردو میں سخن طرازیایں کیں۔ مرزا عبدالقادر بیدل، مرزا معز فطرت موسوی، ۲، خاں، شرف الدین علی خاں پیام، ۳، مرزا علی قلی ندیم، ۴، ٹیک چند بہار، ۵، میر محتشم علی خاں حشمت، ۶، آندرام مخلص، ۷، قزلباش خاں امید، ۸، اسد یار خاں انسان، ۹، مرزا گرامی، ۱۰، میرٹس الدین فقیر، ۱۱ اور مرزا مرتضیٰ قلی فراق، ۱۲، وغیرہ چند قابل ذکر شاعر ہیں۔ ان میں فطرت کی طرح ایسے شاعر بھی ہیں جن کا ذکر بہت کم تذکروں میں ملتا ہے اور ان میں بھی ایک ہی شعر نقل کیا گیا ہے اور آندرام مخلص ٹیک چند بہار جیسے شاعر بھی موجود ہیں جن کی کئی کئی غزلیں ملتی ہیں۔

- ۱۔ نکات اشعار، ص ۲۔ مخزن نکات، ص ۱۰۔ تذکرہ شعرا، اردو، ص ۲۵۔ مجموعہ نثر، ص ۱۱۵-۱۱۶۔
- ۲۔ نکات اشعار، ص ۴۔ مخزن نکات، ص ۱۲۔
- ۳۔ نکات اشعار، ص ۲۶۔ مخزن نکات، ص ۲۲-۲۳۔ تذکرہ ریختہ گو یاں، ص ۲۶۔ تذکرہ شعرا، اردو، ص ۳۳-۳۴۔
- ۴۔ تذکرہ شعرا، اردو، ص ۱۷۷۔ تذکرہ ہندی، ص ۲۶۔ مجموعہ نثر، ص ۲۶۹۔
- ۵۔ نکات اشعار، ص ۱۳۳-۱۳۴۔ مخزن نکات، ص ۲۵-۲۶۔ تذکرہ ریختہ گو یاں، ص ۲۱-۲۴۔ تذکرہ شعرا، اردو، ص ۲۶۔
- ۶۔ نکات اشعار، ص ۷۳۔ گلشن گفتار، ص ۱۵-۱۸۔ مخزن نکات، ص ۲۷۔ تذکرہ ریختہ گو یاں، ص ۲۸-۲۹۔ تذکرہ شعرا، اردو، ص ۲۸-۲۹۔ تذکرہ ہندی، ص ۸۲۔
- ۷۔ مخزن نکات، ص ۲۷۔ تذکرہ شعرا، اردو، ص ۱۳۵۔ مجموعہ نثر، ص ۱۷۶۔
- ۸۔ نکات اشعار، ص ۷-۸۔ مخزن نکات، ص ۳۰-۳۱۔ تذکرہ شعرا، اردو، ص ۱۰۔
- ۹۔ نکات اشعار، ص ۱۲۹-۱۳۰۔ مخزن نکات، ص ۳۱۔ تذکرہ ریختہ گو یاں، ص ۱۷۔ تذکرہ شعرا، اردو، ص ۵-۶۔
- ۱۰۔ نکات اشعار، ص ۸۔ مخزن نکات، ص ۳۲۔
- ۱۱۔ مخزن نکات، ص ۳۳-۳۴۔ تذکرہ شعرا، اردو، ص ۱۱۴۔ مجموعہ نثر، ص ۷۶-۷۷۔
- ۱۲۔ مخزن نکات، ص ۵۲۔ تذکرہ شعرا، اردو، ص ۱۱۴۔

دو اور فارسی شاعر ہیں جن کا اردو شاعری پر بہت بڑا احسان ہے اور وہ ہیں سراج الدین علی خاں آرزو اور مرزا مظہر جانجانا۔ یہ دونوں بنیادی طور پر فارسی کے شاعر ہیں مگر انھوں نے اردو شاعروں کی پوری دونسلوں کی ذہنی تربیت میں نمایاں حصہ لیا۔ شاعروں کی پہلی نسل میں اچھی تعداد ایسے شاعروں کی ہے جو خان آرزو کی شاگرد ہے یا ان کی ادبی محفلوں میں شریک ہوتی ہے۔ خان آرزو اور ان کے تلامذہ کے عہد کو بعض تذکرہ نگاروں نے ”دورہ ایہام گویاں“ کہا ہے کیوں کہ اس دور کے بیشتر شاعر ایہام گو ہیں۔ خود خان آرزو نے ریختہ گوئی کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی۔ تاہم ریختہ میں ان کے جتنے بھی اشعار ملتے ہیں۔ ان سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ انھیں صنعت ایہام بہت مرغوب تھی۔ تلامذہ خان آرزو کی فہرست حسب ذیل ہے:

خان آرزو

تلامذہ خان آرزو

شرف الدین مضمون

تلامذہ مضمون

محمد عارف عارف۔ میر فضل علی دانا۔ سید حاتم علی خاں حاتم

نجم الدین عرف شاہ مبارک تخلص آبرو

تلامذہ آبرو

میر سجاد سجاد، عبدالوہاب یکرو، سید شمس الدین ثاقب، شاہ محسن فدوی، سجان، شہید۔

## غلام مصطفیٰ خاں یکرنگؑ

تلامذہ یکرنگ

دلاور خاں یکرنگ۔ محمد اسلمیل بیتاب

حسن علی شوق

شہاب الدین ثاقب

میر ناصر سامان

شمالی ہند میں جن شاعروں نے اردو شاعری کی ابتدا کی۔ ان میں شرف الدین مضمون اور شاہ مبارک آبرو جیسے استاد ان فن بھی تھے۔ اسی لیے قاسم نے خان آرزو کے بارے میں لکھا ہے۔ ”اگر شعراے ہندی زبان را عیال خان آرزو گوئندی سرزد“۔<sup>۱</sup> محمد حسین آزاد نے خان آرزو کو ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ ”خان آرزو کو زبان اردو پر وہی دعویٰ پہنچتا ہے جو کہ ارسطو کو فلسفہ و منطق پر ہے۔ جب تک کہ کل منطقی ارسطو کے عیال کہلائیں گے۔ تب تک اہل اردو خان آرزو کے عیال کہلاتے رہیں گے۔“<sup>۲</sup>

تلامذہ آرزو میں مضمون اور آبرو تو ایہام گوئی کے موجد ہیں۔ یکرنگ اور دوسرے شاعروں کے ہاں بھی اچھا خاصا ایہام ملتا ہے۔

۱۔ یکرنگ کو بعض تذکرہ نگاروں نے مرزا مظہر کا شاگرد لکھا ہے۔ مصحفی ان کے بارے میں لکھتے ہیں ”بقولے شاگرد خان آرزو اور بقولے میاں آبرو از فوائے کلامش چنیں می تراود کہ شاگرد مرزا مظہر خواہد بود“۔

(تذکرہ ہندی، ص ۲۷۸)

۲۔ مجموعہ فنون، ص ۲۳۔

۳۔ آپ حیات، ص ۱۴۱

اس دور میں خان آرزو اور ان کے تلامذہ کے علاوہ تین شاعر ایسے بھی ہیں جنہیں بجا طور پر ”استادانِ فنِ ریختہ“ کہا جاسکتا ہے اور جن کا خان آرزو یا ان کے گروہ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ ان شعرا کے نام ہیں۔

فائز دہلوی (ان کے یہاں ایہام بہت کم ہے۔)

شا کر ناجی

شاہ حاتم (حاتم نے بعد میں ایہام کوئی ترک کر دی)

ان کے علاوہ اس عہد کے دوسرے اور تیسرے درجے کے شعرا کے نام یہ ہیں۔ پیر خاں کترین۔ احسن اللہ احسن۔ شاہ ولی اللہ اشتیاق، مرزا امان بیگ رنگین۔ شاہ فتح محمد دل اکبر آبادی۔ موزوں۔ شاہ فضل علی فضل وغیرہ۔ ان سب کے ہاں بھی ایہام ملتا ہے۔

ایہام گو شعرا کی اس فہرست کو مکمل تو نہیں کہا جاسکتا البتہ اس میں تمام اہم اور نمائندہ شاعر ضرور آگئے ہیں۔ ۱۔

اعتدال سے بڑھی ہوئی ایہام کوئی نے شعر کو واقعی مرتبہ بلاغت سے گرا دیا تھا۔ قاتم نے احسن اللہ احسن کے ترجمے میں بالکل ٹھیک لکھا ہے کہ ”حلاش لفظ تازہ و ایہام کرد، اما از غایت جوم الفاظ معنی شعرش کمتر بہ نظری آید“۔ ہر خوبی اعتدال سے بڑھ کر خرابی ہو جاتی ہے۔ شعر مختلف المعنی اور پہلو دار الفاظ میں کھوکھورہ گئے۔ صنعت گری، شعبہ بازی، آرائشی، تصنع اور بناوٹ کا دوسرا نام شاعری ہو گیا۔ شاعر خیالات کی بجائے ان الفاظ کا پابند ہو گیا تھا جن سے ایہام کا لطف پیدا کیا جاسکتا تھا۔ ایہام کی اس بگڑی ہوئی روش نے ابتداء کو بھی راہ دی۔ الفاظ اور محاوروں کے ایہام سے فائدہ اٹھا کر فیثیت پیدا کی گئی۔

۱۔ یہ فہرست مرتب کرنے میں ان تذکروں سے مدد لی گئی ہے۔ نکات اشعراء گلشن گفتار، تذکرہ ریختہ گویان، مخزن نکات، گلزارِ ابراہیم، تذکرہ شعراے اردو، گلشن ہند، ”مجموعہ نفیس“۔ دو تذکرے، گلشن بے خار۔  
۲۔ مخزن نکات، ص ۲۲۔

اس سب کے باوجود ایہام گو شعرا کے تمام سرمایہ شعری کو میر کی طرح ”بے رتبہ“ اور قائم کی طرح ”ستم“ کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ یہ شاعروں کی ایک پوری نسل کی ادبی خدمات کے ساتھ نا انصافی ہے۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ شمالی ہند میں اردو شاعری کی ابتدا انھیں میں سے چند بزرگوں کی مرہون منت بھی ہے۔ یہ دور قدرِ اول کی شاعری کا دور نہیں تھا۔ ریختہ گو فارسی اور ہندی کے شاعروں کے ذہن سے سوچتے تھے۔ اسی لیے اس دور میں کوئی شاعر انفرادیت پیدا نہیں کر سکا اور نہ ہی کسی کا اپنا ”لب و لہجہ“ بن پایا۔

ان شاعروں کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ انھوں نے مختلف زبانوں سے الفاظ مستعار لے کر اردو کو مالا مال کیا۔ ابھی زبان میں اتنی سکت نہیں تھی کہ ہر خیال کو بے تکلف ادا کرتی۔ کجا کہ ایہام جیسی مشکل صنعت کی ذمہ داری سچے اہلہ برآ ہو سکتی۔ اس لیے ہندی اور فارسی سے الفاظ، ترکیبیں، ادا کا دے وغیرہ مستعار لیے گئے۔ ہر لفظ کے کئی معنی ہوتے ہیں۔ ان شعرا نے اس معنوی تنوع کو صنعتِ ایہام کے ذریعہ اُجاگر کیا۔ ترتیب الفاظ سے نئے نئے معنی پیدا کر کے زبان کی حدود کو وسیع کیا۔ ان شاعروں کا بنیادی کام مرصع سازی ہے۔ انھوں نے اچھے بُرے سب طرح کے نگینے جڑے ہیں۔ انھوں نے کسی ایسے لفظ کو جو اُن کا مفہوم ادا کر سکتا ہو، نکسال سے باہر نہیں سمجھا۔ الفاظ کا مزاج پہچانا اور ترک و قبول کا عمل بعد میں شروع ہوا اور یہ اسی وقت ممکن تھا جب ایہام گو شعرا نے الفاظ کے انبار لگا دیے تھے۔

جب ایہام گوئی اعتدال سے بڑھی تو فطری طور پر اس کے خلاف ردِ عمل ہونا تھا۔ مرزا

۱۔ میر نے احسن کے بارے میں لکھا ہے: ”طبعش بسیار مائل بہ ایہام بود، ازین جهت شعرا ادبے رتبہ مانند“۔ نکات اشعار، ص ۲۷

۲۔ قائم لکھتے ہیں: ”ہمیں ستم کہ شاعران ابتدائی زمانہ محمد شاہ باعقاد خود تلاش الفاظ تازہ و ایہام نمودہ شعر را از مرتبہ بلاغت انداختہ تا بہ معنی چہ رسد، غرض ناگفتہ بہ“۔ مخزن نکات، ص ۱۴۔

۳۔ علی گڑھ تاریخ ادب اردو کی زیرِ طبع جلد دوم میں راقم الحروف نے ”دورہ ایہام گو یان“ پر بہت تفصیلی بحث کی ہے۔

مظہر جانجناں فارسی کے شاعر تھے لیکن خان آرزو کی طرح انھوں نے بھی اردو شاعروں کی سرپرستی کی اور ان کی تربیت میں نمایاں حصہ لیا بلکہ مرزا مظہر نے خان آرزو سے زیادہ اردو میں شعر کہے ہیں۔ لہٰذا نے شاعروں کی دوسری نسل کی ذہنی ساخت و پرداخت کی۔ جانجناں وہ پہلے اردو شاعر ہیں جنھوں نے ایہام کے خلاف باقاعدہ آواز بلند کی اور ”سادہ گوئی“ کی بنیاد رکھی۔ دیوان زادہ حاتم میں مرزا مظہر کی جس زمین میں کبھی ہوئی حاتم کی غزل ہے۔ وہ ۱۱۳۰ھ میں کہی گئی۔ مرزا مظہر کی غزل کا مطلع ہے۔

ہمارے ساتھ سے یہ دل بھی بھاگا لے کے جاں اپنا

ہم اس کو جانتے تھے، دوست اپنا، مہرباں اپنا

اس پوری غزل کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مرزا نے اردو شاعری کے باقاعدہ آغاز کے وقت ہی ایہام کے خلاف آواز بلند کی تھی۔ مگر اس وقت ان کی آواز قبل از وقت تھی۔ وہ شعرا کو اپنی طرف متوجہ نہ کر سکے۔ کیوں کہ اس عہد میں خان آرزو اور ان کے شاگردوں، ساتھیوں اور بعض دوسرے ایہام گو شاعروں کا طوطی بول رہا تھا اور ایہام مقبول عوام تھا۔ لیکن عام روش کے خلاف مرزا طرز سادہ میں شعر کہتے تھے۔ یہ ان کی تنہا کوششوں کا نتیجہ تھا کہ اتنے بڑے بڑے استادوں کی سرپرستی اور پسند عوام کی حمایت کے باوجود تیس برس کے عرصے میں نہ صرف یہ کہ شاعروں نے ایہام گوئی سے توبہ کر لی۔ بلکہ عوام کا مذاق بھی بدل گیا اور شعرا ایہام سے نفرت کرنے لگے۔ مرزا مظہر کی ریختہ گوئی کا زمانہ وہ ہے جب میر اور سودا کی ذہنی نشوونما بھی نہیں ہوئی تھی اور حاتم، مضمون، آبرو وغیرہ جیسے استادان فن کی شاعری شباب پر تھی۔ ان میں صرف حاتم ایسے شاعر ہیں جنھوں نے مرزا مظہر کی اصلاحات کا اثر قبول کیا اور اپنے کلیات میں سے ایہام میں کہے گئے اشعار

۱۔ عبدالرزاق قریشی نے ان کے ایک چوبیس اشعار (دو مختلف غزلوں کے) مرتب کیے ہیں۔ عبدالرزاق قریشی، مرزا مظہر جانجناں اور ان کا کلام، بمبئی، ۱۹۶۱ء، ص ۲۹۱-۳۱۰ مجھے ان اشعار کے علاوہ ۳۸ اشعار اور طے ہیں جن پر الحاقی ہونے کا شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ ملاحظہ ہو۔ خلیق انجم، مرزا مظہر جانجناں، تحقیق مقالہ، دہلی یونیورسٹی لاہوری۔

۲۔ آزاد لاہوری علی گڑھ میں بھی دیوان زادہ کا قلمی نسخہ ہے۔ جس میں اس غزل پر ۱۱۳۵ھ لکھا ہوا ہے۔

کو نظر ہی کر کے ایک انتخاب مرتب کیا، جس کا نام ”دیوان زادہ“ رکھا۔

یہ مرزا مظہر کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ اردو شاعری ایہام کے خارزاروں سے نکل آئی۔ انھوں نے اُس ادب و شعر کے ایوانِ رفیع کی بنیاد گزاری کی جس کے ستون سودا، میر، درد اور قائم وغیرہ ہیں۔ انھوں نے اُس کتب اور تحریک کا آغاز کیا جس کے شعائر و خصائص میں سوز و گداز، قلبی واردات، فکری عنصر، حیاتی شاعری، وجدانی پرتو اور غزل کا دھیمالہ دلچسپ تیار ہوا، جس نے بعد میں دبستانِ دہلی کی شکل اختیار کر لی اور جسے ہم دبستانِ لکھنؤ سے ممتاز کرتے ہیں۔

حیاتِ انسانی کے ارتقا کی تاریخ اس پر شاہد ہے کہ دنیا کے تمام بڑے بڑے کاموں کا آغاز کسی فرد کی بظاہر نہایت معمولی اور ناقابلِ توجہ کوششوں سے ہوا۔ لیکن جب یہ نخلِ مراد برومند ہو گیا اور انسان نے اس کا سُرائِ لگانا چاہا تو اس کی بنیاد گزاری میں کوئی بہت ہی خاموش سا ہاتھ کام کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ تاریخِ ادبِ اردو میں یہی معاملہ اردو غزل کی طرزِ سادہ کے بانی مرزا مظہر کے ساتھ ہوا۔

کوئی بھی اصلاحی کوشش ہو۔ ادب میں، اخلاق یا سماج میں۔ ایک دن میں بارور نہیں ہوا کرتی، نہ معاشرے کے رجحانات دن اور تاریخوں کے ساتھ بدلنے ہیں۔ یہ تعین کرنا تو بہت مشکل ہے کہ مرزا نے ایہام کی مخالفت کس سن میں شروع کی اور اس اصلاحی تحریک کا کب آغاز ہوا۔ لیکن اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ مرزا اپنی طبعی نفاست پسندی اور سادہ مزاجی کی وجہ سے ابتدا ہی سے طرزِ سادہ اور گفتگوئے شستہ و رفتہ کے شیدائی تھے اور انھیں یہ رمز معلوم تھا کہ شیریں اور اثر انگیز گفتگو ہی ہوتی ہے جو تکلف کی بناوٹوں سے عاری ہو۔ مرزا نے ۱۱۶۴ھ سے قبل ریختہ گوئی ترک کر دی تھی اور بقول خانِ آرزو اپنے تلامذہ کی تربیت کے لیے چند اشعار کہہ لیا کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے تلامذہ کو ایہام کی مخالفت کے لیے تیار کیا۔ خاص طور پر انعام اللہ خاں یقین، احسن اللہ خاں بیان، میر باقر حزیں، محمد فقیہ صاحب درد مند اور ہیبت علی خاں حسرت کو اس روشِ خاص کی وجہ سے مقبولیت حاصل ہوئی۔ درد مند کے علاوہ باقی یہ تمام شاعر صاحبِ دیوان تھے۔ یقین کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ ان کے سامنے میر اور سودا کے چراغ نہ جل سکے۔



اگرچہ میر اور سودا کو خان آرزو سے تلمذ نہیں تھا۔ لیکن یہ دونوں خان آرزو کی ادبی صحبتوں میں شریک ہوتے تھے۔ اس لیے ممکن نہیں کہ خان آرزو سے یہ لوگ متاثر نہ ہوئے ہوں۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ بہ ظاہر یہ دونوں مرزا مظہر کے مخالف ہیں۔ لیکن ذہنی اعتبار سے ان دونوں نے مرزا مظہر کی تحریک کو جتنا فروغ دیا ہے شاید کسی اور شاعر نے دیا ہو۔ علامہ مظہر کے بعد مشعل شاعری میر، درد، اور سودا کے ہاتھوں میں آئی۔ اگرچہ سودا کے ہاں ایہام کے چند اشعار مل جاتے ہیں۔ لیکن اوّل تو اتنے بڑے کلیات میں ان کی کوئی حیثیت نہیں۔ دوسرے ان میں ایہام ”بسیار بہ شستگی“ باندھا گیا ہے۔ مثلاً:

پونج مجھے اس دیر کہن میں کیا پوجے ہے پتھر کو

مجھ وحشی کو سنا برہمن بتوں نے اپنا رام کیا

لیکن جب سودا محض تفریح طبع کے لیے ایہام میں کچھ اشعار کہتے ہیں تو انھیں صفائی پیش کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ ایہام کی ایک غزل کا مقطع ہے:

اسلوب شعر کہنے کا تیرے نہیں ہے یہ

مضمون و آبرو کا یہ سودا ہے سلسلہ

ورنہ حقیقت میں سودا ایہام کے کٹر مخالف ہیں۔ انھوں نے کھلم کھلا اعلان کیا ہے:

یک رنگ ہوں آتی نہیں خوش مجھ کو دورنگی

منکر سخن و شعر میں ایہام کا ہوں میں

---

۱۔ سودا نے مرزا کی اصلاح زبان کی تحریک کا مذاق ایک قطعہ میں اڑایا تھا۔ جو ”بھوگوئی“ کے باب میں نقل کیا گیا ہے۔

۲۔ میر نکات اشعرا کے اختتام پر لکھا ہے: ”ایہام است کہ در شاعران سلف دریں فن رواج داشت، اکنون طبعانے معروف این صنعت کم است۔ مگر بسیار بشتگی بستہ بشود“۔ (نکات اشعرا، ص ۱۷۹)

## سودا کی غزل گوئی

سودا ایک عظیم شاعر تھے۔ لیکن عظیم غزل گو نہیں اگر ان کی متاع فن غزل اور صرف غزل ہی ہوتی تو ہم غزل گو شاعروں میں ہوتا اور بس ان کی شہرت اور مقبولیت اور شاعرانہ عظمت کی اصل بنیاد قصیدہ گوئی اور ہجو گوئی کے ساتھ ساتھ اس حقیقت پر بھی ہے کہ ان کے کلیات میں تقریباً جملہ اصنافِ سخن کے کامیاب نمونے موجود ہیں اور صفِ اول کے غزل گو نہ ہونے کے باوجود انھوں نے غزل کو بہت کچھ دیا ہے۔ اردو غزل میں ”خارجیت“، ”زور بیان“ اور ”نشاط آمیز لب و لہجہ“ انہی کی دین ہے۔

غزل میں جہاں تک زبان و بیان اور قدرتِ اظہار کا تعلق ہے۔ سودا کا ایک مخصوص رنگ اور لب و لہجہ ہے جو ان کی استاد پر حرف نہیں آنے دیتا۔ لیکن غزل کی دوسری شرائط کے اعتبار سے وہ اپنے بعض ہم عصر غزل گو شعرا سے پیچھے رہ جاتے ہیں۔ غزل ایک ایسی صنفِ سخن ہے جس میں ہر شاعر آسانی سے طبع آزمائی کر سکتا ہے بلکہ اردو شاعری کی تو یہ روایت رہی ہے کہ تقریباً تمام شاعروں کی ادبی زندگی کا آغاز غزل ہی سے ہوا، لیکن یہ بہت کم مزاجوں کو اس آتی ہے۔ اس میں بیشتر مضامین رکی اور روایتی ہوتے ہیں۔ عام طور پر شاعر حسن و عشق اور شراب و میکدہ سے آگے نہیں بڑھتا۔ لیکن ان رکی مضامین پر بھی شاعر کی اپنی چھاپ ہوتی ہے۔ ساغر و مینا کے پردوں میں اس کے احساسات، سماج اور دنیا کے متعلق اس کے نظریات، عام زندگی کے تجربات و مشاہدات غرض سب ہی کچھ چھپا ہوتا ہے۔

دوسرے اصنافِ سخن کی طرح غزل کی بنیاد بھی خارجی زندگی پر ہوتی ہے۔ لیکن غزل میں خارجی زندگی برا و راست نہیں پیش کی جاتی بلکہ ماڈی تجربات کو پہلے شاعر کے آتش کدہ دل میں تپنا پڑتا ہے۔ اصل مسالہ دل کی دنیا سے فراہم ہوتا ہے اور دماغ اسے خوب صورت سانچوں میں ڈھالتا ہے۔ بالفاظ دیگر اعلیٰ درجے کی غزل گوئی کے لیے ”دروں بینی“ پہلی شرط ہے۔

سودا کا مزاج اور ذہن غزل کو اس نہیں آسکتا تھا، ان کی شوخ، چنچل اور طرارے بھرتی ہوئی ہمہ رنگ طبیعت اس درد مندی، سوز و گداز اور برہنگی و محسوس کی محفل ہی نہیں ہو سکتی تھی جو غزل کی خصوصیات ہیں۔ سودا کے ہاں جذبات کی وہ صداقت و معصومیت، خلوص، خود سپردگی اور درد مندی نہیں ہے جو لب و لہجہ میں نرمی اور گھلاوٹ اور انداز بیان میں سادگی و بے تکلفی پیدا کر کے شعر کو تیر و نشتر بنا دیتی ہے۔ قدرت نے سودا کو ترن و ملال اور ان کے لطیف احساسات سے محروم رکھا تھا اس لیے وہ زندگی کی ٹھوس حقیقت یعنی غم کی آتش سیال کو الفاظ کے نرم و نازک سانچوں میں ڈھالنے سے معذور رہا۔

سودا کا ادبی کارنامہ قصیدہ گوئی اور ہجو گوئی ہے جن میں داخلیت کی بجائے خارجیت کو دخل ہوتا ہے۔ ان سے قبل ہی یہ دونوں اصناف اردو میں رائج تھیں۔ لیکن یہ صرف سودا تھے جنہوں نے ان کو باقاعدہ فن کی صورت دی اور فنی اعتبار سے ان اصناف کو انتہا پر پہنچا دیا۔ یہ بات بغیر کسی شک و شبہ کے کہی جاسکتی ہے کہ اس میدان میں کوئی ان کا ثانی نہیں۔

اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ سودا پہلے قصیدے اور ہجو کے شاعر ہیں اور بعد میں غزل گو۔ ان کی پوری غزلوں میں جتنے نشتر نکلیں گے وہ شاید ان سے کم ہوں جو دوسرے درجے کے بعض معاصر شعرا کے ہاں مل جائیں گے۔ حالاں کہ سودا کے مقابلے میں ان کا سرمایہ فن بہت مختصر ہے۔

کلیات سودا میں سوز کی سوا سو کے قریب غزلیں اور بیان، قائم، یقین اور شیدائے بعض اشعار بھی شامل ہو گئے ہیں، جنہیں ہم مدتوں سودا کا کلام سمجھ کر جھومتے رہے ہیں اور بیان، قائم وغیرہ کی مثنویاں الگ ہیں۔

سودا کی زندگی ہی میں بعض اہل نظر غزل گوئی میں دوسرے شاعروں کو ان پر ترجیح دیتے تھے۔ کچھ نرائین شفیق نے ”چمنستان شعرا“ میں لکھا ہے:

”اگرچہ یقین ہے کہ مرزا سودا غزل، رباعی و خمس و مثنوی و قصیدہ و قطعہ بند وغیرہ میں بلند مرتبہ رکھتے ہیں..... لیکن یقین کے ریتھے

میں جو فصاحت و ملاحت ہے وہ چیز ہے دیگر ہے۔<sup>۱</sup>

(فارسی سے ترجمہ)

شقیق نے یقین اور سودا کا موازنہ کرتے ہوئے کسی شاعر کی دو رباعیاں بھی نقل کی ہیں۔<sup>۲</sup>  
جو سوانحی حصے میں پیش کی جا چکی ہیں۔

صاحب ”نضر عشق“ نے لکھا ہے کہ:

”اگرچہ سودا تمام طرز کلام پر قدرت رکھتے ہیں۔ لیکن مدح و قدح  
میں کہ جس سے مراد جو قصیدہ گوئی میں انھوں نے معجزہ دکھایا ہے۔“<sup>۳</sup>

شاہ محمد حمزہ نے بھی ”نفس الکلمات“ میں اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان کی رائے  
یہ ہے کہ:

”سودا غزل و مثنوی و قطعہ و مخمس و رباعی سب خوب کہتے ہیں اور  
خاص طور پر قصیدہ گوئی میں سحر سامری دکھاتے ہیں۔“<sup>۴</sup>

سودا کے ہم عصر شاعروں میں میر تقی میر عظیم غزل گو شاعر تھے۔ اس لیے اکثر تذکرہ  
نگاروں نے ان دونوں فن کاروں کا موازنہ کیا ہے۔ اس موازنے سے متعلق کچھ کہنے سے  
پیشتر مناسب ہے کہ میر کی بنیادی خصوصیت بیان کر دی جائے تاکہ ان دونوں کے فن کو  
سمجھنے میں آسانی ہو۔ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے میر کی غزل گوئی پر بحث کرتے ہوئے  
لکھا ہے:

”انھوں نے (میر نے) جس درد اور سوز کے ساتھ یہ نغمہ چھیڑا ہے  
اس کی مثال دنیا کے اردو میں نہیں ملتی۔ میر کی فداگی و دل  
سوزی، حسرتی و برہنگی نے تغزل میں ایک معیاری شان پیدا کر دی

۱۔ چہستان شعر، ص ۱۶۲

۲۔ ایضاً، ص ۱۶۲

۳۔ نضر عشق (قلمی) ورق

۴۔ نفس الکلمات، قلمی

ہے اور ان کے کلام کو سوز و گداز کا آتش کدہ بنا دیا ہے۔<sup>۱</sup>

سودا اور میر کے کلام میں صرف یہی فرق ہے کہ سودا اس خصوصیت سے محروم تھے جو میر کا طرہ امتیاز ہے اور بیشتر تذکرہ نگاروں نے بھی مختلف الفاظ میں اس کا ذکر کیا ہے۔ بھگوان داس ہندی نے دونوں کا موازنہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

”اکثر لوگ فن ریختہ میں میر اور مرزا کو ہم پلہ سمجھتے ہیں اور اکثر غزل و مثنوی میں میر کو اور ہجو و قصیدہ میں مرزا کو ایک دوسرے پر ترجیح دیتے ہیں“<sup>۲</sup> (فارسی سے ترجمہ)

حکیم سید احمد علی خاں یکتا کو سودا سے بہت عقیدت اور محبت ہے جس کا اظہار انھوں نے دیا ہے میں کیا ہے لیکن وہ بھی یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ میر کا فن لاثانی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

”میر نے غزل کو اس انداز سے کہا ہے کہ کوئی اور نہیں کہہ سکتا بلکہ اس باب میں ملک اشعر ابرحرف آتا ہے۔ (بظاہر ملک اشعر ا سے مراد سودا ہے)..... لیکن میر کی تقلید و پیروی بہت مشکل ہے۔ اگرچہ ان کا کلام فصاحت نظام سعدی کے کلام کی طرح بظاہر آسان نظر آتا ہے لیکن حقیقت میں متمتع ہے۔ بیشتر شعرا ان کے مقلد ہیں لیکن یہ شعرا مطلقاً ان کی طرز نہیں پاسکے۔ اس کے برخلاف اگرچہ سودا کے کلام میں کمال چنگی ہے لیکن ہر صاحب فہم کے لیے اس کی تقلید ممکن ہے۔“<sup>۳</sup> (فارسی سے ترجمہ)

یکتا نے میر اور سودا کے کلام پر بہترین تنقیدی رائے دی ہے۔ دماغ کی شاعری کی تقلید ممکن ہے لیکن دل کی شاعری کی نہیں اور سودا کی غزل گوئی دماغ کی شاعری ہے۔

۱۔ میر تقی میر، ص ۳۳۱-۳۳۲

۲۔ تذکرہ ہندی، ص ۲۳

۳۔ دستور الفصاحت، ص ۲۵

قدرت اللہ قاسم نے ان دونوں کے فرق کو بڑے خوب صورت انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ”بعض لوگوں کے خیال سے مرزا اچھے غزل گو نہ تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ:

ہر گل را رنگ و بوئے دیگر است

مرزا ایک بکراں دریا ہیں اور میر ایک عظیم الشان نہر۔ جہاں تک فن کی معلومات کا تعلق ہے میر کو مرزا پر برتری اور قوت شاعری میں مرزا کو میر پر سروری حاصل ہے۔ ”۱۔ قاسم کی بات کو دوسرے الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ سودا تمام اصنافِ سخن پر قدرت رکھتے تھے۔ میر صرف غزل گوئی پر قادر تھے۔ مگر اس فن میں بے مثال تھے۔ مولانا محمد حسین آزاد ان دونوں کے متعلق رائے دیتے ہیں کہ:

”میر صاحب کی طبیعت قدرتی درخیزی اور دل حسرت انگیز تھا کہ غزل کی جان ہے۔ اس لیے ان کی غزلیں ہی ہیں اور خاص خاص بحور و قوافی میں ہیں۔ مرزا کہ طبیعت ہمہ رنگ اور ہمہ گیر، ذہن براق اور زبان مشاق رکھتے تھے۔ تو سن فکر ان کا منہ زور گھوڑے کی طرح جس طرف جاتا تھا، رک نہ سکنا تھا، کوئی بحر اور کوئی قافیہ ان کے ہاتھ آئے تغزل کی خصوصیت نہیں رہتی تھی، جس برجستہ مضمون میں بندھ جائے، باندھ لیتے تھے۔ بے شک ان کی غزل کے اکثر شعر چستی اور درستی میں قصیدے کا رنگ دکھاتے ہیں۔“ ۲

آزاد نے میر اور مرزا سے متعلق ایک واقعہ بھی بیان کیا ہے جس سے ان دونوں کے کلام کی خصوصیت بخوبی واضح ہو جاتی ہے۔ ممکن ہے یہ واقعہ نہ ہوا ہو لیکن اس سے میر اور مرزا کا فرق بخوبی واضح ہوتا ہے۔ آزاد لکھتے ہیں کہ:

”ایک دن لکھنؤ میں میر اور مرزا کے کلام پر دو شخصوں میں تکرار نے طول کھینچا۔ دونوں خواجہ باسط کے مرید تھے۔ انھیں کے پاس گئے

اور عرض کی کہ آپ فرمائیں انھوں نے کہا کہ دونوں صاحبِ کمال  
ہیں مگر فرق اتنا ہے کہ میر صاحب کا کلام آہ ہے اور مرزا صاحب کا  
کلام واہ ہے۔ مثال میں میر صاحب کا شعر پڑھا :

سرہانے میر کے آہستہ بولو  
ابھی ٹلک روتے روتے سو گیا ہے

پھر مرزا کا شعر پڑھا:

سودا کی جو بالیں پہ ہوا شور قیامت  
خدا ام ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے“ ۱۔

جدید دور کے تذکرہ نگاروں میں رام بابو سکینہ کہتے ہیں:

”مختصر یہ کہ وسعتِ نظر، تنوعِ خیالات، جزئیات کے بیان کی  
قدرت، دنیاوی معاملات کی واقفیت اور سب سے بڑھ کر یہ کہ  
مذاق اور ظرافت میں سودا کو میر پر برتری ہے۔ سادگیِ الفاظ،  
سلاستِ زبان، عاشقانہ رنگ، دردِ اثر، فصاحت و بلاغت اور  
قصوف میں میر صاحب کو سودا پر فضیلت ہے۔“ ۲۔

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے سودا کے قصیدے اور غزل پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے۔ ”یہ  
جو عوام میں مشہور ہے کہ اُن (سودا) کا قصیدہ غزل سے بہتر ہے۔ مہمل بات ہے۔  
فقیر (شیفتہ) کے خیال سے اُن کی غزل قصیدے سے بہتر ہے اور قصیدہ غزل سے“ ۳۔  
(فارسی سے ترجمہ) خود سودا کو بھی یہ احساس تھا کہ لوگ انھیں قصیدے کا شاعر سمجھتے  
ہیں۔ ان کا ایک شعر ہے:

۱۔ آبِ حیات، ص ۱۶۳-۱۶۵  
۲۔ تاریخ ادبِ اردو، رام بابو سکینہ، مترجمہ، مرزا محمد عسکری، ۱۹۵۲ء، ص ۱۷۴  
۳۔ گلشنِ بے خار، ص ۱۰۰

لوگ کہتے ہیں کہ سودا کا قصیدہ ہے خوب

ان کی خدمت میں لیے میں یہ غزل جاؤں گا

یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ سودا غزل گوئی میں میر تک نہیں پہنچ پائے۔ لیکن اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کیا سودا غزل میں بالکل ناکام رہے؟ کیا ان کا اپنا رنگ اور انداز نہیں تھا اور وہ صرف روایتی مضامین باندھتے رہے۔ شیخ چاند کا یہی خیال ہے کہ سودا کا اپنا کوئی رنگ نہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

”سودا کا غزل میں کوئی خاص رنگ نہیں۔ وہ اس میدان میں طرح طرح طبع آزمائی کرتا ہے۔ غزل کی جان سادگی بیان ہے۔ سودا نے غزل میں اس کا بہت کم خیال رکھا ہے۔“

مجھے شیخ چاند کی اس رائے سے اختلاف ہے۔ غزل میں سودا کا اپنا مخصوص رنگ ہے جس کی بنیاد خارجیت، زور بیان اور نشاط آمیز لب و لہجہ پر ہے۔

کب ہماری فکر سے ہوتا ہے سودا کا جواب

ہاں متبع کرتے ہیں ناسخ ہم اس مغفور کا

سودا غالباً پہلے شاعر ہیں جنہوں نے غزل کو داخلیت کی گھٹی ہوئی فضا سے باہر نکالا۔ اگرچہ اس کوشش میں وہ اتنے آگے بڑھ گئے کہ ان کا کلام کہیں کہیں بے تاثیر ہو گیا۔ لیکن مصحفی کے ہاں جو داخلیت اور خارجیت کا حسین امتزاج ہے وہ سودا کا مرہون منت ہے۔ سودا نے غزل کو جو ایک خارجی انداز بخشا تھا۔ مختلف زمانوں میں ان کے نمائندے انشاء، جرات، ناسخ، شاہ نصیر اور ذوق وغیرہ رہے ہیں۔ یہ تمام شعرا اپنے اپنے مزاج کے مطابق سودا سے متاثر تھے۔ سودا کے ہاں جو زور بیان، معنی آفرینی، خیال بندی، پرواز تخیل، جذبہ بیان، قدرت اظہار، نشاط انگیزی اور جوش و خروش ہے وہ انہیں کا حصہ ہے۔ سودا کو زبان پر پورا عبور ہے۔ سیکڑوں ہندی اور فارسی محاورے انہیں کی بدولت اردو زبان میں داخل ہوئے۔ الفاظ شدہ ہندی کے ہوں یا ٹھیکہ فارسی کے، ان کے سامنے ہاتھ



باندھے کھڑے رہتے ہیں۔ سودا ان کو اس طرح برجستہ استعمال کرتے ہیں کہ وہ الفاظ اردو کے معلوم ہوتے ہیں۔ زبان پران کی یہی قادر الکلامی ہے جو سنگلاخ زمینوں کو پانی کر دیتی ہے اور وہ مشکل سے مشکل خیال کو باندھ لیتے ہیں۔ ان کی جدت پسند طبیعت نے گلستانِ غزل کو دلاویز، حسین اور رنگین استعارات اور تشبیہات کے پھولوں سے سجایا ہے۔

جیسا کہ ابھی کہا گیا ہے کہ سودا کی سب سے بڑی خصوصیت ان کا زور بیان ہے۔ وہ معمولی سے مفہوم کو اس انداز اور ایسے الفاظ میں بیان کرتے ہیں کہ شعر میں برجستگی، صوتی بلند آہنگی، ترنم اور ایک مخصوص موسیقیت پیدا ہو جاتی ہے۔ میر نے ان کی خصوصیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

”بسیار خوش گواست، بلا گرداں ہر شعرش طرف لطف رستہ رستہ،  
در چمن بندی الفاظش گل معنی دستہ دستہ، ہر مصرع برجستہ اش را سرد  
آزاد بندہ پیش فکر عالیشان طبع عالی شرمندہ“۔<sup>۱</sup>

محمد حسین آزاد نے سودا کی جن خصوصیات کا بیان کیا ہے۔ ان میں سب سے خصوصیت زور بیان ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”چند صفات خاص ہیں جن سے کلام ان کا جملہ شعرا سے ممتاز معلوم ہوتا ہے۔ اول یہ کہ زبان پر حاکمانہ قدرت رکھتے ہیں۔ کلام کا زور مضمون کی نزاکت سے ایسا دست و گریباں ہے۔ جیسے آگ کے شعلے میں گرمی اور روشنی، بندش کی چستی اور ترکیب کی درستی سے لفظوں کو اس دروبست کے ساتھ پہلو بہ پہلو جڑتے ہیں گویا دلائی طہنچہ کی چاپیں چڑھی ہوئی ہیں اور یہ خاص ان کا حصہ ہے۔ چنانچہ جب ان کے شعر میں سے کچھ بھول جائیں تو جب تک وہی لفظ وہاں نہ رکھے جائیں۔ شعر مزایا نہیں دیتا“۔<sup>۲</sup>

۱۔ نکات اشعار، ص ۳۱

۲۔ آب حیات، ص ۱۵۸

ان خصوصیات پر تفصیلی بحث آگے کی جائے گی۔

مناسب ہوگا اگر ہم یہاں ان فارسی شاعروں کا ذکر کر دیں، جنہوں نے سودا کو متاثر کیا اور ان کی ادبی شخصیت کے بنانے میں نمایاں حصہ لیا۔

### سودا اور فارسی شاعر

عہد محمد شاہ میں فارسی شاعری رو بہ زوال تھی۔ لیکن ابھی تک اس کی ادبی حیثیت برقرار تھی۔ شمالی ہند میں ابتدائی دور کے کچھ فارسی شعرا نے اردو میں شعر کہنا شروع کیے یا اردو کی سرپرستی کی۔ دوسرے قسم کے شاعروں میں سراج الدین علی خاں آرزو اور مرزا مظہر جان جاناں بہت اہم ہیں، جس پر تفصیلی بحث ”ادبی پس منظر“ میں کی جا چکی ہے۔

فارسی میں اچھے شاعر اور ادیب پیدا ہونا بند ہو گئے تھے۔ لیکن اس دور کے تمام تعلیم یافتہ لوگوں میں فارسی ادب کا بہت اچھا مذاق تھا اور پھر وہ لوگ اردو شاعروں کی سرپرستی کر رہے تھے۔ خود فارسی کے بڑے شاعر تھے۔ اس لیے فطری طور پر اردو غزل فارسی سے بہت زیادہ متاثر ہوئی۔ اردو شاعروں پر فارسی کا اتنا گہرا اثر تھا کہ ابتدائی دور سے لے کر غالب تک بہت کم صفِ اوّل کے ایسے شاعر ملیں گے، جنہوں نے فارسی میں طبع آزمائی نہ کی ہو۔ سودا فارسی میں شعر کہتے تھے۔ انہوں نے خود اپنے ایک قطعہ میں اس حقیقت کا اظہار کیا ہے۔ ان کے کلیات میں دیوان فارسی بھی شامل ہے۔ فارسی ادب پر ان کی کتنی گہری نظر تھی اور فارسی کے مسلم الثبوت استادوں سے انہیں کتنی عقیدت تھی۔ اس کا اندازہ ”عبرت الغافلین“ سے ہوتا ہے۔ جس میں سودا نے ان اعتراضات کا جواب دیا ہے جو مرزا فاخر مکیں نے امیر خسرو، شیخ سعدی، مولانا روم، مولوی جامی، آسی سبزواری، نعمت خان عالی، مرزا صاحب، خان آرزو اور دوسرے فارسی شعرا کے کلام پر کیے تھے اور پھر خود سودا نے فاخر مکیں کے اشعار پر اعتراضات کیے ہیں۔ سند کے طور پر انہوں نے جو فارسی اشعار پیش کیے ہیں وہ بھی اس بات کا ثبوت ہیں کہ انہوں نے فارسی ادب کا اچھا مطالعہ کیا تھا۔ انہوں نے بعض فارسی مصرعوں اور غزلوں کو بھی تفسیق کیا ہے۔

سودا نے کسی فارسی شاعر کا مکمل تتبع تو نہیں کیا۔ لیکن اس دور کی فارسی شاعری کے عام رجحانات سے وہ ضرور متاثر ہیں اور بعض شاعروں کے اندازِ سخن کی چھاپ ان کے کلام پر پڑی ہے۔ چوں کہ وہ غیر معمولی ذہین انسان تھے۔ ایجاد اور جدت کی پوری صلاحیتیں رکھتے تھے۔ اس لیے فارسی شاعروں سے انھوں نے جو کچھ مستعار لیا۔ اس پر قناعت نہیں کی بلکہ ان تمام پھولوں کو سجا کر خود اپنا گلستاں بنایا ہے۔

اس دور کی فارسی شاعری کے عام رجحانات کو ”سبکِ ہندی“ کہا جاتا ہے۔ ہندوستان کی سیاسی بد نظمی، معاشی بد حالی اور رو بہ زوال تہذیب کا اثر فارسی ادب پر یہ پڑا کہ ادب میں جمود آ گیا۔ ایک مخصوص اقتصادی نظام اور تہذیب کی ترقی کے تمام امکانات ختم ہو چکے تھے۔ زندگی ایک منزل پر پہنچ کر رک گئی تھی۔ ظاہر ہے کہ ادب بھی اس منزل سے آگے نہیں جاسکتا تھا۔ اس ٹھہراؤ اور جمود نے ادب میں جو رجحانات پیدا کیے انھیں اہل ایران ”سبکِ ہندی“ کہتے ہیں۔<sup>۱</sup>

شاہِ حاتم پہلے اردو شاعر ہیں جو ان رجحانات سے بہت زیادہ متاثر ہیں۔ ان کے شاگرد سودا کے ہاں ان میں سے تمام نہیں تو کچھ خصوصیات مل جاتی ہیں۔

سودا پر جن فارسی شاعروں کا اثر نظر آتا ہے وہ اسی سبکِ ہندی کے نمائندہ شاعر ہیں۔

بھگوان داس ہندی نے لکھا ہے۔ ”اگر مثالِ ہندی اشعار غزل میں سودا کو اپنے وقت کا صائب کہا جائے تو ٹھیک ہے۔“<sup>۲</sup> حکیم سید احمد علی خاں تیکتا نے بھی سودا پر صائب کے اثر کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔ سودا اس پاکیزگی اور ملاحظت کے ساتھ غزل کہتے ہیں کہ اگر صائب موجود ہوتے تو خود اس کی داد دیتے۔“<sup>۳</sup>

سودا کے ہاں جو خارجیت ہے وہ ایک حد تک صائب کا اثر ہے۔ صائب زورِ بیان میں غزل کو قصیدے کی حدوں میں لے آتے ہیں۔ یہی حال سودا کا ہے۔ ان کی اکثر غزلوں پر قصیدے کا رنگ چڑھا ہوا ہے۔ صائب کی طرح ان کے ہاں بھی مثالی شاعری کے اچھے

۱۔ اردوئے معلیٰ، غالب نمبر ۱۰، ص ۶۹

۲۔ (الف) سفینہ ہندی، ص ۱۲۵ (ب) تذکرہ ہندی، ص ۱۳۵

۳۔ دستور الفصاحت، ص ۱۷

خامے سمونے مل جاتے ہیں۔ سودا نے صائب کے ایک مصرع کو بہت دلچسپ انداز میں  
تضمین کیا ہے:

سنا نہ ہووے جو سودا یہ مصرع صائب  
تو پوچھ غلق سے میں کیا کروں بیاں تھا  
کہ ایک دن میں اُسے راہ میں اکیلا دیکھ  
کہا کدھر چلے اے فخر شاعراں تھا  
دیا جواب دلم سیر باغ ی خواہد  
کہا میں ہو مہتمم کہ مہریاں تھا  
جو ہووے امر تو میں بھی چلوں رکاب کے بیچ  
رکھے ہے لطف بھی کچھ سیر بوستاں تھا  
سنا یہ مجھ سے تو کہنے لگا کہ ہوا گور  
گرفتہ الم احوالات ہا ہا ہا تھا

سودا نظیری نیشاپوری سے بھی بہت زیادہ متاثر نظر آتے ہیں۔ نظیری کی طرح وہ بکثرت  
محاورے استعمال کرتے ہیں اور بقول شیخ چاندؒ حالات و کیفیات اور معشوقانہ اداؤں  
کو سودا نے مادی اشیاء سے تشبیہ دی ہے۔ یہ سب نظیری کا اثر ہے۔ اس کے سوا اس کی  
تقلید میں مضامین کو جذبات آمیز انداز میں بھی بیان کیا ہے۔ لہٰذا نظیری کی طرح سودا نے  
بھی قطعہ بند غزلیں کہی ہیں جن میں وہ کچھ کم کامیاب نہیں ہیں۔ سودا کا ایک مقطع ہے:

یہ غزل سودا کہی ہے تو نے اس انداز کی

ہند سے پہنچے گی ہاتھوں ہاتھ نیشاپور تک

اس شعر میں سودا نے غالباً نظیری سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے۔

سودا کے ہاں ایسے اشعار کی بھی کمی نہیں، جن میں مضمون آفرینی، نازک خیالی، باریک اندیشی اور خیال بندی کے جوہر دکھائے گئے ہیں اور بظاہر یہ اثر مرزا عبدالقادر بیدل اور ناصر علی کا ہے جو اس میدان کے مرد ہیں۔ سودا ناصر علی کو نعمت خاں پر اس لیے ترجیح دیتے ہیں کہ ناصر علی کا ”خیال“ مرغوب تر ہے۔ ان کا ایک شعر ہے:

کم ہے ناصر علی سے نعمت خاں

اُس سے مرغوب تر ہے اس کا خیال

لیکن سودا پر بیدل کی گرفت زیادہ مضبوط ہے۔ انھوں نے بیدل کے مصرعے بھی تفسیر کیے ہیں۔ ان کا ایک شعر ہے:

سودا بقول حضرت بیدل بکوائے دوست

خطِ جبین ما ست ہم آغوشِ نقشِ پا

ایک اور غزل کے قطعہ بند اشعار ہیں:

سودا سے کہا میں کہ ترے شہرے کو سن کر

دیکھا جو تجھے آکے تو اے بے سرو پا بچ

بولا کہ تجھے یاد ہے وہ مصرع بیدل

عالم ہمہ افسانہ ما دارد و ما بچ

سودا قصیدے اور ہجو کے بادشاہ تھے۔ مولانا محمد حسین آزاد لکھتے ہیں۔ ”مرزا قتیل چار شربت میں فرماتے ہیں۔ ”مرزا محمد رفیع سودا در ریختہ پایہ ملا ظہوری دارد وغیر ازیں کہ زبان ہردو۔ باہم مخالف دارد۔ فرقے نتواں کرد..... مگر ظہوری کی کیا غزلیں کیا قصائد دونوں استعاروں اور تشبیہوں کے پھندوں سے الجھا ہوا ریشم ہے۔ سودا کی مشابہت ہے تو انوری سے ہے کہ محاورہ اور زبان کا حاکم اور قصیدہ اور ہجو کا بادشاہ ہے۔“ یہ جملہ خوبیاں سودا میں موجود تھیں۔ جو بظاہر اس بات کا ثبوت ہیں کہ انوری کو بھی سودا کے مزاج

میں اچھا خاصا دخل تھا۔ سودا نے ایک قطعہ بند غزل لکھی ہے جس میں الفاظ کی شان و شوکت، زور بیان اور محاوروں کے برجستہ استعمال میں وہ انوری تک پہنچ گئے ہیں۔ انھیں خود بھی اس کا احساس ہے کہ یہ مخصوص انداز سخن انوری کا ہے۔ اسی لیے مقطع میں کہتے ہیں:

غرض یہ وہ غزل قطعہ بند ہے سودا

کہ اس کی قدر کوئی کیا جز انوری جانے

سلیم اور کلیم فارسی کے مشہور تمثیل نگار شاعر ہیں۔ سودا نے ان کی غزلوں کو تفسیر بھی کیا ہے جس سے انداز ہوتا ہے کہ وہ ان دونوں شاعروں کو پسند کرتے تھے۔ ان شاعروں کی طرح سودا کے ہاں بھی تمثیل نگاری ہے اور غالباً اس لیے قدرت اللہ شوق لکھتے ہیں ”در غزل گوئی سلیم و کلیم را پس پشت می گزارد“۔

اب ہم مختلف عنوانات کے تحت سودا کی غزل گوئی کی ادبی قدر و قیمت کا تعین کریں گے۔

### داخلیت

دبستانِ دلی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں داخلیت کا عنصر زیادہ ہے جس کی بظاہر یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ جب شمالی ہند میں اردو شاعری کی داغ بیل پڑی تو حکومت کی بنیادیں ملال رائی تھیں، جس پر لکھنؤ کی بجٹ پہلے باب میں کی جا چکی ہے۔ کچھ لوگ تصوف کے فیش ٹل میں پناہ گزیں ہو گئے تھے۔ کچھ نے عیش و عشرت میں ڈوب کر زندگی کی تلخیوں کو بھلا دیا تھا۔ اس عہد کے صوفیا یا تصوف کے فلسفوں سے دل چسپی رکھنے والے عام طور پر وہ لوگ تھے جو اجتماعی زندگی سے رشتہ توڑ کر انفرادیت کو فروغ دینا چاہتے تھے۔ اردو شاعری میں شدید داخلیت انہی سماجی اور سیاسی حالات کی پیدا کردہ ہے۔ ابتدائی عہد کے بعض اردو شاعر خود صوفی تھے اور اکثر شاعروں کو تصوف سے دل چسپی تھی۔ اسی لیے خود میں ”گم رہنے کا انداز“ اپنی ذات کے علاوہ تمام کائنات کو فراموش

کر دینے کی تمنا، محبت میں محبوب سے بھی بے نیاز ہو جانا داخلیت کے یہ مختلف روپ شاعری میں بہت مقبول ہوئے۔ داخلیت کے شہنشاہ میر تقی میر ہیں جو برباد ہو گئے لیکن ہارے نہیں۔ جنھوں نے ایک زندہ صوفی کی طرح خود کو گم کر کے پوری کائنات کو حاصل کیا۔ سودا کے ہاں بھی داخلیت ہے مگر اس میں میر کا سا سوز و گداز اور خشکی و برہنگی کی بجائے رنگینی اور سرمستی ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ نے میر اور سودا کی داخلیت اور اظہارِ غم پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔ ”مرزا سودا اپنی فطرت اور مزاج کے اعتبار سے میر اور درد سے مختلف آدمی تھے مگر انھوں نے بھی زمانے کی لاشی کھائی تھی۔ انھوں نے متین اور باوقار احتجاج کی بجائے ہزل اور سو قیت کے دامن میں پناہ لی۔ سودا کے انداز کو ہڈیاں غم سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔“<sup>۱</sup> ہمیں ڈاکٹر صاحب کی اس رائے سے اختلاف ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ سودا کے ہاں میر، درد اور قائم اور اثر جیسی داخلیت نہیں ہے۔ وہ خارجی شاعر ہیں۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اردو شاعری میں خارجیت کو فروغ انھوں نے ہی دیا اور ان کی غزل میں جو خارجیت ہے وہ ہزل اور سو قیت سے پاک ہے۔

سید امداد امام سودا کی داخلیت سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”خارجی پہلو کو تو مرزا صاحب ایسا برتتے ہیں کہ زبانِ اردو میں سوا میر انیس کے کوئی ان کا جواب نہیں ہے۔ مگر داخلی پہلو پر ان کو ویسی قدرت حاصل نہ تھی جس کے سبب سے وہ میر تقی صاحب میر سے غزل سرائی میں پیچھے نظر آتے ہیں۔“<sup>۲</sup>

سودا کی داخلیت میں خارجیت کی بھی ہلکی سی چاشنی ہوتی ہے۔ ان کے ہاں بہت کم ایسے اشعار ملتے ہیں جن میں صرف داخلیت ہو چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں:

عاشق تو نامراد ہیں پراس قدر کہ ہم  
دل کو گنوا کے بیٹھ رہے صبر کر کہ ہم

۱۔ سید عبداللہ، نقد میر، دہلی، ص ۷۲  
۲۔ امداد امام اثر، کاشف الحقائق، ۲، ص ۱۰۶

اتنا کہاں ہے سوزِ طلبِ دلِ پتنگ کا  
رکھتی نہیں ہے شمع بھی ایسا جگر کہ ہم

---

بس نہ تھا اک داغِ اے دل پھر تو اس سے لگ چلا  
اُس دلی آتش کو ڈرتا ہوں نہ سلگائے فراق

---

بیٹے سے سوزِ عشق ترا ہاتھ کب اٹھائے  
تا پھوٹ کر جگر سے نہ ہو جائے پارِ داغ

---

دیکھا جو ادھر خدا سے ڈر کر  
دل خالی کیا میں آہ بھر کر

---

کیوں مجھ کو نہ مارا غمِ دوری نے ترے آہ  
کس منہ سے کروں گا میں پھر اظہارِ محبت

تصورِ حسن و عشق

ناممکن ہے کہ سودا قہیل غمزہ عشوہ نہ رہے ہوں۔ لیکن ان کا عشق بھی لاکھوں انسانوں کی  
طرح معمولی عشق تھا جس کی بنیاد جنی کیفیات سے زیادہ جسمانی ضروریات پر ہوتی ہے۔



سودا کا دل و دماغ عشق کے معمولی تجربات اور روایتی مضامین تک محدود ہے۔ اس لیے وہ اس مقام سے محروم ہیں جہاں عشق، مادی کثافت کے پردے چاک کر کے حقیقت کا انکشاف کرتا ہے اور عاشق کے دل میں ایک فرد کا نہیں بلکہ پوری کائنات کا درد سمودیتا ہے۔ ان کے ہاں ماورائیت اور روحانی عشق کی جھلکیاں بھی نظر آ جاتی ہیں۔ مگر یہ عشق صرف ذہن و فکر تک محدود ہے جس کا عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ اس عشق کی بنیاد ان فلسفوں پر ہے جو اس رو بہ زوال تہذیب میں ذہین انسان کے آخری پناہ گاہ بنے ہوئے تھے۔ ان کے مادی عشق میں وہ بلندی اور رفعت نہیں جو وحشی آسودگی کا ذریعہ ہوتی ہے۔ ان کا عشق صحت مند نہیں اسی لیے ان کے ہاں وہ درد اور کسک نہیں جو ہمیں تڑپا دیتی ہے جس کی وجہ سے ان کے اشعار ہمارے دل کی گہرائیوں کو نہیں چھو پاتے۔

ان کے ہاں عشق کے بیشتر مضامین محض رسمی اور روایتی ہیں اور عشق کا تصور وہی ہے جو اس دور میں مقبول تھا جس میں جنس اور روحانیت، محبوب اور خدا خلط ملط ہو گئے ہیں۔ صوفیاء کے ہاں مادی عشق کی بہت اہمیت تھی کیوں کہ یہ خدا تک پہنچنے کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے یہ حضرات اپنے مریدوں کو مجازی عشق کی ہدایت کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جب تک انسان خود کو مادی عشق میں جلا کر خاک نہ کرے اسے یہ حق نہیں ملتا کہ وہ خدا تک پہنچنے کی تمنا کرے۔ میر تقی میر کے والد میر کو نصیحت کیا کرتے تھے کہ:

”بیٹا عشق کرو۔ عشق ہی اس کارخانہ ہستی کا چلانے والا ہے..... بغیر عشق کے زندگی وبال ہے۔ عشق میں جی جان کی بازی لگا دینا ہی کمال ہے۔ عشق ہی بناتا ہے۔ عشق ہی جلا کر کندن کر دیتا ہے۔“<sup>۱</sup>

اسی قسم کی نصیحت نقشبندی سلسلے کی ایک برگزیدہ ہستی یعنی مرزا مظہر جان جانا کو ان کے والد بھی کیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ”جس انسان کا دل محبت کے داغوں سے برشتہ نہیں ہوا اور اس کی طبیعت کے خاشاک جل کر خاک نہیں ہوئے اور دل پاک نہیں ہوا اس کی طینت کی زمین خدا کی محبت کے ختم کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ کیوں کہ مجازی عشق زینہ ہے عشق کا۔ اگر

۱۔ میر تقی میر، میر کی آپ بیتی، مترجمہ ثار احمد فاروقی، دہلی، ۱۹۵۷ء، ص ۳۳

تم نے عشق مجازی کا رشتہ طوقی گلو نہ کیا اور کوچہ و بازار میں رسوا و خوار نہ ہوئے تو فقیر کی روح تم سے خوش نہیں رہے گی۔<sup>۱</sup> سودا کے ہاں اس عشق کا تصور تو ملتا ہے مگر صرف رکی طور پر۔ ان کا شعر ہے:

ناصحا اس عشق سے ہوتا ہے لذت یاب دل  
جس میں حرمت کم ہو رسوائی و خواری بیشتر

ایک اور شعر ملاحظہ ہو:

سودا ہوئے جب عاشق کیا پاس آبرو کا  
سنتا ہے اے دیوانے جب دل دیا تو پھر کیا

اس عشق میں سر پر خاک ڈالنی پڑتی ہے۔ گریبان چاک کر کے خاک و خون میں نہانا پڑتا ہے۔ عشق کی لذت تو اسی میں پنہاں ہے کہ انسان ناکام رہے اور خون جگر کھاتا رہے۔ بقول سودا خضر نے آب حیات صرف اس لیے پیا تھا کہ وہ خون جگر کی لذت سے محروم نہیں ہونا چاہتے تھے۔

عشق میں خون جگر کھانے کی گر لذت نہ تھی

خضر نے حیراں ہو آبِ زندگانی کیوں پیا

عشق میں لطف ہی ناکامی کا ہے۔ اگر عاشق کی آہ و زاری کا اثر محبوب پر ہو جائے تو وہ عشق کی اصل لذت سے محروم ہو جاتا ہے۔

تاثرِ عشق نے مزہ درد کھودیا

اُن نے ندان دیکھ مرا حال رو دیا

سودا کو اس کا افسوس ہے کہ ”غیم دوری“ میں وہ زندہ رہے۔ گویا ان کی محبت میں ابھی کمی

تھی۔ اب ان کی غیرت اور حمیت اجازت نہیں دیتی کہ محبوب کے پاس جائیں اور اظہارِ محبت کریں :

کیوں مجھ کو نہ مارا غم دوری نے ترے آہ

کس منہ سے کروں گا میں پھر اظہارِ محبت

عشق میں وہ دونوں انسان کامیاب ہیں جنہوں نے اپنے محبوب کو پالیا یا جو محبوب کے راستے پر شہید ہو گئے۔ سودا کو بکن کی اس لیے تعریف کرتے ہیں کہ وہ اگر ”قمارِ عشق“ میں شیریں کو نہ پاسکا تو کیا ہوا۔ اس نے اپنا سر تو کھودیا اور پھر سودا خود کو لعنت ملامت کرتے ہیں اور شرم دلاتے ہیں کہ جب اُن سے یہ بھی نہ ہو سکا تو پھر کس منہ سے خود کو ”عشق باز“ کہتے ہیں:

سودا قمارِ عشق میں شیریں سے کو بکن

بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھوسکا

کس منہ سے پھر تو آپ کو کہتا ہے عشق باز

اے روسیہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

اور پھر یہاں سے سودا کے عشق میں ماورائیت پیدا ہونی شروع ہوتی ہے۔ اُن کا عشق افلاطونی بننے لگتا ہے۔ شاعر پر محبوب کی آنکھوں کا جادو چلتا ہے اور نہ زلفوں کا سحر۔ وہ عشق برائے عشق کرتا ہے:

نہ آنکھوں میں تری جادو نہ ہرگز سحر زلفوں میں

یہ دل جس سے ہے دیوانہ محبت کا ہے وہ لٹکا

عشق ایک فن شریف ہے جو ہر بواہوس کے بس کی بات نہیں۔ مرزا مظہر کا ایک شعر ہے:

ہوس عشق مکن اے دل بے صبر و قرار

عاشقی فن شریفے ست ولے کارِ تو نیست

سودا کہتے ہیں:

گر کہیں عاشق ہے اے سودا تو میں تجھ سے کہوں  
وہ عمل میں لائیو جو نیک ہو کردارِ عشق

ایک اور شعر ہے:

عشق سے صاف دلوں کو نہیں تازی نسبت  
رہے تھا سنگ میں پہلوے شرر آئینہ  
عشق کا وہ مسلک ہے جس میں انسان کے جذبے کی قدر ہے۔ جہاں فلاں ابن فلاں کی  
کوئی قیمت نہیں۔ عشق کا کوئی حسب ہے اور نہ نسب بقول سودا:

کہتے ہیں جسے عشق سو وہ چیز ہے سودا  
جوں ذاتِ خدا جس کی حسب ہے نہ نسب ہے  
عشق کا گھر دیو حرم کی طرح تنگ بھی نہیں۔ اس میں اتنی کشادگی اور وسعت ہے کہ  
ہر فرقے، ہر جماعت اور ہر مذہب کے لوگ اس میں آسکتے ہیں۔  
عشق وہ گھر ہے جہاں ہفتا دود و ملت کو ہے راہ  
تنگ جوں دیو حرم کب در ہے اس درگاہ کا  
عشق ایک مذہب ہے۔ اسلام میں خلافِ شریعت کام کرنے والے کو دوزخ میں ڈالا  
جائے گا لیکن مذہبِ عشق میں گناہ کرنے والے کے لیے بڑی سزا ہے۔ خدا کی بنائی ہوئی  
دوزخ نارِ عشق کا ایک شتمہ ہے:

عشق کے ذرہ شریعت سے قدم باہر نہ رکھ

سمجھے ہے دوزخ کو اپنا ایک شتمہ نارِ عشق

اگر جذبہ صادق ہے اور عاشق سلامت روی سے راہ عشق طے کرتا ہے تو بندگی اپنی انتہا کو پہنچ کر خداوندی ہو جاتی ہے اور بقول سودا :

کمال بندگی عشق ہے خداوندی

کہ ایک زن نے مہ مصر سا غلام لیا

اگرچہ محبوب گوشت پوست کا انسان ہے لیکن حقیقت میں یہ مظہر خداوندی ہے۔ خدا کا نور ہے جو خوب صورت انسانوں کے سانچوں میں ڈھل گیا ہے۔

کفر کی میری تحلی ہے نظیر شمع طور

پوجوں ہوں جس بت کو میں اک نور ہے اللہ کا

### محبوب

سودا کے عشق کا بھرم اُس وقت کھلتا ہے جب وہ اپنے محبوب کی تعریف کرتے ہیں۔ ان کے ہاں محبوب کا کوئی مکمل اور جامع تصور نہیں۔ انھوں نے محبوب کے جسم، بعض اعضا اور صفات کی ضرورت کی ہے۔ مگر پورا کلیات سودا پڑھنے کے بعد بھی ہمارا ذہن سودا کے محبوب کی تصویر بنانے میں ناکام رہتا ہے۔ اس کی شخصیت اور سیرت الفاظ کے گورکھ دھندے میں چھپی رہتی ہے۔ بظاہر اس کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ خود سودا کے ذہن میں کوئی حسین تصویر نہیں تھی۔ ان کے ہاں ذاتی تجربات مشاہدات اور انفرادی حیات و تاثرات کی شدید کمی ہے۔ انھوں نے خوبصورتی کو جانچنے کے تمام پیانے مستحضر لیے ہیں۔ ان کا اپنا کوئی معیار نہیں۔ اسی لیے محبوب کی تعریف اور توصیف میں انھوں نے جتنے بھی مضامین باندھے ہیں۔ ان میں کہیں بھی محبوب کی انفرادیت نہیں ابھرنے پائی۔

اُن کے ہاں وہ معاملہ بندی بھی نہیں جو انشاء و جرأت اور بعض دوسرے شاعروں کے ہاں مل جاتی ہے اور جو کم از کم ایک زندہ محبوب کا پتا دیتی ہے۔

سودا کا محبوب امر ہے ایسے اشعار کی تعداد اچھی خاصی ہے، جن میں انھوں نے اپنے

محبوب کے ”خط“ کے متعلق گل افشائیاں کی ہیں۔ خط کا تعلق جمالیات سے نہیں۔ حیات اور تاثرات سے بھی بہت کم ہے۔ یہ مضمون صرف شعر کہنے کے لیے ہوتا ہے۔ اس موضوع پر سودا کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

جز خط سبز عارضِ دلدار ہم نشیں  
دیکھا ہے آپ نے یہ کبھو رنگ اور نمک

خط آچکا پہ مجھ سے وہی ڈھنگ اب تک  
ویسا ہی میرے نام سے ہے نگ اب تک

خط سبز اس کے سے عارض پر ہو گیا دونی صفا  
یہ وہ آئینہ ہے بہو نچادے جسے زنگار فیض

کوچ شاہ حسن کا ہے وہ غبارِ خط نشان  
گرد لشکر سے اٹھی وقتِ سواری بیشتر

ممکن ہے بیت کے اعتبار سے اس قسم کے بعض اشعار کا شمار عظیم شاعری میں ہو جائے۔ لیکن جہاں تک مضمون اور مواد کا تعلق ہے یہ تیسرے درجے کی معمولی سطحی اور ناقص شاعری ہے۔ پہلے شعر کا مضمون ”رنگ اور نمک ردیف اور قافیہ کا مرہون منت ہے۔“ ”نمک“ ردیف ہے اور ”رنگ“ قافیہ۔ دوسرا شعر مطلع ہے اور ظاہر ہے کہ ”ڈھنگ“ اور ”نگ“ کے قافیہ اس کی تخلیق کے موجب ہیں۔ تیسرا شعر ”خط سبز“ ”دونی صفا“، ”آئینہ“ اور ”زنگار“ جیسے الفاظ کا گورکھ دھندا ہے۔ چوتھے شعر میں ایک خوب صورت تشبیہ

ہے۔ ان تمام اشعار سے سودا کی قادر الکلامی کا ضرور پتا چلتا ہے۔ لیکن ان میں سے کوئی شعر بھی ہماری جمالیاتی حس کو اپیل نہیں کرتا۔

اب چند ایسے اشعار ملاحظہ ہوں جن میں سودا نے محبوب کے جسم، خط و خال اور بعض اعضاء کی تعریف کی ہے:

عالم کا قمری آسا ہے طوق بندگی کا

قامت کو تیرے جیسے سرو روا بنایا

-----

لب لعلی بتاں پر سرخی پاں ہے کہ چادو ہے  
بنادی شکل طوطی صورتِ سرخاب آتش پر

یہ اس کے رنگ عارض سے ہے دل بیتاب آتش پر  
نٹھرتا ہی نہیں سینے میں جوں سیاب آتش پر

-----

دیکھے اگر صفائے بدن کو ترے صبا

کھولے کبھو نہ شرم سے بندقبائے گل

-----

خال زیر زلف پر مت جی چلا اے مرغِ دل

مان میرا بھی کہا یہ دام بے دانہ نہیں

-----

سودا خرام قد کو ترے دیکھ کر کہے

ہے رات تو یہ کہ ہوا یاں تمام ناز

-----

ہے خوبی دندان دہن خوبیوں میں لیکن  
بتیسی کہوں اس کی کہ موتی کی لڑی ہے

---

تہنم یوں نمایاں ہے مٹی آلودہ دندان سے  
نہ ہو ابر یہ میں اس طرح بجلی کی لہچلیاں

---

دندان و لب پہ سارے تھنیم جاں میں لیکن  
مٹی دو انگلی مل کر کھایا جو پان مارا

---

ہے سرو سے قامت کے ترے قمری تو والہ  
اور کبک دری تک تری رفتار کا عاشق

---

نازک اندامی کروں کیا اس کی اے سودا بیاں  
شع ساں جس کے بدن پر ہو پیچے کا خراش

---

ان تمام اشعار میں محبوب کے جسم اور اعضا کی تعریف کی گئی ہے۔ مگر کوئی ایک شعر بھی ہماری جمالیاتی حس کی آسودگی کا سامان نہیں بن سکتا۔ یہ سب روایتی مضامین ہیں۔ محبوب کی یہ تمام صفات سو فی صدی ریکی ہیں۔ جن پر فارسی اور اردو کے ہزاروں شاعر طبع آزمائی کر چکے ہیں۔ ان میں صرف سودا کا طرز بیان اور تشبیہات و استعارات ہیں جنہوں نے



انہیں گوارا کر دیا ہے۔ ان اشعار کو پڑھ کر یہ گمان ہوتا ہے کہ سودا کی توجہ زبان و بیان پر تھی۔ وہ محبوب کی خوبیوں سے اتنے متاثر نہیں ہیں کہ ان کے احساسات اور جذبات بے تکلف، سادہ اور بے ساختہ زبان اور لب و لہجہ میں ڈھل جائیں۔ وہ محبوب کی قامت سے زیادہ ”قمری“ طوق بندگی“، ”سرورواں“ پر توجہ صرف کرتے ہیں۔ محبوب کے لب لعلیں اُن کے لیے اتنے اہم نہیں جتنے کہ ”طوطی“، ”سرخاب“ اور ”آتش“ ہیں۔

سودا اور ان کے محبوب کے تعلقات بھی بہت عبرت ناک ہیں۔ وہ اپنے محبوب کی نظر میں ذلیل و خوار رہتے ہیں۔ رقیبوں کو ہمیشہ اُن پر ترجیح دی جاتی ہے۔ اُن سے محبت یا ان پر التفات تو بہت دور کی بات ہے۔ ان کا ذکر آتے ہی محبوب میلوں دور بھاگ جاتا ہے۔ وہ جب محبوب کو دردِ دل سناتے ہیں تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑتا ہے۔ اس قسم کے مضامین ابتدا سے لے کر آج تک تقریباً تمام غزل گو شعرا کے ہاں ملتے ہیں۔ یہ غزل کے روایتی مضامین ہوتے ہیں جو اکثر محض قافیے کی مجبوری سے باندھے جاتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ شاعر اور محبوب کے اصل تعلقات کی جھلکیاں بھی ہوتی ہیں جن میں محبت یک طرفہ نہیں ہوتی بلکہ محبوب بھی عاشق پر فدا ہوتا ہے جن سے عاشق کی خودداری اور عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ دونوں کے قابلِ احترام انسانی رشتے کا پتہ چلتا ہے۔ مگر سودا اور ان کے محبوب کے تعلقات ہمیشہ ہی مضحکہ خیز رہتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ڈرتے ڈرتے جو کہا میں کہ ترا عاشق ہوں

قہقہہ مار لگا کہنے وہ طنز، درست

-----

ٹک سادہ دلی پر تو مرے رحم کراے یار

ہوں تجھ سے ستم گر سے طلب گارِ محبت

-----

باتیں مجھے بھاتی ہیں بامیزشِ دشنام  
ہوں اس لیے اس شوخ کی گفتار کا عاشق

دیکھے ہے مجھ کو اپنی گلی میں تو پھر مجھے  
وہی ہی گالیاں ہیں وہی سنگ اب تلک

سنتا ہے جس جگہ وہ مرا ذکر ایک بار  
بھاگے ہے وہاں سے لاکھ ہی فرسنگ اب تلک

### تصوف

سودا کے ہاں تصوف کے مضامین صرف برائے شعر گفتن ہیں اور بقول محمد حسین آزاد ”تصوف جوایشیا کی شاعری کی مرغوب نعمت ہے۔ اس میں مرزا پھیکے ہیں۔ وہ حصہ خواجہ میر درد کا ہے۔“ سودا شہر آشوبوں اور ہجوؤں کے سہارے زوال پذیر سماج کا مقابلہ کرتے رہے۔ ان کے لب و لہجے میں جو تضحیک اور طنز و خنجی ہے انہی حالات کی پیدا کردہ ہے۔ جنہوں نے بعض لوگوں کو تصوف کی پناہ گاہ میں جگہ دی تھی جس پر پہلے باب میں تفصیلی بحث کی جا چکی ہے۔ سودا تصوف کو صرف فلسفہ کی حد تک مانتے تھے۔ ان کی عملی زندگی میں اسے کوئی دخل نہیں تھا۔ ان کے کلام میں تصوف کے جتنے مضامین ملتے ہیں۔ ان کی بنیاد تصوف کے مقبول عام فلسفوں پر ہے۔ سودا یہ تسلیم کرتے ہیں کہ کائنات کے ذرے ذرے میں خدا کا ظہور ہے لیکن نگاہ دیدہ تحقیق کی ضرورت ہے۔ وہ مویٰ تھے جنہیں خدا کا جلوہ دیکھنے کے لیے کوہ طور پر جانا پڑا۔ اگر دیکھنے والی آنکھ ہو تو ہر سنگ میں اس کے ظہور کا شرار دیکھا جاسکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

سودا نگاہ دیدہ تحقیق کے حضور  
جلوہ ہر ایک ذرہ میں ہے آفتاب کا  
ہر سنگ میں شرار ہے تیرے ظہور کا  
موسیٰ نہیں کہ سیر کردوں کوہ طور کا

جسے بلبل صرف گلستاں میں دیکھتی ہے۔ وہ بیاباں کے ہر خار میں موجود ہے۔ زلیخا کو جو نور  
صرف مکناں میں نظر آیا تھا۔ وہ ہر ستارے میں نظر آسکتا ہے بشرطیکہ چشم بینا ہو

بلبل نے جسے جا کے گلستان میں دیکھا  
ہم نے اسے پُر خار بیابان میں دیکھا  
روشن ہے وہ ہر ایک ستارے میں زلیخا  
جس نور کو تو نے مکناں میں دیکھا

سودا مذہب کی ان ظاہری رسوم کے خلاف ہیں جو انسانوں میں تفریق اور ایک دوسرے  
سے نفرت پیدا کرتی ہیں۔

خدا سے محبت کرنے والوں کے لیے مسجد اور مندر کی کوئی قیمت نہیں ان کے لیے دل سب  
سے بڑی عبادت گاہ ہے۔

دیر و حرم کو دیکھا اللہ رے فضولی  
یہ کیا ضرور تھا جب دل کا مکاں بنایا

شیخ کعبہ دل کی حقیقت سے بے بہرہ ہے اور خانقاہ و مدرسہ کی الجھنوں میں گرفتار ہے:

کعبہ دل کی حقیقت کو پہنچا اے شیخنا  
خانقاہ و مدرسہ تیرا ٹھکانہ ہے عبث

جس نے ذات باری تعالیٰ کا نشان پایا ہے۔ وہ پھر رام و رجم سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ خدا ہندو یا مسلمان نہیں ہے، یہ مسجد و مندر انسان کی اپنی تخلیق ہیں۔

ہے مگر ایہ زباں کہنے سے اب رام و رجم  
جن نے پایا ہے نشان اس کو نہیں نام سے کام

سودا کی نظر میں وہ انسان قابل عزت و احترام ہے جو دوسرے انسانوں سے محبت کرتا ہے۔ ہندو بتوں کی پوجا کرتے ہیں۔ مسلمان خدا کی عبادت کرتے ہیں۔ لیکن سودا اس شخص کو پوجتے ہیں جو آشنا پرست ہے۔

ہندو ہیں بت پرست مسلمان خدا پرست  
پوجوں میں اس کسی کو جو ہو آشنا پرست

ایک بت خانے کو تو ذکر مسجد بنانے سے اتنا ثواب نہیں ہوتا جتنا برہمن کا دل توڑنے سے گناہ ہوگا۔

تو ذکر بت خانے کو مسجد بنا کی تو نے شیخ  
برہمن کے دل کی بھی کچھ فکر ہے تعمیر کا

خدا کو تلاش کرنا ہے تو انسانوں ہی میں تلاش کرو۔ خدا کے بندوں کی دل جوئی کرو۔ خدا خود مل جائے گا:

شیخ کعبہ میں خدا کو تو عبث ڈھونڈے ہے  
طالب اس کا ہے تو ہر ایک کی کر دل جوئی

سودا کے ہاں جو کہیں کہیں انسانی عظمت کا احساس ملتا ہے۔ وہ بھی تصوف کی دین ہے۔ مثلاً:

جو خاک نشیں ہیں نہ سمجھو انھیں قدر

وہ دانہ ہے خرمن جسے مائی میں رلایا

### واعظ وزاہد

صوفی حضرات اہل باطن ہوتے ہیں جو تصنع، بناوٹ اور دکھاوے سے نفرت کرتے ہیں۔ ان کا مقصد خدا تک پہنچنا اور خود کو خدا کی ذات میں گم کرنا ہوتا ہے۔ وہ اس کی قطعی پروا نہیں کرتے کہ ان کے بارے میں عوام کی کیا رائے ہے۔ اس کے برعکس زاہد اور واعظ کی زندگی میں مکر اور ریا کو دخل ہوتا ہے۔ ان کے کردار اور گفتار میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ان کی تنہائیاں رند مشرب کی زندگی کی طرح رنگین اور ہر طرح کے گناہوں سے لبریز ہوتی ہیں۔ سودا جیسے ظریف انسان کو اس سے بہتر اور کیا موضوع مل سکتا تھا۔ ان کے دیوان میں سیکڑوں اشعار ایسے ہیں جن میں واعظ کا معشکہ اڑایا گیا ہے اور اکثر اشعار میں نظریاتی اختلاف سے زیادہ معشکہ اڑانے کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔ یہاں صرف چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔

پھرے ہے شیخ یہ کہتا کہ میں دنیا سے منہ موڑا  
الہی ان نے اب داڑھی سوا کس چیز کو چھوڑا

-----

مغ نے دی پگڑی پہ زاہد کے مجھے قرض شراب  
کام سودا ہی کا ہوتا ہے خدا ساز درست

-----

شیخ اتنا تو جتاؤ نہ تم اپنا تقویٰ  
عوضے کرو ہے بجہ و دستار ہنوز

-----

شیخ صاحب سے مریدوں کو نہیں زہار فیض  
بخشتے ہے رندوں کو ان کا جبہ و دستار فیض

-----

کہا تو مان لے سودا کا، توبہ کر اس سے  
لب و دہن کے تئیں کر کے شست و شوا عظم

### بے ثباتی

صوفی شعرا کا یہ بہت محبوب موضوع ہے۔ بے ثباتی اور قناعت کے فلسفے زوال پذیر سماج میں بہت مقبول ہوتے ہیں۔ اگر بعض مصلح دماغوں نے حکمران طبقے کی عیش کو شکی اور دنیا پرستی کے خلاف بے ثباتی اور قناعت کے فلسفوں کو پیش کیا تو عوام کی اخلاقی صحت و درستی کے لیے۔ لیکن یہ فلسفے شکست خوردہ انسانوں کے زخموں پر مرہم کا کام بھی کرتے رہے ہیں۔ اگر انسان مادی دنیا میں ناکام رہے تو دل کو یہ کہہ کر تسکین دے لیتا ہے کہ یہ دنیا ناپائدار ہے۔ یہاں ہمیشہ کس کی بنی رہی ہے۔ دنیا کی مثال اس سورج کی ہے جو صبح پوری تابنا کیوں کے ساتھ جلوہ گر ہو۔ لیکن شام ہوتے ہوتے جس کا چہرہ زرد پڑ جائے۔ پھر ایسی ناپائدار چیز سے دل لگانے سے فائدہ؟ سودا نے اس موضوع پر بہت شعر کہے ہیں:

رخصت ہے باغباں کہ ٹلک دیکھ لیں چمن  
جاتے ہیں وہاں جہاں سے پھر آیا نہ جائے گا

-----

دور سا غرق تھا ابھی یا ہے ابھی چشم پر آب  
دیکھ سودا گردشِ افلاک سے کیا کیا ہوا

-----

مہاں جو کوئی آیا گھر آساں دنی کے  
دو دن کھلا کے روٹی اس کو ندان مارا

---

آراستہ جو بزم ہوئی دورِ فلک میں  
واں جام بجز گردشِ ایام نہ آیا  
ہے رنگ تماشا ئے جہاں صورتِ خورشید  
صبح کو دیکھا وہ نظرِ شام نہ آیا

---

انتہا عیشِ جہاں کی جو تو دیکھا چاہے  
بزمِ مستاں پہ نگہ غور سے کرا آخر شب

---

اس جامہ پہ اتنا نہ ابھر بلبلے کی طرح  
جامہ یہ ترا پوچ ہے تو غیر ہوا بیچ

---

کرخانہ گردوں پہ نظرِ چشمِ فنا سے  
ہے مثلِ حباب اس کی بھی تعمیر ہوا پر

---

دیوے تھے وہ کچھ کہ نہ پھر چھین لے تھے سے  
زنہار نہ رکھ یہ طمعِ خام جہاں پر

---

کچھ اس چمن میں آ کے نہ دیکھا میں جوں حباب  
آب رواں کو سیر کیا سو بھی یک نفس

### قناعت

اگرچہ سودا ہرگز قانع نہیں تھے۔ ان کی تمام زندگی امیروں اور نوابوں کی قصیدہ خوانی میں گزری۔ مگر ان کے کلام میں قناعت کے موضوع پر جتنے اشعار ملتے ہیں تصوف کے کسی اور فلسفہ پر نہیں ملتے۔ بظاہر اس کی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ اُس دور کے عوام میں قناعت کے فلسفے کو بہت زیادہ مقبولیت تھی جو اس دور کے سیاسی اور سماجی حالات کا ردِ عمل تھا۔ مغل تخت پر اتنی تیزی سے بدلتے ہوئے بادشاہوں کو دیکھ کر انسان گوشہ نشینی کے سوا کچھ بھی کیا سکتا تھا۔ سودا کا شعر ہے۔

خطرہ ہے تجھ سے مسند شاهی کو اے فلک

حاضر ہے پوست سخت مرا پشم تو اکھاڑ

دہلی کی عظیم الشان عمارتوں اور حویلیوں کو اجڑا ہوا اور برباد دیکھ کر انسان سوچتا تھا کہ ان حویلیوں کا مالک بننے سے بہتر ہے کہ وہ کلاؤ فقیر سر پر سجالے۔ بقول سودا:

منعم نہ مر بنائے عمارت کی فکر میں

یہ سب حویلیاں تھیں جہاں تک ہیں اب اجاڑ

-----



ایسی بچی ہے سر پہ سہارے کلاہ فقر  
جس کے حضور ہو نہ سکے تاج شاہ سبز

گھر امن کا اسی کو ملا زیر آسماں  
جس نے جہاں میں آن کے مہار کی ہوس

مفلوس کو نہیں دنیا میں کسی کا خطرہ  
خوف ہے ان کو کہ جو دام و درم رکھتے ہیں

گو منتظر دعا کا ہمارے ہے اب قبول  
دست و دہن پیاریے اپنی یہ خو نہیں

یہ رتبہ جاو دنیا کا نہیں کم مال زادی سے  
کہ اس پر روز و شب میں سینکڑوں ہی چڑھتے آتے ہیں

دیکھی نہ بنا ہم نے وہ قصر فریدوں کی  
جو اپنے خرابہ کی تعمیر نظر آئی

سودا کے عہد میں تبدیلی اتنی تیزی سے ہو رہی تھی کہ قناعت کے علاوہ اور کوئی چارہ  
نہیں تھا۔ کل جو تخت پر تھا، آج بھیک مانگ رہا ہے۔

طلب نہ چرخ سے کرنا تو راحت اے سودا  
پھرے ہے آپ وہ کاسہ لیے گدائی کا

سیم و زر کے آگے سودا کچھ نہیں انسان کی  
خاک میں رہنا بھلا تھا بلکہ اس اکسیر کا

بیخانے میں ازل کے مرے دل سے زاہدا  
دھویا ہے نقش ساقی نے امید و بیم کا

بیٹھ رہ سودا تسلی دل کو دے  
در بدر منت سے کیا حاصل پھرا

حباب آسا کیا ہے کار استغنا تمام اپنا  
رکھا محروم میں قطرے سے اس دریا میں جام اپنا

طمع دولت کی پیٹاب و تعب مت رکھ زمانے سے  
مہوس تانا نہ جھونکے آگ میں مس زرنہیں ہوتا

-----

مجھ گدائے بھی کسی شاہ سے ڈالا نہ سوال  
گو مجھے بخت نے اسکندر و دارا نہ کیا

-----

دیر بانٹے تھا متاع دو جہاں اے سودا  
بے نوائی نے مری اس کو اشارا نہ کیا

-----

شاہاں سے سوال اپنی رعونت شکنی ہے  
کوئین تلک ورنہ ہے پیش فقرا پچ

-----

نہ دیکھی خوشدی جز یک تبسم ہم نے غنچے میں  
ہوا سے اس چمن کے ہے دلا ترک ہوس بہتر

-----

نظر میں ان کے جن کو دولت استغنائے بخشی ہے  
گس سے ہے ہما بہتر ہما سے ہے گس بہتر

## احساس تشنگی

سودا کو اس سیاسی، سماجی، معاشی اور تہذیبی زوال کا شدید احساس ہے، جس نے حکمران طبقے سے لے کر عوام تک ہر فرد کی زندگی کو اجیرن بنا رکھا تھا۔ سودا کی بے جوہر آشوب، طنز و طعنت اس حقیقت کا ثبوت ہیں کہ ان میں سیاسی اور سماجی شعور تھا۔ وہ حالات کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن دورے میں جو مروجہ علوم ملے تھے اور جن فلسفیوں اور ادیبوں نے ان کی شخصیت بنائی تھی ان میں سے کوئی سودا کی رہنمائی نہیں کر سکتا تھا اور سودا حالات کا تجزیہ نہ کر سکے اور زوال کے گہرے اندھیرے میں دور تک روشنی کی کرن نہ دیکھ سکے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے یہاں تشنگی، پیاس اور بے چینی کا احساس پیدا ہو گیا۔ انھوں نے زندگی میں سب کچھ حاصل کیا۔ دولت، عزت اور شہرت ہمیشہ ان کے غلام رہے لیکن جب سودا اپنے ارد گرد کے ماحول پر نظر ڈالتے تو انھیں ایسے لوگ بھی نظر آتے جو حوادثِ زمانہ کے شکار تھے، سودا خود کو اس سماج کے اعلیٰ طبقے کا ایک فرد سمجھتے تھے۔ اس لیے اس طبقے کی بربادی خود ان کی بربادی تھی۔ شریفوں کو ذلیل اور ذیلیوں کو شریف بننے دیکھ کر وہ تڑپ اٹھتے ہیں۔ وہ جاگیرداری نظام کے پروردہ تھے۔ جس میں شرافت کا دار و مدار انسان کے خاندان، خون اور حسب و نسب پر ہوتا ہے۔ ذاتی صلاحیتوں پر نہیں۔ سودا اس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جس کی زبانوں حالی عبرت ناک تھی۔ ان کے سامنے اعلیٰ طبقے کا اقتدار پاش پاش ہو رہا تھا، اور نچلے طبقے کے بعض ذہین افراد اپنی ذاتی کوششوں، سازشوں اور چال بازیوں سے دولت اور طاقت حاصل کر رہے تھے۔ زوال کے اس خطرناک طوفان میں بعض لوگ ایسے ساحل پر اتر گئے جہاں تصوف کے فلسفوں کی مدد سے انھوں نے زندہ رہتے ہوئے بھی زندگی سے فرار حاصل کر لیا اور وقتی طور پر مصائب و آلام سے نجات پالی۔ مگر سودا کے پہلو میں دل نہیں تھا اور دماغ بہت ہی مشکل سے تصوف سے سمجھوتہ کر سکتا تھا۔ اس لیے حالات کی تنگی تلوار ہمیشہ ان کی گردن پر لٹکی رہی۔ وہ اپنے دور کے سیاسی اور سماجی حالات سے کس حد تک متاثر تھے، انھوں نے

حالات کا کس طرح تجزیہ کیا اور ان پر کس طرح تنقید کی ہے؟ اس پر تفصیلی بحث ”شہر آشوب“ کے باب میں کی گئی ہے۔ یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ اگرچہ مالی اعتبار سے سودا تقریباً تمام زندگی آسودہ رہے۔ انھیں اپنے عہد کے امراء و رؤسا اور نوائین کی سرپرستی حاصل رہی۔ لیکن انھیں یہ احساس ہمیشہ پریشان کرتا رہا کہ آسمان ان کے حق میں بخیل ہے۔ انھیں دنیا میں وہ سب کچھ نہ مل سکا جس کے وہ مستحق ہیں۔ سودا نے اپنی ناکامی کا ذکر طرح طرح سے کیا ہے۔ محبت میں ناکامی اور محبوب سے دائمی جدائی بھی دنیوی ناکامی کے استعارے ہیں۔ اس موضوع پر چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں:

پایا وہ ہم اس باغ میں جو کام نہ آیا  
کچھ اپنے تئیں جز ثمر خام نہ آیا

اس کا تو گلہ کیا ہے کہستان جہاں میں  
مجھ تک قدح بادۂ گلفام نہ آیا

یوں منہ نہ دھو اے صبح کے آگے مرے سودا  
جوں لالہ پر از خون جگر جام نہ آیا

کسی کا دین کیا حق نے کسی کی دنیا  
سب کا سب کچھ کیا پر تجھ کو ہمارا نہ کیا

برگشتہ نصیب اپنے نہ پھرتے کبھو دیکھے  
ہرچند رہی گردشِ ایام جہاں پر

پائے نہ جھانکنے بھی کبھو ہم درِ چمن  
رکھتے ہیں دل میں رخصتِ دیوار کی ہوس

آن کر اس میکدے کے بیچ بزمِ پُر آب  
قسمت اپنی ہم نہ پائے ساغرِ معمور تک

کیا گلا صیاد سے ہم کو یوں ہی گزرے ہے عمر  
اب اسیرِ دام ہیں تب تھے گرفتارِ چمن

خرمن برق زدہ کا ہوں وہ دانہ کہ مجھے  
نہ کوئی مرغ چلے نے کوئی بو دے مجھ کو

### غم پرستی

غم زندگی کی بنیادی حقیقت ہے۔ اس کا اثر مزاج پر مختلف ہوتا ہے۔ بعض ہستیاں غم کو شکار کر لیتی ہیں اور بعض کو غم۔ میر نے انفرادی اور ذاتی غم کو اتنی وسعت دی کہ اس میں آفاقیت پیدا ہو گئی۔ ان کے اشعار میں کائنات کا دل دھڑکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ان کی یاسیت اور قنوطیت کی فضا میں انسانی وقار و عظمت کا احساس بلند حوصلگی، زندگی کی ہلچل،

گرمی، تڑپ اور نا کامیوں سے کام لینے کا سلیقہ ملتا ہے، جس سے غم زدہ اور شکست خوردہ انسان میں حوصلہ، عزم اور نبرد آزمائی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ مگر سودا کا غم انفرادی اور کسی حد تک روایتی ہے۔ ایک بڑے شاعر کی طرح سودا اپنے غم میں آفاقیت اور ہمہ گیریت پیدا نہیں کر سکے۔ ان کے غم میں وہ وسعت پیدا نہ ہو سکی جو اپنے دامن میں غم زدہ کو پناہ دے سکے اور جو ہر زخم پر مرہم کا کام دے سکے۔ غم کے بیان میں ان کی خارجیت نکل ہوتی ہے۔ ان کا مزاج مفہوم کے بیان کرنے سے زیادہ الفاظ کی مرصع کاری کی طرف متوجہ رہتا ہے۔ اسی لیے ان کی داستان غم سن کر بے ساختہ منہ سے ”واہ“ نکل جاتی ہے لیکن ”آہ“ صرف میر کا حصہ ہے۔

سودا کے ہاں غم کے بیشتر مضامین رمی ہیں جن پر ان کے انداز بیان کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔

سودا وصل میں بھی غم ہجر کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں کیوں کہ غم ایک مستقل کیفیت ہے اور وصل وقتی :

وصل بھی ہو تو دل مرا غم کو نہ چھوڑے ہجر کے

یہ تو ہمیشہ ہے رفیق وصل ہے گاہ گاہ کا

آنکھوں سے آنسو اس وقت بہتے ہیں جب انسان اپنے غم کی انتہا پر پہنچ جائے اور ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جائے۔ بہت کم لوگ ہوں گے جو کسی کے رونے کا ذکر سن کر متاثر نہ ہوں لیکن سودا اپنی اشک باری کا ذکر اس طرح اور ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ پڑھنے والا ان کی شاعرانہ صنایع کا تو ضرور قائل ہو جاتا ہے لیکن متاثر نہیں ہوتا۔ مثلاً

قطرہ گرا تھا جو کہ مرے اشک گرم سے

دریا میں ہے ہنوز پھولا حباب کا

-----

کچھ تازہ تعلق نہیں اس دل کو الم سے  
تھا طفل میں گہوارہ مرا دامن غم سے

شربت ہے مجھے زہر غم ہجر کہ میری  
کھنٹی جو بنی روز تولد سو وہ سم سے

غافل غضب سے ہو کے کرم پر نظر نہ رکھ  
ہے شراب برق سے دامن سحاب کا

پوچھتے ہی پوچھتے گزری ہے مجھ کو روز و شب  
چشم ہے یا رب مری یا منہ کسی ناسور کا

سودا سے یہ پوچھا میں دل میں بھی کسی کو دوں  
وہ کر کے بیاں اپنا روداد بہت رویا

بعض اشعار میں سودا میر سے قریب آگئے ہیں۔ اس لیے ان اشعار میں تاثیر بھی ہے اور  
درد بھی۔ لیکن ایسے اشعار کی تعداد بہت کم ہے۔ چند ملاحظہ ہوں۔

دوستو سنتے ہو سودا کا خدا حافظ ہے  
عشق کے ہاتھ سے رہتا ہے یہ رنجور سدا



بہنا کچھ اپنی چشم کا دستور ہو گیا  
دی تھی خدا نے آنکھ پہ ناسور ہو گیا

اس باغ میں اک گل کو خنداں جو کہیں دیکھا  
سو غنچہ کی واں صورت دیکھ کر نظر آئی

### زورِ بیان

سودا کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت زورِ بیان ہے اور یہی خصوصیت انھیں اپنے ہم  
عصروں سے ممتاز کرتی ہے۔ اگرچہ دوسرے شعرا کے یہاں بھی یہ صفت پائی جاتی ہے  
لیکن اس ہمہ گیری کے ساتھ نہیں کہ اسے ان کے کلام کی خصوصیت کہا جاسکے۔ یہ سودا اور  
صرف سودا کا حصہ ہے۔ اسی نے سودا کو انفرادیت بخشی ہے اور اسی خصوصیت کی وجہ سے  
سودا کی آواز سب سے علاحدہ ہے۔ ان کی طبیعت میں جو شگفتگی و زندہ دلی، نشاط و سرمستی  
اور رنگینی ہے۔ اسی نے ان کے وجدان کو نشاط آمیز بنایا ہے اور یہ زورِ بیاں اسی نشاط آمیز  
وجدان کا عطیہ ہے۔ ان کے کلام میں داخلیت موجود ضرور ہے لیکن اس میں سوز و گداز،  
درد و غم اور دھیمی دھیمی آنچ کی بجائے ہشونی، البیلا پن اور زیر لب مسکراہٹ ہے۔ دبستان  
دلی کے بیشتر شاعروں کے کلام پر یاسیت و قنوطیت، رنج و غم اور شکست خوردگی کے بادل  
چھائے ہوئے ہیں۔ اس کے برعکس سودا کے ہاں وہ رجائیت ہے جو شکست کھا سکتی ہے  
لیکن شکست تسلیم نہیں کر سکتی۔ وہ بربادیوں کا ماتم نہیں کرتے، ناکامیوں کا نوحہ نہیں پڑھتے  
بلکہ ان کا معکمہ اڑاتے ہیں اور ان پر قبضہ لگاتے ہیں۔ اسی جذبے اور فطرت نے انھیں  
ممتاز جو نگار بنایا ہے۔

نشاط آمیز وجدان نے ان کے کلام میں ہماہمی اور طوفان کی سی کیفیت پیدا کر دی  
ہے۔ سودا صرف مفہوم ہی پر نہیں بلکہ الفاظ پر بھی توجہ کرتے ہیں۔ میر اور سودا کو زبان  
پر تقریباً برابر قدرت تھی۔ لیکن میر قلبی واردات کو سیدھے سادے الفاظ میں پیش کر دیتے

ہیں۔ ان کے لیے شاعری درد و غم کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ اس کے برعکس سودا اسے فن سمجھتے ہیں۔ انھوں نے ”عبرت الغافلین“ اور ”سبیل ہدایت“ میں جو تنقیدیں کی ہیں ان سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ معنی و الفاظ دونوں کو برابر اہمیت دیتے تھے۔

مولانا محمد حسین آزاد نے سودا کی اس خصوصیت کی طرف خاص طور پر اشارہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔ ”اُن کا کلام کہتا ہے کہ دل کا کنول ہر وقت کھلا رہتا تھا۔ اس پر سب رنگوں میں ہم رنگ اور ہر رنگ میں اپنی رنگ۔ جب دیکھو طبیعت شورش سے بھری اور جوش و خروش سے لبریز۔ نظم کی ہر فرع میں طبع آزمائی کی ہے اور کہیں رکے نہیں۔ چند صفتیں خاص ہیں، جن سے کلام اُن کا جملہ شعرا سے ممتاز معلوم ہوتا ہے۔ اول یہ کہ زبان پر حاکمانہ قدرت رکھتے ہیں۔ کلام کا زور مضمون کی نزاکت سے ایسا دست و گریبان ہے جیسے آگ کے شعلہ میں گرمی اور روشنی، بندش کی چستی اور ترکیب کی درستی سے لفظوں کو اس درو بست کے ساتھ پہلو بہ پہلو جڑتے ہیں گویا ولایتی طہنچہ کی چانپیں چڑھی ہوئی ہیں اور یہ خاص ان کا حصہ ہے۔ چنانچہ جب ان کے شعر میں سے کچھ بھول جائیں تو جب تک وہی لفظ وہاں نہ رکھے جائیں شعر مزاعی نہیں دیتا۔“ حقیقت یہی ہے کہ سودا کو الفاظ کی مرصع کاری پر جو قدرت تھی۔ وہ مشکل ہی سے نصیب ہوتی ہے۔ ان کے بیشتر اشعار بے ساختہ اور برجستہ معلوم ہوتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ صرف آمد ہے شاعر نے دماغ پر زور نہیں دیا خود بخود شعر ہو گیا ہے۔ حالاں کہ ایک اچھا شعر کہنے کے لیے ہفت خواں طے کرنے پڑتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

غنچے سے مسکرا کے اسے زار کر چلے

زگس کو آنکھ مار کے بیمار کر چلے

آئے جو بزم میں تو اٹھا چہرے سے نقاب

پردانے ہی کو شمع سے بیزار کر چلے

-----

لطف اے اشک کہ جوں شمع گھلا جاتا ہوں  
رحم اے آہ شرر بار کہ جل جاؤں گا

---

چن میں صبح جب اس جنگ بھوکا نام لیا  
مبا نے تیغ کا آب رواں سے کام لیا

---

سودا جو ترا حال ہے اتنا تو نہیں وہ  
کیا جاپے تو نے اسے کس آن میں دیکھا

---

سودا کی جو بالیں پہ کیا شور قیامت  
خدا ام ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے

---

کنیفیت چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا  
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

---

تم جن کی شاکرتے ہو کیا بات ہے ان کی  
لیکن ٹک ادھر دیکھو اے یار بھلا میں

یہ اشعار زور بیان کی بہترین مثال ہیں۔ ان کی برجستگی، سلاست، روانی، صفائی اور بے ساختگی کہہ رہی ہے کہ یہ معمولی دماغ کی پیداوار نہیں۔ لطف بیان نے ان میں شعریت

پیدا کی ہے۔ ان میں زندگی کی ہمہ رنگی ہے خار جیت ہے۔ لیکن وہ خار جیت نہیں جس نے بعد کے شاعروں میں مرثیہ صورت اختیار کر لی تھی۔ غم ہے، لیکن نبرد آزمائی کے حوصلے کے ساتھ۔ اسلوب بیان میں دریا کا سا بہاؤ ہے۔ یہ فن اکتسابی نہیں، خداداد ہے۔

سودا کلام میں زور پیدا کرنے کے لیے تکرار لفظی سے بھی کام لیتے ہیں۔ میر کے ہاں بھی اس کی اچھی خاصی مثالیں ہیں لیکن دونوں کے ہاں نمایاں فرق ہے۔ سودا کے ہاں تکرار لفظی، شوخی، تکلف اور رنگینی کو بڑھاتی ہے۔ لیکن میر کے ہاں داخلیت کی کیفیت اور اثر کو۔

بولو نہ بول شیخ جی ہم سے کڑے کڑے

یاں چٹ کیے ہیں اس سے عمامے بڑے بڑے

قامت نے تیرے باغ میں جانچ بندگی

لکھوالیا ہے سرو چمن سے کھڑے کھڑے

بوسہ کی ان لبوں سے یہ سودا ہوس نہ رکھ

جن سے کہ مانگ مانگ میں دشنام رہ گیا

سن سن کے عرض حال مرا یار نے کہا

سودا نہ باتیں بیٹھ کے یاں محصل بنا

اب کے بھی دن بہار کے یوں ہی چلے گئے  
پھر پھر گل آچکے پہ جن تم بھلے گئے

---

ساقی ہمیں تری شب دیکھ کے گوری گوری  
شرم سے شمع ہوئی جاتی ہے تھوری تھوری

سودا کے ہاں زور بیان کی ایک اور صورت ہے اور وہ ہے حروفِ عطف یا حروف ربط کے واسطے سے مصرع یا شعر کو کئی ٹکڑوں میں تقسیم کر دینا، یا مختلف ہم معنی الفاظ کو حروفِ عطف کے واسطے سے ایک مصرع میں جمع کرنا۔ اس سے ان کے کلام میں جو صوتی بلند آہنگی، ترنم اور موسیقیت اور پُر شور بیان کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے وہ ان کی مخصوص انفرادیت کی تشکیل کرتی ہے۔

عزت و آبرو و حرمت و دین و ایمان  
روں کس کس کو میں یارو کہ گیا کیا کیا کچھ  
والہ و شیفہ و زار و حزیں و مجنوں  
اپنے عاشق کو کل اس نے نہ کہا کیا کیا کچھ  
ضعف و ناطاقتی و سستی و اعضا شکنی  
ایک گھٹنے میں جوانی کے بڑھا کیا کیا کچھ

---

نہ تلتطف نہ محبت نہ مروت نہ وفا  
سادگی دیکھ کہ اس پر بھی ملا جاتا ہوں

---

جور و ستم تعدی و اندوہ و درد و غم  
مائل ہوئے ہیں اس دلِ ناشاد کی طرف

---

یا تبسم یا نگہ یا وعدہ یا گاہے پیام  
کچھ بھی اے خانہ خراب اس دل کے سمجھانے کی طرح

---

مہر و وفا و شرم و مروت سب ہی کچھ اس میں سمجھے تھے  
کیا کیا دل دیتے وقت اس کو ہم نے خیالِ خام کیا

---

دین و دل و ایمان و حواس و خرد و ہوش  
سب کچھ گئے لے کر نہ گئے سینے سے غم کو

---

صورت میں میں کہتا نہیں ایسا کوئی کب ہے  
اک دھج ہے سو وہ قہر ہے آفت ہے غضب ہے

---

مہر و قرار و ہوش و دل و دیں فدا کیا  
تس پر بھی میری جان تجھے مجھ سے کیس رہا

## نشاط آمیزی

جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ سودا پہلے شاعر ہیں جنہوں نے اردو شاعری کو نشاط آمیز لب و لہجہ دیا ہے اور یہی خصوصیت ہے جو انہیں میر، درد اور دوسرے ہم عصر شعرا سے الگ کر کے ان کی آواز میں انفرادیت اور مخصوص آہنگ پیدا کر دیتی ہے۔ اگرچہ سودا اس گہرائی، گیرائی، خود سپردگی اور خشکی سے محروم تھے جو شدید داخلیت کے لیے ضروری ہیں لیکن وہ اس بگڑی ہوئی خارجیت کے بھی شکار نہیں جو فحاشی کی حدوں سے آگے نکل جاتی ہے۔ ان کے ہاں ایک رکھ رکھاؤ، اعتدال اور توازن ہے جسے ان کے مزاج کی شگفتگی اور رنگینی نے حسین تر بنا دیا ہے۔ فراق گورکھپوری نے سودا کی اس خصوصیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔ ”سودا کے کلام میں داخلیت نے سوز و ساز اور درد و غم کا گہرا رنگ اختیار کرنے کی بجائے شگفتگی، الیلا پن، سرمستی، نشاط اور رنگینی اختیار کر لی ہے۔ کیوں کہ جب داخلیت بجائے غم کے نشاط کی طرف متوجہ ہوتی ہے تو نشاط کی فطری وسعت شاعر کے دل کو دنیا کی رنگارنگ بزم آرائیوں کی طرف لے جاتی ہے اور صحیح معنی میں خارجی شاعری کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے“۔ سودا کے کلام میں تڑپا دینے والی تاثیر نہیں ہے لیکن ان کے مضامین میں جدت و ندرت ہے۔ تنوع و نکتہ آفرینی ہے۔ شوقی اور شگفتگی ہے جس کا اثر زبان و بیان پر بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ سودا کی شاعری صرف ”درد و غم“ کا بیان یا پردہ سخن نہیں بلکہ وہ ہیئت پر بھی پوری توجہ صرف کرتے ہیں۔ اب سودا کے چند ایسے اشعار ملاحظہ فرمائیے جن میں انہوں نے غم عشق کا بیان کیا ہے۔

جوں شمع تن ہوا شب ہجراں میں صرف اشک

پر جس قدر میں چاہوں تھا اتنا نہ رو سکا

نہ کھینچ اے شانہ ان زلفوں کو یاں سودا کا دل اٹکا  
اسیر ناتواں ہے یہ نہ دے زنجیر کا جھٹکا

---

داغ تجھ عشق کا جھمکے ہے مرے دل کے بچ  
مہر ذرہ میں درخشاں نہ ہوا تھا سو ہوا

---

تاثر عشق نے مرے درد کھو دیا  
ان نے ندان دیکھ مرا حال رو دیا

---

بوسہ کے ذائقہ کو نہیں شہد وسم میں فرق  
ہم پی گئے اے ہمیں قسمت نے جو دیا

---

ہے طرفہ تمنا کہ رہوں لب بہ لب اس کے  
جس سے کہ کبھو بوسہ بہ پیغام نہ آیا

---

خبر لے وادی میں سودا کی یوں سنا ہے آج  
کہ ایک شوخ کسی بے گنہ کو مار آیا

---



سنے سے میں دعا کو لایا جو شب لیوں تک  
کہنے لگی اجابت کیدھر خیال آیا

---

جب تیشہ کو بہن نے لیا ہاتھ، تب یہ عشق  
بولا کہ اپنی چھاتی پہ دھرنے کو سل بنا

---

ترے کوچے سے جو میں آپ کو چلتے دیکھا  
جی کسی تن سے نہ اس طرح نکلتے دیکھا

---

ہے فکر وصل صبح تو اندوہ ہجر شام  
اس روز شب کے دھندے میں میں اب تو مر چلا

---

تو نے سودا کے تئیں قتل کیا کہتے ہیں  
یہ اگر سچ ہے تو ظالم اسے کیا کہتے ہیں

---

جب میں گیا اس کے تو اسے گھر میں نہ پایا  
آیا وہ اگر میرے تو در خود نہ رہا میں

---

عجب قسمت ہماری ہے کہ جس کی شمع الفت سے  
جراغ دل کیا روشن سو ہے داغ آشنائی کا

---

جو مذکور اس سے کرتا ہے مرا غم خوار رونے کا  
تو کہتا ہے کہ چپ رہ ہے اسے آزار رونے کا

---

خونِ جگر شراب تر شمع بہ چشم تر  
ساغر مرا گردِ نہیں ابر بہار کا

---

کس قدر بہتِ المحب سے دل ہے سودا کا بھرا  
زخم نے دل کے نہ دیکھا منہ کبھی انکسور کا

---

قطرۂ اشک ہوں پیارے مرے نظارے سے  
کیوں خفا ہوتے ہو پل مارتے ڈھل جاؤں گا  
چھیڑمت بادِ بہاری کہ میں جوں تک بہت گل  
پھاڑ کر کپڑے ابھی گھر سے نکل جاؤں گا

---

ظالم میں کہہ رہا کہ تو اس خوں سے درگزر  
سودا کا قتل ہے یہ چھپایا نہ جائے گا

### سادگی بیان

یہ ٹھیک ہے کہ سودا کی غزل پر قصیدے کا رنگ ہے لیکن ان کے ایسے اشعار کی تعداد بھی کچھ کم نہیں ہے جن میں سادگی بیان کا اعجاز دکھایا گیا ہے۔ ان اشعار میں سودا نے فارسی ترکیبوں اور فارسی اضافتوں سے دامن بچائے رکھا ہے۔ ان اشعار میں حسن بیان بھی ہے اور تاثیر بھی۔ ان کے ہاں سہل ممتنع نہیں ہے۔ لیکن اس سہل بیانی اور سادگی بیان کی بہت سی مثالیں مل جاتی ہیں، جس پر ہر شاعر کو قدرت نہیں ہوتی۔ یہ سلاست اور روانی آسانی سے پیدا نہیں ہوتی۔

حاضر ہے تیرے سامنے سودا کر اس کو قتل

مجرم یہ سب طرح سے ہے پر یک نگاہ کا

-----

دکھاؤں گا تجھے زاہد اس آفتِ جاں کو

خللِ دماغ میں تیرے ہے پارسائی کا

-----

جگر ان کا ہے جو تجھ کو صنم کہہ یاد کرتے ہیں

میاں ہم تو مسلمان ہیں خدا بھی کہتے ڈرتے ہیں

-----

یارو میں کیا عہد اسے مانو تم سچ  
پھر دل نہ کہیں دوں اگر اب کی رہے جی سچ

---

سوچھی تدبیر نہ تقدیر کو بہلانے کی  
جب تجھے قتل پہ عاشق کے مچلتے دیکھا

---

سرشک چشم نہ تھا میں کہ اے فلک تو نے  
نظر سے خلق کے گرتے نہ مجھ کو تھام لیا

---

تیرے کوچہ سے جو میں آپ کو چلتے دیکھا  
جی کسی تن سے نہ اس طرح نکلتے دیکھا

---

جو عمل چاہیے کیجیے مرے دکھ دینے کا  
وہ نہ کیجیے کہ کہے کوئی سزاوار نہ تھا

---

پیار و اشفاق و وفا مہر و محبت الطاف  
دل کو جس روز لیا کون سا اقرار نہ تھا

---

غیروں کو دیکھ بیٹھے ہوئے بزم میں تری  
جب کچھ نہ بس چلا تو میں ناچار اٹھ گیا

---

کیفیتِ چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا  
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

---

اس کے کوچے میں نہ چل ساتھ مرے اے سودا  
آفت آجائے نہ اے یار کہیں میرے پر

---

سودا کا حال تو نے نہ دیکھا کہ کیا ہوا  
آئینہ لے کے آپ کو دیکھے ہے تو ہنوز

---

ساقی گئی بہارِ رعی دل میں یہ ہوں  
تو منتوں سے جام دے اور میں کہوں کہ بس

---

نہ دیکھا اس سوا کچھ لطف اے صبح چمن تیرا  
گل ایدھر لے گئے گلچیں گئی روتی ادھر شبنم

---

دل کے کلڑوں کو بغل بچ لیے پھرتا ہوں

کچھ علاج ان کا بھی اے شیشہ گراں ہے کہ نہیں

چھوٹی بھروں میں شعر کہنا میر کا فن ہے۔ سودا نے بھی اس پر طبع آزمائی کی ہے اور جہاں تک اسلوب بیان کا تعلق ہے وہ اکثر میر تک پہنچ جاتے ہیں۔ میر چھوٹی بھروں میں سادگی بیان سے کام لے کر شعر کو تیر و شتر بنا دیتے ہیں۔ سودا نے بھی چھوٹی بھروں میں گفتگو سے سادہ کی ہے۔ رہا سوال تاثیر کا تو وہ صرف میر کا حصہ ہے۔

دیکھے بلبل جو یار کی صورت پھر نہ دیکھے بہار کی صورت  
برق دیکھی ہو جس نے سو جانے مجھ دل بے قرار کی صورت

قاصد اٹک آئے خبر کر گیا قتل کوئی دل کا نگر کر گیا  
فائدہ اب کیا کرے تریاق وصل نہر غم ہجر اثر کر گیا

دل میں ترے جو کوئی گھر کر گیا سخت مہم تھی کہ وہ سر کر گیا  
وہم غلط کار نے دل خوش کیا کس پہ نہ جانے وہ نظر کر گیا

دیکھا جو ادھر خدا سے ڈر کر دل خالی کیا میں آہ بھر کر

رجش کا مرے نہ پوچھ باعث آجانے دے یار در گذر کر

گدا دست اہل کرم دیکھتے ہیں ہم اپنا ہی دم اور قدم دیکھتے ہیں  
نہ دیکھا جو کچھ جام میں جم نے اپنے سواک قطرہ ے میں ہم دیکھتے ہیں

جب نظر اس کی آن پڑتی ہے زندگی تب دھیان پڑتی ہے  
جھیل لیتے ہیں عاشق اے فریاد جس کے سر جیسی آن پڑتی ہے

دل کسی سے کہ جب پلٹتا ہے دین و دنیا سے جی اچھتا ہے  
عشق سے تو نہیں ہوں میں واقف دل کو شعلہ سا کچھ پلٹتا ہے

### مشکل زمینیں

سودا نے نئی نئی اور مشکل زمینوں میں بھی طمع آزمائی کی ہے اور اپنی چابک دستی سے ان  
سنگار زمینوں کو پانی کر دیا ہے۔ انھیں الفاظ پر اتنی قدرت ہے کہ خارزار بھی گلستاں بن  
جاتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ زبان کی خارجیت اشعار کو سوز و گداز سے محروم کر دیتی ہے۔  
سودا کی ایسی غزلوں میں محض قافیہ بندی ہوتے ہوئے بھی وہ خارجی فن کا مکمل نمونہ  
ہیں۔ ان زمینوں میں سے بیشتر سودا کی اپنی ایجاد ہیں۔ یہاں چند زمینیں اور ردیف،  
قافیہ پیش کیے جاتے ہیں جن سے سودا کے عظمت فن کا اندازہ ہوگا۔

ع نلک خاک لے تو چھوڑ کے غافل پلنگ و خواب

سنگ و خواب، بنگ و خواب، ننگ و خواب، شلنگ و خواب، لنگ و خواب

ع ہمیشہ سے مری چشم پر آب درتہ آب

حباب درتہ آب، گلاب درتہ آب، مراب درتہ آب، خراب درتہ آب، کباب

درتہ آب، آفتاب درتہ آب، حجاب درتہ آب، خوشاب درتہ آب

ع ودا بہت ہے جو دے سر کو سنگ و خشت شکست

زشت شکست، کنشت شکست، کشت شکست

ع فندقی انگشت کیا کر رہا ہے رنگ دست

اورنگ دست، مرسنگ دست، زیرسنگ دست، ڈھنگ دست، جنگ دست،

پاسنگ دست، دنگ دست

ع لاگے ہے کس کے منہ پہ بایں زور پشت دست

مغرور پشت دست، دور، بدستور، پور، مقدور، نور، منظور

ع ہستی کو تری بس ہے اک گل کی اشارت

بلبل، بل، جل، کاکل، بیل، سنبل، قلقل

ع نامے کا اپنے چمن میں جو کروں ساز درست

آواز، انداز، اعجاز، ناز، طناز، دعا باز، خدا ساز

ع بنگ پی بنگ خیال اس کا ہے افلاک پرست

خاک، ادراک، تاک، فتراک، ہوسناک، خاک، مسواک، بیباک

ع اشک کو کب ہے شناساے گہر سے پیوند

نظر، شجر، بحر، اثر، دیدہ تر، جگر، ہنر

ع کھینچ کر پوست کرے گردش ایام سفید

بادام، انجام، گل اندام، سید فام، شام، نیگام



ع یہ اس کے رنگِ عارض سے ہے دل بیتاب آتش پر  
سیماب، آب، تیزاب، اسباب، شب تاب، سرخاب، شراب ناب،  
گرداب، پیچ و تاب۔

ع کب لگ سکے اس سے کوئی رنگ اور نمک  
نیرنگ، خشک، سنگ، رنگ، جنگ، ڈھنگ، آہنگ، بنگ، گلرنگ۔  
سودا کی مشکل زمینوں کی ان غزلوں میں بھی بیشتر اشعار ایسے ہیں جو صرف قافیہ بندی  
کے زمرے میں آتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسی زمینوں میں مضمون کی طرف شاعر کی  
توجہ بہت کم جاتی ہے۔

شمع رو کہنا اسے سودا ہے تار کی عقل  
شمع کا عکس اس کے عارض پر کلف ہے ماہ کا

سمور و قائم و سنجاب سرما میں منعم کو  
رکھیں ہیں آسرا غربائے لُج و لُک آتش کا

کر رکھا ہے گلے کعبہ دستار اُسے  
شیخ جی آپ ہیں کس مرتبہ مسواک پرست

جو دیکھے مرغِ ہوا کو وہ دام میں تیرے  
تو ہووے رشک سے ماہی کباب درتہ آب

گئی ہے سر سے گذر موج اشک آنکھوں کی  
مجھے یہ لے گئی خانہ خراب در تہ آب

---

بے خوابی سے ہے میرے جوشا کی وہ شمع رو  
یارو کہو یہ اس سے کہ ناداں پتنگ و خواب

---

دل طوطی خط کو نہ دے اس شوخ کے سودا  
کھاوے گا اس آئینے کو زنگار محبت

---

دامن ابر نچرتا ہے جو اتنا شاید  
کسو عاشق کے ہوا دیدہ تر سے پیوند

---

فریب وعدہ کا شکوہ جو میں رو رو کے کرتا ہوں  
تو میری سادہ لوحی پر وہ ہنس دیتا ہے قہہ قہہ کر

---

جز خط سبز عارض دلدار ہم نشیں  
دیکھا ہے آپ نے یہ کبھو رنگ اور نمک

---

ہر مرغ کو پہچان کے نامے کو تو لینا  
نامے کے کبوتر کا ہے میرے جگری رنگ

## ایہام گوئی

سودا جب میدانِ ادب میں آئے ہیں تو ایہام گوئی متروک ہو چلی تھی اور اکثر شاعر اس غیر فطری صنعت سے متنفر ہو چکے تھے۔ شاہ حاتم ایہام گوئی سے توبہ کر چکے تھے۔ سودا جیسے ذہین انسان کے سامنے سوائے اس کے اور کوئی راستہ نہیں تھا کہ وہ بھی ایہام گوئی سے انکار کر دیں۔ ان کا شعر ہے۔

یک رنگ ہوں آتی نہیں خوش مجھ کو دورنگی

منکر سخن و شعر میں ایہام کا ہوں میں

تاہم سودا کے یاں بھی ایہام کی چند مثالیں مل جاتی ہیں۔ لیکن کلیاتِ سودا کی ضخامت کے پیش نظر ان مثالوں کی تعداد کچھ زیادہ نہیں ہے۔ اگر سودا ایہام میں شعر کہتے ہیں تو انھیں یہ معذرت پیش کرنی پڑتی ہے۔

اسلوب شعر کہنے کا تیرا نہیں ہے یہ

مضمون و آبرو کا ہے سودا یہ سلسلہ

چند ایسے اشعار ملاحظہ ہوں جن میں سودا نے ایہام سے کام لیا ہے۔

کس قدر بہت العجب سے دل ہے سودا کا برا

زخم نے دل کے نہ دیکھا منہ کبھی انگور کا

سودا غزل چمن میں تو ایسی ہی کہہ کے لا

گل پھاڑیں سن کے جیب کو، دیں بلبلیں صلا

حکاک کا پر بھی مسیحا سے کم نہیں  
فیروزہ ہووے مردہ تو دیوے ہے وہ جلا

-----

جب مست چمن سے ہو چلا گھر کو وہ لا لا  
غنچے نے صراحی لی اٹھا گل نے پیالا  
انہوں نے ایک پوری غزل ایہام میں کہی ہے جس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔  
اے لالچی تو کیسہ غیروں کا مت ٹٹولے  
جو کچھ تو چاہے یک شب مجھ پاس آ کے سولے  
وہ تو بچی کا ہرگز ہم کو لکھے نہ نامہ  
گدڑی میں جا کبوتر لیتا ہے مول گو لے  
اس غزل کے مقطع میں بھی سودا نے معذرت پیش کی ہے۔  
ہو شاد اس غزل سے روح آبرو کی سودا  
تو اس زمیں میں ناداں طور اپنا کیوں نہ بولے

### مزاح اور ظرافت

سودا اردو ہجو نگاری کے امام ہیں اور ابھی تک اردو ادب کی پوری تاریخ اس فن میں سودا کا  
جواب پیدا نہیں کر سکی۔ ان کی ہجو نگاری پر علاحدہ باب میں بحث کی جائے گی۔ یہاں  
صرف اس ظرافت کا جائزہ لینا مقصود ہے جو ان کی غزلوں میں بکھری ہوئی ہے۔  
سودا فطری طور پر ہنسوز، زندہ دل اور شگفتہ مزاج تھے۔ ان کا کلیات پڑھتے ہوئے معلوم  
ہوتا ہے کہ ایک شخص اپنے ارد گرد ہونے والے واقعات اور حالات کا گہری نظر سے جائزہ

لے رہا ہے۔ جہاں کہیں اسے بے جوڑ، بے ڈھنگی، بے آہنگ اور مضحکہ خیز چیزیں نظر آتی ہیں۔ وہ ہنس دیتا ہے کبھی یہ ہنسی زیر لب ہوتی ہے اور کبھی قہقہہ بن جاتی ہے۔ سودا اپنے کمال فن سے ان واقعات کی تصویر اتار دیتے ہیں اور اگر اصل واقعات میں کچھ کمی ہو تو وہ اپنے زورِ تخیل سے انہیں مکمل اور جامع بنا دیتے ہیں۔ اس طرح ان کے ذاتی مشاہدات و تجربات تمام انسانوں کی ملکیت بن جاتے ہیں۔

بقول مولانا محمد حسین آزاد ”ان کے دل کا کنول ہر وقت کھلا رہتا تھا۔ وہ خود ہنستے تھے اور دوسروں کو ہنساتے تھے۔ اسی لیے ان کی غزلوں میں بھی ظرافت کا عنصر ہے۔“

غزل میں جہاں کہیں ان کی رگِ ظرافت پھڑکی ہے۔ وہ متانت و سنجیدگی اور تہذیب کے دائرے سے باہر نہیں آئے۔ ایک اچھے ظرافت نگار کی طرح اکثر و بیشتر وہ خود ہی اپنے نشتر وں کا شکار بنتے ہیں۔ انہوں نے اپنی اور محبوب کی کمزوریوں کا اس طرح سے مضحکہ اڑایا ہے کہ بے ساختہ ہنسی آ جاتی ہے۔ یہ ظرافت اس عہد کے عاشق اور محبوب کے تعلقات کی مکمل تصویر بھی ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

اس مصیبت سے تو مت مجھ کو نکال اب گھر سے  
تو کہے آج ہی جا میں کہوں کل جاؤں گا

نواحی میں ترے کوچے کی ہے یہ حال سودا کا  
کہ جوں چنڈا شیاں گم کر کے بستی میں پھرے بھٹکا

باتیں کرو عدو سے سودا کو گالیاں دو  
قرباں ہوں آپ کی میں اس داد اور دہش کا

مجلس سے مجھ کو اٹھتے جلیسوں کے سامنے  
 عزت کہو نہ دی یہ کہ پوچھے کدھر چلا  
 نکلا پڑے ہے جامہ سے کچھ ان دنوں رقیب  
 تھوڑے سے دم دلا سے میں کتنا ابھر چلا

مانگا جو میں دل کو تو کہا بس یہی اک دل  
 جتنے ہی تو چاہے مرے کوچے سے اٹھا لا

دیکھتا ہوں میں تری بزم میں ہر ایک کا منہ  
 طلب رحم کی نظروں سے گنہگار کی طرح

نکالے ہے وہ بے رخ ہو کے اپنے گھر سے یوں مجھ کو  
 شہ شطرنج کو جس طرح کشتیں دیویں شہہ شہکر

ڈرتے ڈرتے جو ترے کوچے میں آ جاتا ہوں  
 صید خائف کی طرح رو بقضا جاتا ہوں

جب پیر مغاں سے جا میں دستِ رز ماگلی  
 بولا کہ سعادت ہے پر وہ ابھی بالی ہے

جو یوں لاٹھی دکھاتا ہوں تو دانت اپنے نگو سے ہے  
 رقیب آگے ترے دے ہے مجھے بندر کی سی گھڑکی

فارسی اور اردو ادب میں شیخ و زاہد کی عیاری و مکاری پر بہت لے دے رہی ہے۔ ان  
 دونوں زبانوں کے طنز و ظرافت کا حصہ اس موضوع پر ہے۔ سودا نے بہت دل چسپ انداز  
 میں واعظ و شیخ کی گت بنائی ہے۔ اس موضوع پر پہلے بحث کی جا چکی ہے۔ یہاں چند شعر  
 اور ملاحظہ فرمائیے۔

سچ میں دنیا تو ہم چھوڑیں گے لیکن زاہدا  
 چھوڑنا تیری طرح داڑھی کا مشکل ہوئے گا

ٹوٹا وضو شیخ تو جو رو کے ان کی نیند  
 اچنی تو یہ کہا کہ صدائے تنگ و خواب

واعظا دیکھو بولا تو اگر سودا سے  
 بے طرح کا ہے یہ کافر بہت بیباک پرست

ڈروں ہوں میں نہ کریں رند تیری داڑھی کا  
تبرکات میں داخل ہر ایک مو واعظ

ہزار شیشہ سے اس میں تیں چھپائے ہیں  
تری جو پگڑی ہے یہ صورت سب و واعظ

دیکھ زاہد کے سر عمامہ نو  
ہاتھ اٹھا رند بولے یا رزاق

شیخ صاحب کے عقد میں دنیا  
آئی تھی کب جو دی انھوں نے طلاق

پھر ہے شیخ یہ کہتا کہ میں دنیا سے نہ موڑا  
الہی ان نے اب داڑھی سوا کس چیز کو چھوڑا

غزل کے بعض قطعات ظرافت کی مکمل تصویریں ہیں، جن میں سودا نے مضحکہ خیز واقعات  
پیش کیے ہیں اور ان واقعات کی ستم ظریفی کا اکثر شکار خود ہیں۔

سودا کو کہتے ہیں کہ ہے اس سے مصاحبت  
کتنا غلط یہ حرف بھی مشہور ہو گیا



اوروں کی نسبت ان دنوں کچھ لگ چلا تھا وہ

دو چار جھڑیوں میں بدستور ہو گیا

ایک اور قطعہ میں سودا نے اردو شاعری کی اس روایتی محفل کا مضحکہ اڑایا ہے جس میں محبوب اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے عاشق وہاں پہنچتا ہے۔ اس کے ساتھ وہ ہی بے اعتنائی برتی جاتی ہے جو روایتی عاشق کی قسمت میں ہے۔ سودا کے قدرت بیان اور جزئیات نگاری نے اس قطعہ کو انتہائی دل چسپ بنا دیا ہے۔

ترغیب نہ کر مجھ کو داں چلنے کی اے سودا

اس یار نے اب ہم سے یہ چہل نکالی ہے

وارد میں ہوا اس کے کل گھر میں تو یہ دیکھا

تیوری سے چڑھا صورت کچھ اور بنالی ہے

ہر بات پہ ہے میری اوروں سے اسے چشمک

مجھ پر وہ کنایہ ہے نوکر پہ جو گالی ہے

غیر اس کے اشد سے جب کرنے لگے نوکیں

اٹھا میں یہ کہہ کرتب یاں مرغ کی پالی ہے

ایک ان میں سے یوں بولا کیوں جاتے ہو تم بیٹھو

جاؤ گے تو یہ مجلس پھر لطف سے خالی ہے

اس شوخ نے یہ سن کر بولا کہ خدا سے ڈر

سر پر سے بلا اپنی جوں توں کی میں ٹالی ہے

پس غور کراے ناداں جس گھر میں یہ صحبت ہو

داں جا کے خوشی آتا یہ خام خیالی ہے

ایک اور قطعہ میں سودا نے ایک شیخ کا واقعہ بیان کیا ہے۔ شیخ صاحب قسمت کے مارے ایک شام کو اتفاق سے میخانے سے گزرے۔ رندوں نے کس طرح اُن کا استقبال کیا اور ان کی کیا گت بنائی سودا کی زبانی سنئے:

کوئے میخانہ سے ناگہ شام کو گزرے جو شیخ  
کیا کہوں سودا جو رندوں نے سلوک ان سے کیا  
کر سلام ان کو کہا جلدی سے لو یا رو قدم  
ہیں ز قسم اولیا یا از قبیل انبیا  
کوئی بولے تھام لومنے سے انھوں کی خاک پا  
کوئی کہتا تھا کرو آنکھوں میں اپنے طوطیا  
آخر کار اس جگہ کیا دیکھتا ہوں رات کو  
وہ مقدس صورت اور ایسے بزرگ بے ریا  
ڈھونڈتے جاتے ہیں پیچھے پیچھے عمامہ کو آپ  
اک مرید آگے چلا جاتا ہے دکھانا دیا

### قطعات

سودا فارسی کے جن شاعروں سے متاثر تھے ان میں نظیری نیشاپوری کا بھی نام آتا ہے۔ نظیری کی طرح سودا نے بھی اکثر قطعہ بند غزلیں کہی ہیں۔ ان کا مشاہدہ بہت تیز تھا۔ جزئیات پر ان کی گہری نظر رہتی تھی اور وہی سہی کسر وہ اپنے تخیل سے پوری کر دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض قطعات منظوم افسانے بن گئے ہیں۔ اس قسم کے چند قطعات ”ظرافت نگاری“ کے تحت دیے جا چکے ہیں۔ چند اور ملاحظہ ہوں۔ ایک قطعہ میں سودا نے اہل دنیا اور اہل چمن کا موازنہ کیا ہے۔ انھیں اہل چمن پر رشک آتا ہے۔ کیوں کہ خدا نے زندگی کا پورا لطف ان کی قسمت میں لکھا ہے وہ کسی سے حسد کرتے ہیں اور نہ کوئی اُن سے۔ انھیں والی شام بننے کی تمنا ہے اور نہ والی روم، نہ وہ ہوس جاہ و منصب میں گرفتار اور نہ کوئی انھیں بخشش کرنے والا ہے۔ یہ اہل چمن بھی تلاش دنیا میں

مارے مارے نہیں پھرتے ان کی پوری زندگی عیش و عشرت کا مرقع ہے۔ صبح کو جب بلبل حسین نغمے سناتی ہے تو ہر ایک گل بہار سے اپنے ہتھ کا جام لے لیتا ہے۔ اس قطعہ میں سودا کی تمنا ردِ عمل ہے اُن کے سیاسی و سماجی حالات کا۔ اب وہ قطعہ ملاحظہ ہو۔

معاشِ اہل چمن جائے رشک ہے سودا  
کہ زندگی کا انھوں نے مزا تمام لیا  
کسی کا ان میں سے محسوس ہے نہ والی روم  
حسد کسی کو نہ اس پر کہ جن نے شام لیا  
کہیں نہ واسطے منصب کے ہیں یہ بحرائی  
سلام کر کے کسو سے نہ لاکھ دام لیا  
کبھو میں ان کو نہ دیکھا تلاشِ دنیا میں  
کبھو نہ فکر و تردد سے کوئی کام لیا  
ادھر شروع ہوا صبحِ نغمہ بلبل  
ادھر بہار سے ہر ایک گل نے جام لیا

ایک اور قطعہ ملاحظہ ہو، جس میں دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ کھینچا ہے۔ اس قطعہ میں بھی بھرپور افسانویت ہے۔

پوچھا اک روز میں سودا سے کہ اے آوارہ  
تیسرے رہنے کا معین بھی مکاں ہے کہ نہیں  
یک بیک ہو کے برآشفقہ لگا یوں کہنے  
کچھ تجھے عقل سے بہرہ بھی میاں ہے کہ نہیں  
دل کو جن کے ہے تعلق یہ مکاں کیا جانے  
عدم و ہستی انھوں نے کے بگماں ہے کہ نہیں  
دیکھا میں قصرِ فریدوں کے در اوپر اک شخص  
حلقہ زن ہو کے پکارا کوئی یاں ہے کہ نہیں

اردو میں اس قسم کی قطعہ بند غزلیں بہت کہی گئی ہیں۔ میر تقی میر کے یہاں بھی اس کی اچھی

مثالیں موجود ہیں۔ لیکن سودا نے ان قطعات کو جس مقصد کے لیے استعمال کیا اور جس طرح اپنے مشاہدے اور تجربے سے انہیں مکمل تصویریں بنادیا اس کی مثالیں اردو شاعری میں بہت کم ملیں گی۔

### عریانیت

سودا نے جھوٹکاری میں فحاشیت اور ابتذال کی انتہا کر دی ہے۔ جو جھوٹیں دہلی میں کہی گئی ہیں ان میں سودا تہذیب کے دائرے سے باہر نہیں گئے۔ لیکن ضاحک اور فخرمیں جھوٹیں جو اودھ میں کہی گئیں ہیں انہیں دونوں کی جھوٹوں میں سب سے زیادہ فحاشیت ہے جس کا صاف مطلب ہے کہ اودھ کا ماحول اس فحاشیت کے لیے سازگار تھا۔ غزل میں سودا نے بہت کم فحش، عریاں اور مبتذل شعر کہے ہیں اور وہ بھی انشائ اور جرأت کی معاملہ بندی کے مقابلے میں سچ ہیں۔ اگرچہ اردو میں خارجیت کی ابتدا سودا سے ہوتی ہے لیکن سودا معاملہ بندی کی اس کچھڑ میں نہیں گرے جس نے بہت سے دامنوں کو خراب کیا۔ بلکہ حیرت تو اس پر ہوتی ہے کہ سودا کے ہاں معاملہ بندی بہت کم ہے اور فحش اشعار کی تعداد حیرت انگیز طریقہ پر مختصر ہے اور اتنے اشعار خواجہ میر درد جیسے بزرگ کے دیوان میں بھی مل جاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ سودا کے ہاں غزل گوئی کے خاص معیار تھے اور انہوں نے غزل پر جھوٹا کوئی اثر نہیں پڑنے دیا۔ اس کے برعکس میر صرف غزل کے شاعر تھے مگر ان کے ہاں فحش اشعار کی تعداد سودا کے اشعار سے کہیں زیادہ ہے۔ معاملہ بندی کے چند اشعار نیچے۔

ہوا جاتی رہی وعدوں ہی میں تو شک نہالی کے  
جواب بھی سوز ہو مل کر تو جاڑا ہے دولائی میں

صورت ملی دو کی زباں کو کرو گے کیا  
گو ہم سے تم نے صحبت شب کی چھپائی بات

پھولوں کی بیج پر جو نہ سوئے تو کیا ہوا  
یہ عیش ہے کہ تو ہو بغل بیج ننگ و خواب

آج تو مل گئے تھا یہ کہو تو بارے  
اب نہ ملنے کی مکافات کروں یا نہ کروں  
اب چند اشعار ایسے ملاحظہ ہوں جن میں ہلکی سی فحاشی ہے۔ مگر ناگوار نہیں:  
چئی اٹھ کر میں تجھے رات کروں یا نہ کروں  
حق خدمت بھی کچھ اثبات کروں یا نہ کروں

اٹھ جانے میں ہے زور مزا یار سے لڑ کر  
ملنے ہیں تو پھر چھاتی سے چھاتی کو رگڑ کر

واہ وا بے، تمہا کو دالے کے  
دے ہے تو دھا ہمیں دکھا کے گال

### تمثیل نگاری

اس فن میں سودا نے صائب کا تتبع کیا ہے۔ بقول شیخ چاند صائب نے یہ صنعت زیادہ تر اخلاقی اور حکیمانہ مضمون کے لیے استعمال کی ہے۔ لیکن سودا نے اخلاقی اور حکیمانہ مضامین کے ساتھ ساتھ عاشقانہ مضامین میں بھی اس صنعت کا استعمال کیا ہے۔ اس صنعت میں پہلے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اگر انسان کی فطرت ہی خراب ہو تو نیک لوگوں کی

صحبت کیا اثر کر سکتی ہے اور مثال یہ دیتے ہیں کہ آبِ گہر سے کبھی رشتہ تر نہیں ہو سکتا۔ یا پہلے مصرع میں کہتے ہیں کہ روشن دل کبھی اپنی حد سے آگے نہیں بڑھتے اور پھر چراغ کی مثال دیتے ہیں جو کبھی اپنے سائے سے آگے نہیں بڑھتا۔

سودا کے عہد میں اردو ابھی نوزائیدہ تھی۔ یہ سودا کی قادر الکلامی اور استادی کا کرشمہ ہے کہ انھوں نے بعض مشکل مضامین ادا کیے ہیں۔ اس صنعت میں چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

زینت دلیل مفلسی ہے ننگ کماں کو دیکھ  
نقش و نگار چھٹ نہیں کچھ اس کے خانے میں

میں زمانے کی سخاوت کا نہیں ہرگز مقرر  
چھین کب لیتے ہیں کچھ دے کر کسی کو اہل جود

دل بے عشق کی دشمن ہے تحریک نفس ناصح  
کرے ہے کام پتھر کا ہوا مینائے خالی سے

اے دو دل کو یک جا بہ بساطِ دوراں  
چوٹ کھاتی نہیں وہ نرد جو ہونرد کے ساتھ

### خیال بندی

سودا کے لیے شاعری دردِ غم کے اظہار کا ذریعہ نہیں تھی بلکہ وہ شاعری کو ایک فن سمجھتے تھے۔ اسی لیے ان کے ہاں خارجیت ہے۔ ان کی غزل میں بے شک وہ تڑپا دینے والا اثر

نہیں ہے جو داخلی شاعروں کی خصوصیت ہوتا ہے۔ لیکن غزل کی ہیئت کو جو کچھ انھوں نے دیا ہے، ان کے عہد کا کوئی شاعر نہیں دے سکا۔ خیال بندی اور مضمون آفرینی صرف ان شاعروں کے کلام میں ملتی ہے جو دل سے نہیں دماغ سے شاعری کرتے ہیں، جن کا مشاہدہ بہت وسیع ہوتا ہے اور جنھیں زبان و بیان پر پوری قدرت ہوتی ہے۔ یہ جادو دکھانے کا فن ہے۔ اس میں واردات قلبی، انسانی جذبات اور احساسات کی ترجمانی نہیں ہوتی بلکہ صرف شکوہ الفاظ، استعاروں اور تشبیہات کی مرصع کاری ہوتی ہے۔ معنی یابی اور مضمون آفرینی کے بارے میں محمد حسین آزاد نے بہت چچی ٹکلی رائے دی ہے۔ وہ ”آب حیات“ میں لکھتے ہیں۔ ”کلام کو رنگین اور استعارہ و تشبیہ سے بلند کر دکھانا آسان ہے۔ مگر زبان اور روزمرہ کے محاورے میں صاف صاف مطلب اس طرح ادا کرنا جس سے سننے والے کے دل پر اثر ہو یہ بات بہت مشکل ہے۔ شیخ سعدی کی گلستاں کچھ چھپی ہوئی نہیں ہے نہ اس میں نازک خیالات ہیں نہ کچھ اعلیٰ مضامین ہیں، نہ چچیدہ تشبیہیں ہیں نہ استعارہ در استعارہ فقرے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی کہانیاں ہیں، صاف صاف باتیں ہیں۔ اس پر آج تک اس کا جواب نہیں۔ مینا بازار اور پنج رقعہ کے انداز میں صد ہا کتابیں موجود ہیں۔ اس معاملے میں غور کے بعد یہ معلوم ہوا کہ جو بزرگ خیال بندی اور نازک خیالی کے چمن میں ہوا کھاتے ہیں اول ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایسے نئے مضامین نکالیں جو اب تک کسی نے نہ باندھے ہوں لیکن جب متقدمین کے اشعار سے کوئی بات بچی ہوئی نہیں دیکھتے تو ناچار انھیں کے مضامین میں موٹا گافیاں کرتے ہیں اور ایسی ایسی لطافتیں اور نزاکتیں نکالتے ہیں کہ غور سے خیال کریں تو نہایت لطف حاصل ہوتا ہے۔“<sup>۱</sup>

فارسی میں ناصر علی، غنی اور بیدل کے کلام کو اردو میں ناتج کی پوری شاعری کو اس معنی یابی اور مضمون آفرینی نے ڈبویا۔ سودا کے ہاں خیال بندی فارسی شاعروں اور خاص طور پر بیدل کے اثر سے آئی۔ ان کی ہمہ گیر طبیعت نے یہ اثر ضرور قبول کیا مگر بہت معمولی۔ اس لیے ان کے ہاں اس قسم کے اشعار کی تعداد غزلوں میں بہت محدود ہے۔ البتہ قصائد میں نسبتاً زیادہ ہے اور درحقیقت خیال بندی قصائد ہی کے لیے موضوع بھی ہے۔ اب چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

رطوبت داغ دل میری کی ہے گرداب آتش کا  
فسون عشق نے زہرہ کیا ہے آب آتش کا

---

قطرہ گرا تھا جو کہ مرے اشک گرم سے  
دریا میں ہے ہنوز پھپھولا حباب کا

---

گل مرے مشہد پہ کب بھیجے ہیں وہ ابرو کماں  
طرح غنچہ کے کھلے جب تک نہ پیکاں تیر کا

---

بسانِ طائرِ رنگِ حنا قدم لے کر  
ہر ایک کبک نے پیارے ترا خرام لیا

---

دیکھا میں گلے میں تیرے ہار دست غیر  
تارِ نگہ میں اشک کا دانہ پرو دیا

---

لب لعلِ بتاں پر سرخی پاں ہے کہ جادو ہے  
بنادی شکلِ طوطی صورتِ سرخاب آتش پر

---



گر نہ ہو پانی دل اس کا خوف سے اے شعلہ خو  
لگ اٹھے تیری نگاہ گرم سے درپن میں آگ

---

یہ نہیں دریا کہ جس سے گزرے تو پل باندھ کر  
موج چشم عاشقاں دے توڑ پل میں پل کے پل

---

اڑ لگتی ہے جلوے پہ حسینوں کے مری آنکھ  
وید اُن کی سے پہنچے ہے بہم بال و پر چشم

---

بہ معنی آشنا مینائے ہے پر ز خاموشی  
برائے ہرزہ گو گفتار لا طائل ہے شمشے میں

---

طاہر رنگِ حنا کی نمط اب اے صیاد  
ہوں تو میں ہاتھ میں تیرے پہ اڑا جاتا ہوں

---

خیال پہنچے مڑگاں میں یہ احوال ہے دل کا  
کہ جیسے صید کو شاہین کا چنگل ملتا ہے

---

شمع رو کہنا اُسے سودا ہے تاریکی عقل  
شمع کا عکس اس کے عارض پر کلف ہے ماہ کا

### حسن تعلیل

اس صنعت میں پہلے شاعر کوئی واقعہ یا حقیقت بیان کرتا ہے اور اس واقعے کے ظہور پذیر ہونے کی جو علت پیش کرتا ہے وہ صرف اس کے ذہن کی پیداوار ہوتی ہے۔ مثلاً پہلے مصرع میں شاعر اپنے محبوب کو خطاب کر کے کہتا ہے۔ رات تو بے نقاب پھرتا ہے اور دوسرے مصرع میں اس دعوے کی دلیل پیش کرتا ہے کہ جیسی تو سورج شرم کے مارے پانی میں جا چھپتا ہے۔ حالانکہ رات کو سورج کے چھپنے کے وجوہ کچھ اور ہیں۔ سودا کو یہ صنعت بہت پسند تھی اس لیے ان کے کلام میں حسن تعلیل کی بہت مثالیں ملتی ہیں۔

چمن نہ تنہا جنھوں کے غم سے ہنوز چھاتی پہ کھائے ہے گل  
رکھے ہے اب تک ہزار جا۔ سے روش بھی سینہ نگار اپنا

دلیل ہے تری شب بے نقاب پھرنے کی  
چھپے ہے شرم سے جا آفتاب در تہ آب

تارے یہ نہ سمجھو بہ شب تار فلک پر  
پہنچی ہے مری آہ شرربار فلک پر

تہا نہ شمع روئے ہے سودا کی خاک پر  
گل بھی تو لوٹتا ہے گریباں کو پھاڑ پھاڑ

---

شبنم کرے ہے دامن گل شست و شو ہنوز  
بلبل کے خون کا نہ گیا رنگ و بو ہنوز

---

کلیوں نے دیکھ شوخی گل چیں کو اس قدر  
اتنا لہو پیا کہ ہے پر خوں دہن ہنوز

---

کس کے ہیں زیر زمیں دیدہ نم ناک ہنوز  
جا بجا سوت ہیں پانی کے تہ خاک ہنوز

---

یا قوت نہیں ہے وہ ترے لعل سے اے شوخ  
جا ڈوبی ہے یہ آب میں ہو کر خجل آتش

---

کہکشاں ہے نام کو لیکن مرے احوال پر  
آسماں روتا ہے منہ پہ دھر کے ہر شب آستیں

---

شب نہ تھا بے قراری سے بھی کو کام ہے  
نور شمع اس شوخ بن جوں برق بے آرام ہے

لالہ بخود رو نہیں ہے خون نے فرہاد کے  
جوش میں آکر لگا دی کوہ کے دامن میں آگ

### تشبیہات واستعارات

سودا نے تشبیہوں اور استعاروں کو بھی اظہار بیان کا ذریعہ بنایا ہے۔ وہ تشبیہوں کے سہارے سے ایک مفہوم ادا کرتے ہیں۔ ایک مفہوم کے سہارے تشبیہ کا استعمال نہیں کرتے۔ اسی لیے ان کی تشبیہیں بہت سادہ اور پرکار ہوتی ہیں جن کی بنیاد ان کے تجربات اور مشاہدات پر ہوتی ہے۔ سودا تشبیہ کی مدد سے بے جان الفاظ میں روح ڈال کر ایک جاندار تصویر بنا دیتے ہیں۔ محبوب کی نازک اندامی کے لیے اس سے بہتر تشبیہ نہیں ہو سکتی کہ جب محبوب کو پسینہ آتا ہے تو اس کے جسم پر ایسے خراش آ جاتے ہیں جیسے موسم پکھلنے سے شمع پر۔

نازک اندامی کروں کیا اس کی اے سودا بیاں

شمع ساں جس کے بدن پر ہو پسینے کا خراش

شاعر محبوب کی گلی سے بغیر آواز پیدا کیے دے پاؤں آہستہ آہستہ گزرتا ہے تاکہ کسی کو خبر نہ ہو۔ اس کی اپنی کوئی منزل اور جائے قیام نہیں ہے جس طرف راستہ ملتا ہے وہ بڑھ جاتا ہے۔ دیکھیے سودا نے اس کیفیت کو کیسی خوبصورت تشبیہ کے ساتھ بیان کیا ہے :

تری گلی سے گذرتا ہوں اس طرح ظالم  
کہ جیسے ریت سے پانی کی دھار گذرے ہے

سودا نے ان تشبیہات کے بیان میں زندگی کے عام تجربات اور مشاہدات سے بھی کام  
لیا ہے۔ جب لشکر روانہ ہونے کے لیے تیاری کرتا ہے تو ہر طرف گرد اٹھتی ہیں۔ سودا اس  
تشبیہ کا بڑا برجستہ استعمال کرتے ہیں۔

کوچ شاہِ حسن کا ہے وہ غبارِ خطِ نشان  
گردِ لشکر سے اٹھی وقتِ سواری بیشتر

یہ حقیقت ہے کہ تشبیہوں نے بعض اشعار کو بے مزہ اور پھیکا بھی کر دیا ہے۔ ایسی چند  
تشبیہیں اور استعارے اور ملاحظہ فرمائیے:

بخشے ہے یوں دل کو میرے تقویتِ دشنامِ یار  
جوں دوائے تلخ سے پاوے کوئی بیمارِ فیض

دیکھوں ہوں یوں میں اس ستمِ ایجاد کی طرف  
جوں صید وقتِ ذبح کے صیاد کی طرف

تجھ بن اعضا کا ہے یہ میرے حال  
تارِ شیرازہ بن ہوں جوں اوراق

کلزے تو ابھی لعل کے دل بچ دھرے ہیں  
ہم نے تو ابھی موتی ہی آنکھوں میں بھرے ہیں

جن نے نہ دیکھی ہو شفقِ صبح کی بہار  
آکر ترے شہید کو دیکھے کفن کے بچ

حلقہ میں اس کی زلف کے عارض پہ کر نظر  
جوں شب میں رہ گیا ہو گرہ کھا کے نورِ صبح

بزم میں وہ شمع رویا رب کرے گا کب درود  
یوں ہوں آتش زیرِ پا جس طرح سے مجر میں عود

دُور آویزہ اس کی زلف اور رخسار سے باہم  
جھمکتا ہے برنگِ گوہر شب تاب آتش پر

### قصیدہ نگاری

موضوع کے اعتبار سے قصیدے کا دامن بہت وسیع ہے، اس میں مدح، ستائش اور ہجو کے علاوہ مختلف موضوعات پر طبع آزمائی کی جاسکتی ہے، مثلاً مناظرِ قدرت، مظاہرِ فطرت، پند و نصائح، مذہبی خیالات، معاشی بد حالی، سیاسی انتشار، موسم کی کیفیت، مختلف علوم کا بیان وغیرہ بھی قصیدے کے موضوعات ہیں۔ شہر آشوب بھی قصیدے ہی کا ایک انداز ہے۔

قصیدے کی ابتدا عربی زبان سے ہوئی، بقول شبلی:

”ایران میں جس زمانے میں شاعری کا آغاز ہوا، عرب کی شاعری  
مدحیہ قصائد پر محدود تھی، اس لیے ایرانی شعرا نے بھی ان ہی کی  
تقلید کی۔ اس کے ساتھ صلہ اور انعام کی توقع صرف قصیدہ سے  
ہو سکتی تھی۔ یہ اسباب تھے کہ ایران نے سب سے پہلے قصیدہ گوئی  
سے ابتدا کی۔“<sup>۱</sup>

دکنی اردو میں آغاز ہی سے قصیدے ملتے ہیں۔ بہمنی دور میں نظامی، بیدار، مشتاق، لطفی،  
عادل شاہی دور میں عبدل، قطب رازی، کمال خاں رستمی، ملک خوشنود، نصرتی، اعلیٰ اور  
ایاتھی، قطب شاہی عہد میں خواصی، طبعی اور بعد کے شاعروں میں بحر، نوری، ضعیفی اور دولی

اور نگ آبادی وغیرہ نے بھی قصیدہ نگاری کے اچھے نمونے چھوڑے ہیں۔<sup>۱</sup>

اجزائے ترکیبی کے اعتبار سے قصیدے کے چار حصے ہوتے ہیں۔ پہلے حصے کو تشبیب کہا جاتا ہے، بقول شبلی ”عرب میں مدحیہ قصائد کا یہ انداز تھا کہ تمہید میں عشقیہ اشعار ہوتے تھے، جن کو تشبیب کہتے ہیں۔“ اہل ایران نے صرف عشقیہ مضامین کی پابندی نہیں رکھی بلکہ طرح طرح کے موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے۔ عام طور پر نصائح، مذہبی خیالات، صبر اور قناعت، خودداری، انسانی عظمت، دنیا کی بے ثباتی و ناپائیداری، شاعرانہ تعلیٰ، ہم عصروں پر طعن و تعریض، معاشی بد حالی وغیرہ جیسے مضامین باندھے جانے لگے۔ تشبیب کے بعد گریز ہوتا ہے، یعنی شاعر ادھر ادھر کی باتیں کر کے اصل موضوع کی طرف آتا ہے، پھر مدح شروع ہوتی ہے اور دعا پر قصیدے کا خاتمہ ہوتا ہے۔ اردو میں بھی عام طور پر انہی اجزائے ترکیبی کو برقرار رکھا گیا۔

سودا کے معاصرین نے بھی قصیدے کہے ہیں مگر انھیں دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ابھی اردو زبان قصیدے کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ سودا اردو کے پہلے شاعر ہیں جنہوں نے قصیدہ نگاری کو باقاعدہ فن کی حیثیت سے انتہائی بلندی پر پہنچایا۔ سودا کے بعد اردو ادب کی تاریخ میں صرف ذوق وہ شاعر ہیں جنہیں دوسرا بڑا قصیدہ گو کہا جاسکتا ہے۔ لیکن قصائد ذوق میں وہ تنوع، نیرنگی قدرت اظہار اور وہ پُر شور انداز بیان نہیں ہے جو اچھے قصیدے کے لیے لازم ہے اور یہی وہ خصوصیات ہیں جنہوں نے سودا کو انفرادیت بخشی ہے۔ قصیدے کا انداز بیان دوسرے اصنافِ سخن سے مختلف ہوتا ہے۔ مضمون آفرینی، جوش

۱۔ جلال الدین احمد جعفری کی تحقیق ہے:

”کہ اس عہد کے شعراء میں ہاشمی، نصرانی، وجہی وغیرہ اور بعض سلاطین قطب شاہی کا پتا چلتا ہے کہ ان لوگوں نے سخن گستری کے میدانوں میں اپنی اپنی جولانیاں دکھائی ہیں لیکن ان سب کے ذخائر کلام میں مثنوی، مفردات، قطعات اور مرثیے کے سوا قصائد کا وجود اس وقت محقق نہیں ہے۔“

جلال الدین احمد جعفری، تاریخ قصائد اردو، الہ آباد، ص ۱۳۔

۲۔ شعر الجم، ۵، ص ۱۔  
 ۳۔ پروفیسر ضیاء احمد بدایونی لکھتے ہیں۔ ”حقائق کے دور میں ہمیں کوئی قابل ذکر قصیدہ نگار نہیں ملا۔ اس دور میں زیادہ سے زیادہ دلی کے قصائد پیش کیے جاسکتے ہیں۔ لیکن انھیں کوئی امتیازی حیثیت حاصل نہیں ہے۔“ نگار اصنافِ سخن نمبر، جنوری، فروری ۱۹۵۷ء، ص ۵۰۔

بیان، چنگی کلام، مشکل زمینی، شکوہ الفاظ، روانی و سلاست اور جدتِ ادا وغیرہ قصیدے کی خصوصیات ہیں۔ سودا کے قصائد میں یہ تمام خوبیاں موجود ہیں۔ قصیدے کے لیے خارجیت بہت ضروری ہے۔ سودا کے عہد میں دلی کے تقریباً تمام شاعر دل کی دنیا میں کھوئے ہوئے تھے۔ سودا پہلے شاعر ہیں جو اپنے اندر کی دنیا سے نکل کر باہر آئے ہیں۔

مولانا سید علی طباطبائی نے میر کے متعلق لکھا ہے کہ وہ قصیدہ کہنا نہیں جانتے تھے۔ لطفاً طباطبائی کا جواب دیتے ہوئے مولانا عبدالسلام ندوی نے میر اور سودا کی قصیدہ نگاری کا موازنہ کیا ہے۔ میر اور سودا نے ایک ہی زمین میں قصیدہ کہا ہے۔ دونوں نے قصیدے میں بہار یہ تشبیہیں لکھی ہیں۔ مولانا نے ثابت کیا ہے کہ میر کی تشبیہ کے مقابلے میں سودا کی تشبیہ کچھ بھی نہیں ہے۔<sup>۱</sup> اس موازنہ پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی لکھتے ہیں:

”مولوی عبدالسلام ندوی نے نہ پورے قصیدہ اور پوری تشبیہ کو سامنے رکھا اور نہ ان اصولوں کو جو اس زمانہ میں قصیدہ کا معیار تھے، محض چار شعروں کو لے کر سودا کے خلاف اور میر کے حق میں فیصلہ دے دیا ہے۔ یہ طریقہ بحث، آئین انتقاد کے منافی ہے۔ میر پختہ مشق اور قادر الکلام شاعر تھے، اس لیے انھوں نے قصیدے بھی لکھے، لیکن فن کے لحاظ سے ان کے قصائد سودا و ذوق کے ہم رتبہ نہیں ہو سکے۔“<sup>۲</sup>

اردو کے تقریباً تمام تذکرہ نگاروں نے سودا کو امام فن مانا ہے، بعض لوگ سودا کو بنیادی طور سے قصیدہ گو مانتے تھے اور ان کے قصیدے کو غزل پر ترجیح دیتے تھے۔ خود سودا نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ سودا کا قصیدہ ہے خوب

ان کی خدمت میں لیے، میں یہ غزل جاؤں گا

۱۔ شرح دیوان غالب ص ۹۳۔ بحوالہ شعرالبند، ۱، ص ۶۷-۷۰۔

۲۔ عبدالسلام ندوی، شعرالبند، ۱، اعظم گڑھ، ۱۹۳۹ء، ص ۶۷-۷۰۔

۳۔ میر تقی میر، ص ۳۱۸



شیفتہ نے بھی ”گلشن بے خار“ میں لکھا ہے:

”عوام میں جو یہ مشہو ہے کہ اس کا (سودا) قصیدہ غزل سے بہتر ہے، مہمل بات ہے۔ فقیر کے خیال سے اس کی غزل قصیدے سے بہتر ہے اور قصیدہ غزل سے“۔ (فارسی سے ترجمہ)

صاحب ”طور کلیم“ نے بھی شیفتہ کے الفاظ دہرائے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ محدودے چند کو چھوڑ کر سب تذکرہ نگاروں نے سودا کی قصیدہ نگاری اور بھوگوئی کو ان کی باقی تمام شاعری پر ترجیح دی ہے۔

سودا نے اپنے فن کی بنیاد فارسی قصیدہ نگاری کی روایات پر رکھی ہے بلکہ ان کے بعض قصیدے فارسی کے مشہور شاعروں کی زمینوں میں ہیں۔ مثلاً

اٹھ گیا بہن و دے کا چنستاں سے عمل

تج اردی نے کیا ملک خزاں متاصل

اسی زمین میں انور کی کا بھی مشہور قصیدہ ہے۔ جس کا مطلع ہے۔

- ۱۔ گلشن بے خار، ص ۱۰۰
- ۲۔ سودا کے فن قصیدہ نگاری کے متعلق رائے نقل کی جاتی ہیں۔ مصحفی لکھتے ہیں۔ ”اگر در علوم ادب معانی ایات قصیدہ خاقانی گویم روا۔ نقاش اول نظم قصیدہ در زبان ریختہ اوست حالا ہر کہ گوید پیرد و بخش خواہد بود“۔ (تذکرہ ہندی، ص ۱۲۵) میر حسن لکھتے ہیں ”در قصیدہ و بھوید بیضا دارد، قصائد عذب و دل آویز و بیان بھو بلند“۔ (تذکرہ میر حسن، ص ۸۲-۸۳) عاشقی کی رائے ہے ”جمع ریختہ گویان ہند، دے را امام فن و غیر سخن می دانستند۔ اگرچہ جملہ طرز کلام استاد ی بود حادی الا در مدح و قدح کہ مراد از بھو و قصیدہ اعجاز بکار بردہ، و قصائد ریختہ بر قصائد ملا عربی شیرازی پہلو بہ پہلو گفتہ“۔ (نشر عشق، ص ۶۵) صاحب تکملۃ اشعار قصیدہ گوئی میں انھیں بے مثل اور بے بدل بتاتے ہیں۔ ”خصوصاً در قصیدہ گوئی بے مثل دے بدل بود“۔ (تکملۃ اشعار ص ۲۹۶) نقاش علی کا بیان ہے۔ ”خصوصاً در مدح و بجا گوئی یکا است“۔ (بارغ معانی، ورق ۶۲ ب) شاہ جزہ کا خیال ہے ”علی انھیں در قصیدہ گوئی باز در سحر سامری می کشد، و قصائدش با قصائد عربی پہلوی زند“۔ (فص الکلمات ورق ۴۱ ب) جتلا لکھتے ہیں ”عجب زباں و سرخیل ریختہ گویان ہند و ستاں بود۔ در جمع فنون نظم خاصہ در قصائد وقت بسیار بکار بردہ“۔ (گلشن سخن ورق ۵۶ ب) سحر لکھنوی لکھتے ہیں ”در قصیدہ گوئی عربی عہد و در غزل نظیری وقت خویش بودہ“۔ (بہار بے خزاں، ص ۸۵) آزرہ لکھتے ہیں۔ ”در شاعری فیہا در قصیدہ گوئی و بجا زبان ریختہ گوئی بہ منزلتے رسیدہ کہ بالا بر از اں ممکن نیست“۔ (تذکرہ آزرہ، ص ۲۸)

جرم خورشید چو از حوت در آید بہ حمل  
اشہب روز کند اوہم شب را ارجل

عرتی کا بھی ایک قصیدہ اسی زمین میں ہے۔

چہرہ پردانِ جہاں رخت کشد چوں بہ حمل  
شب شود نیم رخ و روز شود مستقبل

بلکہ اس زمین کے قصیدے میں سودا نے عرتی کا ایک مصرع بھی تضمین کیا ہے۔

تا کجا شرح کروں میں کہ بقول عرتی  
اغگر از فیض ہوا سبز شود در منقل

خاقانی کے ایک قصیدے کا مطلع ہے۔

ثار اشک من ہر شب شکر ریز است پنبانی  
کہ ہمت را ز ناشوئست با زانو و پیشانی

اسی زمین میں سودا نے آنحضرتؐ کی شان میں ایک قصیدہ کہا ہے جس کا مطلع ہے۔

ہوا جب کفر ثابت، ہے وہ تمغائے مسلمانی  
نہ لونی شیخ سے، ز قار تسبیح سلیمانی

خاقانی کا ایک اور قصیدہ ہے:

ایں کز جہاں علامت انصاف شد نہاں  
اے دل کرانہ کن زمیاں خانہ جہاں

سودا کا مطلع ہے:

منکر خلا سے کیوں نہ حکیموں کی ہو زباں  
جب شہرہ سے مرے ہو ہلا اس قدر جہاں

بعض تذکرہ نگاروں نے رائے دی ہے کہ سودا کے قصائد عرتی، خاقانی اور انورسی کے پہلو بہ پہلو ہیں اور بعض کا خیال ہے کہ سودا اکثر میدانوں میں فارسی قصیدہ گو شعرا سے آگے

نکل گئے ہیں۔ مولانا محمد حسین آزاد لکھتے ہیں:

”اول قصائد کا کہنا اور پھر اس دھوم دھام سے اعلیٰ درجہ فصاحت و بلاغت پر پہنچانا ان کا پہلا فخر ہے۔ وہ اس میدان میں فارسی کے نامی شہسواروں کے ساتھ عنان در عنان ہی نہیں گئے بلکہ اکثر میدانوں میں آگے نکل گئے ہیں، ان کے کلام کا زور و شور انوری اور خاقانی کو دیا جاتا ہے اور نزاکت مضمون میں عرتی و ظہوری کو شرماتا ہے۔“<sup>۱</sup>

یہ کہنا تو بہت مشکل ہے کہ سودا نے فارسی قصیدہ گو شعرا کو بہت پیچھے چھوڑ دیا، لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ سودا اردو قصیدہ نگاروں کے امام ہیں۔

سودا نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت علیؓ، حضرت امام کاظمؑ، حضرت امام ضامنؑ، حضرت امام عسکریؑ، حضرت امام مہدیؑ، حضرت فاطمہؑ، حضرت امام زین العابدینؑ، حضرت امام حسینؑ، حضرت امام باقرؑ، حضرت امام جعفر صادقؑ اور حضرت امام تقیؑ کی مدح میں قصائد لکھے ہیں۔ باقی قصائد میں سودا نے عالم گیر ثانی، شاہ عالم، غازی الدین خاں وزیر آصف جاہ، شجاع الدولہ، آصف الدولہ، حکیم میر محمد کاظم، سرفراز الدولہ، حسن رضا خاں، نواب سیف الدولہ احمد علی خاں، بسنت خاں خواجہ سرا، نواب مہرباں خاں رند اور نواب عماد الملک کی مدح کی ہے۔ ایک فارسی قصیدہ در تعریف مسجد نوبھی کلیات میں شامل ہے۔

اب قصائد سودا کا تفصیلی جائزہ لیا جاتا ہے۔

مطلع: عام طور پر مطلع کی خوبی یا خرابی قصیدے کے باقی اشعار کا پتہ دیتی ہے، اس لیے قصیدہ نگار کوشش کرتا ہے کہ جذبات خیال اور جدت بیان سے ایسی ندرت اور شگفتگی پیدا کر دے کہ سننے والا اور پڑھنے والا چونک جائے اور اس کی تمام تر توجہ قصیدے کی طرف مبذول ہو جائے۔ سودا نے اس کا پورا پورا خیال رکھا ہے۔ ان کے اکثر مطلع اس فن کا بہترین نمونہ ہیں۔ حضرت امام مہدیؑ کی مدح میں قصیدے کا مطلع ہے۔

جوں غنچہ آساں نے مجھے بہرِ عرضِ حال  
دیں سوزِ باں دہن میں ولیکن سبھی ہیں لال  
اس قصیدے کا مطلع ثانی ہے۔

چاہے اگر کوئی دو جہاں کا متاع و مال  
تیرے گدائے در سے کرے آکے وہ سوال  
سرفراز الدولہ کی مدح میں جو قصیدہ ہے، اس کے مطلع میں جدت نے عجیب لطف پیدا  
کر دیا ہے۔

صبحِ عید ہے، اور یہ سخن ہے شہرہ عام  
حلالِ دخترِ رز بے نکاح و روزہ حرام  
حضرت فاطمہؑ کی مدح میں ایک قصیدے کا مطلع ہے۔

مکھڑے سے اپنے زلف کے پردے کو تو اٹھا  
لہریہ میں ماوِ درخشاں کو مت چھپا  
ایک اور مطلع ہے۔

ہووے جو قطرہ ریز یہ چشمِ تر آب میں  
پیدا ہو پھر بجائے گہرِ انگر آب میں  
چند مطلعے اور ملاحظہ ہوں۔

ہوا جب کفر ثابت، ہے وہ تمغائے مسلمانی  
نہ ٹوٹی شیخ سے زقارِ تسبیحِ سلیمانی

---

چہرہ مہروش ہے ایک سنبل مشک فام دو  
حسن بتاں کے دور میں ہے سحر ایک شام دو

یار و مہتاب و گل و شمع بہم چاروں ایک  
میں، کتاں، بلبل و پروانہ بہم چاروں ایک  
ایک مطلع میں فاخر مکیں کے استاد اکسیر پر کس انداز میں چوٹ کی ہے۔  
مستغنی ذاتی نہ مہوس کی ہو تنخیر  
معدن ہے جہاں سونے کا داں خاک ہے اکسیر

### تشبیہ

جیسا کہ شروع میں بتایا گیا ہے کہ تشبیہ قصیدے کی تمہید ہوتی ہے۔ اکثر و بیشتر تشبیہ کا مدح سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، چوں کہ اس میں ہر طرح کے موضوعات کی گنجائش ہے، اس لیے شعرا کو اپنی علیت، قابلیت کے اظہار اور قادر الکلامی کے جوہر دکھانے کا پورا موقع ملتا ہے۔ سودا کی بیشتر تشبیہیں بہت دل چسپ ہیں، بعض میں جدت فکر اور ندرت بیان نے تشبیہ کو فن قصیدہ گوئی کا بہترین نمونہ بنا دیا ہے۔ سودا نے بھی ان تمام موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے جو فارسی قصیدوں میں موجود تھے۔ ایک نعت کی تشبیہ میں وہ قناعت کی تلقین کرتے ہیں ان کا عقیدہ ہے کہ اگر انسان اپنے میں کوئی ہنر پیدا کرے تو پھر اسے دنیاوی جاہ و جلال کی ضرورت نہیں، دولت جمع کرنے سے پریشانی خاطر کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

ہوا جب کفر ثابت، ہے وہ تمغائے مسلمانی  
نہ ٹوٹی شیخ سے زناں تسبیح سلیمانی

ہنر پیدا کر اول ، ترک کچھ تب لباس اپنا  
 نہ ہو جوں تیغ بے جوہر و گر نہ ننگِ عریانی  
 فراہم زر کا کرنا باعثِ اندوہ دل ہووے  
 نہیں کچھ جمع سے غنچہ کو حاصل جز پریشانی  
 خوشامد کب کریں عالی طبیعت اہل دولت کی  
 نہ جھاڑے آستین کہکشاں شاہوں کی پیشانی  
 کرے ہے کلفت ایام ضائع قدر مردوں کی  
 ہوئی جب تیغ زنگ آلودہ کم جاتی ہے پیچانی  
 ایک منقبت کے تشبیہ کے اشعار ہیں۔

اگر عدم سے نہ ہو ساتھ فکر روزی کا  
 تو آب و دانہ کو لے کر گھر نہ ہو پیدا  
 نہیں میں طالب زرق آسمان سے کہ مجھے  
 یقین ہے کاسہ واڑوں میں کچھ نہیں ہوتا  
 نکل وطن سے غربت میں زور کیفیت  
 کہ آبِ بخت ہے جب تک ہے تاک میں صہبا  
 ہنر کو مفلسی ہرگز ضرر نہیں کہ نہیں  
 چنار کو تہی دہتی سے نقص جوہر کا

تشبیہ کا ایک خاص موضوع موسم بہار ہے۔ سودا کے صرف ایک قصیدے کی تشبیہ

بہار یہ ہے، جس میں اکتیس اشعار میں موسم بہار کی عکاسی کی گئی ہے۔ زور بیان، تشبیہات، استعارات اور جدتِ تخیل نے بہت سے اشعار کو انتہائی دل چسپ بنا دیا ہے، لیکن بعض اشعار میں یہی خصوصیات اعتدال سے گزر کر عیب بن گئی ہیں، اس تشبیہ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

سجدہ شکر میں ہے شاخِ ثمر دار ہر ایک  
دیکھ کر باغِ جہاں میں کرم عزو جل  
واسطے خلوت نو روز کے ہر باغ کے بیچ  
آب جو قطع لگی کرنے روش پر مخمل  
تار بارش میں پروتے ہیں گہرائے نگرگ  
ہار پہنانے کو اشجار کے ہر سو بادل  
بار سے آبِ رواں عکسِ جہنم گل کے  
لوٹے ہے بزرہ پہ از بسکہ ہوا ہے بے کل  
آب جو گرد چمنِ لمعہ خورشید سے ہے  
خطِ گلزار کے صفحہ پہ طلائے جدول  
لڑکھاتی ہوئی پھرتی ہے خیاباں میں نسیم  
پانوں رکھتی ہے صبا صحن میں گلشن کے سنبھل  
سایہ برگ ہے اس لطف سے ہر اک گل پر  
ساغرِ لعل میں جوں کیچے زمرہ کو حل

اس بہار یہ تشبیہ کے ایسے بھی چند اشعار ملاحظہ ہوں، جن میں مبالغہ آرائی کی وجہ سے

عیب پیدا ہو گیا ہے، جن کا بہار کی عکاسی سے کوئی تعلق نہیں اور جو صرف ذہنی مشق کی مثال ہیں۔ یہ اشعار ہم کو بالکل متاثر نہیں کرتے۔

شاخ میں گل کی نزاکت یہ بہم پہونچی ہے  
 شمع ساں گرمی نظارہ سے جاتی ہے پگل  
 جوشِ روئیدگی خاک سے کچھ دور نہیں  
 شاخ میں گادز میں کے ہے جو پھوٹے کوئیل  
 فیض تاثیر ہوا یہ ہے کہ اب حنظل سے  
 شہد ٹپکے جو لگے نشترِ زنبورِ عسل  
 کشت کرتے ہیں ہر اک تخم سے از فیض ہوا  
 گرتے گرتے بہ زمیں برگ ویر آتا ہے نکل  
 سبز قام ان دنوں آتا ہے نظر ہر گرو  
 خواہ ہو شیخ پسر خواہ ہو فرزندِ منغل

سودا نے بعض تشبیہوں میں تعلقی بھی کی ہے۔ ایک منقبت کی تشبیہ میں اپنے فن کی تعریف کی ہے اور ایک ایسے شاعر کو برا بھلا کہا ہے جس نے ان پر سرقہ کا الزام لگایا تھا۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

نام آوری کے واسطے حاسد نہ کر تلاش  
 جاگہ کسی کے نام کو اس عہد میں کہاں  
 گریاں کہے تو ریختہ ایراں میں فارسی  
 چاہے جگہ جو شہرہ کو ہو تو نہ یاں نہ داں  
 عالم کی السنہ پہ مرا اس قدر ہے شعر  
 گویا درقِ بیاض کا ہر منہ میں ہے زباں  
 میں نے سنا کہ تجھ کو مرے ایک شعر پر



دزدی کا اپنے معنی کے ہے وہم مہرباں  
 شاید بہ اتفاق توارد ہو پر مجھے  
 لفظوں کا اپنے غم کہ ہوئے کس پہ رائگاں  
 ازراہ دوستی میں کہوں تجھ سے ایک بات  
 طبع شریف پر جو نہ آوے ترے گراں  
 زہار ہم سری کا مرے تو نہ کر خیال  
 ہوگا غریب مضحکہ نزدیک شاعراں

تشبیہ کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ ایسے موضوعات پر طبع آزمائی کی جائے جو ممدوح کی حیثیت کے مطابق ہوں، یعنی تشبیہ میں جو کچھ کہا جائے وہ موقع محل کے بالکل ہی خلاف نہ ہو۔ سودا نے اکثر قصیدوں میں اس کا خیال رکھا ہے، لیکن بعض میں ان کا قلم بہک گیا ہے، انھوں نے حضرت علیؑ کے قصیدے کی تشبیہ میں جو غزل شامل کی ہے اس کے چند اشعار یہ بھی ہیں۔

چہرہ مہروش ہے ایک سنبل مشک فام دو  
 حسن بتاں کے دور میں ہے سحر ایک شام دو  
 میرے تیرے یہ ربط ہے جیسے بیان بحر و موج  
 واقعی میں تو ایک ہیں گو کہ ہوئے بنام دو  
 ابروئے یار کا خیال دل میں رہے ہے روز و شب  
 ہووے جو تیغ آبدار کیوں نہ کرے نیام دو

ایک اور قصیدہ حضرت علیؑ کی شان میں ہے، اس کی تشبیہ میں بھی ایسے ہی اشعار شامل ہیں جو کسی طرح بھی جائز نہیں۔

غازی الدین خاں وزیر کے قصیدے میں سودا نے خوشی کو ایک حسینہ تصور کر کے اس کا سراپا لکھا ہے۔ سراپا لکھنے کا اچھوتا انداز ہے، ایک صبح سودا کی آنکھ جھپک گئی، تو خوشی نے در دل پر دستک دی، شاعر نے پوچھا، کون؟ جواب ملا کہ خوشی! شاعر نے آنکھ کھولی تو دیکھا

کہ ایک توبہ شکن حسینہ کھڑی ہے، اس کے حسن و جمال نے پہلی ہی نظر میں سودا کو دیوانہ کر دیا۔ اس کے بعد سراپا شروع ہوتا ہے، جس میں سودا نے اپنے فن کا کمال دکھایا ہے۔

### گریز

تشبیہ کے بعد شاعر اصل موضوع یعنی مدح پر آتا ہے، چوں کہ تشبیہ اور مدح دو مختلف چیزیں ہوتی ہیں اس لیے ان دونوں میں تعلق پیدا کرنے کے لیے ایک یا ایک سے زیادہ شعر کہا جاتا ہے۔ ان اشعار کو گریز یا مخلص کہا جاتا ہے۔ گریز کی خوبی یہ ہے کہ اس میں بے ساختگی اور برجستگی ہو۔ یہ نہ معلوم ہو کہ شاعر نے زبردستی مدح کا ذکر چھیڑا ہے، بلکہ ایسا معلوم ہو کہ باتوں باتوں میں ذکرِ ممدوح آگیا ہے جو بالکل فطری ہے۔ قصیدے کے حسن و کمال کا اچھا خاصہ دار و مدار گریز پر ہوتا ہے۔ سودا نے گریز کے اشعار پر پوری توجہ صرف کی ہے، ان کے اکثر گریز بے تکلف اور بدیع ہیں جن میں فن کی پوری مہارت دکھائی گئی ہے۔ بعض قصیدوں میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ممدوح کا ذکر باتوں باتوں میں آگیا ہے اور بعض میں ممدوح کا ذکر اس طرح آتا ہے جیسے تشبیہ کا لازمی نتیجہ ہو، ایک نعتیہ قصیدے میں سودا دنیاوی عشق میں اپنی ناکامی اور سیہ بختی کا ماتم کر کے خود کو اس طرح سمجھاتے ہیں۔

خدا کے واسطے باز آ تو اب ملنے سے خواہاں کے  
نہیں ہے ان سے ہرگز فائدہ غیر از پشیمانی  
نظر رکھنے سے حاصل ان کے چشم و زلف کے اوپر  
مگر بیمار ہووے صعب یا کھینچے پریشانی  
نکال اس کفر کو دل سے کہ اب وہ وقت آیا ہے  
برہمن کو صنم کرتا ہے تکلیفِ مسلمانی  
زہے دین محمد پیروی میں اس کے جو ہوویں  
زہے خاکِ قدم سے اس کی چشمِ عرش نورانی

اور پھر آنحضرتؐ کی شان میں اصل مدح شروع ہوتی ہے، حضرت علیؑ کے قصیدے میں سودا اپنے محبوب کے جو دوستم اور بے وفائی کا گلہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

فریاد کروں کس سے رواداری کی تیرے  
کہنے کے لیے گبرو مسلمان ہے برابر  
نالش کروں اب داں کہ جہاں حق بطرف ہیں  
مور و ملخ و دیو و سلیمان ہے برابر

اب گریز کے بعد حضرت علیؑ کی شان میں مدح شروع ہوتی ہے۔ حضرت امام مہدیؑ کی منقبت میں سودا کسی ایسے شاعر کی خبر لیتے ہیں جس نے ان پر سرقہ کا الزام لگایا تھا، پھر شاعرانہ تعلق کے بعد اس طرح اصل موضوع پر آتے ہیں۔

نام اپنے سے کوئی جو مرے شعر کو پڑھے  
بولے فصاحت اس کا نہیں یہ لب و دہاں  
اس کا یہ شعر ہے کہ قلم جس کی روز و شب  
ایسے جناب کی ہے ثنا میں مدح خواں

اور یہاں سے سودا اصل موضوع پر آ جاتے ہیں۔ حکیم میر محمد کاظم کی شان میں کہے گئے قصیدے میں سودا فن طبابت کا بیان کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ انسان کا جسم کن کن چیزوں سے مرکب ہے، بیماریوں کے مختلف وجوہ بیان کر کے تشخیص مرض کے طریقوں پر روشنی ڈالتے ہیں اور پھر کہتے ہیں۔

قاعدہ یوں ہے پھر آگے ہے شفا اس کے ہاتھ  
جس کے ہے قبضہ قدرت میں علاج عالم  
سوتوان باتوں میں ہے خوض طبیبوں میں کے  
اس زمانے میں بجز میر محمد کاظم

کہیں کہیں سودا نے ڈرامائیت پیدا کر کے گریز کو بہت دل چسپ بنا دیا ہے۔ غازی الدین کے قصیدے میں خوشی سودا کو جگاتی ہے اور کہتی ہے کہ ”اب تو شیشہ اے اندوہ کا پتھر سے چمک“ آج خوشی کا دن ہے، لوگوں کو محتسب کا خوف نہیں ہے، ہر گھر میں خوشی کے شادیاں بچ رہے ہیں مگر تو آج بھی حزن و ملال میں ڈوبا ہوا ہے۔ یہاں سے گریز شروع ہوتا ہے۔

سن کے میں نے یہ کہا اس سے کہ اے مایہ ناز  
خیر ہے بات سمجھ کر تو کہہ اتنا نہ بہک  
بے سبب کیوں کہ میں اندوہ کی الفت چھوڑوں  
کس طرح دوستی غم کروں دل سے منفک  
کر کے دریافت یہ مجھ سے کہا اس نے کہ مگر  
سج میں تیرے یہ مژدہ نہیں پہنچا اب تک  
آج اس شخص کی ہے سالگرہ کی شادی  
کہ بصورت ہے وہ انسان و بہ سیرت ہے ملک  
یعنی نواب سلیمان خرد نام آصف جاہ  
عید میں جس کے یہ غبور بزرگ و کوچک

سودا نے گریز کی اس ٹینک کو خطابیہ قصائد میں زیادہ دل چسپ انداز سے استعمال کیا ہے، عماد الملک کی مدح میں قصیدے کی ابتدا اس طرح کی ہے۔

کہے ہے کاتبِ دوراں سے فشی تقدیر  
سمجھ کے دفترِ قسمت کیا کر اب تحریر  
یہ روز و شب تو بنائے گا تا کجا اس طرح  
کہ جامِ مہر میں آتش دے مہ کو کاسہ شیر

مختلف مشورے دے کر کاتبِ دوراں اصل وجہ بتاتا ہے۔

سنا نہیں ہے کہ غازی دیں عماد الملک

جو میر بخشی تھا واں کا سواب ہوا ہے وزیر

آصف الدولہ کے قصیدے کی ابتدا بالکل ڈرامائی انداز میں ہوتی ہے۔ قصیدے کا مطلع ہے۔

سودا پہ جب جنوں نے کیا خواب و خور حرام

لائے گھر اس طبیب کے ہے عقل جس کا نام

طیب نے سودا کا حال دیکھ کر کہا کہ اس کے لیے قصد و مسہل بہت فائدہ مند ہوں گے۔ سودا نے سُن کر جواب دیا کہ میرے جسم میں تو خون کی ایک بوند بھی نہیں ہے، اصل بات یہ ہے کہ میرے جسم میں جتنا لہو تھا وہ اس سال خیر آباد کے عامل نے پی لیا اور مسہل تو وہ انسان ہے جس نے زیادہ کھایا ہو، میرے لیے تو عید کا مہینہ بھی رمضان ہی رہا اور قرض لے کر علاج کرنے سے فائدہ؟ یہ سُن کر عقل مشورہ دیتی ہے۔

تب اس نے یوں کہا کہ بتاؤں میں وہ علاج

اس درد سے تو پا کے شفا ہو جو شاد کام

اس کے حضور عرض یہ کر جس کے سایہ میں

مورِ ضعیف پیل سے لے اپنا انتقام

اور پھر آصف الدولہ کی مدح میں اشعار ہیں۔

نواب بسنت خاں خواجہ سرا کے قصیدے میں سودا نے تمثیل نگاری سے کام لیا ہے۔ قصیدے کے ابتدائی دو شعر ہیں۔

کل حرص نامِ شخے سودا پہ مہرباں ہو

بولا نصیب تیری سب دولتِ جہاں ہو

گر اشرفی روپے کی خواہش ہو تیرے دل میں  
ظاہر ترے پہ ہر جا گنجینہ نہاں ہو  
”حرم“ چھ اشعار میں سودا کو دعائیں دیتا ہے۔ سودا جواب دیتے ہیں۔  
سن کر یہ حرف بولا سودا کہ قدر و رتبہ  
کب اشرفی روپے کی نزدیک عافاں ہو

اور پھر سودا صبر و قناعت کی تلقین کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ زرد جواہر آنے جانے والی  
چیز ہے، دولت سے انسان کا دل کالا ہو جاتا ہے، اہل دانش کبھی ہوس جاہ و منصب نہیں  
کرتے۔ گریز کا آخری شعر ہے۔

جو کچھ کہا ہے تو نے یہ تجھ کو سب مبارک

میں اور میرے سر پر میرا بسنت خاں ہو

گریز کے بعد اصل موضوع یعنی مدح شروع ہوتی ہے۔ مولانا شبلی نے مدح کے متعلق  
اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے۔

” (قصیدہ) ..... جس کا اصلی موضوع مدح ہے، بڑے کام کی چیز  
ہے، لیکن اس کے لیے شرط ہے کہ (۱) جس کی مدح کی جائے در  
حقیقت مدح کے قابل ہو (۲) مدح میں جو کچھ کہا جائے سچ کہا  
جائے (۳) مدحیہ اوصاف اس انداز سے بیان کیے جائیں کہ  
جذبات کو تحریک ہو۔ فارسی قصائد میں یہ شرطیں کبھی جمع نہیں  
ہوئیں، اولاً تو اکثر ایسے لوگوں کی مدحیں لکھی گئیں جو سرے سے  
مدح کے مستحق نہ تھے، یا تھے تو ان کے واقعی اوصاف نہیں لکھے گئے،  
بلکہ تمام قوت مبالغہ اور غلو میں صرف کردی گئی اکبر، خانخاناں،  
شاہجہاں کے سینکڑوں معرکے تاریخی یادگار ہیں، جن کے بیان

سے مردہ دلوں میں جنبش پیدا ہو سکتی ہے۔ عرقی، نظیری، فیضی وغیرہ نے ان لوگوں کی مدح میں سینکڑوں پرزور قصائد لکھے لیکن ان معرکوں کا کہیں نام تک نہ آیا۔ اس کے مقابلے میں عرب کی شاعری پر نظر ڈالو عرب اولاً تو کسی کی شاعرانہ مدح کرنا عار سمجھتے تھے اور مدح کرتے تھے تو کبھی صلہ اور انعام لینا گوارا نہیں کرتے تھے، پھر جو کہتے تھے، سچ کہتے تھے۔ ایک رئیس نے ایک عرب شاعر سے کہا کہ میری مدح لکھو، اس نے کہا۔ ”افعل اقول“۔ یعنی تم کچھ کر کے دکھاؤ تو میں کہوں۔“

یہ اقتباس طویل ضرور ہے، لیکن سودا کے قصائد کو سمجھنے کے لیے مفید ہے۔ اگر مولانا کی ان تین شرطوں کو مدح کا معیار مان لیا جائے تو ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑے گا کہ سودا نے (مذہبی قصائد کو چھوڑ کر) ان شرائط کا بہت کم خیال رکھا ہے۔

انھوں نے قصائد میں اس قدر مبالغے سے کام لیا ہے کہ سننے والے کے ذہن پر ممدوح کی شخصیت کا کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا۔ ان کی قادر الکلامی اور مبالغہ آرائی نے نواب شجاع الدولہ جیسے بہادر اور دلیر سپاہی اور احمد علی خاں کو برابر کر دیا ہے۔ مدح کرتے ہوئے شاعر کو یہ خیال رکھنا چاہیے کہ ممدوح کی کچھ نہ کچھ ذاتی خصوصیات بغیر مبالغے کے پیش کرے تاکہ انفرادیت ابھر سکے۔ سودا نے ایسا نہیں کیا ان کے یہاں ایک اچھے انسان کا مخصوص تصور ہے، یہ وہ انسان ہے جو جاگیر داری دور میں آئینڈیل ہو سکتا تھا۔ اس کی خصوصیات ہیں: عدل و انصاف، ایمانداری، فیاضی، مروت، حلم، نیکی و بزرگی، خداترسی، وغیرہ۔ بزرگان دین کی علیست و قابلیت کی مدح کر رہے ہوں یا کسی بادشاہ و نواب کی یا کسی امیر کی، سودا اس انسان میں یہی خوبیاں دیکھتے ہیں۔ چوں کہ سودا کے مدح کے مضامین محدود ہیں۔ اس لیے ان کے قصائد میں ایک بزرگ دین اور عام ممدوح میں کوئی نمایاں فرق نہیں ہے، حضرت علیؑ اور آصف الدولہ کی شجاعت، بہادری، عدل و انصاف وغیرہ پر کہے گئے اشعار کا اگر موازنہ کیا جائے تو کوئی فرق نہیں ملتا اور ہرگز یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ایک دنیائے

اسلام کا ہیرو ہے اور دوسرا ایک چھوٹی سی ریاست کا نواب اور پھر شجاعت و بہادری میں  
آصف الدولہ کا جو حال تھا اس سے کون واقف نہیں۔ جاگیر داری دور کے انسان کی  
خصوصیات کو سودا کے قصائد میں ملاحظہ کیجیے۔

## عدل و انصاف

حضرت علیؓ کے عدل و انصاف کی مدح ان الفاظ میں کی گئی ہے۔  
رکھا جب سے قدم مسند پر آؤں نے شریعت کا  
کرے ہے موج بحر عدلت تب سے بہ طغیانی  
اگر نقصان پر خس کے شرر کا تک ارادہ ہو  
گرہ کو آگ کے دوہیں کرے غرق آن کر پانی  
یہ کیا انصاف ہے یارو کہ طیر و وحش تک جگ میں  
اس امن و عیش سے اپنی بسراوقات لے جانی  
پلے ہے آشیاں میں باز کے بچے کبوتر کا  
شباں نے گرگ کو گلہ کی سوچی ہے نگہبانی  
ایک اور قصیدہ میں کہتے ہیں۔

طبع انساں میں ترے عدل سے رکھتے ہیں اثر  
حفظ و آب بقا شریعت و سم چاروں ایک  
آفت و قہر و بلا و غضب آفاق کے بیچ  
ہو کے آپس میں ترے تیغ کا دم چاروں ایک  
یہ اشعار بھی حضرت علیؓ کی مدح میں ہیں۔



ہیبتِ عدل یہ بڑی ہے کہ ہر دشت میں شیر  
 واسطے دردِ مر آہو کے گھسے ہے صندل  
 سامنے بڑ کے یہ کیا دخل کہ نکلے آواز  
 گرگ کے پوست کو منڈھوا کے بجائیں جو دہل  
 حضرت امام موسیٰ کاظمؑ کی مدح سرائی اس طرح کی ہے۔

از بس اب ان کے عدل سے معمور ہے جہاں  
 پہونچا ہے کارِ خلق اس امن و اماں تک  
 بچہ جو گو سپند کا گم ہو تو گرگ و شیر  
 پہونچا دیں تانہ ڈھونڈ کے اس کو جہاں تک  
 دہشت سے اس خیال کے زہرہ ہوان کا آب  
 پہونچیں نہ ہم مباد کسی کے گماں تک  
 گلچیں کی کیا مجال جو توڑے چمن میں پھول  
 صورت سے گل کے لرزے ہے باؤخراں تک  
 بہ جائے ایک خس کھوریلے میں موج کے  
 زنجیر سے بندھا پھرے آبِ رواں تک  
 عالم گیر ثانی کی مدح میں سودا نے جو قصیدہ کہا ہے اس میں یہ اشعار بھی ہیں۔

جہاں پناہ ترے در گہِ عدالت میں  
 کسی کو دیوے اذیت کوئی معاذ اللہ

جلے جو شام کو پروانہ بزم میں تیری  
 تو صبح شمع کے آتا ہے سر پہ روزِ سیاہ  
 شرارِ سنگ سے خاشاک کو جو پہونچے ضرر  
 لے آونے کھینچ کے دیوان کوہ کو پرکاہ  
 غازی الدین خاں کے عدل کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

عدل یہ عصر میں اس کی ہے کہ ہر ایک طبیب  
 فعلہ تپ کو بھی تبرید لکھے خار خشک  
 کرنے دیوے نہ رفو چاک کتاں کو انصاف  
 تا نہ رشتہ کے لیے ماہ کی کھولے پتہ پک  
 شجاع الدولہ ایسے عادل اور منصف تھے کہ بقول سودا۔

تو وہ عادل ہے جہاں میں کہ قلمرو میں ترے  
 چیونٹی بھی دست تعدی سے نہ ہووے پامال  
 ایک اور قصیدے میں وہ کہتے ہیں۔

کیا بیاں اس کی عدالت کا زباں پر اداں  
 سحر ہے صولت عدل اس کے تئیں کراں باز  
 بازو کنجشک کی کھینچے جو مقصور تصویر  
 رعب کنجشک سے پرواز کرے صورت باز  
 پیش خس تاب نہ آتش کو بجز خاموشی  
 نہ یہ طاقت کہ زباں اپنی کرے شعلہ دراز

آصف الدولہ کے انصاف و عدل کا بیان اس طرح کیا ہے۔

جا سے بے جا ترے قلم و میں کب توانا سے ناتواں ہو دے  
ذره ' خاک کی حفاظت کوں باد تند آکے پاسباں ہو دے  
سنگ اس عہد میں ہو واں پانی شیشہ گر کی جہاں دکان ہو دے  
سرفراز الدولہ کے عدل کی داد ان الفاظ میں دی ہے۔

بروز جمعہ سدا ہاتھ میں لے ناخن گیر  
پھرے ہے شیر کو پیشے میں ڈھونڈتا حجام  
اسی امید پہ تا قصر کر کے ناخن شیر  
برائے ہیکل اطفال دے کے لے انعام

ان اشعار میں سودا نے حضرت علیؓ، حضرت امام موسیٰ کاظمؑ، حضرت امام ضامنؑ، شجاع الدولہ، آصف الدولہ، حسن رضا خاں کے عدل و انصاف کی مدح کی ہے۔ اس موضوع پر سودا کے مخصوص مضامین ہیں، جسے وہ مختلف الفاظ میں بیان کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً اب طاقتور کمزوروں کو پریشان نہیں کرتے، بلکہ شیر بھی بکریوں سے ڈرتے ہیں۔ شیر، گرگ، اژدر، باز وغیرہ نے اپنی خونخواریت چھوڑ دی ہے، آگ، شمع، حنظل، سم، سنگ وغیرہ نے اپنے منفی اثرات ترک کر دیے ہیں۔ سودا کے جدت بیان نے ان مضامین کو ثقافتی تشبیہوں اور استعاروں کے سانچوں میں ڈھالا ہے، یہ اشعار حسن تخیل، زور بیان، حسن تعلیل اور جدت فکر کا بہترین نمونہ ہیں، مگر ان کی بنیادی خرابی صرف یہ ہے کہ حضرت علیؓ اور عالم گیر یا آصف الدولہ کے مدحیہ اشعار میں قطعی فرق نہیں ہے، پھر کوئی ایسی بات نہیں کہی گئی جس کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ ہو، بالکل یہی حال دوسرے اوصاف کا ہے۔ مختلف عنوانات کے تحت یہ اوصاف بھی ملاحظہ کیجیے۔

## شجاعت و بہادری:

کیا بتاؤں جس قدر اس کی برش کا ہے صفا  
کیا کروں میں زوریاں پر اپنے مولا کا بیاں  
روز میداں سامنے آوے گر اس فن کا عدو  
کوئی نہ گردوں سا جس کے سر کا ہودے استخواں  
جب کمر سے کھینچ کر مارے وہ اس کے فرق پر  
موسے سر سے ناخن پاتک نہ ٹھہرے درمیاں

(قصیدہ در مناقب حضرت علیؑ)

دعوائے بندگی ہو جسے اس جناب میں  
اس کے تئیں ہے فن شجاعت میں یہ کمال  
مستک میں فیل مست کے مارے اگر وہ تیر  
گردن میں استخواں کے کبھو بند ہوے بھال  
سو قار اس طرح سے نمودار ہو رہے  
جوں اژدھا پہاڑ سے جھانکے ہے سر نکال

(قصیدہ در مناقب امام مہدیؑ)

رستم کو خبر ہو کہ ترا اس پہ ہے آہنگ  
جیوے بھی جو یہ سن کے تو کھایا نہ لگے انگ  
بل چوٹی کا پاوے تو کرے چھپنے کا واں قصد

بہن پہ تجھے دیکھ کے عرصہ ہو نیٹ تنگ  
 طائر کے جو تو صید پہ لے تیر و کماں ہاتھ  
 ارجن کے وہیں چہرے سے پرواز کرے رنگ  
 حربے سے یہ دہشت پڑے سادنت کے دل میں  
 بچ جائے اگر جان سے کھا کر تر سر چنگ  
 ہاتھ اس کے میں دے کر کبھو شمشیر برہنہ  
 اک آئینہ دکلاؤ تو بھاگے وہ دو فرسنگ

(قصیدہ در مدح شجاع الدولہ)

تجھ نعرۂ غضب کی یہ صولت ہے گرسنیں  
 فیصل ہوں بر و بحر کے باشندگان تمام  
 زہرہ ہو آب سینہ میں، بیت سے شیر کا  
 تڑپے نہنگ پیاس سے مانی ہو جوں بدام  
 اشج تو اس قدر ہے کہ میداں میں روز جنگ  
 کیا تاب رو برد ہوں ترے رستم اور سام  
 قالب تہی کریں وہ قلم اس کی دیکھ کر  
 تصویر تری تیغ کی کھینچے جو بے نیام

(قصیدہ در مدح آصف الدولہ)

## فتیاضی

چاہے اگر کوئی دو جہاں کا متاع و مال  
تیرے گدائے در سے کرے آکے وہ سوال  
بر سے ترا جو ابر کرامت زمین پر  
پیدا بجائے دانہ گہر ہوں ہر ایک سال

(قصیدہ در مدح امام مہدی)

کسی کے آگے کوئی ہاتھ پارے کیا ڈل  
مٹھی باندھے ہوئے پاتا ہے تولد کو دک

(قصیدہ در مدح غازی الدین خاں)

گہر فشاں ہے سدا دست فیض کا اس کے  
نگرگ بار نہ ہو جس کے ابر عشر عشر  
غنی ہوا ہے یہ اس کے کرم سے ہر محتاج  
کہ فرق ہو نہیں سکتا بہم امیر و فقیر  
تمیز کیا کہوں اجزائے کار کی اس کے  
کہ جس کے رمز کو پہونچے نہ آسماں کا دبیر  
دوام زلف بہتاں سے کرے اسے تنخواہ  
جو مانگے فرقہ عشاق سے کوئی جاگیر

(قصیدہ در مدح آصف جاہ)

سنا میں حاتم طائی کو تجھ سے نسبت کیا  
 مرے خن کو یقین کر وہ ہے زباں زد عام  
 بزیر سقف فلک شہرہ سنا اوس کا  
 طنین پشہ صدا فیل کی ہے در حمام  
 (درمدح سرفراز الدولہ)

گلشن دہر میں چار طرف  
 ایک مفلس جو ڈھونڈیے تو نہیں  
 غنچہ کی بھی گرہ میں بند کیا  
 اس کی بخشش نے حب زر کے تئیں  
 (قصیدہ درمدح نواب احمد علی خاں)

### مروت:

راج اتنی ہے مروت کہ غزالوں کو پلنگ  
 اس طرح سمجھے ہے فرزند گویا لے پالک  
 (قصیدہ درمدح نواب غازی الدین خاں)

جس جگہ تیری مروت کا زباں پر ہو ذکر  
 شعلہ واں خس کی اذیت کو سمجھتا ہے وہاں  
 پدری کی ہے انھوں کی جو ترے دامن تک  
 مادر گیتی کی بے مہری سے پہونچے اطفال  
 (قصیدہ درمدح شجاع الدولہ)

ان کے علاوہ سودا نے فہم و ادراک، حلم، غنود کرم، نیکی و بزرگی، شرافت و پاکیزگی، خدا ترسی، علیت و قابلیت وغیرہ جیسی خصوصیات کی تعریف کی ہے۔ انھوں نے مہرباں خاں رند کے دیوان و اشعار کی مدح میں ایک قصیدہ بھی لکھا ہے۔ ممدوح کی شخصیت اور اس کی ذات کے علاوہ سودا نے اس کے ساز و سامان کی بھی مدح کی ہے۔ مثلاً اکثر قصیدوں میں گھوڑا، ہاتھی، تلوار، تیر، کمان، سپر، نیزہ، پاکی اور ناکی وغیرہ کی تعریفیں کی گئی ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ اردو مرثیوں میں جو ان اشیا کی تعریفیں ملتی ہیں، اس کی روایت سودا ہی نے قائم کی تھی تو غلط نہ ہوگا، کیوں کہ سودا سے قبل اردو مرثیوں میں یہ انداز نہیں تھا۔ سودا نے ایک قصیدے میں شجاع الدولہ اور حافظ رحمت خاں روہیلے کے معرکے کی تفصیل بھی بیان کی ہے۔ سودا حافظ رحمت خاں کے ساتھیوں سے پوچھتے ہیں کہ تم تو جاں گسار تھے۔ ایک ہی قوم اور ایک ہی گرد کے تھے، پھر یہ کیسے ہوا کہ تم میدان جنگ میں حافظ کی لاش چھوڑ کر فرار ہو گئے۔ وہ لوگ سودا کو جواب دیتے ہوئے شجاع الدولہ اور اس کی فوج کے کارناموں کا ذکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایسے جاں باز بہادروں کے مقابلے میں کون ٹھہر سکتا تھا، ہم تو خیر ساتھیوں میں تھے، خود حافظ کا لڑکا باپ کی لاش چھوڑ کر فرار ہو گیا۔ اس قصیدے میں سودا نے میدان جنگ کا پورا نقشہ کھینچ دیا ہے اور کوشش کی ہے کہ معمولی تفصیلات بھی بیان کر دی جائیں، یہ قصیدہ اردو رزمیہ کا بہترین نمونہ اور شجاع الدولہ کی مدح کا بہت ہی خوب صورت انداز ہے۔

### دعا یا حسن طلب

مدح کے بعد بزرگان دین سے دعا مانگی جاتی ہے اور اگر قصیدہ اہل دول کی شان میں ہے تو حسن طلب سے کام لے کر اپنے لیے کچھ مانگا جاتا ہے۔ سودا کا حسن طلب بہت کمزور ہے۔ اگرچہ وہ قصیدہ نگار ہیں لیکن حسن طلب دراز کرتے ہوئے انھیں بہت شرم آتی ہے اور جب تک وہ بالکل ہی مجبور نہیں ہو جاتے اپنے لیے کچھ نہیں مانگتے۔ سودا نے صرف غازی الدین خاں وزیر، آصف الدولہ اور سرفراز الدولہ حسن رضا خاں کے سامنے ہاتھ پھیلا یا ہے، باقی قصیدوں میں ممدوحین کے اقبال کی بلندی کی دعائیں مانگی ہیں۔



کچھ کمزوریوں اور خامیوں کے باوجود قصائد سودا اردو نظم کے اعلیٰ ترین نمونے ہیں، سودا الفاظ کے بادشاہ ہیں۔ ان کے پاس الفاظ کا بہت بڑا خزانہ ہے اور وہ ہر لفظ کے مزاج اور اس کے استعمال سے بخوبی واقف ہیں۔ طرح طرح کی تشبیہات اور استعارات کے سہارے ایک ہی بات کو سوانداز سے کہہ سکتے ہیں، مشکل اور سنگلاخ زمینوں کو پانی کر دینا سودا ہی کا کام تھا، بعد کے تمام قصیدہ نگار سودا سے متاثر ہیں اور اکثر شعرا نے ان کی زمینوں میں قصیدے لکھے ہیں۔

### ہجو گوئی

ظرافت نگار جب ناہموار، بے آہنگ، بد صورت اور ناقص چیزیں دیکھتا ہے تو اپنی تخلیقی قوتوں کو رو بکار لا کر انہیں اور بھی مضحکہ خیز بنا دیتا ہے۔ اس عمل تخلیق کے پیچھے مختلف جذبات کا فرما ہوتے ہیں۔ ظرافت نگار بے ڈھنگے، بے تناسب اور بے محل عناصر پر خود بھی ہنستا ہے اور اپنی صنائی اور خلاقی کی قوتوں کا استعمال کر کے دوسروں کے لیے بھی ہنسنے ہنسانے کا سامان فراہم کرتا ہے۔ وہ اخلاقی مصلح نہیں ہوتا۔ اس کا مقصد صرف ہنسا ہنسانا ہے۔ اس کے برعکس طنز نگار کی مسکراہٹ میں نشتر بھی ہوتے ہیں، جن کا استعمال سماج اور زندگی کے ناسوروں پر کیا جاتا ہے۔ اس کا مقصد ایک تعمیری کام یعنی انسان کی اصلاح ہوتا ہے۔ ہجو نگاری کے محرکات بھی تقریباً وہی ہوتے ہیں جو ظرافت نگاری کے ہیں۔ بقول کلیم الدین احمد ”ظرافت نگار کسی مشاہدہ کو دیکھ کر مسکرا اٹھتا ہے۔ لیکن کسی اور قسم کا جذبہ اس کے دل میں نہیں ابھرتا۔ اسی جگہ ظرافت نگار اور ہجو گوئی راہیں الگ الگ ہو جاتی ہیں۔ ہجو گو بے ڈھنگے، ناقص، بد صورت مناظر کو دیکھ کر بے تاب ہو جاتا ہے۔ نا انصافی، بے رحمی اور ریا کاری کی مثالیں دیکھ کر اس کے دل میں نفرت، غضب، حقارت اور اسی قسم کے جذبات ابھرنے لگتے ہیں۔ وہ بھی صنائع ہے اس لیے وہ اپنے جذبات کو محض سیدھے سادے طور پر بیان نہیں کرتا۔ وہ اپنے جذبات سے ان کی شدت کے باوجود علاحدگی اختیار کرتا ہے اور ان سے الگ تھلگ ہو کر انہیں قابو میں لا کر ان کا صنعت کارانہ اظہار کرتا ہے۔ اس صنعت کارانہ اظہار کی وجہ سے جذبات کی شدت میں کمی نہیں

زیادتی ہوتی ہے۔ جھوگوانسانی کمزوریوں، خامیوں، فریب کاریوں کو اپنے طنز کا نشانہ بناتا ہے۔ لیکن جھوگوانسان ہے اور انسانی حدود میں گھرا ہوا ہے۔ اس لیے اگر ہمیشہ نہیں تو اکثر اس کی جھوڑوں کی ابتدا کسی ذاتی جذبہ سے ہوتی ہے۔ لیکن اگر وہ اپنے فن کی اہمیت اور اس کی ضروریات سے آگاہ ہے تو وہ اپنے ذاتی جذبے سے علاحدگی اختیار کرتا ہے اور اسے ایک قسم کی عالمگیری عطا کرتا ہے۔ بہر کیف جھوگوسارے جذبات پر تصرف رکھتا ہے۔ وہ ہنستا بھی ہے اور روتا بھی ہے۔ وہ ہمدردی، رحم، انصاف اور فیاضی کے جذبات کو ابھارتا ہے اور ساتھ ساتھ وہ غصہ، نفیض اور حقارت کو بھی بھڑکاتا ہے۔ ظرافت نگار کے مقابلے میں اس کی جذباتی دنیا زیادہ وسیع اور کشادہ ہے۔“

جیسا کہ کلیم الدین صاحب نے کہا کہ جھوگوئی میں فنکاری ذات اور شخصیت کو براہ راست دخل ہوتا ہے۔ اس لیے جھوکی بنیاد عام طور پر کسی ذاتی جذبے پر ہوتی ہے۔ لیکن اس فن کا کمال یہ ہے کہ فنکار اپنے فن میں اتنی وسعت، ہمہ گیریت اور عمومیت پیدا کر لے کہ اس میں کسی فرد، جماعت یا اداروں کے نام کی حیثیت محض ایک نشان یا اشارہ کی رہ جائے اور فنکار کا جذبہ یا اس کی شخصیت اتنی دب جائے کہ پہچانی نہ جاسکے اور جھوگوانسانی کمزوری، ظلم و ستم، نا انصافی، عیاری و مکاری، خود پرستی اور خود فریبی، جھوٹی عزت اور وقار کے خلاف ایک بلند آواز بن جائے۔

ظرافت نگاری اور جھوگوئی میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ عام طور پر ظرافت نگار تہذیب اور اخلاق کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتا۔ اس کے برعکس جھوگو کے ہاں حقارت اور نفرت کے جذبات کی اتنی شدت ہوتی ہے کہ وہ پھبتی، تمسخر، استہزا اور مضحکہ اڑانے سے آگے بڑھ کر فحش نگاری اور ابندال پر بھی اتر آتا ہے۔

اردو شاعری میں جھوگوئی کی ابتدا بھی فارسی ہی کے اثر سے ہوئی۔ فارسی میں اس کا آغاز عہد ساسانی کے شاعر رودکی سے ہوتا ہے لیکن ان کے ہاں جھو یہ اشعار کی تعداد بہت کم ہے۔ اسی عہد کے ایک اور شاعر دقیقی نے بھی اس فن میں طبع آزمائی کی۔ لیکن ابھی یہ فن ابتدائی مدارج میں تھا۔ دور سلجوقی میں انوری، خاقانی اور سوزنی نے اسے بہت ترقی

دی۔ ان کے بعد کمال اصفہانی کا نام آتا ہے۔ کمال ہر شاعر کے لیے جھوگوئی کو لازمی قرار دیتے ہیں۔ اُن کے خیال سے جو شاعر اس پر قدرت نہیں رکھتے ان کی مثال ایسے شیر کی ہے جو حریفوں سے مقابلہ کرنے کے لیے چنگال اور دندان نہ رکھتا ہو۔ پروفیسر محمد علیم الدین سالک نے ان کا ایک قطعہ نقل کیا ہے۔

ہجا گفتن ہر چہ پسندیدہ نہ بود (؟)

مبادا کے کالت آں ندارد

ہر آں شاعرے کو نہ باشد ہجا گو

چو شیرے کہ چنگال و دندان ندارد

خداوند اساک را ہست دردے

کہ الا ہجا بیچ در ماں ندارد

چو نفریں بود بو لہب ز ایزد (؟)

مرا جھو گفتن پشیاں ندارد

اگر جھو گوئی تو در گردن من

کہ ہرگز زیانے بہ ایماں ندارد لے

عبیدزاکانی کے کلام میں بھی جھو یہ شاعری کی اچھی خاصی مثالیں مل جاتی ہیں۔

شمالی ہند میں اردو شاعری کے آغاز ہی سے جھوگوئی کی ابتدا ہوئی۔ اس سلسلے میں غالباً پہلا نام میر جعفر زٹی کا ملتا ہے۔ لیکن ان کا مزاج ہزل گوئی کی طرف زیادہ راغب نہ تھا۔ انھوں نے باقاعدہ جھوئیں نہیں کہیں۔ البتہ ان کے کلام میں جھو یہ اشعار اچھے خاصے مل جاتے ہیں۔

ابتدائی عہد کے بیشتر اردو شاعروں نے ہجو پر اشعار کہے ہیں۔ بڑی بڑی برگزیدہ ہستیاں بھی اس سے دامن نہ بچا سکیں۔ حاتم، آبرو، میر، شاکر ناجی اور کمترین وغیرہ کے یہاں تو اس قسم کے اشعار مل ہی جاتے ہیں۔ حیرت ہے کہ مرزا مظہر جانجاناں جیسے ثقہ بزرگ بھی خاموش نہیں رہے۔

سودا نے ہجو گوئی کو باقاعدہ فن کی صورت دی۔ وہ اس فن کے امام ہیں اور خاتم بھی۔ ان سے پہلے اور ان کے بعد اردو میں کوئی اتنا بڑا ہجو گو نہ پیدا ہو سکا۔<sup>۱</sup> انشا اور مصحفی نے بھی اس صنف میں طبع آزمائی کی۔ مگر ان کی ہجویں تیسرے درجے کی ہیں، جن کی بنیاد محض ذاتی عناد و بغض پر ہے۔ انشا میں وہ تمام صلاحیتیں تھیں جو انھیں ایک عظیم ہجو نگار بنا سکتی تھیں۔ مگر انھوں نے اپنی صلاحیتوں کو معمولی ادبی معرکوں میں ضائع کر دیا۔ مصحفی اس مزاج کے آدمی نہیں تھے۔ انھیں تو انشا نے خواہ خواہ اس میدان میں کھینچ لیا تھا۔

سودا کے ہاں رچا ہوا سماجی شعور تھا۔ ان کے اکثر مرتبی وہ لوگ تھے جو صاحبِ اقتدار تھے۔ ان صحبتوں میں رہ کر سودا نے ملکی سیاست کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔

ان کی ہجوؤں کو بہ غور پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سودا اپنے زمانے سے شدید نا آسودگی کا اظہار کر رہے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان کی نا آسودگی اور غمِ حقارت اور نفرت کے جذبے میں تبدیل ہو گیا ہے۔ لیکن یہی جذبہ ان کی ہجو نگاری کا سرچشمہ ہے۔

رشید احمد صدیقی نے سودا کی ہجو گوئی پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے۔ ”سودا کو ہجو وہجا میں نہ صرف فہلِ تقدم حاصل ہے بلکہ ان کے کلام سے طنزیات کی بہترین صلاحیت و استعداد بھی نمایاں ہے۔..... بہترین طنز کی اساسی شرط یہ ہے کہ وہ ذاتی عناد و تعصب سے پاک اور ذہن و فکر کی بے لوث برہمی یا شگفتگی کا نتیجہ ہو۔ اس معیار پر سودا کی ہجویں تمام و کمال پوری نہیں اترتیں۔ تاہم اس خاورستان میں بھی طنز و مضحکات کے ایسے نمونے ملتے ہیں جن سے ان کی زندہ دلی اور شگفتہ مزاجی کا ہمیں پوری طرح معترف ہو جانا پڑتا

۱۔ آزاد لکھتے ہیں۔ مگر اس وقت تک اردو کے شاعر صرف ایک دو شعروں میں دلی کا غبار نکال لیتے تھے۔ یہ طرز خاص کہ جس سے ہجو ایک موٹا ٹہنا اس بارغ شاعری کا ہو گئی۔ ان ہی (سودا) کی خوبیاں ہیں۔ عالم، جاہل، فقیر، امیر، نیک، بد کسی کی داغ بیل ان کے ہاتھ سے نہیں پڑتی۔ آبِ حیات، ص ۱۵۴۔

ہے۔<sup>۱</sup> میرے خیال سے کوئی ایک طرز بھی ایسا نہیں ملے گا جس کا محرک ذاتی جذبہ نہ ہو۔ ذہن و فکر کی ایسی برہمی اور شکستگی کا تصور ہی ناممکن ہے، جس کی بنیاد ذاتی عناد و تعصب اور ذاتی جذبے پر نہ ہو لیکن جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں کہ بھونگار کے کمال کی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنی ذات اور شخصیت کو زیادہ سے زیادہ چھپانے اور فن میں ہمہ گیری اور عمومیت پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائے۔

سودا نے بھوگوئی کے لیے تقریباً تمام اصنافِ سخن استعمال کیے ہیں۔ غزل، قصیدہ، مثنوی، ترکیب بند، ترجیع بند، رباعی، قطعہ وغیرہ۔ غرض ہر صنف میں بھویں موجود ہیں۔ سودا کی بھوؤں کو پانچ مختلف عنوانات کے تحت تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱- وہ بھویں جن کی بنیاد محض ذاتی بغض و عناد پر ہے یا جس کا مقصد کسی سے چھیڑ چھاڑ کرنا ہے۔

۲- اخلاق کی اصلاح کے لیے لکھی جانے والی بھویں۔

۳- مذہبی اختلاف پر لکھی جانے والی بھویں۔

۴- وہ بھویں جو ادبی اختلاف یا معاصرانہ چشمکوں کی وجہ سے لکھی گئیں۔

۵- وہ بھویں جن میں اپنے دور کے سیاسی حالات کی اتاری اور مالی بد حالی کا مضحکہ اڑایا گیا ہے۔

بھوؤں کا مختلف عنوانات کے تحت جائزہ لینے سے قبل مناسب ہے کہ سودا کی بھوگوئی کی خصوصیات پر روشنی ڈالی جائے۔

سودا کا مشاہدہ بہت تیز ہے۔ وہ جب کسی منظر کو دیکھتے ہیں تو پہلی ہی نظر میں ان کا ذہن منظر کی معمولی سے معمولی تفصیل کو محفوظ کر لیتا ہے۔ اسی لیے جب وہ اس منظر کو الفاظ کے سانچے میں ڈھالتے ہیں تو کوئی گوشہ تشنہ نہیں رہنے پاتا۔ اصل منظر میں جو کچھ کی رہ جاتی ہے، سودا اسے اپنے زورِ قلم سے پورا کر دیتے ہیں۔ جو مصوری اور شاعری کا حسین ترین

۱۔ رشید احمد صدیقی، طنزیات و مضحکات اردو، الہ آباد، ص ۴۶۔

استزاج ہے۔ اس جزئیات نگاری کے لیے اعتدال اور توازن اساسی شرط ہے۔ سودا جب اعتدال کی حدود میں رہتے ہیں تو ان کی تصویریں فن کا بہترین نمونہ ہوتی ہیں۔ لیکن کبھی کبھی وہ توازن کھو بیٹھتے ہیں۔ سودا نے راجہ زرت سنگھ کے ہاتھی کی جھوکھی ہے۔ ہاتھی بہت کمزور اور لاغر ہے۔ سودا اس کے پورے جسم کا جائزہ ان الفاظ میں لیتے ہیں۔

خداوند! یہ آرا ہے کہ خرطوم  
یہ ظالم چیرتا ہے جس سے مظلوم  
غرض ہونی تھی باقی ماندوں کی خیر  
بسانا تھا خدا کو کعبہ و دیر  
بدن پر اب نظر آتی ہے یوں کھال  
طناب ست سے خیمہ کا جوں حال  
نمودار اس طرح ہر اتخاں ہے  
گویا ہر پہلی اس کی زردباں ہے  
نہ بیڑی ہے نہ کٹ بندھن نہ لکڑا  
رکھے ہے ناتوانی اس کو جکڑا  
ضعفی نے کی اس کی فریبی گم  
گیا ہاتھی نکل اور رہ گئی دم  
سمجھنا فیل اسے دیوانہ پن ہے  
کسی مدت کا یہ بام کہن ہے  
ستوں اس کے تلے یہ پاؤں ہیں چار  
رہے دو دانت آگے سو ہیں اڑوار  
جو بیٹھے یہ تو اٹھنا ہے اسے دور

لگیں جب تک نہ اس کو راج و مزدور  
ہلاتا یوں ہے یہ کانوں کو ہر بار  
کہ دھونکیں پنکھوں سے کولیوں کا انبار  
یہ عالم چلنے میں خرطوم کا ہے  
کہ دست کور میں گویا عصا ہے

سودا پڑھنے والے کے سامنے اس ہاتھی کی جو تصویر پیش کرنا چاہتے ہیں، اس میں کامیاب  
ہیں۔ انھوں نے اپنے تخیل اور تشبیہات و استعارات کے سہارے ہاتھی کی مکمل تصویر کھینچ  
دی ہے اور معمولی سی معمولی تفصیل کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ لیکن یہی جزئیات نگاری کبھی  
کبھی اتنی طویل ہو جاتی ہے کہ پڑھنے والا اکتا جاتا ہے اور ہجو بے اثر ثابت ہوتی ہے۔  
سودا کے کلام میں ایسی ہجو بھی ہیں جن کی دل چسپی اور حسن طوالت کی نذر ہو گیا ہے۔

ہجو کی ایک خصوصیت مبالغہ آرائی بھی ہے۔ بعض واقعات، مناظر یا تصویریں ہماری توجہ  
اپنی طرف مبذول نہیں کر سکتیں۔ ہجو نگار ان واقعات وغیرہ کے پیش کرنے میں مبالغے  
سے کام لیتا ہے تاکہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکے۔ تصویر کے بعض حصوں کو نمایاں  
کرنے کے لیے مصور کو تیز اور شوخ رنگ استعمال کرنے پڑے ہیں۔ ہجو نگار شوخ اور تیز  
رنگوں کا کام مبالغے سے لیتا ہے لیکن یہاں بھی اعتدال شرط ہے۔ سودا اکثر اعتدال کی  
حدوں سے باہر نکل جاتے ہیں۔ ان کا مبالغہ غلو کی حد تک پہنچ جاتا ہے اور ہجو حقیقت کم اور  
جن اور پری کی کہانی زیادہ بن جاتی ہے۔ ہجو میر ضاحک میں ضاحک کے زیادہ کھانے کا  
بیان اس طرح کیا گیا ہے۔

گھر میں اب جس کے دیگچہ کھڑے  
در پر اس کے یہ بیٹھے یوں اڑ کے  
گور سے پھر جو رستم اٹھ کر آئے  
میت اس کی اٹھائے یا نہ اٹھائے

آگ لگ کر کسی کے گھر سے دود  
ایک ذرہ بھی گر کرے ہے نمود  
لوگ تو دوڑے ہیں بھانے کو  
دوڑے یہ لے رکابی کھانے کو  
ہر کسی بیٹے کی دکان پر جا  
اپنی باتوں میں اس کو لے ہے لگا  
کام ہر وجہ اپنا کر لیوے  
کٹے بندر کی طرح بھر لیوے  
توڑ کھاتا ہے جا کے پاخانے  
یہ بوا سیر اپنی کے دانے

اگر ضاحک کسی کی شادی میں جاتے ہیں تو وہاں کی تقریبوں اور سامان عیش و عشرت  
سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا بلکہ

یہی پوچھے ہر ایک سے بے شرم  
پوڑی کا آٹا سخت ہے یا نرم  
صاحب خانہ اس میں گر جھنجھلائے  
اپنے نفروں سے جوتیاں لگوائے  
اس کو ہرگز نہیں حیا سے لگاؤ  
جائے تو یہ کہے پلاؤ پلاؤ

اس قسم کا بے اثر اور بے کیف مبالغہ سودا نے عام طور پر ادبی معرکوں میں کہی جانے والی  
ہجوؤں میں کیا ہے۔ بعض دوسری ہجوؤں میں مبالغہ نے بہت زیادہ حسن پیدا کر دیا ہے اور  
ہجو کے اثر کو بہت بڑھا دیا ہے۔ شاہ جہاں آباد کے ایک کوتوال نولاد خاں کی ہجو میں سودا



کہتے ہیں کہ فولاد خاں نے چوروں سے رشوت لے رکھی ہے۔ اس لیے ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اس کے جتنے ملازم ہیں وہ ابک سے ایک بڑھ کر چور ہیں اور حالت یہ ہے کہ اگر فولاد خاں کی نظر بچ جائے تو یہ چور اُس کے مال پر بھی ہاتھ صاف کر دیں۔ فولاد خاں ان کی حرکتوں سے تنگ آ گیا اور ایک دن اُن سے کہا۔

ایک دن اس نے سب سے طنز کی راہ  
 کہا تم ہو مرے پنٹ دل خواہ  
 چیز میری جو اب چراؤ تم  
 چوک میں بیچنے نہ جاؤ تم  
 قیمت اس کی جو کچھ مشخص ہو  
 اتنے کو تم اسے مجھی کو دو  
 ایک ان میں سے یہ خن سن کر  
 لگا کہنے کہ اس سے کیا بہتر  
 کیا جب آپ تم نے یہ انصاف  
 میں بھی کرتا ہوں عرض رکھیے معاف  
 آپ کے سر پہ یہ جو پگڑی ہے  
 دو خریدار اس کے ہیں درپے  
 دس روپے وہ مجھے دلاتے ہیں  
 کہیے اب آپ کیا لگاتے ہیں

ان خصوصیات کے علاوہ سودا کی جھوگوئی کی ایک خصوصیت فحش نگاری بھی ہے۔ لیکن سودا نے فحاشی اور ابتذال سے کام اکثر ان جھوٹوں میں لیا ہے جو ادبی معرکوں میں کبھی گئیں۔ باقی جھوٹوں میں ابتذال شاذ و نادر ہی ہے اور وہ بھی اعتدال اور توازن کے ساتھ۔ میرزا ملک

خاص طور پر ان کی فحش نگاری کے شکار ہوئے ہیں۔ ان معرکوں میں سودا اپنے حریف سے آگے بڑھ کر اس کے لائق احترام لواحقین کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔ میرزا حاک کی بیوی اور ندرت کشمیری کی دختر پر سودا کی ہجویں موجود ہیں جو کسی طرح بھی مناسب نہ تھیں۔

### ادبی معرکے

سودا کی ہجو گوئی کا یہ حال تھا کہ لوگ ان سے خائف رہتے تھے۔ کریم الدین نے لکھا ہے کہ ”خان آرزو کے مکان پر جن ایام میں مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔ سودا بھی وہاں حاضر ہوا کرتا تھا۔ جب سودا غزل پڑھا کرتا تھا تمام شعر حاضرین مجلس مشاعرہ اس کی مدح کیا کرتے تھے۔ اس مدح کے دو سبب ہوتے تھے۔ ایک یہ کہ وہ شاعر واقع میں اچھا شعر کہتا تھا۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ سب شاعر ہجو سے ڈرا بھی کرتے تھے۔ اگر اُس کی تعریف نہ کریں گے وہ ہجو کرے گا۔ اس خوف سے سب کو واہ واہ کرنا پڑتا۔“<sup>۱</sup> قدرت اللہ قاسم نے بھی ”مجموعہ نثر“ میں تقریباً یہی بات لکھی ہے۔

اکثر تذکرہ نگاروں نے ان ادبی معرکوں میں سودا کو بے قصور بتایا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ سودا کے مخالفین نے پہلے ہجو کی اور پھر سودا نے جواب دیا۔ قدرت اللہ قاسم لکھتے ہیں کہ محمد بقا اکبر آبادی، فدوی پنجابی اور ضاحک دہلوی نے رکیک ہجویں کہہ کر سودا کو اشتعال دلایا۔<sup>۲</sup> فدوی کے ترجمے میں حکیم سید احمد علی خاں لکھتے ہیں۔ ”فدوی قوت شاعری اور معمولات فن کے غلط زعم میں مرزا سودا سے مقابل ہو گئے۔“<sup>۳</sup> حسرت کا ذکر کرتے ہوئے یکتا لکھتے ہیں۔ ”طنطنہ شاعری اور معلومات فن کی وجہ سے سلطان اشعرا (سودا) سے مقابلہ کرنا چاہتے تھے۔“<sup>۴</sup> مرزا علی لطف نے فدوی اور سودا کے معرکے میں سودا کو بے قصور بتاتے ہوئے لکھا ہے۔ ”فدوی برخود غلط انسان تھے۔ مرزا محمد رفیع سودا سے

۱۔ طبقات اشعرا۔ کریم الدین، ص ۱۰۵

۲۔ مجموعہ نثر، جلد ۱، ص ۳۰۴

۳۔ دستور الفصاحت، ص ۷۶

۴۔ ایضاً، ص ۷۲

مباحثہ کرنے فرخ آباد آئے اور ذلت اٹھائی۔ لے مردان علی خاں جتلا بھی فدوی کو ”خود پسند اور بر خود غلط“ لے بتاتے ہیں۔ غرض نہ صرف تذکرہ نگاروں کے بیانات سے پتا چلتا ہے کہ اکثر ابتدا دوسری طرف سے ہوتی تھی بلکہ خود سودا کی جھوڑ میں بھی اس کے شواہد موجود ہیں۔ ایک جھوٹے غزل کے اشعار ہیں۔

بعضے ایسے بھی ہیں نامعقول ہے جن کا سخن  
اپنی شہرت ہونے کی سمجھیں ہیں وہ تدبیر جنگ  
پوچھ گوئی سے نہیں ہٹتے بہ میدانِ سخن  
کرتے ہیں گویا وہ جڑ کر پاؤں میں زنجیر جنگ  
یکدگر ہوتا ہی ہے سقمِ سخن پر اعتراض  
اس پہ کیا لازم جو کیجیے ہو گریباں گیر جنگ  
ابرود و مڑگاں کے مضمون میں کرے جو ان کے دخل  
کرنے یہ اُس سے لگیں ناداں بہ تیغ و تیر جنگ  
میں تو ہوں حیران اب ان شاعروں کی وضع پر  
کرتے پھرتے ہیں جو پڑھ پڑھ شعر بے تاثیر جنگ  
ایک ان میں سے لگا سودا کے آگے پڑھنے شعر  
واسطے اتنے کہ تا کیجیے بایں تر ویر جنگ  
سن کے یہ بولا خدا کے واسطے کیجیے معاف  
میں تو ہوں شاعر غریب اور آپ ہیں شمشیر جنگ

کسی نے سودا کی جھوکی۔ سودا اسے جواب دیتے ہیں۔

گر ہجو میری کہنے سے اس پر ہو نگاہ  
تا یہ بھی کہے جانے مجھے خلق اللہ  
سو وہم تمھارا ہے میں اور آپ کی ہجو  
لا حول ولا قوۃ الا باللہ

میر تقی تاقی دہلی میں ایک مرثیہ گو شاعر تھے۔ انھوں نے سودا پر اعتراضات کیے۔ سودا نے  
”سبیل ہدایت“ میں ان اعتراضات کا ذکر کیا ہے۔

آپ کے ہوتے جب کسی کے حضور  
مرثیہ کہنے کا ہوا مذکور  
واں یہ بولی زبان سحر طراز  
حق میں اس بے زباں کے بندہ نواز  
ریختے کی جو وہ کہے ہے غزل  
لفظ و معنی میں اس کے کم ہے خلل  
مرثیوں کے سنے جو کتنے بند  
بندش ان کی نہ آوے اپنے پسند  
معنی ان کے تب آویں فہم کے ہاتھ  
شرح لکھدے جو مرثیہ کے ساتھ

ظاہر ہے کہ سودا کب اعتراضات برداشت کر سکتے تھے۔ انھوں نے اگرچہ میر تقی کی  
ہجو نہیں کہی لیکن ان کے مرثیہ پر پھر پور تنقید کر کے انھیں نا اہل ثابت کر دیا۔

یہ ٹھیک ہے کہ اکثر و بیشتر پہلے زیادتی دوسری طرف سے ہوتی تھی۔ لیکن ایسی بھی مثالیں

موجود ہیں جن میں سودا نے ابتدا کی۔ ضاحک اکثر لوگوں کی ہجو کرتے تھے۔ یہی بات سودا کو ناگوار تھی۔ انھوں نے ضاحک کی ہجو لکھی اور پھر ضاحک نے بھی جواب دیا۔ میر علی ہاتف نے حکیم آفتاب کی ہجو کہی تھی۔ سودا کو یہ بات بھی ناگوار گزری اور انھوں نے میر علی ہاتف کی ہجو کہہ دی۔

ایک بار انشاء اللہ خاں انشا کے والد ماشاء اللہ خاں مصدر سے ملنے گئے۔ کچھ بات ناگوار گزری اور سودا نے ان کی ہجو کہہ دی۔

### سودا اور قیام الدین قائم

قائم کو سودا سے تلمذ تھا۔ اسی لیے قائم نے اپنے تذکرے میں سودا کا ذکر بہت ادب اور احترام سے کیا ہے بلکہ سودا کو حضرت قائم لکھا ہے۔ بقول قاضی عبدالودود قائم سودا کا عقیدت مند شاگرد تھا۔ سودا کی مدح میں جو قصیدہ قائم نے لکھا ہے۔ اس کے دیوان (نسخہ) انڈیا آفس) میں موجود ہے۔ سودا کی وفات کے بعد قائم نے ایک غزل کہی تھی جس کی ایک بیت ہے۔

پڑھیے کس کا سخن کہ دل سے مٹے

داغ مرزا رفیع سودا کا ل

لیکن کلیات سودا میں ایک مثنوی ہے جس کا عنوان ہے مثنوی بطور ساقی نامہ در ہجو میاں فوقی۔

قدرت اللہ قائم نے لکھا ہے کہ یہ مثنوی سودا نے قائم پر کہی ہے۔ اُن کا بیان ہے کہ قائم پہلے ہدایت اللہ ہدایت کے شاگرد تھے۔ کسی بات پر ان بن ہو گئی۔ قطع تعلق کر لیا اور استاد کی ہجو کہی۔ قائم نے قائم کے تین شعر بھی نقل کیے ہیں۔ قائم سودا کے شاگرد ہو گئے اور بقول قائم خباثت اصلی کی وجہ سے ان کی شاگردی سے بھی پہلو تہی کی۔ سودا نے ان کی ہجو میں ایک ساقی نامہ کہا۔ بعد میں قائم کے معافی مانگنے پر ہجو پر ایک فرضی نام فوقی ڈال

دیا گیا۔<sup>۱</sup>

اس مثنوی کے مطالعہ سے یہی پتا چلتا ہے کہ زیادتی قائم کی تھی۔ انھوں نے ہی پہل کی تھی۔ سودا نے صرف جواب دیا ہے اور ظاہر ہے کہ سودا جیسا قادر الکلام شاعر جب جواب دینے پر آئے گا تو کیا کچھ نہ کہے گا۔ چند تمہید یہ اشعار کے بعد سودا اصل موضوع پر اس طرح آتے ہیں۔

نک میاں فوٹی کے گھر تک اے صبا  
کہہ سلام شوق تو جا کر مرا  
بعد ازاں کہو کہ اتنا بھی غرور  
شاعری کے فن میں کرنا کیا ضرور  
اوروں کو بکری کہو شیر آپ کو  
بکری بھی گر کچھ کہے پھر آپ کو  
بات بکری کی لگے تم کو بُری  
دوڑو تم اس پر قلم کی لے پھری

ان اشعار سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ ابتدا قائم کی طرف سے ہوئی تھی۔ سودا کہتے ہیں کہ عام زندگی میں وہ بکری ہی سہی لیکن میدانِ سخن کے وہ مرد ہیں۔ جس میں قائم کی حیثیت مبتذل بند اور ایک عالم کے چور کی ہے۔

گرچہ میں بکری ہوں تم شیر جری  
پر قلم کی تیغ کاغذ کی پھری

پاس اس عاجز کے بھی ہر آن ہے  
 دیکھ لو یہ گو ہے یہ میدان ہے  
 کیا قصیدہ کیا غزل کیا قطعہ بند  
 جو ردیف و قافیہ کیجیے پسند  
 آپ کہہ کر مجھ کو بھی فرمائیے  
 جس کو جی چاہے اسے دکھلائیے  
 گھر میں شیخی کرنی کچھ رکھتی ہے مول  
 کھیا میں گڑ پھوڑنے سے کیا حصول

اس کے بعد سودا نے قائم پر الزام لگایا ہے کہ قائم نے سارے مضامین دوسرے شاعروں  
 کے چرائے ہیں۔

ہو گیا ظاہر جو کچھ تھا تم میں زور  
 مبتذل بند اور اک عالم کے چور

آخر میں سودا نے قائم کی ایک غزل کے کچھ اشعار پر تنقید کی ہے۔ پوری مثنوی میں سودا  
 نے کہیں تہذیب کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔

سودا اور ندرت کا شمیری

ندرت فارسی کے شاعر تھے۔ ناصر لکھنوی نے لکھا ہے۔ ”مولوی ندرت کا شمیری کہ  
 فاضل اور علامہ عصر تھا۔ اُس (سودا) کے مقابلے میں ایسا شرمندہ ہوا کہ ترک دہلی کے سوا  
 کچھ بن نہ آیا۔ ایک شعر مولوی ندرت کی غزل کا کہ سودا کی خدمت میں ہے، لکھا جاتا

خود بخود در جنگ باشد آں رفیع پست قدر

سر بسر سودائے خود از جہل صفر ریختہ“ لے

سودا نے اسی غزل کو خمس میں تقصیم کر کے ندرت کی ہجو کر دی۔ یہ ہجو کلیات سودا میں موجود ہے۔ اس خمس کے پہلے بند میں سودا نے ندرت پر الزام لگایا ہے کہ ان کے شعر ناموزوں ہوتے ہیں۔ دوسرے بند سے پتا چلتا ہے کہ ان دونوں کا اختلاف کسی حسین کی وجہ سے تھا۔ بندیہ ہے۔

قاضی اور کوتوال سے لے جانتے ہیں تا بدر

جنگ کا مبدأ ہے تیرے گھر وہ رشک ماہ بدر

پھر مجھے کہتا ہے اے بھڑوے تو یہ ازراہ عذر

خود بخود در جنگ باشد آں رفیع پست قدر

سر بسر سودائے خود از جہل صفر ریختہ

مگر یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا کیوں کہ ہجو میں خواہ خواہ بھی اس قسم کے الزامات لگائے جاتے ہیں اور ممکن ہے کہ سودا کا اشارہ دختر ندرت کی طرف ہو۔ ایک خمس اور ایک سیدیں اور ہیں۔ خمس ندرت کی ہجو میں اور سیدیں ندرت کی دختر کی۔ ندرت کی ہجو میں سودا نے طرح طرح کے مشورے دیے ہیں، جن میں سب سے اہم یہ ہے۔

ایسی غزل کا عرس میں تم سے جز انصرام ہو

بحر میں جس کی ہر طرح شبہ خاص و عام ہو

تقطع اس کی جس کئے صبح سے تا بہ شام ہو

اس کی طرف سے آخرش تم کو یہی پیام ہو

گھوڑے کو دو نہ دو لگام منہ کو تنگ لگام دو



مدرس میں سودا نے دخترِ ندرت کے حسن و شباب کی تعریف کی ہے۔ کلیاتِ سودا میں ایک رباعی بھی ہے، جس میں سودا نے ندرت پر وہی الزام لگایا ہے کہ شعر ناموزوں کہتے ہیں۔ رباعی ملاحظہ ہو۔

گر ہجو پہ سودا کے اسے رغبت ہے  
ہونے دو کہ گیدی کے تئیں رجعت ہے  
موزوں نہ کرے شعر کو اپنے احق  
کرتے پھرے ہجو لوگوں کی یہ ندرت ہے

### مرزا مظہر

مرزا مظہر نقشبندی سلسلے کے بہت بڑے بزرگ تھے۔ بیشتر تذکرہ نگاروں نے بہت ادب اور احترام سے ان کا ذکر کیا ہے۔ خود سودا نے ان کی وفات پر قطعہ تاریخ کہا تھا۔ لیکن سودا نے ان کی بھی ہجو کہی ہے۔ غالباً مرزا مظہر خاموش رہے اور کوئی جواب نہیں دیا۔ سودا کی ہجو چار شعر کی ہے جس میں مرزا مظہر پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ ان کا شعر فارسی ہے نہ اردو بلکہ باٹ کا روڑا ہے۔

مظہر کا شعر فارسی اور ریختہ کے سچ  
سودا یقین جان کہ روڑا ہے باٹ کا  
آگاہِ فارسی تو کہیں اس کو ریختہ  
واقف جو ریختہ کے ذرا ہووے شٹاٹ کا  
سن کر وہ یہ کہے کہ نہیں ریختہ ہے یہ  
اور ریختہ بھی ہے تو فیروز شہ کی لاٹ کا

القصہ اس کا حال یہی ہے جو سچ کہوں  
کتا ہے دھوبی کا کہ نہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔

بقاؒ اور سوداؒ

بعض تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ بقاؒ نے پہلے سوداؒ کی جھوکہی۔ بقاؒ نے میر اور مرزا دونوں کی  
جھویں ایک ساتھ کہی ہیں۔ اُن کا پانچ اشعار کا ایک قطعہ ہے۔

عیب ہے گرچہ کثرت یک لفظ  
خن فاری سے تا ہندی  
پر جدا ہے تمام عالم سے  
طرز سودا و وضع میر تقی  
یعنی واں لفظ تو ہے برکن شعر  
ہے ہے سے یاں کلام کی بھرتی  
کھول دیوان دونو صاحب کے  
اے بقاؒ ہم نے بھی زیارت کی

۱۔ آخری مصرع کے محاورے سے فائدہ اٹھا کر آزاد لکھتے ہیں۔ نکتہ اس میں یہ ہے کہ مرزا صاحب نے ایک  
دھوبن گھر میں ڈالی تھی۔ (آب حیات، ص ۱۴۳) یہ نکتہ یقیناً آزاد کے ذہن کی اختراع ہے۔ اس کا کوئی  
اور ثبوت نہیں ملتا۔

۲۔ کمال نے ان کا نام محمد بقاؒ (تذکرہ کمال، ورق ۱۰۰ اب) اور ذکاؒ نے محمد بقاؒ اللہ خاں لکھا ہے (عیار اشعرا،  
ورق ۳۱ الف) غالباً ذکاؒ کا بیان درست ہے کیوں کہ بقاؒ کے والد کا نام حافظ لطف اللہ خوش نویس اکبر  
آبادی تھا (خوش معرکہ زیبا۔ قلی) ذکاؒ نے لکھا ہے کہ تلاش روزگار میں شاہجہاں آباد سے لکھنؤ چلے گئے  
ہیں (عیار اشعرا، ورق ۳۱ الف) ۱۲۰۶ھ میں حج کے لیے روانہ ہوئے اور وہیں انتقال کیا۔ (تذکرہ کمال  
ورق ۱۰۰ اب)۔ ناصر گھنوی کے بیان کے مطابق آخری عمر میں دیوانے ہو گئے تھے۔ جب حالت ٹھیک  
ہوئی تو زیارت کے لیے روانہ ہو گئے۔ ناصر علی کا بیان ہے کہ ان کا پہلے غیس غیس تھا۔ شاہ حاتم کے  
شاگرد ہوئے تو انھوں نے بقاؒ غیس قرار دیا۔ خوب چند ذکاؒ لکھتے ہیں کہ فارسی میں انھیں محمد فاخر کہیں اور  
اردو میں شاہ حاتم سے تلمذ تھا۔

شعر سودا و میر کے دیکھے

وہ تو تو تو کریں ہیں یہ ہی ہی<sup>۱</sup>

قدرت اللہ قاسم، ناصر لکھنوی وغیرہ نے دو شعر نقل کیے ہیں جو بقا نے میر اور مرزا کی ہجو میں کہے تھے۔

مرزا و میر دونوں باہم تھے نیم ملا

فن سخن میں یعنی ہر ایک تھا ادھورا

اس واسطے بقا اب ہجوؤں کی ریساں سے

دونوں کو باندھ باہم میں نے کیا ہے پورا<sup>۲</sup>

مگر حیرت ہے کہ کلیات سودا میں بقا پر کوئی ہجو نہیں۔ شاید سودا نے بقا کو قابل اعتنا نہیں سمجھا یا ممکن ہے کہ سودا کی کہی ہوئی ہجو دست برد زمانہ کی نذر ہو گئی ہو۔ میری نظر سے کلیات سودا کے قلمی نسخوں میں بھی بقا پر کوئی ہجو نہیں گزری۔ یہ معرکہ لکھنؤ میں ہوا تھا جیسا کہ مصحفی نے ”تذکرہ ہندی“ میں لکھا ہے۔

### میر تقی اور سودا

میر تقی کا ذکر سودا کی ہجو گوئی کے تحت نہیں آنا چاہیے تھا کیوں کہ سودا نے ان کی ہجو نہیں کہی بلکہ ان کے ایک مرثیے پر اعتراضات کیے ہیں۔ یہ اعتراضات ایک مثنوی سبیل ہدایت

۱۔ یہ اشعار تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ تذکرہ کمال اور تذکرہ خوش معرکہ زیادہ دونوں میں موجود ہیں۔

البتہ تیسرا شعر تذکرہ کمال میں نہیں ہے۔

۲۔ شاید بقا کو میر اور مرزا کی شہرت اور مقبولیت ناگوار گزرتی تھی۔ کمال نے بقا کا ایک قطعہ نقل کیا ہے۔ جس میں وہ اپنے ربیعہ کو رھک غزل سودا بتاتے ہیں:

مرا ربیعہ رھک غزل سودا ہے  
تجین اس پر بھی بقا کو یہ گماں ہے کہ نہیں  
بس مجھی کو نظر آتا ہے یہ لعل بے جرم  
تم بھی تک دیکھو صاحب نظراں ہے کہ نہیں

کی شکل میں ہیں۔ چونکہ یہ ادبی معرکہ تھا۔ اس لیے اس کا ذکر یہاں کیا گیا۔  
میر تقی دہلی کے رہنے والے تھے اور بحیثیت مرثیہ گو انھیں اچھی خاصی شہرت حاصل تھی۔  
سبیل ہدایت سے پتا چلتا ہے کہ پہل انھوں نے کی تھی۔ بقول سودا:

سو زبانی تمھاری اے مخدوم  
ہوا اپنے تئیں کو یوں معلوم  
مرثیہ وہ جسے عوام الناس  
روئیں سُن سُن پڑھیں جب ان کے پاس  
اور سودا کا مرثیہ سُن کر  
چپ ہی رہ جاؤں ہوں میں سر دھن کر  
کیسی ہی طرح کوئی اس کی بنائے  
لیکن اس پر کبھو نہ رونا آئے  
بارہا یہ سخن ہوا ظاہر  
حق میں بندے کے غائب و حاضر

سودا اس قسم کے اعتراضات سننے کے عادی نہیں تھے۔ انھوں نے میر تقی کا ایک مرثیہ  
حاصل کیا اور اس کے ایک ایک شعر پر دل کھول کر تنقید کی۔ پہلے ہی شعر پر سودا نے اتنی  
اشعار میں تنقید کی ہے۔ پہلے ان کے مرثیے کا شعر پیش کیا ہے اور پھر اس پر تنقید کی  
ہے۔ (اسی مثنوی کے درمیان میں سودا نے اردو نثر بھی لکھی ہے)  
میر تقی کا ایک شعر ہے۔

اے تصدق یہ پدر یہ مادر اور یہ جد پاک  
ختم ہے تم پر یہ سب صاحب کمالی السلام

سودا اعتراض کرتے ہیں۔

گر نہیں جانتے تو سن لو اب  
ساتھ اوس کے ہے جس کا نام و نسب  
گر تعلق کمال کا ہوتا  
پیر نوح باپ سا ہوتا  
منحصر کچھ نہیں نسب پہ کمال  
جس پہ ہو فضل ایزد متعال  
بندش الفاظ کی غلط اس کی  
بری ہے معنی کی غلط اس کی  
پیش مصرع میں لفظ ”یہ“ سے مراد  
آپ کو ہے بزرگی اجداد  
پر نکلا ہے اس سے یوں بیکد  
سب تصدق پدر سے لے تاجد

میر تقی کا شعر ہے۔

ہے گریباں گیر گردوں تیرے لشکر کا لہو  
تا قیامت کم نہیں ہوتی ہے لالی السلام

سودا اعتراض کرتے ہیں۔

خوں سوا ایسی جا میں لفظ لہو  
نہیں آتا محاورے میں کبھو

اور لالی کا حرف کر دو حک  
 ہو نہ ثابت شفق سے یہ جب تک  
 تا نہ تشبیہ ہو شفق کی یہاں  
 معنی جو چاہو اس میں تم سو کہاں

میر تقی کا شعر ہے۔

اے ہوا لاؤل ہوا آخر کے مالک پائیں  
 دے ہوا الظاہر ہوا الباطن کے والی السلام

سودا معترض ہیں۔

کیا ہوا لاؤل و ہوا آخر  
 کیا ہوا الباطن و ہوا الظاہر  
 حق کی جانب پھرے ہے ان کی ضمیر  
 اس سوا جس پہ کہیے ہے تکفیر  
 کیا یہ خاطر میں آپ کے آیا  
 مالک اس کا حسین ٹھہرایا

اس طرح سودا نے میر تقی کے صرف چند اشعار پر اعتراضات کیے ہیں اور عام طور پر سودا  
 حق بجانب ہیں۔

میر تقی میر اور سودا

میر نے ”نکات اشعرا“ میں سودا کی بہت تعریف کی ہے۔ اُن کے متعلق لکھا ہے..... خوش

خلق، خوش گو، گرم جوش، یار باش، شگفتہ رونو جوان ہے..... غزل و قصیدہ و مثنوی و قطعہ و  
خمیس و رباڑا سب خوب کہتا ہے۔ وہ سرآمد شعرائے ہندی ہے۔ بہت خوش گو  
ہے..... چناں چہ ریختہ کا ملک الشعرا اسی کو ہونا چاہیے۔ انھوں نے نہ صرف نثر بلکہ نظم  
میں بھی سودا کی فنی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ ان کا ایک شعر ہے۔

نہ ہو کیوں ریختہ بے شورش و کیفیت و معنی

گیا ہو میر دیوانہ رہا سودا سو مستانہ

میر کی ایک جھو ہے جس کا ایک شعر یہ بھی ہے۔

ایک دو ہی ہوتے ہیں خوش طرز و طور

اب چنانچہ میر و مرزا کا ہے دور

سودا نے بھی میر کی استاد تسلیم کی ہے۔

سودا تو اس غزل کو غزل در غزل ہی کہہ

ہونا ہے تجھ کو میر سے استاد کی طرف

سودا نے ایک مثنوی میں بھی میر کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

کیا رہا ہے مشاعرہ میں اب

لوگ کچھ جمع آن ہوتے ہیں

میر و مرزا رفیع و خواجہ میر

کہتے یہ اک جوان ہوتے ہیں

لیکن ان دونوں کے کلام میں ایک دوسرے کے خلاف بھی اشعار ملتے ہیں اور یہ کہنا بہت  
مشکل ہے کہ ابتدا کس نے کی۔ سودا کا شعر ہے۔

نہ پڑھیو یہ غزل سودا تو ہرگز میر کے آگے  
وہ ان طرزوں سے کیا واقف وہ یہ انداز کیا سمجھے

میر کا شعر ہے۔

طرف ہونا مرا مشکل ہے میر اس شعر کے فن میں  
یوں ہی سودا کہہ رہا تھا ہے سو جاہل ہے کیا جانے

بات صرف شعروں تک نہیں رہی بلکہ دونوں نے ایک دوسرے کی باقاعدہ جویں بھی کہیں  
اور اس کی ابتدا غالباً میر ہی کی طرف سے ہوئی۔ سودا کو کتنے پالنے کا بہت شوق تھا۔ میر کو  
یہ بات بہت ناگوار تھی۔ انھوں نے سینتیس اشعار کی ایک جھونکی، جس میں سودا کو بہت  
بڑا بھلا کہا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

اک جو لچر کو رزق کی وسعت سی ہو گئی  
تنگی کی حوصلے نے تو رجعت سی ہو گئی  
کتوں کے ساتھ کھانے لگا کتوں سے معاش  
چھڑی کی طرح شام و سحر کتوں کی تلاش  
کتے ہیں پاس کتے ہیں جیب و کنار میں  
کتے ہیں آستینوں میں کتے ازار میں  
آواز دے دے کتوں کو توڑے ہے اپنی جان  
مر جائے گا یہ بھونکتے ہی بھونکتے ندان

اس جھونکی پر سودا کا نام نہیں ہے بلکہ کلیات میر مرتبہ آسی میں اس جھونکی کا عنوان ”جھو عاقل نام  
ناکے کہ بندگان انے تمام داشت“ ہے۔ کلیات سودا میں اس کا جواب شامل ہے اور اس  
کے عنوان میں میر تقی میر کا نام بھی موجود ہے۔ اصل عنوان ہے ”مخمس در جواب طعن



میر تقی کہ فی الحقیقت میر شیخ بودہ است۔۔۔“ محس میں میر کو شیخ بتایا گیا ہے۔ میر نے سودا کو جو برا بھلا کہا تھا۔ اس سب کا جواب دیا گیا ہے اور آخر بند میں سودا نے الزام لگایا ہے کہ میر کو علت مشائخ ہے۔ تین بند ملا دیے ہوں۔

کر شیخ زباں اپنی مری نجس سے کوتاہ  
نے گل ہوں میں اس باغ میں نے خار سر راہ  
خوبی سے نہ شہرہ نہ بدی سے ہوں با فواہ  
مستے برہ میکدہ ہر شام و سحر گاہ  
واقف نہ کسی سے میں نہ مجھ سے کوئی آگاہ

یہ سچ ہے جو کہتا ہے تو مجھ پر بھی یقین ہے  
کتے کو کہے پاک سو وہ دشمن دیں ہے  
لیکن وہ سگ نفس نجس اس سے کہیں ہے  
تجھ پر جو ہر اک لحظہ و ہر آن تعین ہے  
تو اس کا نہ کہنا کرے تب پاک ہے واللہ

سودا بزبان جز سخن راست نہ لاوے  
احسن ہو جو تجھ سا کوئی تو اس کو نہ بھاوے  
کتے کا ملوث تو نہا پاک ہو آوے  
علت کی مشائخ کے جو دھوئے سے نہ جاوے

خالی کریں دھو دھو اُسے زمزم کا اگر چاہ  
سودا نے میر کی ایک اور جھوکی ہے، جس میں سودا کا فن ہجو کوئی معراج پر ہے۔ نوا اشعار

کے اس ہجویہ قطعہ میں سودا کہتے ہیں۔ ایک دن میں ایک مشفق کے گھر گیا۔ ان کے ہاں ایک بزرگ کاتب تھے۔ بے چارے بہت پریشان تھے۔ انھوں نے سودا کو اپنی مصیبت کا حال ان الفاظ میں سنایا۔

ایک مشفق کے گھر گیا تھا میں  
 سنو نک نقل یہ عجائب ہے  
 ان کے گھر میں ہے ایک مرد بزرگ  
 خوشنویسی کے فن سے کاسب ہے  
 راقم سرنوشت کا اس کو  
 ہے بجا گر کہوں کہ نائب ہے  
 کہنے لاگا وہ آکے مجلس میں  
 آہ یہ نفس شوم غالب ہے  
 ورنہ لکھنے سے ہاتھ اٹھاؤں میں  
 کیا کروں فکر قوت واجب ہے  
 میں جو پوچھا سب کہا مت پوچھ  
 بات کہنی یہ نامناسب ہے  
 لیکن اس واسطے میں کہتا ہوں  
 درد سننے کا تو جو طالب ہے  
 ہے جو کچھ نظم و نثر عالم میں  
 زیرِ ایراد میر صاحب ہے  
 ہر ورق پر ہے میر کی اصلاح  
 لوگ کہتے ہیں سو کاتب ہے

معلوم ہوتا ہے کہ میر اور سودا کی معاصرانہ چشموں بہت معمولی رہیں۔ کیوں کہ ترک وطن کے بعد جب سودا کو اپنا وطن اور اہل وطن یاد آتے ہیں تو میر صاحب کی یاد انھیں خاص طور پر پریشان کرتی ہے۔ ان کے اشعار ہیں۔

ہمیں لے آئی ہے شہر غریب جس دن سے  
کبھو انھوں کی طرف سے نہ نامہ و پیغام  
علی الخصوص تغافل کو میر صاحب کے  
کہوں میں کس سے کہ باوصف تمام (کذا)  
لکھا نہ پرچہ کاغذ بھی اتنی مدت میں  
کہ بے قراروں کو تاہو وے موجب آرام

میرے خیال سے میر اور سودا نے ایک دوسرے کی ہجو اسی وقت تک کہی جب تک سودا دہلی میں تھے۔ میر کی ہجو کا ایک مصرع ہے۔

دلی میں تین کتیاں کہیں لے کے پالیاں

بعض محققین نے اس مصرع کے پیش نظر یہ ثابت کیا ہے کہ ہجو سودا کے ترک وطن کے بعد کہی گئی۔ حالاں کہ اس مصرع سے یہ ثابت نہیں ہوتا۔

### فدوی اور سودا

اکثر تذکرہ نگاروں نے اس معرکے میں فدوی کو قصور وار ٹھہرایا ہے۔ علی لطف نے لکھا ہے کہ ”فدوی بر خود غلط آدمی تھا۔ مرزا محمد رفیع سودا سے مباحثہ کرنے فرخ آباد آیا اور ذلت اٹھائی۔“ اس معرکے میں سودا کے ساتھ ان کے ایک شاگرد فتح علی شیدا بھی شریک تھے کلمات سودا میں ان کی ایک مثنوی ”در ہجو فدوی متوطن پنجاب کہ دراصل بقال بچہ بود“ بھی شامل ہے۔ سعادت خاں ناصر لکھنوی نے لکھا ہے کہ سودا نے فدوی کی ہجو ”قصہ بوم اور بقال کا“ لکھی ہے۔ حالاں کہ یہ ہجو سودا کی کہی ہوئی نہیں بلکہ ان کے

شاگرد فتح علی شیدا کی ہے۔ اس کا ثبوت اوّل تو مثنوی کے بعض اشعار ہیں اور دوسرے بعض تذکرہ نگاروں مثلاً میر حسن، قدرت اللہ شوق اور علی لطف نے لکھا ہے کہ اس کے مصنف شیدا ہیں۔ اس مثنوی سے ہمیں پتا چلتا ہے کہ پہلے فدوی اور شیدا میں معرکہ ہوا تھا اور سودا بعد میں میدان میں آئے ہیں۔ فدوی کی عادت تھی کہ ہر ایک کے شعر پر اعتراض کرتے تھے اور اپنی بیاض کو جامی کے دیوان سے بھی بہتر سمجھتے تھے۔ شیدا لکھتے ہیں۔

شعر پہ ہر ایک کے کرتے ہیں وہ اعتراض  
جامی کے دیوان سے خوب جانیں ہیں اپنی بیاض  
سب پہ کرے ہے وہ طعن جتنے کہ استاد ہیں  
شعر پہ میرے بھی اب ان کے یہ ایراد ہیں

شیدا نے کسی شعر میں ”شیخ اور برہمن کو دین سے نسبت لکھا تھا“۔ اس پر فدوی نے اعتراض کیا کہ شیخ کا دین ہوتا ہے اور برہمن کا دھرم۔ شیدا اس اعتراض کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

شعر وہ میرا سنا جا کے انھوں نے کہیں  
شیخ و برہمن کو ہے جس میں کہ نسبت بہ دیں  
اپنی سخن فہمی پر کہتے ہیں یہ ہو کے گرم  
دین تو ہے شیخ کے اور برہمن کے دھرم

شیدا اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

سن کے غرض میں یہ بات بولوں جو جل بھن کے اب  
کھول کے ننگ گوش فہم سن لیں یہ احباب سب  
میری زبانی انھیں یہ جو ہیں قرآن خواں  
پوچھے تو اتنا کوئی تم میں سے اے مہرباں  
آئیے قرآن کو کیوں دھوئے ڈالو ہو تم

۱۔ قاضی عبدالودود اسے سودا کی تصنیف مانتے ہیں۔ تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہو۔ اسی کتاب میں ”سودا کا الحاق کا نام“۔

کافروں کو ہے خطاب جس میں لکم دینکم  
 دونوں پہ اطلاق دیں ازروئے قرآن ہے  
 خواہ برہمن کوئی خواہ مسلمان ہے  
 شیخ ہی سے سمجھے ہو دین کی نسبت فقط  
 اپنی زلیخائی پر کتنے ہو برخود غلط  
 دین اگر ہووے ایک جمع نہ ادیان ہو  
 دوہی نہ سمجھے اسے ان سا جو نادان ہو

اس کے بعد شیدائے ایک نقل بیان کی ہے، جس میں ایک بیچے اور آلو کا قصبہ بیان کر کے  
 فردوسی کو آلو بتایا ہے۔ کلیات سودا میں اس مثنوی کے بعد پانچ اشعار کی ہجو ہے، جس میں  
 سودا نے لکھا ہے کہ فردوسی کو شعر و شاعری سے تو کوئی سروکار ہے نہیں۔ استادان فن سے  
 خواہ خواہ لڑتا بھڑتا ہے۔ حسرت سے دھول دھپا کرتا ہے۔ اس قطعہ کا آخری شعر ہے۔

گر شاعری یہی ہے دھولیں تو کیا ہیں اک دن  
 پاپوشیں کھاکسو سے تڑوادے گا یہ کلا

کلیات سودا میں ایک اور ہجو ”ہجو فردوسی“ کے نام سے ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ سودا کے  
 فرخ آباد چھوڑنے کے بعد تک یہ معرکہ جاری رہا۔ کیوں کہ ایک بند میں سودا کے فیض آباد  
 پہنچنے کا ذکر ہے۔

سُن بے آلو پہونچ کے بنگالے  
 مادہ سگ آپ کو تو بنوالے  
 میرے تئیں گو ہے بسکہ ذوق بہ سگ  
 سگ بہت خوب میں نے ہیں پالے  
 اتنے شاگرد ڈھونڈتا ہے عبث  
 سگ سے اک آکے تو گرہ کھالے  
 ایسے شاگردوں سے کہیں بہتر

کل آویں گے بھونکنے والے  
 صورتوں میں پڑیں گے رنگا رنگ  
 لال طوسی سفید اور کالے  
 چاہے آلو ہی تو رہے بن کر  
 غلق شاگرد اپنے کر ڈالے  
 کس نیاید بزیر سایہ بوم  
 در ہما از جہاں شود معدوم

اس جھوکے پہلے بند سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ اصل جھگڑا فدوی اور سودا کے شاگرد شیدا کا تھا۔ سودا لکھتے ہیں۔

فدویا بولے ہے میں ہوں استاد  
 میں کیا فن شاعری ایجاد  
 آکے شیدا جو ہو مرا شاگرد  
 گوش دل سے سنے مرا ارشاد  
 مرتبہ اس کے شعر کا ہو یہ  
 سخن اس کا سخن کے ہو استاد  
 رفتہ رفتہ سنا یہ شیدا نے  
 کہا اس نے کہ خانماں برباد  
 معنی کے گھر کو تو نے ویراں کر  
 پھینک دی اس کی کھود کر بنیاد  
 کس طرح سے میں ہوں ترا شاگرد  
 بیت سعدی کی یہ مجھے ہے یاد  
 کس نیاید بزیر سایہ بوم  
 در ہما از جہاں شود معدوم

سودا نے نو بندوں کا ایک اور محسوس لکھا ہے، جس میں فدوی کو طرح طرح سے ”آلو پیچے کا“

ثابت کیا ہے۔ اس محسّس کے دو بند ملاحظہ ہوں۔

کیا ہے چرخ بنانے میں اس کے میں یہ ہنر  
نہیں ہے اصلی و نقلی میں فرق ذرہ بھر  
جو اور بوم ہو سو مادہ یہ لگے وہ زر  
جو راہ باٹ میں آتا ہے صبح و شام نظر  
کہے ہے خلق وہ جاتا ہے آلو پیے کا  
نظر کر دو تو کہ ذرہ بھی بھڑوے میں ہے شعور  
جو ملنے سے کس و ناکس کے ہووے ہے مغرور  
کسی کو صحبت شعر اس سے کچھ نہیں منظور  
ہوئی ہے بسکہ یہ صنعت گری مری مشہور  
ہر ایک دیکھنے آتا ہے آلو پیے کا

فدوی نے سودا اور شیدا کی جو جویں کہی تھیں، وہ اب نہیں ملتیں۔ البتہ محمد حسین آزاد نے ”آب حیات“ میں تین مصرعے نقل کیے ہیں جو بقول آزاد فدوی نے سودا کی جویں کہے تھے۔

کچھ کٹ گئی ہے پٹی کچھ کٹ گیا ہے ڈورا  
دُم داب سامنے سے وہ اڑ چلا لٹورا  
بھڑوا ہے مسخرا ہے سودا اسے ہوا ہے

جعفر علی حسرت اور سودا

ان دونوں کا کوئی باقاعدہ معرکہ نہیں ہوا۔ جن دنوں سودا فرخ آباد میں تھے شاید حسرت بھی وہاں تھے۔ کیوں کہ سودا نے فدوی کی جویں ایک شعر یہ بھی کہا تھا۔

حسرت سے دھول دھپا لڑتا ہے شاعری پر  
یاں تک کہ فخر اپنا کرتا ہے یہ بللا

ناصر لکھنوی نے ”تذکرہ خوش معرکہ زیبا“ میں لکھا ہے کہ ”جب تمام ہندوستان میں سودا

کی شہرت ہوئی اور حسرت کا بازار ٹھنڈا رہا تو اس نے مرزا رفیع پر اعتراض کرنا شروع کیا۔ سودا نے نواب شجاع الدولہ بہادر کی مدح میں ایک قصیدہ کہا تھا جس کا ایک مصرع ہے۔

نور خورشید ہو جس طرح سے شب کو زائل

بہ سبب ریاضی دانی کے اوس پر یہ اعتراض کیا کہ نور خورشید کا شب کو زائل نہیں ہوتا۔ اس مکابرہ میں تفصیل حسین خاں مدنی اور مدعا علیہم ہوئے خاں صاحب نے کہا نور خورشید کا زائل ہونا تاریکی شب سے اور ثابت اور فروغ کو کب اس پر حجت ہے۔ ایک دن میر سوز نے مرزا رفیع سودا سے کہا ہم حسرت کو آپ کی طرف نا صاف اور ہر بات میں خلاف پاتے ہیں۔ ٹکٹجہ بھوسے اوس کو مالش دیا چاہیے اور معترف اپنے قصور کا اد سے کیا چاہیے۔ سودا نے فرمایا میں اوس کی ہجو کرتا ہوں جو شاعر ہونہ کہ ایسے شاعر کی۔ یہ رباعی تمہارے نام سے کہی جاتی ہے۔ اوس کی تنبیہ کو کافی ہوگی۔

کیوں سوز پہ حسرت کا نہ دل ہوے پسند  
ہے شعر کی گرمی کا دھواں اس کی بلند  
حسرت اد سے کیوں نہ ہووے شاعر بے سوز  
عطار کا لونڈا ہے وہ مٹھو گل قند

میر سوز اور سودا

بعض شواہد سے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سوز اور سودا کے تعلقات بہت اچھے تھے۔ جب سودا نے فرخ آباد سے عزم سفر کیا تو میر سوز کے سر پرست اور شاگرد مہربان خاں رند کے دیوان اور اشعار کی تعریف کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے۔

شعر کی بحر میں ترا استاد  
کشتی ذہن کو ہے باد مراد

۱۔ تذکرہ خوش معرکہ زیبا (لمی)۔ سودا نے حسرت کی ہجو میں غزل کہی ہے۔ جس کا مطلع ہے۔

بہدانے کا آندھی سے اڑا ڈھیر ہوا پر  
ہر مرغ اسے کھا کے ہوا بیر ہوا پر



لیک خدمت میں تیری اتنی عرض  
کرنی اس خیر خواہ کو ہے فرض  
اس کو ہر طرح تو غنیمت جان  
پھر ملے گا نہ سوز سا انسان

میں نے دیوان سوز کے تین چار قلمی نسخے دیکھے ہیں مگر کسی میں ایک شعر بھی ایسا نہیں جو سودا  
کی جہو میں کہا گیا ہو۔ خود کلیات سودا مرتبہ آسی میں بھی سودا کا ایسا کوئی شعر نہیں۔ البتہ  
بعض تذکروں میں یہ شعر ملتا ہے۔

سوداؔ یہ سن کے تیرا نظم کلام  
کہتی ہے سوز کی استادی ہائے ہائے (؟)

مرزا فاخر مکیں اور سوداؔ

سودا کے ایک شاگرد نے ایک جہو میں لکھا ہے۔

سودا و مکیں میں پڑی اوس سے ہے لڑائی  
تھے ورنہ بہم پیش ازیں جوں شکرو شیر

اس شعر سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ پہلے ان دونوں کے تعلقات بہت اچھے تھے۔ ”عبرت  
الغافلین“ سے اس معرکہ کے بیشتر حالات کا علم ہوتا ہے۔ اشرف علی خاں ایک بااخلاق،  
مہذب اور عمدہ گھرانے کے فرد تھے۔ انھوں نے طویل عرصے کی محنت سے فارسی شاعروں  
کا ایک تذکرہ مرتب کیا اور تصحیح کے لیے فاخر مکیں کے پاس لے گئے۔ مکیں نے کہا کہ ”مارا

۱۔ مطبوعہ کلیات سودا میں ایک طویل جہو ہے۔ جس کا مطلع ہے۔

کیا حضرت سوداؔ نے کی اے مصطفیٰؐ

کرتا ہے جو جہو اس کی تو ہر صفحے میں تحریر

بعض محققین اور ناقدین کو دھوکا ہوا کہ یہ قصیدہ خود سودا کی تصنیف ہے۔ حالانکہ اندرونی شہادتوں سے ثابت  
ہوتا ہے کہ یہ سودا کے شاگرد کا کیا ہوا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ شاگرد کون تھا۔ قاضی عبدالودود نے مختلف دلائل  
سے ثابت کیا ہے کہ یہ قصیدہ سودا کے شاگرد مرزا حسن کی تصنیف ہے تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ اردو ادب،

اکتوبر ۱۹۵۰ء، ص ۱۵۳-۱۷۹۔

دماغ نیست خوب ایں کار را برائے خاطر شما بشرطے قبول کنم کہ اشعار تمام شعراے ہند را از فیضی و عتی و ناصر علی و بیدل و سراج الدین علی خاں آرزو و میر شمس الدین فقیر گرفتہ یک قلم خط یکشم مگر تصحیح و انتخاب اشعار شعراے اہل ولایت خواہم نمود۔

اشرف علی خاں کو یہ منظور نہیں تھا، وہ تذکرہ واپس لے آئے اور شیخ آیت اللہ شا کے پاس لے گئے۔ شیخ مذکور نے چند جزو کی تصحیح کی تھی کہ انھیں لکھنؤ سے فیض آباد جانا پڑا۔ اشرف علی خاں مجبور ہو کر پھر مرزا فاخر کے پاس گئے۔ مرزا نے کہا میں اس نسخے کی تصحیح اُس وقت کروں گا جب تم تحریری درخواست لکھ کر دو گے۔ اشرف علی خاں نے وہ تحریر لکھ کر دی۔ مرزا نے غصے سے وہ تحریر پھینک دی اور کہا جو کچھ میں کہوں وہ لکھو۔ چنانچہ اشرف نے مجبوراً وہ تحریر لکھی۔ جس کی عبارت تھی کہ میں پہلے بھی یہ تذکرہ مرزا فاخر کی خدمت میں لایا تھا مگر مصروف ہونے کی وجہ سے وہ تصحیح نہ کر سکے۔ مجبوراً تذکرے کے تیس جزو شیخ آیت اللہ شا کے پاس لے گیا کیوں کہ میں ان کی استادی تسلیم کرتا تھا۔ انھوں نے عرصے تک یہ تذکرہ دیکھا۔ انھوں نے غلطیوں کو صحیح سمجھا اور بعض غلطیوں کو اور بھی غلط کر دیا۔ اس لیے مجبوراً دوبارہ مرزا فاخر کی خدمت میں حاضر ہوا۔ کیوں کہ آج کل اس شہر میں ان سے بڑا صاحب کمال کوئی نہیں ہے اور اُن سے تصحیح کی پھر درخواست کی۔<sup>۱</sup> (فارسی سے ترجمہ) اشرف علی خاں نے مجبوراً یہ عبارت لکھ کر دے دی۔ مرزا فاخر نے اکثر اساتذہ کے اشعار قلم زد کر دیے بلکہ بعض کی اصلاح بھی کی۔ اشرف علی خاں نے جب یہ خبر سنی تو بہت پریشان ہوئے اور وہ تذکرہ واپس لے آئے اور کچھ دن بعد سودا کے پاس آئے۔ سودا نے کہا کہ مجھے فارسی سے کچھ زیادہ علاقہ نہیں۔ آپ کسی اور کے پاس لے جائیے۔ مگر وہ تذکرہ چھوڑ گئے۔ کچھ دن بعد سودا نے تذکرے کا مطالعہ کیا تو انھیں بڑی حیرت ہوئی کیوں کہ اکثر مشاہیر فن کے اشعار قلم زد تھے یا ان پر اصلاح کی گئی تھی۔ سودا کو یہ بات بہت ناگوار گزری اور انھوں نے مرزا فاخر کیس کی بددماغی اور خود سری کے خلاف باقاعدہ محاذ قائم کیا۔ ”عبرت الغافلین“ مکین کی اصلاحوں کا جواب ہے۔ مکین نے امیر خسرو، سعدی، مولانا روم، مولوی جام، آہی سہروردی، مولانا افسری، نعمت خاں عالی،

مرزا صائب، امتیاز خاں خالص، خان آرزو، محمد قلی سلیم طشتری وغیرہ کے اشعار قلم زد کیے۔ سودا نے ”عبرت الغافلین“ میں یہ تمام اشعار پیش کیے ہیں۔ فاخرکیں نے جو اصلاحیں دی تھیں۔ سودا نے ان کا جائزہ لے کر اعتراضات کا جواب دیا ہے اور پھر خود فاخر کے کلام پر اعتراضات کیے ہیں۔

مرزا احسن نے جو مصحفی کی جو لکھی ہے۔ اس میں سودا اور مکین کے ادبی معرکے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

اشرف علی خاں نامی باخلاق مہذب  
تھے عمدہ گھرانے سے وہ ایک مرد بہ توقیر  
تھا شعر کا شوق ان کو جوانی سے نہایت  
مصروف اسی میں رہے جب تک کہ ہوئے پیر  
اک عمر کے عرصہ میں بہت شوق و شغف سے  
ان خاں نے کیا تھا غرض اک تذکرہ تحریر  
مذکور سنا فارسی گوئی کا مکین کے  
اشرف علی خاں نے جو بافواہ جماہیر  
اس تذکرہ کو لے گئے القصہ وہ اوس پاس  
تا دیکھے وہ اس تذکرہ کے شعر بتا خیر  
دکھلایا جب اوس تذکرہ کو خاں نے مکین کو  
تب عذر دماغ اپنا بیاں کردہ بہ تکریر  
تصحیح رکھی اوس کی کئی شرط پہ موقوف  
جو جو اسے منظور تھا لا اوس کو بہ تقریر  
ہاتھ اپنے سے اک بند پہ لکھ اوس نے وہ شرطیں  
جو باتیں کہ پائیں تھیں قرار اوس کی بہ تدبیر  
پھر اوس نے کہا کیجیے مہر اپنی اب اس پر  
تا ہووے با سنا د مژین بہ تحاریر

اشرف علی خاں کی یہ تحریر اپنے پاس رکھ کر مکین نے تذکرہ کی اصلاح شروع کی۔ کچھ دن میں اشرف علی خاں کو خبر ملی کہ مکین نے اپنی شمشیر قلم سے بڑے بڑے مشاہیر کی گردنیں اڑا دی ہیں۔ اُن کو یہ بات بہت ناگوار گزری اور:

پاس اوس کے سے القصد وہ پیش آہِ خشونت  
 اوس تذکرے کو لائے اوٹھا سخت ہو دل گیر  
 لا گھر میں جو اوس تذکرے کے حال کو دیکھا  
 سودا کئے لا اوس کو لگے کرنے یہ تقریر  
 اس ظلم کا انصاف کرو، دو میری تم داد  
 میں ورنہ گریباں کو ڈالوں گا ابھی چیر

سودا نے انکساری سے کام لیتے ہوئے کہا کہ آپ واقعی انصاف کے طالب ہیں تو اُن لوگوں کے پاس جاییے جو فارسی کے استاد ہیں۔ میں تو ریختہ گو ہوں۔ سودا کا جواب سن کر اشرف آزرده ہو کر واپس چلے گئے لیکن تذکرہ وہیں چھوڑ گئے۔ مجبور ہو کر سودا اس تذکرے کی طرف متوجہ ہوئے تو انھیں معلوم ہوا کہ فاخر مکین نے اساتذہ فارسی کے ساتھ بڑا ظلم کیا ہے۔

دیکھی تو عجب طرح کا ہے قتلِ مچایا  
 ہاتھ اپنے میں لے اوس نے قلم کا تبر و تیر  
 استادوں کے وہ شعر کہ ہر حرف جنھوں کا  
 دیوان فصاحت کے کتابہ کی ہے تحریر  
 اوس کے تئیں کاٹا ہے بنایا ہے بگاڑا  
 ہر شعر کے معنی کو کیا ہے زیر و زیر



ایں مصرع ظاہر اوالہ درحق شیخ علی حزیں علیہ رحمۃ گفتہ، القصہ حالاً  
 باوجود تجاہل و تغافل مخالفت ہامی کند۔ چنانچہ روزے پیش مختار  
 الدولہ بہ واسطہ عزیزے استغاثہ کرد، با آنکہ روے ندیدنی فقیر را  
 نواب معزاللہ ندیدہ بود۔ جواب داد کہ بر ما ثابت است کہ فلانے با  
 بیچ احدے سرکار ندارد بر خود شباشاں حکومت ماسزاوار  
 نیست.....“۔

اس خط میں مکین نے اشرف علی خاں کے تذکرے کا کوئی ذکر نہیں کیا بلکہ سودا پر الزام لگایا  
 کہ وہ مکین کا تلمذ اختیار کرنا چاہتے تھے۔ چون کہ انھیں منظور نہیں تھا۔ اس لیے سودا ناراض  
 ہو گئے۔ میرا خیال ہے کہ مکین نے حقیقت چھپائی ہے اور یہ محض الزام تراشی ہے کہ سودا  
 ان کا تلمذ اختیار کرنا چاہتے تھے۔ یہ واقعہ سودا کی آخری عمر کا ہے۔ اس وقت سودا جیسے  
 مشہور شاعر کو شاگرد بنانا کسی کے لیے بھی قابل فخر تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ فارسی میں سودا کو  
 شہرت حاصل نہیں ہوئی تھی لیکن اردو میں تو انھیں جو مقام حاصل تھا۔ وہ صدیوں میں  
 دو چار ہی کو ملتا ہے۔

بہر حال اس معارضہ نے اتنا طول کھینچا کہ مکین کو لکھنؤ چھوڑنا پڑا۔ وہ محمد راغب خاں کے  
 نام ایک خط میں لکھتے ہیں۔

”آتش در خانہ ناہجار افتد کہ دریں تازگی خیلے با من کج باخت،  
 بتارخ دوازدم شہر ذی قعد روز سہ شنبہ خود را از دست کشکش عزیزاں  
 اینجا خلاص نموده، ارادہ گرم روی کردم، آخر روز در عین ہوائے ابر بہ  
 خانہ دوستے نقل مکان کردم باوجودیکہ شب بہ شدت بارش شد و صبح  
 کمال برودت و ابر بود روانہ شدہ بہ بجنور رسیدم و گوشہ گزیدم۔ شب  
 از کوفت راہ و تنہائی و عدم رفیق مزاج داں انچہ گذشت  
 صبر بر آں کرد۔ چہاردم روز پنجشنبہ بوقت طلوع آفتاب بہ سیندی  
 کہ چہار پنجم کردہ بود تا آخر روز آہستہ آہستہ رسیدہ۔ طرفہ خلل در خود

۱۔ مکین کے خطوط کے حوالے معاصر حصہ ۱۹، مئی ۱۹۶۴ء سے لیے گئے۔

محسوس کردم..... روزی جمعہ از آں جابہ ہماں حال قدم در راہ گذاشتیم  
بعد دو پہر بہ سدھولی کہ چہار کردہ بود وارد شدہ منزل گر قہیم، سامعہ و  
باصرہ معطل شد و حواس دیگر مختل، سقوط اشتہا بدرجہ ای کہ رغبت بیچ  
چیز نبود، چنانچہ اصلاً نخوردم۔<sup>۱</sup>

مکین کے اس خط سے یہ بھی انکشاف ہوتا ہے کہ سودا کے گھر کو آگ لگ گئی تھی۔ وہ لکھتے  
ہیں۔

”اکثر بیدلاں در آتش ز بانہا سوختہ و آتش فساد برائے خود فروختہ  
ایں است کہ دریں ایام خانہ اش سوخت و آب از دیدہ بریخت  
فایدہ نیند دخت اللھم احفظنا من شرور انفسنا۔“<sup>۲</sup>

اگر سودا نے فخر مکین کی بھوکہی ہے تو مکین نے بھی اپنی طرف سے کوئی کمی نہیں کی۔ انھوں  
نے بھی سودا کی شاعرانہ صلاحیتوں کا مذاق اڑایا ہے۔

نہ دید از خود فروشی دشمن ما جنس بہبودے  
ببازار جہاں دارد عبث سوداے بے سودے  
دکانے چیدہ بہر گرمی بازار از سودا  
ندارد گرچہ غیر از آہ محرومی دم و دودے  
بایں بے مائیگی جوش خریداران طمع دارد  
خیال باطل او را قماش کاش می بودے  
طمع گوئی از گفتار صاحب مایگاں گیرد  
کند ابلہ فریبی تا کہ از قلب زر اندودے

۱۔ معاصر، حصہ ۱۹، ص ۷۵  
۲۔ معاصر، حصہ ۱۹، ص ۷۶

متاع روے دست اوست قصد روشی با من  
 بجز رو ساختن ہرگز نہ بیند روے مقصودے  
 بدل با وعدہ نقد وفا جنس جفا کردہ  
 نمی داند کہ در پیش است آخر روز موعودے  
 مرا ارزاں نماید خود گراں قیمت شود لیکن  
 نمی ارزد پیشیزے نرخ خود چنداں کہ افزودے  
 براہ وصف گاہے یک وجہ رہ طے نمی کردے  
 بگاہ طعنہ در یک گام صد گز راہ پیودے  
 سخن باہر کس از بیش و کم من در میاں دارد  
 ز دلالی دل او چچ آیا شرم نہ نمودے ۱

غلام حسین ضاحک اور سودا

ضاحک ان خوش نصیب لوگوں میں ہیں جنہیں سودا کی بھجوں نے زندہ جاوید کیا ہے۔ سودا اور ضاحک دونوں ایک دوسرے کی بھجگوئی میں فحش نگاری کی انتہا تک پہنچ گئے تھے۔ عام طور پر یہی خیال تھا کہ ضاحک کا دیوان مرتب ہی نہیں ہوا۔ محمد حسین آزاد نے لکھا تھا کہ ”میر حسن مرحوم ان کے صاحب زادے سودا کے شاگرد تھے۔ میر ضاحک کا انتقال ہوا تو سودا فاتحہ کے لیے گئے اور دیوان اپنا ساتھ لیتے گئے۔ بعد رسم عزائے سی کے اپنی یادہ گوئی پر جو کہ اس مرحوم کے حق میں کی تھی بہت سے عذر کیے اور کہا کہ سید مرحوم نے دنیا سے انتقال فرمایا۔ تم فرزند ہو جو کچھ اس روسیہ سے گستاخی ہوئی معاف کرو۔ بعد اس کے نوکر سے دیوان منگا کر جو بھجیں ان کی کہی تھیں سب چاک کر ڈالیں۔ میر حسن نے بہ مقصد غلو حوصلہ و سعادت مندی اسی وقت دیوان باپ کا گھر سے منگایا اور جو بھجیں ان



کی تھیں وہ پھاڑ ڈالیں۔<sup>۱</sup> اب آزاد کا بیان ایک دل چسپ حکایت سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔ اول تو میر ضاحک کا دیوان مل گیا ہے۔<sup>۲</sup> اور دوسرے ضاحک کا انتقال سودا کی وفات کے بعد ہوا۔<sup>۳</sup> دیوان میں سودا کی ہجویں موجود ہیں۔

ان دونوں کے معرکے کی ابتدا کب ہوئی؟ اور کس نے کی؟ اس سے متعلق ناصر لکھتے ہیں۔ ”جب نواب شجاع الدولہ بہادر نے سنا کہ مرزا رفیع فرخ آباد میں آیا ہے شقہ خاص اس کی طلب میں قلمی فرمایا سبحان اللہ کیا وضع داری تھی کہ نواب کے شقہ کے جواب میں یہ رباعی لکھی۔ سودا بچے دنیا تو بہر سو کب تک (پوری رباعی دی ہے) حضور پر نور اس رباعی سے خیلے گراں خاطر ہوئے۔ میر غلام حسین بہ تخلص ضاحک کہ نمک مجلس تھے۔ واسطے رفع ملال یوں بول اٹھے اگر وہ حضور پر نور کی شقہ سے نہیں آتا ہے غلام بے طلب کھینچ بلاتا ہے۔ قصیدہ سالگرہ کا نواب عماد الملک غازی الملک غازی الدین خاں کی تعریف میں سودا کا کہا ہوا تھا تمام اس مصنف کی مذمت میں الٹا۔ چنانچہ یہ شعر۔

پاؤں کھڑی پہ رکھو ہاتھ میں لو آئینہ

بال..... کے چنو ناک پہ دھر کے عینک

جب وہ مزخرفات سودا نے سنے بحکم آنکھ دیوانہ را ہوئے بس است روانہ لکھنو کو ہوا۔ میر سابق الذکر نے کہ دلیری و شوخ چہشی ان پر ختم تھی۔ بے سابقہ معرفت مرزا کی ملاقات کو قدم رنجہ کیا۔ اس فروتنی سے غبار عناد کا سودا کے دل سے مطلق صاف ہو گیا۔ موافق قاعدہ ہندوستان عطر و پان کے واسطے اندر تشریف لے گئے۔ اس عرصہ میں کہ برآمد ہوں اس ٹھہول نے قلمدان کھولا اور یہ مطلع ایک پرچہ پر لکھا دیکھا

رستم سے تو کہہ پیارے سرتیغ تلے دھر دے

پیارے یہ ہمیں سے ہو ہر کارے و ہر مردے

۱۔ آپ حیات، ص ۱۸۲-۱۸۳۔

۲۔ یہ دیوان بتیاراج۔ بہار کے محافظ خانے میں محفوظ تھا۔ قیام الدین احمد صاحب نے معاصر (جولائی ۱۹۶۲ء) میں اس کا تعارف کرایا ہے۔ میں نے اصل دیوان نہیں دیکھا۔ اسی مقالے سے استفادہ کیا ہے۔

۳۔ علی گڑھ میگزین ۱۹۵۳ء، ص ۱۳۳۔

اس کے برابر یہ مطلع لکھ دیا:

سودا نے اٹھا چوڑ جب پاد دیا پڑے

یہ ان ہی سے ہوتا ہے ہر کارے و ہر مردے

بعد دو چار گھڑی کے جب وہ صحبت برہم ہوئی۔ سودا نے قلمدان کھولا اور وہ مطلع پڑھا۔  
یقین کلی ہوا کہ سیدنا سید اور مردنا معتمد ہے بے اختیار یہ شعر زبان پر گزرا۔

ریم سوزاک پدر ہے تو شریر

رحم مادر سے اُلٹ نکلا ہے میر ل

اول یہ ترجیع بند کہا بعد اس کے یہ قصیدہ۔

ضحا کا کیوں نہ وہ پرداز کرے زیرِ فلک

پہنچی چھین سے ہونطفہ کی حلت جس تک ۲

بعد خرابی بسپار باستدعائے میر حسن یہ ہجو مولوی ساجد شاہ آبادی کے نام پر ہوئی۔ باقی  
ترجیع بند اور محسن و مثنوی ہنوز بدستور۔ ۳

محمد حسین آزاد لکھتے ہیں۔ ”سودا نے جو ان کے حق میں گستاخی کی ہے اس کا سبب یہ ہوا کہ  
اول کسی موقع پر انھوں نے سودا کے حق میں کچھ فرمایا۔ سودا خود ان کے پاس گئے اور کہا کہ  
آپ بزرگ میں خرد آپ سید میں آپ کے جد کا غلام عاصی اس قابل نہیں کہ آپ اس  
کے حق میں کچھ فرمائیں۔ ایسا نہ کیجیے کہ مجھ گنہگار کے منہ سے کچھ نکل جائے اور قیامت  
کے دن آپ کے جد کے سامنے رو سیاہ ہوں۔ تلامذہ الہی کے دماغ عالی ہوتے ہیں۔ ان

۱۔ ناصر نے پورا ترجیع بند نقل کیا ہے۔

۲۔ قاضی عبدالودود صاحب کا خیال ہے کہ ”ناصر نے جس کا یہ قصیدے کے بارے میں لکھا ہے کہ دراصل  
ضاحک کی ہجو میں تھا۔ یہ قابل قبول نہیں، یہ ہجو ساجد ہی کی ہے۔“ علی گڑھ میگزین ۱۹۵۳ء، ص ۱۳۷۔

۳۔ تذکرہ خوش معرکہ زیبا، قلمی، آزاد لائبریری، علی گڑھ۔

کی زبان سے نکلا کہ نہیں بھئی یہ شاعری ہے اس میں خردی و بزرگی کیا۔ سودا آئیں تو کہاں جائیں۔ پھر جو کچھ انھوں نے کہا خدا نہ سنوائے۔ لیکن یہ تمام بیانات درست نہیں۔ سودا نے ضاحک کی ہجو میں جو ترجیع بند کہا تھا، جس کا مطلع ہے۔

جا صبا ضاحک سے کہہ بعد از سلام

کیوں کیا کرتا ہے ہجو خاص و عام

اس کے بعض اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ ضاحک ہر شخص کی ہجو کرتے تھے۔ ان میں بعض لوگ سودا کے ملنے والے بھی تھے۔ یہ بات انھیں ناگوار گزری اور انھوں نے ضاحک کی ہجو کہہ دی۔ اس معرکے کی ابتدا غالباً اسی ترجیع بند سے ہوئی۔ چند جتہ جتہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

آپ کو کہتا ہے تو سید ہوں میں

جد مرا پوچھو تو ہے خیر الانام

-----

پس دکھا تو اب کسی کی ہجو میں

ہو اگر ختم رسالت کا کلام

-----

ہجو کرتا کیوں تو ان اشخاص کی

وہ جو ہیں ممتاز زیرِ آسمان

-----

کہہ معالج خاں نے تیرا کیا کیا  
 شعر ان کا اپنے منہ میں گہہ بھرے  
 میرنواب اور ان کے بھائی کی  
 جھو تو کرتا ہے وہ ہیں منگرے  
 میرزا بہلو سے تا مرزا علی  
 نظم میں آئے ترے سب سے پرے

کچھ میری جھو تو اے بھڑوے نٹ  
 تو سہی دوں بانس سے تجھ کو الٹ

آخری شعر بتا رہا ہے کہ ضاحک نے ابھی تک سودا کی جھو نہیں کہی تھی اور ضاحک نے  
 میرنواب، ان کے بھائی، مرزا بہلو، مرزا علی اور معالج خاں وغیرہ کی جھو جویں کہی تھیں، وہ  
 سودا کو ناگوار گزریں اور یہی ناگواری جھوگوئی کی ابتدا کا سبب بنی۔ سودا نے ایک اور مخمس  
 لکھا تھا۔ کلیات سودا مرتبہ آسی میں یہ ”مخمس درجواہلیہ میرضاحک“ کے عنوان سے شامل  
 ہے۔ مگر اس کے صرف پانچ بند دیے ہیں جب کہ قلمی نسخوں میں ۴۵ بند ہیں۔ مخمس کا پہلا  
 بند ہے۔

- ۱۔ دیوان ضاحک میں معالج خاں کی جھویں موجود ہیں۔ دو شعر یہ ہیں۔  
 کھودے ہے سب کی ذات اور ایماں طرف ہے یہ کوئی معالج خاں  
 ہے معالج کہ یا ہے یہ دجال پڑے سب سیدوں کا اس پہ وبال  
 (معاصر جولائی ۱۹۶۲ء، ص ۱۱۶-۱۱۷)
- ۲۔ کلیات سودا مرتبہ آسی میں یہ نام مرزا رفیع ہے لیکن اکثر معتبر قلمی نسخوں میں مرزا علی ہے۔ مطبوعہ کلیات  
 سودا میں مرزا علی کی جھو کے ایک مخمس کے تین بند موجود ہیں۔ ”اک قصہ میں سنا تھا مردم سے یہ قصار“۔ نو بند کا  
 یہ مخمس دیوان میر حسن کے قلمی نسخے (رضا لاہوری رام پور ص ۳۰۸-۳۱۰) میں موجود ہے۔ غالباً یہ سودا کا  
 نہیں ہے کیوں کہ کلیات سودا کے اکثر قلمی نسخوں میں نہیں ہے۔

ضاحک کی اہلیہ نے جب ڈھول گھر دھرایا  
 بے وجہ رات ساری ہمایوں کو جگایا  
 بیٹھک میں بیٹھ بوڑھے چونڈے کو جب ہلایا  
 تب شیخ سداؤ اس پر اساک کھا کر آیا  
 بولا کہ کیوں بے ضاحک بکرا کوئی منگایا  
 سودا نے ضاحک کی ججو میں ایک مثنوی بھی کہی تھی۔ جس کا مطلع ہے۔

عجیب و غریب زیر سما  
 ایک یاں صورت آشنا اپنا

اس مثنوی میں ضاحک کی بسیار خوری کا طرح طرح سے مضحکہ اڑایا ہے۔

محمد حسین آزاد نے سکندر مرثیہ گو اور ضاحک سے متعلق ایک دل چسپ واقعہ لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔ ”سودا کے دیوان میں میر ضاحک مرحوم کی یہ ججو جب میں دیکھتا تھا: یارب یہ دعا مانگتا ہے تجھ سے سکندر۔ تو حیران ہوتا تھا کہ سکندر کا یہاں کیا کام میر مہدی حسن فراغ..... کو خدا مغفرت کرے انھوں نے بیان کیا کہ ایک دن حسب معمول مرزا سلیمان شکوہ کے ہاں پائیں باغ میں تخت بچھے تھے۔ صاحب عالم خود مسند پر بیٹھے تھے۔ شرفا و شعرا کا مجمع تھا۔ مرزا رفیع اور میاں سکندر مرثیہ گو بھی موجود تھے کہ میر ضاحک تشریف لائے۔..... اتفاقاً صاحب عالم نے مرزا رفیع سے کہا کہ کچھ ارشاد فرمائیے..... سودا نے کہا۔ میں نے تو ان دنوں میں کچھ کہا نہیں۔ میاں سکندر کی طرف اشارہ کیا کہ انھوں نے ایک مخمس کہا ہے۔ صاحب عالم نے فرمایا کیا؟ سودا نے پہلا ہی بند پڑھا تھا کہ میر ضاحک مرحوم اٹھ کر میاں سکندر سے دست و گریباں ہو گئے۔ سکندر بیچارے حیران کہ نہ واسطہ نہ سبب یہ کیا آفت آگئی۔ سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ دونوں صاحبوں کو الگ کیا اور سودا کو دیکھیے تو کنارے کھڑے مسکرا رہے ہیں۔“ ۱۔ اس مخمس کا پہلا بند ہے۔

یا رب تو مری سن لے یہ کہتا ہے سکندر  
 ضاحک..... کسی بن میں قلندر  
 گھر اس کے تولد ہو اگر بچہ بندر  
 گلیوں میں نچاتا پھرے وہ بنگلے کے اندر  
 روٹی تو کما کھاوے کسی طور چھندر

دیوان میر حسن میں ایک مخمس شامل ہے جو اس کا جواب ہے۔ اس کا پہلا بند ہے۔

ضاحک نہ خوف کر تو اب کیا ہے یہ چھندر  
 بکرے کا ہے وہ ..... اور زادۂ قلندر  
 باندھے ہے جب نہ تب وہ بکرے کو باہر اندر  
 لکڑی کے بل نچا تو اس کو مثال بندر

..... ڈرے ہے تیرا..... پہ ہے سکندر

سکندر کی ہجو میں جو مخمس ہے وہ سودا ہی کی تصنیف ہے۔ کیوں کہ کلیات سودا کے اکثر معتبر قلمی نسخوں میں شامل ہے۔<sup>۱</sup> لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اس کا جواب کس نے لکھا تھا۔ دیوان ضاحک میں یہ مخمس شامل نہیں ہے اور مخمس میں جتنی فحش نگاری کی گئی ہے اور جس طرح کے مشورے دیے گئے ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ میر حسن کی تصنیف نہیں کیوں کہ ایک بیٹا اپنے باپ کو اس طرح کے مشورے نہیں دے سکتا۔ غالباً یہ مخمس ضاحک کا کہا ہوا ہے اور ان کے دیوان میں شامل ہونے کی بجائے دیوان میر حسن میں شامل ہو گیا ہے۔

دیوان ضاحک میں سودا کی ہجو میں موجود ہیں۔ ایک غزل کے دو شعر ہیں:

<sup>۱</sup> پہلے قاضی عبدالودود صاحب اسے سکندر کی تصنیف بتاتے تھے (علی گڑھ میگزین ۱۹۵۳ء، ص ۱۴۳) لیکن اب وہ چھٹی تسلیم کرتے ہیں کہ یہ سودا کی کہی ہوئی ہے (سوریا، خاص نمبر، ۲۹، ص ۵۷)۔

اتنا آگے کبھی سودا نہ ہوا تھا سو ہوا  
 بنگلے میں بیٹھ کے رسوا نہ ہوا تھا سو ہوا  
 گو کہ در ماہہ ہوا بیش و لے عزت کم  
 شاعروں بچ چو تھیلا نہ ہوا تھا سو ہوا  
 ایک جہو میں ضاحک نے سودا کے کتوں کے شوق کو برا بھلا کہا ہے۔ تین شعر ملاحظہ ہوں۔

اوس کا سارے سگوں سے نانا ہے

ایک سفرہ پہ ساتھ کھاتا ہے

کلوا اور جھیرا لینڈی اور تازی

سب شریک طعام اور ہم بازی

کلوا کلہ چبائے جاتا ہے

اوچھڑی جھیرا ساتھ کھاتا ہے

ایک دوسری جہو کے دو اشعار یہ ہیں۔

ناصر الملک کا وہ سالا ہے

چاہے گھڑنے میں کھیلا کالا ہے

سلف سب شاعروں میں سودا ہے

ایک سر میں ہزار سودا ہے

مذہبی جہویں

سودا کی مذہبی جہویں صرف تین ملتی ہیں۔ کسی مجتہد نے یہ فتویٰ دے دیا کہ کوا حلال ہے۔

اس مضحکہ خیز بات پر سودا کی رگ ظرافت پھڑک گئی اور انھوں نے مجتہد اور ان کے حامیوں کی جھوکہ ڈالی۔ جھوکی ابتدا اس طرح ہوتی ہے۔

لشکر کے بیچ آج یہی قیل و قال ہے  
کھانے کی چیز کھانے کا سب کو خیال ہے  
یوں دغل امر و نہی میں کرنا محال ہے  
جو فقہ داں ہیں سب کا یہ اُن سے سوال ہے  
اک مسخرا یہ کہتا ہے کوا حلال ہے  
مسخرے کے ساتھ اس کے حامی چاند خاں اور اک مہربان بھی لپیٹ میں آ جاتے ہیں۔

حامی انھوں کے قول کا ہودے ہے چاند خاں  
اور دوسرے میں کیا کہوں اک اپنے مہرباں  
کچھ شک رہا ہے کوئے کی حلت کے درمیاں  
ہم سے جو کوئی پوچھے تو ہم بھی کہیں کہ ہاں  
اک مسخرا یہ کہتا ہے کوا حلال ہے  
اس کے بعد سودا نے ایک دل چسپ قصہ بیان کیا ہے۔ ایک مجتہد نے اپنے نوکر سے کہا۔ ”کوا حلال چیز ہے میرے لیے پکا“۔ نوکر نے پہلے تو انکار کیا۔ لیکن آقا کے اصرار سے تنگ آ کر پکانے پر مجبور ہو گیا۔ بہ مشکل تمام کوا پکا۔ تو مجتہد بولے۔ ”گھی پی لیا ہے تو نے تو کوا رہا ہے خام“۔ نوکر نے جواب دیا میاں خدا کا نام لو۔ میرے لیے تو یہ سؤر سے بھی زیادہ حرام ہے۔ آقا کو غصہ آ گیا۔ انھوں نے ملازم کو مارنا پیشنا شروع کر دیا۔ نوکر بھی خاموش نہ رہا اور آخر نوبت یہ پہنچی۔

جس وقت بڑھ پڑی غرض آپس میں دوت دات

ایدھر سے دھول چلنے لگی اور ادھر سے لات



پگڑی انھوں کی ان کئے جیب ان کی ان کے ہات  
 مبدا جو اس فساد کا پوچھو تو اتنی بات  
 اک مسخرا یہ کہتا ہے کو احوال ہے  
 لوگوں نے بیچ میں پڑ کر ان دونوں کو چھڑایا۔

مطبوعہ کلیات سودا میں ایک ہجو ہے جس کا عنوان ہے۔ ”قصیدہ در ہجو شخصے کہ متعصب  
 بود“۔ لیکن بہت سے قلمی نسخوں میں شاہ ولی اللہ کا نام موجود ہے۔ ہجو کی ابتدا میں سودا نے  
 شاعرانہ تعلی سے کام لیتے ہوئے کہا ہے۔

کروں چمن میں اگر جا کے میں غزل خوانی  
 تو بلبلیں ہوں مرے چہچہے کی دیوانی  
 موا نہیں وہ مرے صیت شعر کو سن کر  
 زمیں میں شرم سے اب گڑ گیا ہے خاقانی  
 یقین تو جان کہ زانو ادب کے اس فن میں  
 کرے ہے تہ مرے آگے عبید زاکانی  
 اس کے بعد سودا اصل موضوع پر آتے ہیں۔

نہ ہو دے کیونکہ مرا رتبہ شعر میں یاں تک  
 میں کیسے پیر کی کرتا ہوں اب ثنا خوانی  
 انھوں کی ذات مبارک میں یہ تعصب ہے  
 کریں نہ چشم میں سرمہ ہو گر صفا ہانی  
 کوئی جو اس کا سبب جا کے پوچھے ہے ادن سے

تو کہتے ہیں کہ ہے یہ بھی کوئی مسلمانی  
 لگانا سرمہ کو واں کے جہاں رہیں شیعہ  
 بھلی ہیں اس سے تو یہ آنکھیں کور ہو جانی  
 علی کا نام لے کوئی جو آ کے مجلس میں  
 کہیں ہیں قتل کرو اس کو ہے یہ ایرانی

اس کے بعد سترہ اشعار میں سودا نے تقریباً یہی باتیں کہی ہیں اور شاہ ولی اللہ پر ان کے  
 مذہبی تعصب کی وجہ سے لعن طعن کی ہے۔

ایک اور ہجو مولوی ساجد کی ہے۔ مطبوعہ نسخے میں اس ہجو کا عنوان ہے۔

”قصیدہ در ہجو مولوی ساجد در بیان آنکہ یزید علیہ اللعنة را اولی الامر گفته بود“۔

اس ہجو میں یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ ایک رافضی عالم سنی بن کر مولوی ساجد کے پاس گیا  
 اور پوچھا۔

کہ دیکھ ماہ محرم نبی کی اُمت میں  
 درست ہے کہ یہ دیں یکدگر مبارکباد  
 پہن لباس مکلف بروز عاشورہ  
 کریں معانقہ آپس میں ہو کے خرم و شاد  
 رافضی عالم کو سنی سمجھتے ہوئے مولوی ساجد نے

دیا جواب کہ ہم سنیوں کے مذہب میں  
 عمل یہ ان دنوں کرتے نہیں ہیں کچھ ایجاد  
 یہ بات ہوتی ہی آتی ہے عہد حضرت سے

ہزار جا ہے کتب بیچ اس کا اشتہاد  
 حنا کو ہاتھوں سے ملنا لگانا سرے کا  
 لباس پہن کے پڑھنا وظیفہ و اوراد  
 بڑا ثواب ہے اس کا کہ ہے یہ روزِ عید  
 کریں نہ گو یہ عمل شیعیان ز راہِ عناد  
 یہ باتیں سن کر رافضی عالم نے مکابرہ شروع کر دیا اور ایسی ایسی دلیلیں پیش کیں کہ بقول  
 سودا:

غرضکہ رافضی بے ادب نے از روِ جہل  
 خموش مولوی صاحب کو کر کے حد سے زیاد  
 یہ کہہ کے اٹھ گیا ظاہر ہے اس حمایت سے  
 خسریند کا تو ہے وہ ہے ترا داماد  
 اس جھوٹا آخری شعر مطلع کی شکل میں ہے۔

مکن تو لعن بہ شرویزید و ابن زیاد  
 بگو بہ مولوی ساجد مدام لعنت باد

### دیگر جھوٹیں

اس عنوان کے تحت سودا کی بعض اخلاقی اور سماجی جھوٹوں کا ذکر کیا جائے گا۔ مطبوعہ کلیاتِ  
 سودا میں بخیل لوگوں پر دو جھوٹیں ہیں۔ پہلی جھوٹ کا عنوان ہے ”مثنوی در جہو امیر دولت مند  
 بخیل“۔ مثنوی کی ابتدا خدا کی تعریف سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد ایک دل چسپ نقل  
 بیان کی ہے جو اس طرح شروع ہوتی ہے۔

اتفاقاً اک آشنا میرے  
گئے تھے ایک عمدہ کے ڈیرے  
جو ہیں وارد ہوئے یہ واں ناگاہ  
اٹھا چاروں طرف سے ابر سیاہ

بارش کے آثار دیکھ کر صاحب خانہ بہت پریشان ہوئے۔ اس نے مہمان سے پوچھا کہ  
بارش ہونے والی ہے۔ تمہارے پاس واپس جانے کا کوئی سامان ہے۔ مہمان نے جواب  
دیا۔ مجھے کیا پتا تھا ورنہ میں کچھ نہ کچھ لے آتا۔ اتنے میں بارش شروع ہو گئی۔ صاحب خانہ  
نے کہا میری بد نصیبی ہے کہ آپ تشریف لائے۔ بارش میں بھیگتے ہوئے واپس  
جائیں گے۔ مہمان نے جواب دیا۔

بولے یہ سادگی سے کیا ہے ضرور  
بھیگتا جاؤں گا میں اتنی دور  
رکھے خالق سلامت آپ کی ذات  
نہ کھلے گا تو میں رہوں گا رات

یہ جواب سن کر صاحب خانہ کی تو جان نکل گئی۔ مگر اب صبر کے سوا کیا چارہ تھا۔ کھانے کا  
وقت ہوا تو مہمان نے بکاول سے کہا کچھ تیار ہے تو لاؤ۔ اتفاق سے صاحب خانہ وہاں  
موجود نہیں تھا۔ بکاول نے آقا کے بگل کی داستان تقریباً ۴۷ اشعار میں بیان کی  
ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ چوں کہ صاحب خانہ کا مطبخ شاذ و نادر ہی استعمال ہوتا تھا۔  
اس لیے بکاول مطبخ کا حال بیان کرتے ہوئے بتاتا ہے۔

بسکہ مطبخ میں سردی رہتی ہے  
ناک بادریچوں کی بہتی ہے

اون کے مطبخ سے دود اوٹھے اگر  
 تھے لے دوڑتے ہیں مشکیں بھر  
 لگے ہے دینے کوئی اوٹھکے ازاں  
 کوئی دکھلاوے ہے کھول کر قرآن

بکا دل صاحب خانہ کے لڑکے کا ذکر کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ ایک دن اُس لڑکے نے  
 اپنے کسی دوست کی دعوت کر دی۔ بھلا یہ فضول خرچی کیسے برداشت کر سکتا تھا۔ وہ آگ  
 بگولا ہو گیا اور جو کچھ نہ کہنا تھا اس نے کہا۔ اپنے لڑکے پر ناراض ہوتے ہوئے صاحب  
 خانہ فرماتے ہیں۔

یارو مجھ سے تو لا ولد بہتر  
 میرا بیٹا اور اس قدر اتر  
 اس کا دادا بھی گرچہ تھا عیاش  
 اس سلیقے سے پر کرے تھا معاش  
 جو کوئی اس کے گھر میں نوکر تھا  
 رات کو اس پہ یہ مقرر تھا  
 پھرتا وہ کلڑے مانگتا گھر گھر  
 لاتا آقا کے آگے جھولی بھر  
 اچھے چُن چُن کے آپ کھاتے تھے  
 برے تنخواہ میں لگاتے تھے

ایک اور بخیل پر جو ہے جو اس جو کے مقابلے میں غیر دل چسپ ہے۔ مطبوعہ کلیات میں

صرف دو بند ہیں۔ ممکن ہے کسی قلمی نسخے میں اور بندل جائیں۔

بخیل کی طرح سودا اس آدمی کو بھی پسند نہیں کرتے جو بڑھاپے میں شادی کرتا ہے۔ اس موضوع پر سودا کی تین جھویں ملتی ہیں۔ ایک جھوکا عنوان ہے۔ ”قطعہ تاریخ جھوش صنعت اللہ کہ کتھا شدہ بود“۔ اس نو اشعار کی جھویں کسی نے ایک بوڑھے کی جوان بیوی سے پوچھا کہ تیری عقل پر کیوں پتھر پڑ گئے تھے جو تو نے اس ”مٹی کے تھوئے“ سے شادی کی۔ یہ سن کر بیوی نے

دیا جواب کہ اے بھڑوے خبر ہے تجھ کو  
فرشتے نے مرے دامن کو آج تک نہ چھوا  
سوائے خرس سے میں بیاہ کرنے بیٹھوں گی  
کہ جس کی داڑھی کا ہر بال جیسے ہووے سوا  
میں پیرزادی کر اس کی جہاں میں ہوں مشہور  
جو کہتی ہوں اسے بھائی تو وہ کہے ہے بوا

ایک شیخ صاحب نے ”بارہ برس کی چھو کری“ سے شادی کر لی۔ پہلے تو سودا نے ان کی شادی کا حال بڑے دل چسپ انداز میں بیان کیا ہے۔ پھر میاں بیوی کے تعلقات بیان کیے ہیں۔ کچھ بند ملاحظہ ہوں۔

تھے بسکہ شیخ بات سے دنیا کی پاک و صاف  
مسواک لے کے جو رو سے کرنے لگے زفاف  
چوٹی سے اپنی کھول کے اُن نے وہیں موباف  
مشکلیں جکڑ انھوں کی کہا کیجیے معاف

مجھ کو تو کچھ دلی نظر آتے ہیں شیخ جی

لایا غضب میں شیخ کو جو رو کا بند دست  
 مٹکیں توڑا پلچ گئے جو رو سے کر کے جست  
 بال اس کے ان کے ہاتھ تھے ریش ان کی اس کے دست  
 عہدے سے بر نہ آئے تھے از بس ضعیف و پست  
 پاپوشیں تب سے جو رو کی کھاتے ہیں شیخ جی

جو رو سے شیخ جی کو یہ صحبت ہے اب مدام  
 بھڑوا و مسخرا و مچندر ہے ان کا نام  
 خلوت میں جب بلاتے ہیں اس کو بوقتِ شام  
 دیتی ہے تب وہ بھیج کے لوگوں سے یہ پیام

بٹی کو اپنی کیوں یہ بلاتے ہیں شیخ جی

ایک اور شخص ہے جو کسی شیخ جی کی شادی پر کہا گیا ہے۔ اُس میں بھی دولہا کی اسی طرح  
 گت بنائی گئی ہے۔

سودا کی اور بھی کئی دل چسپ ہجویں ہیں۔ مثلاً ”مثنوی در ہجو طفل ضائع روزگار لکڑی ہاز“  
 اس ہجو میں کہانی کے ذریعے اخلاقی درس دیا گیا ہے۔ ”مثنوی در ہجو حکیم غوث“ میں حکیم  
 صاحب کا مضحکہ اڑایا گیا ہے۔ نجف خاں سے نواب ضابطہ خاں کی شکست پر بھی ایک  
 ہجو یہ قطعہ لکھا ہے۔ اس طرح اور بھی چند ہجویں ہیں جو کلیاتِ سودا کے مطبوعہ نسخے  
 میں شامل ہیں۔

ہمیں ان ہجوؤں میں نہ صرف اس عہد کی معاشرت، تہذیب اور سیاسی اور سماجی حالات کی  
 جھلکیاں ملتی ہیں بلکہ ایسا بھی مواد حاصل ہوتا ہے جس سے سودا کی شخصیت کو سمجھنے میں مدد  
 ملتی ہے۔ ان ہجوؤں سے بآسانی سراغ لگایا جاسکتا ہے کہ سودا کن اخلاقی اور انسانی

قدروں پر ایمان رکھتے تھے۔ خود ان کے عہد کے انسان کا اندازِ فکر کیا تھا۔ کسی شاعر کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے ضروری یہ ہے کہ ادبی محقق اس شاعر کے عہد کا گہرا مطالعہ کر کے تنقید کی مدد سے خود کو اس ماحول میں پہنچا دے تاکہ شاعر کے ماحول اور اس کے اندر کے انسان کو قریب سے دیکھ سکے۔ اس سلسلے میں ہجویات سودا کا مطالعہ خاص طور پر اہم ہے۔

سودا کے بعد متعدد شعرا نے ہجویں کہیں۔ لیکن سودا اس فن کو جس بلندی پر پہنچا گئے تھے، اس سے آگے اور کوئی نہ جاسکا۔ سودا قصیدہ کی طرح اس فن کے بھی امام اور خاتم قرار پاتے ہیں۔

### مصطفیٰ اور سودا

ان دونوں کی عمروں میں اتنا فرق تھا کہ جب مصطفیٰ پیدا ہوئے ہیں تو سودا مقبولیت اور شہرت کی انتہائی بلندیوں پر تھے۔ مصطفیٰ کی سودا سے ملاقات بھی صرف ایک بار ہوئی تھی۔ اس وقت سودا لکھنؤ میں تھے۔ چوں کہ مصطفیٰ کے لکھنؤ میں قیام کی کوئی صورت نہیں نکلی اس لیے وہ دہلی واپس آ گئے اور ۱۱۹۸ھ میں جب دوبارہ لکھنؤ پہنچے تو سودا کی وفات کو تین سال گزر چکے تھے جس کا مطلب ہے کہ یہ دونوں کبھی ایک دوسرے کے مد مقابل نہیں ہوئے۔ نیز یہ کہ مصطفیٰ کی کوئی تصنیف سودا کی وفات سے قبل اشاعت پذیر نہیں ہوئی۔ ان کا سب سے پہلا تذکرہ ”عقد ثریا“ ہے جو سودا کی وفات کے بعد مکمل ہوا۔ اس میں مصطفیٰ لکھتے ہیں۔

”اگرچہ مردِ کم علم بود اما ذکاوت و روانی طبعش از کلامش پیدا است،  
در زبان ریختہ علم یکسانی برافراشتہ و ہمیشہ با امر صحبت داشتہ۔ قصائد  
وغزلے در جواب بعضی قصائدِ عربی تصنیف نموده و ماسوائے ایں  
در گفتن ہجو با قدرتِ شاعری خود را نموده، غرضکہ ہمہ باتفاق بہ سبب

- ۱۔ مصطفیٰ اور سودا کے موضوع پر قاضی عبدالودود کا مقالہ اردو ادب اکتوبر ۱۹۵۰ء میں شائع ہوا تھا۔ میں نے اسی مقالے سے استفادہ کیا ہے۔ (خ۔۱)
- ۲۔ مصطفیٰ لکھتے ہیں۔ ”فقیر در عبد نواب شجاع الدولہ بہادر روزے برائے دین ایں بزرگ بہ خدمت رسیده بود۔“ تذکرہ ہندی، ص ۱۲۵-۱۲۶۔



شہرت بسیار و خوبی کلام استاد مسلم الثبوتش میدانند، والحق کہ چنین نامش در ہندوستان رد زبان پازاریان و غزلیات دیوانش بہر اطراف و جوانب و ہر جاہل و امی را بر زبان با ایں ہمہ شہرت کہ در ریختہ نصیحتش بود آخر آخر عنان (کذا) شعر فارسی ہم سر بیدرد را بہ درد آورد۔ اگر چہ ایں حرکت مناسب شناس نہ بود۔<sup>۱</sup>

گویا مصحفی نے سودا پر اعتراض کیے ہیں کہ وہ

- ۱- کم علم ہیں۔
  - ۲- ان کی شہرت بازار یوں میں ہیں۔
  - ۳- ہر جاہل اور امی کی زبان پر ان کے اشعار ہیں۔
  - ۴- اس کے علاوہ مصحفی نے سودا کی فارسی گوئی کو ناپسند کیا ہے۔
- مصحفی کی دوسری تصنیف ”تذکرہ ہندی“ وفات سودا کے تقریباً ۱۴ سال بعد شائع ہوئی۔ اس میں بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

” (سودا) ..... در عصر خویش سر آمد شعراے ریختہ گو گزشتہ۔ بعضے اورا دریں فن بہ ملک اشعرائی پرستش می کنند۔ بعضے بہ سبب دریافت اغلاط صریح و توارد صاف در بعضے اشعارش بہ جہل و سرقتہ اش نیز نسبت می دہند۔ غرض ہر چہ بود در روانی طبع نظیر خود نہ داشت ..... دیوانش بہ فرنگ و صفا ہاں رسیدہ، دیگرے ایں شہرت در خواب ندیدہ۔ اگر در مثال ہندی اشعار غزل صائب و نقش گویم بجا است۔ و اگر در علو مراتب معانی ابیات قصیدہ خاقانی گویم روا۔ نقاش اول نظم قصیدہ در زبان ریختہ اوست۔ حالا ہر کہ گوید پیر و متبعش خواہد بود۔“<sup>۲</sup>

یہاں مصحفی اعتراض کرتے ہیں کہ:

۱ عقیدتیا، ص ۳۲  
۲ تذکرہ ہندی، ص ۱۲۵

۱۔ بعض لوگ کلام سودا میں اغلاط صریح اور تواریف صاف کو سودا کے جہل اور سرقہ سے نسبت دیتے ہیں۔

سودا کے متعلق یہ باتیں صرف وہ شخص کر سکتا ہے، جسے اُن سے کوئی بغض ہو۔ سودا یقیناً کم علم نہیں تھے۔ ان کا اردو، فارسی کلام، عبرۃ الغافلین اور سبیل ہدایت اس کا ثبوت ہیں۔ یہ بھی غلط ہے کہ اُن کی شہرت صرف بازیوں میں تھی اور صرف جاہل اور اسی لوگوں کو ان کے اشعار یاد تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ سودا کو خواص اور عوام دونوں میں مقبولیت حاصل تھی۔ اس کا ثبوت لاتعداد کلیات سودا کے قلمی نسخے ہیں جو ہندوستان اور غیر ممالک کی لائبریریوں میں ملتے ہیں۔ فارسی میں ممکن ہے بہت اچھے شعر نہ کہہ پائے ہوں لیکن ایسا بھی نہیں کہ اس دور کے ہندوستانی فارسی شعرا کے مقابلے میں بہت کم درجے کے ہوں سودا پر تو اردو کا الزام بے جا ہے۔ اردو کا کوئی شاعر اس الزام سے بری نہیں۔ خود مصحفی بھی۔ رہا سوال اغلاط صریح کا تو یہ بھی مصحفی کی زیادتی ہے۔ سودا کے کلام میں زبان کی صرف وہ غلطیاں ملتی ہیں جنہیں اس عہد میں جائز سمجھا جاتا تھا۔

نہ صرف نثر میں بلکہ مصحفی نے نظم میں بھی سودا پر اعتراضات کیے ہیں یا خود کو ان سے بہتر شاعر بتایا ہے۔

مصحفی نے دیوانِ اول میں سودا کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔ دیوانِ دوم لکھنؤ میں مرتب ہوا تھا۔ اس میں یہ دو اشعار ہیں۔

مصحفی رینتہ پہنچا ہے مرا رتبے تک

شوریاں گرد ہے مرزا کی بھی مرزائی کا

۱۔ مصحفی نے بڑی ہوشیاری سے سودا پر اعتراض کیا ہے۔ خود تو ان کی بہت تعریف کی ہے۔ اور اعتراضات دوسروں کی زبانی کرائے ہیں۔

۲۔ یہ تمام اشعار مصحفی اور سودا، قاضی عبدالودود، اردو ادب، اکتوبر ۱۹۵۰ء سے لیے گئے ہیں۔

سودا کا بھی سرد ہو چکا ہے بازار  
اب بزمِ سخن ہے مرے دم سے گلزار

دیوانِ چہارم میں یہ دو شعر ہیں۔

غرورِ شاعری اے مصحفی اچھا نہیں اتنا  
تجھے کیا میر و مرزا سے ہے چپ اے مصحفی نسبت

میر و مرزا کے جو طالع نہ ملے ہم کو تو کیا  
مصحفی اپنا زمانہ بھی میر اچھا گذرا

دیوانِ ہفتم میں یہ اشعار بھی ہیں۔

مسند نشین ریختے جب تک ہے مصحفی  
جیتا ہے میر درد بھی سودا نہیں موا  
کچھ میں جرأت نہیں ہوں مصحفی سحر بیاں  
میر و مرزا سے لڑانے یہ غزل جاؤں گا

دیوانِ ہشتم کا ایک شعر ہے۔

کلامِ میر کا ہو مصحفی کہ مرزا کا  
نہ پاسکے گا مرے انتخاب سے پیوند

قصائد میں بھی مصحفی نے سودا کا ذکر کیا ہے۔ ایک قصیدے میں مصحفی نے سودا کا تفوق تسلیم کیا ہے۔

بھلا میرے مرقع کا بھی عالم اک ذرا دیکھو  
اگر ہے ہاتھ میں سودا کے یارو خامہ مانی  
قصائد میں مرے اور اس کے چنداں فرق تو کیا ہے  
میں عرقی ہی سہی اس فن کا گر گزرا وہ شروانی

ایک قصیدے میں سودا کو پورا شاعر تسلیم کیا ہے۔

کیوں کے دلی کے چچ گزرے ہیں  
ڈھائی شاعر سر آمد شعرا  
اس کی تفصیل یہ کہ کہتے ہیں  
میر و مرزا و درد و درد

غزل اور قصیدے کے ان اشعار میں مصحفی نے کبھی سودا کو خود سے بڑا شاعر مانا ہے۔ کبھی ان پر اپنا تفوق ظاہر کیا ہے۔ کبھی ان کو شروانی (خاقانی) تسلیم کیا ہے اور کبھی پورا شاعر۔ لیکن ایک قصیدے میں مصحفی نے سودا کو بہت زیادہ بُرا بھلا کہا ہے۔

یہ گوئے یہ میداں یہ زباں اور یہ بیاں ہے  
دعویٰ ہو جسے شعر کا آئے نہ کہاں ہے  
سودا کے تئیں کہتے ہیں شاعر مغلط  
سو شاعری اس کی بھی بلیغوں پہ عیاں ہے  
مضمون و معانی سے نہیں بہرہ کچھ اس کو  
سچ پوچھو تو ارد کی فقط صاف زباں ہے  
سو اس میں بھی تو غور سے دیکھے تو بہت جا  
معنی ستم لفظ سے فریاد کناں ہے

سوال یہ ہے کہ آخر مصحفی کو سودا سے کیا عناد تھا۔ ان دونوں کے ذاتی تعلقات کبھی نہیں رہے جو کسی تنازعہ کا امکان ہوتا۔ مصحفی صرف سودا کی شہرت اور مقبولیت سے آزرده خاطر تھے۔ جیسا کہ ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے۔

مصطفیٰ اک میں رہا ہوں یادگار رفتگاں  
جان تو قائم مقام میر اور مرزا مجھے

-----

مرزا و میر کا تو نہ کر ذکر مصطفیٰ  
اشعر ہیں اب تو کشور ہندوستان میں ہم  
اس شعر میں تو مصطفیٰ نے بالکل صاف الفاظ میں کہہ دیا۔

حسد کی جا نہیں ابے مصطفیٰ کلام ان کا  
کہ اپنے وقت کے مرزا و میر ہم بھی ہیں  
مصطفیٰ کے اس رویے کے خلاف تلامذہ سودا کا صف آرا ہونا ایک فطری بات تھی۔ مصطفیٰ  
نے ایک قصیدہ لکھا ہے جس میں انھوں نے کہا ہے کہ کوئی شخص مصطفیٰ کے نام سے تلامذہ  
سودا کی جھو لکھتا ہے۔ حالاں کہ:

جو لوگ آج ہیں قائم مقام سودا کے  
کروں گا جھو میں ناحق انھوں کی نام بہ نام  
خدا نخواستہ کچھ سر پھرا نہیں میرا  
ولے جو چاہے کرے یوں یہ گردش لیا م  
کہ دوست اپنے جو ہوں وہ بھی پھر بنیں دشمن  
یہی تو چاہے ہے البتہ آسمان کی خرام

اس کے بعد تلامذہ سودا میں مرزا احسن، میر فخر الدین ماہر اور محمد رضا کی تعریف کی ہے اور

لکھا ہے کہ میں تو ان سب کی عزت کرتا ہوں۔ اس کے بعد مصحفی لکھتے ہیں کہ ان کے ایک شاگرد گرم یہ خبر لائے ہیں کہ تلامذہ سودا نے مصحفی کی ہجو لکھی ہے۔

میں گوشہ گیر ہوں مدت سے پر یہ قہر سنو

کہ جب گیا ہے کبھی گرم اُس طرف ناکام

لکھے ہیں ہجو میاں مصحفی بہم یہ لوگ

دیا ہے بس یہی شاہ کمال نے پیغام

پھر مصحفی نے تلامذہ سودا کو ان الفاظ میں ڈرانے کی کوشش کی ہے۔

نہیں یہ ہجو کے قابل پر اُن کی خدمت کو

جو یوں بھی چاہیں تو کافی ہیں بس مرے خدام

اگرچہ ہیں وہ نوا خواں و لیکن ان میں سے

بلا ہیں منتظر و گرم جوں برہنہ جسام

اس قصیدے سے اندازہ یہ ہوتا ہے کہ مصحفی کو یہ اطلاع ملی کہ تلامذہ سودا نے ان کی ہجو بھی ہے تو انھوں نے کوشش کی کہ اُس ہجو کی اشاعت نہ ہو۔ اگر وہ یہی قصیدہ ہے۔

کیا حضرت سودا نے کی اے مصحفی تقصیر

کرتا ہے جو ہجو اس کی تو ہر صفحے میں تحریر

تو اس کی اشاعت ہو کر رہی۔ یہ ہجو کلیات سودا، مطبوعہ مطبع مصطفائی اور کلیات سودا مرتبہ آسی دونوں میں موجود ہے۔ اس ہجو یہ قصیدے میں مصحفی کے تمام اعتراضات کا جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔

یہ قصیدہ کس نے لکھا تھا۔ یہ پتہ نہیں چلتا کیوں کہ کسی کلیات میں مصنف کا نام نہیں ملتا۔ قاضی عبدالودود نے ثابت کیا ہے کہ یہ قصیدہ مرزا احسن کی تصنیف ہے۔ میرے

خیال سے یہ بھی ممکن ہے کہ فخر الدین ماہر، محمد رضا اور مرزا احسن تینوں اس کے مصنف ہوں۔ کیوں کہ مصحفی کا یہ شعر قابل غور ہے۔

لکھے ہیں جہو میاں مصحفی بہم یہ لوگ

دیا ہے بس یہی شاہ کمال نے پیغام

اس شعر میں ”بہم یہ لوگ“ غور طلب ہے۔ اس زمانے میں جھونگاری اتنی عام تھی کہ اگر یہ کسی ایک شاعر کا ہوتا تو اسے اپنا نام چھپانے کی ضرورت نہیں تھی۔ چوں کہ کم از کم تین لوگ شریک تھے۔ اس لیے کسی ایک کے نام سے منسوب نہیں کیا جاسکا۔

### مرثیہ نگاری

مرثیہ اردو شاعری کا پیش بہا خزانہ ہے۔ اس میں غزل کی سادگی و سوز و گداز۔ قصیدے کی شان و شوکت، مثنوی کا اندازِ بیان، رزم و بزم کی مرقع کشی، فطرت نگاری، انسانی رشتوں اور تعلقات کی ترجمانی، حق اور باطل کی جنگ وغیرہ سب ہی کچھ شامل ہے۔

اردو میں مرثیہ نگاری کی ابتدا محمد قطب شاہ کے عہد میں ہوئی اور دکنی شاعروں نے اس منصبِ سخن پر کافی توجہ دی۔ دکن کے مرثیہ گو شاعروں کی فہرست اچھی خاصی طویل ہے۔ البتہ شمالی ہند میں سودا سے قبل مرثیہ کہنے والوں کی تعداد بہت محدود تھی۔ ان میں غلام مصطفیٰ خاں کیرنگ<sup>۱</sup>، میرامانی<sup>۲</sup>، خواجہ برہان الدین عاصمی<sup>۳</sup>، اعلیٰ علی<sup>۴</sup>، سید محمد تقی<sup>۵</sup>، نذر علی خاں گماں<sup>۶</sup>، میرزا علی قلی ندیم<sup>۷</sup> کے

۱۔ میر نے ان کے مرثیے کے تین اشعار نقل کیے ہیں۔ نکات اشعار، ص ۱۹۱۔

۲۔ میرامانی ولد میر آئی (عاصمی)..... ہانگیر بسیار آشنا بود۔ بیشتر فکر مرثیہ می نمود۔ تذکرہ شعراء اردو، ص ۱۵

۳۔ خواجہ برہان الدین عاصمی (آٹمی)..... متوطن شاہجہاں آباد..... مرثیہ ہم خوب می گوید۔ نکات اشعار، ص ۱۱۸

۴۔ میر اعلیٰ علی از سادات علی شان..... ابن میر دلایت اللہ خاں..... مرثیہ نیز می گوید تذکرہ شعراء اردو، ص ۲۰

۵۔ سید محمد تقی۔ سید نجیب الطریفین از مرثیہ گو بیان حضرت عبداللہ احسین... مولدش شاہجہاں آباد الحال بطرفہ فرخ آباد احتیاطات دارد۔ تذکرہ شعراء اردو، ص ۳۷۔ سودا نے بیل ہدایت میں انھیں کے مرثیے پر اعتراضات کیے ہیں۔

۶۔ سردے ست سپاہی پیشہ از یاران کو کہ خاں نغاں۔ اصلش از شاہجہاں آبادست، مرثیہ و منقبت و غزل ہمہ می گوید۔ تذکرہ شعراء اردو، ص ۱۴۰-۱۴۱

۷۔ شعر فارسی و مرثیہ درینختہ بہ خوبی می گفت۔ چنانچہ اکثر مرثیہ ہائے او مشہور اند۔ تذکرہ شعراء اردو، ص ۱۷۷

میر عبداللہ مسکین لے، حزیں لے، غمگین لے وغیرہ کے نام ملتے ہیں۔ شمالی ہند کے یہ شعرا مرچے کو مغفرت حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ اس لیے اکثر ان کے مرچے فن شاعری کے عام اصولوں سے آزاد ہوتے تھے۔ سودا نے سید محمد تقی کے مرچے پر اعتراضات کرتے ہوئے لکھا تھا۔

آپ کے مرچے کا ہوں قائل  
خون جس سے عوام کا ہے دل  
سن کے بچا سے جس پہ بدھو تک  
شام سے کوئیں سینہ صبح تلک  
لیکن افسوس صد ہزار افسوس  
یہی آتا ہے بار بار افسوس  
بدھو بچا سمجھ جسے رودیں  
معنی اس کے نہ مجھ سے حل ہو دیں

سودا کو بنیادی اعتراض یہ تھا کہ مرثیہ گو شاعر فن شاعری کے اصولوں کی پابندی نہیں کرتا۔ سید محمد تقی پر اعتراض کرتے ہوئے سودا نے اردو نثر میں لکھا تھا۔

”پس لازم ہے کہ مرتبہ در نظر رکھ کر مرثیہ کہے نہ کہ برائے گریہ عوام اپنے تئیں ماخوذ کرے۔ نادر مقالہ ہے کہ عقلاً جو نہ سمجھیں اور ضبط تفحیک و قصد بکا میں رہیں اس کا سیاق و سباق جہلا

۱۔ سودا نے ایک شعر آشوب میں مسکین کا ذکر کیا ہے۔

اسقاط حمل ہو تو کہیں مرثیہ ایسا پھر کوئی نہ پوچھے میاں مسکین کہاں ہے

عمر شفیق صدیقی صاحب نے ان کا اسی ہندوں کا ایک مرثیہ نقل کیا ہے۔ گل گرسٹ اور اس کا عہد، ص ۲۴۱-۲۶۱  
۲۔ حزیں اور غمگین دونوں مسکین کے بھائی تھے۔ درگاہ کلی خاں ان تینوں کے بارے میں لکھتے ہیں۔ ”وے بزبان رینے مرثیہ گفتن مہارت تمام دارند۔ در ہند شعر کلام لہذا شہرت دارد۔ در واقع ہر سہ کس بسیار خوب مرثیہ گویند۔“ مرقع دہلی، ص ۵۱



دریافت کریں اور پھوٹ بہیں۔“

معنی لفظوں سے ہوتے ہیں روپوش  
یاں تلک رجبہ سخن پہونچا

یہ حال صرف سید محمد تقی ہی کا نہیں تقریباً اکثر مرثیہ گو شعرا کا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ ادب اور احترام کی وجہ سے کسی میں اتنی جرأت نہیں ہو سکتی کہ ان کے مرثیوں پر اعتراض کریں۔ لیکن سودا کب چوکنے والے تھے۔

یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ سودا نے کب مرثیہ نگاری کی ابتدا کی۔ میر، خواجہ خاں حمید اور نگ آبادی اور قیام الدین قائم نے سودا کے مرثیوں کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ غالباً کچھ بھی نرائن شفیق پہلے تذکرہ نگار ہیں جنہوں نے ”کلیات سودا“ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

”کلیات مضمین برقصائد و مثنوی و..... محسن و ترجیع بند و قطعہ و رباعی و مرثیہ قریب دو ہزار بیت بہ نظر امعان رسیدہ“۔<sup>۱</sup>

چنستان شعرا کا سنہ تالیف تقریباً ۱۱۷۵ھ ہے۔ گویا ۱۱۷۵ھ سے قبل جو کلیات سودا مرتب ہوا تھا۔ اس میں مرثیے بھی تھے۔ لیکن شفیق کے الفاظ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت تک سودا نے مرثیہ نگاری کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی۔ رواج زمانہ سے متاثر ہو کر چند مرثیے کہہ لیے ہوں گے۔ شیخ چاند لکھتے ہیں۔ ”سنہ ۱۱۷۵ھ سے قبل سودا کے مرثی کا ذکر سننے میں نہیں آیا۔ سب سے پہلی مرتبہ اس کے مرثیوں کا ذکر شفیق نے اس کے کلیات کے بیان کے سلسلے میں کیا ہے۔ یہ ابھی تک نہیں معلوم ہوا کہ سودا نے دہلی میں مرثیہ کہنا شروع کیا تھا یا وہاں سے جانے کے بعد ۱۱۷۵ھ تک کے مرتبہ کلیات میں اس کے کسی مرثیے کا پتا نہیں چلتا۔ معلوم نہیں کہ شفیق کے پیش نظر کس سنہ کا کلیات تھا“۔<sup>۲</sup> ہمارا خیال ہے کہ سودا نے دہلی ہی میں مرثیے کہنے شروع کر دیے تھے۔ لیکن فرخ آباد

۱۔ کلیات سودا، ص ۴۳۳۔  
۲۔ چنستان شعرا، ص ۳۲۷  
۳۔ سودا، ص ۲۸۸

میں مہربان خاں رند کے مذاق نے سودا کو مجبور کر دیا کہ وہ سنجیدگی سے اس فن کی طرف متوجہ ہوں۔

اردو مرثیہ نگاری کے ارتقا میں سودا کی حیثیت اُس سنگ میل کی ہے جو ایک واضح اور صاف راستے کے تعین میں مددگار ہوتا ہے۔<sup>۱</sup> سودا نے مرثیہ نگاری کی ابتدا کی اور نہ ہی اسے انتہا پر پہنچایا۔ لیکن اس صنفِ سخن کی ہیئت اور مواد میں ان کے تجربات بہت اہم اور تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔ ضمیر، خلیق اور بعد کے عظیم مرثیہ گو شعرا انیس اور دہیر نے سودا سے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔<sup>۲</sup>

معلوم ہوتا ہے کہ سودا کے ابتدائی مرثیے فن کے کچھ اچھے نمونے نہیں تھے۔ اس لیے بعض لوگ سودا کے مرثیوں پر اعتراض کرتے تھے اور بعض انھیں مرثیہ گوئی کا اہل ہی نہیں سمجھتے تھے۔<sup>۳</sup> خود سودا نے ”سبیل ہدایت“ میں اس کا ذکر کیا ہے کہ سید محمد تقی ان کے مرثیوں پر اعتراض کرتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

شعر کے قاعدے کے موجب ہم  
کہنے لاگے تھے مرثیہ کم کم  
سو زبانی تمھاری اے مخدوم  
ہوا اپنے تئیں کو یہ معلوم  
مرثیہ وہ جسے عوام الناس  
روئیں سُن سُن پڑھیں جب ان کے پاس

۱۔ اظہر علی فاروقی لکھتے ہیں، مرزا سودا کے مرثیے ایک سنگ میل کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اردو مرثیہ، ص ۳۱۵۔

۲۔ دہیر نے سودا کی زمین میں ایک مرثیہ کہا۔ جس کا اعتراف ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

بس اے دہیر بند ہے بریاں جگر کباب  
سودا کے مرثیے کا تو ممکن نہیں جواب  
پرنفعل حق سے مرثیہ یہ بھی ہے انتخاب  
کافی ہے تجھ کو بخشش عشر کے واسطے

۳۔ سودا کے مرثیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے آزاد لکھتے ہیں:

”مرثیے اور سلام بھی بہت کہے ہیں۔ اس زمانے میں مسدس کی رسم کم تھی۔ اکثر مرثیے چومعزع ہیں۔ مگر مرثیہ گوئی کی آج کی ترقی دیکھ کر ان کا ذکر کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ شاید انھیں مرثیوں کو دیکھ کر اگلے وقتوں میں مثل مشہور ہوئی تھی کہ ”بگڑا شاعر مرثیہ گو اور بگڑا گویا مرثیہ خواں“۔ آپ حیات، ص ۱۵۶

اور سودا کا مرثیہ سن کر  
 چپ ہی رہ جاؤں ہوں میں سر دھن کر  
 کیسی ہی طرح کوئی اس کی بنائے  
 لیکن اس پر کبھو نہ رونا آئے  
 بارہا یہ سخن ہوا ظاہر  
 حق میں بندے کے غائب و حاضر  
 سچ ہے یہ مجھکو مرثیے کا ڈھب  
 نہیں آتا وہ جس سے رودیں سب

بعض لوگ سودا سے فرمائش کرتے تھے کہ وہ مرثیوں کے علاوہ کچھ اور سنائیں سودا ان کو  
 جواب دیتے ہیں۔

جو مجھ سے کہتے ہیں کہ مرثیے سوا کچھ اور  
 وہ چاہتے ہیں زباں سے مری سنا کچھ اور  
 کبھو نہ میں تو کہوں اس کے ماورا کچھ اور  
 الم سے آل محمد کے ہے بھلا کچھ اور

لیکن کچھ ہی عرصے میں سودا نے اس فن پر کمال حاصل کر لیا اور اپنے تمام معاصر مرثیہ گو  
 شعر پر سبقت لے گئے۔ سودا سے قبل مرثیے غزل کے انداز پر مریع یا چومصرعے کہے  
 جاتے تھے۔ سودا نے مرثیے کی تکنیک میں گونا گوں تجربات کیے۔ ان کے ہاں مرثیے کی  
 حسب ذیل صورتیں ملتی ہیں۔

۱۔ منفردہ ۲۔ مستزاد منفردہ ۳۔ مثلث ۴۔ مثلث مستزاد ۵۔ مریع ۶۔ مریع مستزاد  
 ۷۔ مخمس ترکیب بند ۸۔ مخمس ترجیع بند ۹۔ مسدس ۱۰۔ مسدس ترکیب بند ۱۱۔ دھرہ  
 بند ۱۲۔ مرثیہ دوازده مصرع معہ دھرہ۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ مرثیہ کو پہلی بار جس نے مسدس کی شکل دی وہ سودا ہیں اور

بعد میں مرثیہ کی پہلی فارم سب سے زیادہ مقبول ہوئی۔ شبلی کا بیان ہے کہ ”اس وقت تک مرثیے عموماً چومصرعے ہوتے تھے۔ غالباً سب سے پہلے سودا نے مسدس لکھا“۔ ۱۔ سودا کے معاصرین میں سکندرؒ ایک مرثیہ گو شاعر تھے۔ چوں کہ وہ صرف مرثیہ کہتے تھے۔ اس لیے انھیں مرثیہ گوئی کے میدان میں بہت شہرت اور مقبولیت تھی۔ ان کے متعلق سید افضل حسین ثابت رضوی نے لکھا ہے۔

”سب سے پہلے جن بزرگوار نے مرثیہ مسدس کیا وہ سکندر پنجابی مرثیہ گو شاعر ہیں اور سب سے پہلا اس طرز کا یہ مشہور و مقبول مرثیہ ہے۔

ہے روایت شتر اسوار کسی کا تھار رسولؐ

یہ بھی لکھنؤ میں رہتے تھے۔ انھیں کی طرف سے مرزا سودا نے میر ضاحک مرحوم کی ہجو کہی تھی جس کا مفصل ذکر آب حیات میں ہے..... ایک مسدس مختصر سودا مرحوم کے کلیات میں بھی ہے۔ جس کا مطلع یہ ہے۔

۱۔ موازنہ انیس و دہرہ ص ۱۹۔ اثر لکھنؤی لکھتے ہیں۔ ”جہاں تک تحقیق ہو سکا ہے سودا ہی پہلا شاعر تھا جس نے صحت مسدس میں مرثیہ کہا۔ انیس کی مرثیہ نگاری ص ۶۔

۲۔ پورا نام خلیفہ محمد علی، سکندر ظفر (مجموعہ نغز، جلد ۱، ص ۲۹۹) اور عرف میاں گھسیا تھا (تذکرہ شعراے اردو، ص ۹۲، دو تذکرے، عشقی، ص ۳۳۸، شورش نے ان کا نام شیخ سکندر لکھا ہے (دو تذکرے، شورش، ص ۳۳۷) جو غلط ہے۔ سکندر پنجابی الاصل تھے۔ لیکن ان کی نشو و نما دہلی میں ہوئی تھی۔ (مجموعہ نغز) محمد شاہ کراتی کے شاگرد تھے (تذکرہ کمال، ورق ۶۲ ب، تذکرہ شعراے اردو، مجموعہ نغز) ادبی زندگی کے آغاز میں قصہ خوانی کرتے تھے۔ بعد میں مرثیہ گوئی کی طرف متوجہ ہوئے (تذکرہ ہندی ص ۱۱۶) شاہ کمال نے فیض آباد کے جن شاعروں کا ذکر کیا ہے ان میں سے سودا کے ساتھ سکندر کا بھی نام ہے (تذکرہ کمال دیاچہ) جس کا مطلب ہے کہ سکندر فیض آباد بھی گئے تھے۔ کمال مدعی ہیں کہ لکھنؤ میں ان کی سکندر سے ملاقاتیں ہوئی ہیں۔ اور لکھنؤ ہی سے سکندر حیدر آباد آئے (تذکرہ کمال) سکندر ہر وقت شراب پیے رہتے تھے (تذکرہ سرور، ص ۳۵۰۔ تذکرہ شعراے اردو، مجموعہ نغز) مصحفی نے تذکرہ ہندی (تالیف ۱۲۰۰-۱۲۱۰ھ) میں لکھا ہے کہ ان کی عمر پچاس سے تجاوز ہوگی (تذکرہ ہندی) حیدر آباد میں انتقال کیا۔ بعض لوگوں کا بیان ہے کہ حیدر آباد میں ان کی قبر زیارت گاہ عوام ہے اور بعض کہتے ہیں کہ ان شہر کے لوگوں نے ان کی لاش کر بلائے معلیٰ بیچ دی (مجموعہ نغز) سرور نے بھی یہی لکھا ہے کہ اس کی لاش کر بلائے معلیٰ بیچ دی گئی تھی (تذکرہ سرور) انھوں نے ایک قصہ طراح و مانی و بادشاہ دل خوار بھی لکھا تھا۔ اکثر پنجابی پوری، بنگالی اور مارواڑی میں مرثیے کہتے تھے (تذکرہ شعراے اردو)

۳۔ امیر احمد علوی نے دس ہندوں کا یہ مرثیہ یادگار انیس میں نقل کیا ہے۔ اس کا پہلا بند یہ ہے۔

ہے روایت شتر اسوار کسی کا تھار رسولؐ  
جس محلے میں کہ رہتے تھے حسین ابن جبول  
ایک جگہ شہر مدینہ میں ہوا اس کا نزول  
ایک لڑکی کھڑی دروازے پہ بیمار و طول

کس سے اے چرخ کہوں جا کے تری بیدادی

مگر وہ کتاب میں مقید ہے اور سکندر کا مرثیہ تمام ہندوستان میں پڑھا جاتا ہے۔ فقیر تک گلیوں میں پڑھتے پھرتے ہیں۔ لے سودا سکندر کے معاصر ضرور تھے مگر سکندر صرف بحیثیت مرثیہ گو مشہور تھے۔ ان وجوہ سے مرثیہ کو بطور مسدس کہنے کا سہرا میرے نزدیک سکندر کے سر ہے یا کم سے کم جب یہ بات مشتبہ ہے کہ دو معاصرین میں سے اول کس نے کہا تو سکندر اور سودا دونوں کو موجد ماننا چاہیے۔ لے

مطبوعہ کلیات سودا میں مرثیوں کی تفصیل یہ ہے۔ مرلے ۶۱، مرلے مستزاد ۱، منفردہ ۸، منفردہ مستزاد ۱، مسدس ۱، مسدس ترکیب بند ۲، مسدس ترجیع بند ۱، مثلث ۱، مثلث مستزاد ۱، مخمس ۱، مخمس ترجیع بند ۲، مخمس ترکیب بند ۲، مسدس دہرہ بند ۲، مسدس مع دہرہ پنجابی ۱، مسدس مع دہرہ پوری ۲، منفردہ بزبان دکھنی ۱، دوازدہ مصرع مع دہرہ ۱، کل مرچے ۹۱

ان میں تیرہ مرثیوں کے مقطع میں مہربان تخلص آیا ہے، جس سے خیال ہوتا ہے کہ یہ مہربان خاں رند کے مرچے ہیں اور غلطی سے اس میں شامل ہو گئے ہیں۔ لیکن گمان غالب یہ ہے کہ یہ مہربان کے مرچے نہیں۔ کسی اور نے ان کے نام سے لکھے تھے۔ مہربان خود شاعر نہیں تھے جسے عام طور پر مہربان کا دیوان سمجھا جاتا ہے، وہ کلکتہ میں موجود ہے مگر اس میں تمام غزلیں میر سوز کی ہیں۔ میں نے یہ نسخہ خود نہیں دیکھا۔ مجھے یہ اطلاع اپنے دوست صدیق الرحمن قدوائی صاحب سے حاصل ہوئی ہے۔ لے

قاضی عبدالودود مرآئی سودا پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔ ”دیوان ہفتم (کلیات سودا مطبوعہ مطبع مصطفائی) دیوان مرثیہ ہے، جس کا آغاز ایک فارسی دیباچے سے ہوتا

۱۔ خط لیے کہتی تھی پردے سے گی زار و زار ہوا آجھ کو خدا کی قسم اے ناتھ سوار (یادگار انیس، ص ۱۶) از کلکھنوی، بھی سکندر کے اس مرچے کی مقبولیت تسلیم کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

قدیم مرثیہ نگاروں میں ایک میاں سکندر تھے۔ ان کا ایک مرثیہ، ہے روایت شتر اسوار کسی کا تھار سول، پیکر سوز و گداز ہے اور کچھ برس ادھر تک اتنا مقبول تھا کہ فقیر اسے پڑھتے ہوئے پھیری لگاتے تھے۔ (انیس کی مرثیہ نگاری، ص ۶)

۲۔ حیات دیر، ص ۱۱۵۔

۳۔ دیوان رند کے نسخہ..... کا یہ حال ہے کہ غالب اس میں ایک شعر بھی ایسا نہیں جو سوز کے کسی نسخے میں نہ ہو۔ سویرا، ۲۹، ۱۹۶۱ء، ص ۵۵)

ہے۔ جو عجب نہیں کہ صالح الدین کا لکھا ہوا ہو۔ اس کے بعد سودا کی مثنوی ”سبیل ہدایت“ ہے جس میں سید محمد تقی اکبر آبادی (میر نہیں) کے ایک سلام پر اعتراضات ہیں۔ مثنوی کے بعد اسی شاعر کے ایک مرثیے کی تنقید مریعات کی شکل میں ہے۔ جس سے پیشتر سودا کی اردو نثر بطور تمہید ہے۔ خود سودا کے مرثیے اور سلام اس کے بعد آتے ہیں۔ کلیات سودا کے بہت کم مخطوطات میں مراٹھی اور سلام شامل ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا ایک الگ مجموعہ تھا، جس کا ایک نسخہ بقول دتاسی سراج الدولہ (حیدر آباد) کے کتب خانے میں تھا (تاریخ جلد ۶، ص ۷۰)۔۔۔۔۔ وہ مراٹھی جن میں ”مہربان“ یا ”مہربان خاں“ بطور قافیہ آیا ہے۔ یقیناً جس نے بھی لکھے ان (مہربان خاں رند) کی طرف سے لکھے۔ وہ بھی، جن میں نام بطور قافیہ نہیں، ممکن ہے کہ انھیں کے نام سے کہے گئے ہوں۔۔۔۔۔ شواہد اس پر دال ہیں کہ مہربان خاں خود شعر نہیں کہتے تھے، دوسروں کے اشعار اپنی طرف منسوب کر لیا کرتے تھے۔ یہ مراٹھی سودا کے ہیں یا کسی اور شاعر کے؟ اس کے متعلق کوئی فیصلہ کن بات اس وقت نہیں کہی جاسکتی۔“ ۱۔

سودا کو مرثیہ نگاری سے اظہارِ فن مقصود نہیں تھا۔ لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں تھا کہ فن کے تمام اصولوں کو نظر انداز کر دیا جائے۔ وہ مرثیہ گوئی کو آمدنی کا ذریعہ بھی نہیں بنانا چاہتے تھے۔ جیسا کہ انھوں نے خود ایک شعر میں کہا ہے۔

یہ روسیہ تو ایسا نہیں جسے ہودے  
تلاش مرثیہ گوئی سے دام و درہم کا

ان کا عقیدہ تھا کہ اگر کر بلا کے درد انگیز اور غم ناک واقعات کی یاد دلا کر وہ اپنے سامعین کو زلا سکیں تو یہ کارِ ثواب ہے۔ اس کا اجر قیامت کے دن انھیں ملے گا۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں۔

زیادہ اس سے نہ کر اب تو سودا طول کلام  
درد بھیج شہیدوں پہ کر خن کو تمام

جزا بہر دو جہاں اس کی تجھ کو دیں گے امام  
 سخن تو تیرا رولاتا ہے شکل ابرمطیر  
 ایک اور مرثیہ کا آخری بند ہے۔

سودا اب چشم مہاں کو ہے یہ نظم جلا  
 پاوے گا اس کا محمد سے تو محشر میں صلا  
 تجھ کو جنت میں ہر اک بیت پہ گھر دیں گے ولا  
 سننے سے جس کے یہ اشک آنکھوں سے آتا ہے چلا

سن کے اس مرثیے کو بزم میں جو رودے گا  
 آب چشم اس کا گناہوں کو ترے دھو دے گا

سودا کو شہدائے کربلا سے بڑی عقیدت اور محبت تھی۔ انھوں نے واقعات کربلا کے بیان میں غمناکی اور درد انگیزی پیدا کرنے کی پوری کوشش کی ہے مگر وہ ایک درد مند دل نہیں رکھتے تھے۔ ان کی شاعری کی بنیاد دلسوزی اور خشکی پر نہیں بلکہ ہنرمندی پر ہے۔ وہ الفاظ کے بادشاہ ہیں۔ اس لیے ہر طرح کے مضامین کے اظہار پر قدرت رکھتے ہیں۔ لیکن کلام میں اثر انگیزی کے لیے کچھ اور صلاحیتوں کی ضرورت ہے جن سے سودا محروم تھے۔ اگرچہ میر نے سودا کے مقابلے میں بہت کم مرثیے کہے ہیں (غالباً مراٹھی میر کی تعداد اکتالیس سے زیادہ نہیں) لیکن میر کے مرثیوں میں وہ نشتریت ضرور ہے جو عقیدت مندوں کو رونے پر مجبور کر دے۔ شیخ چاند سودا کے مرثیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ”اس میں شبہ نہیں کہ سودا کے مرثیوں میں مرثیت بڑی حد تک مفقود ہے۔ مرثیے کی بڑی غرض و غایت غم انگیز مضامین کو رقت خیز پیرائے میں بیان کر کے رلاتا ہے۔ سودا کے مراٹھی میں یہ جو ہر نہیں“۔ سید صفدر حسین میر اور سودا کے مرثیوں کا موازنہ ان الفاظ میں کرتے ہیں۔ ”سودا کے برخلاف میر کا مرثیہ سوز و گداز سے لبریز ہے۔ میر کی دل پر شگنی وہ میدان ہے

جہاں سودا گرد ہو جاتے ہیں۔ سودا کے مرثیوں پر مزید بحث کرنے سے قبل بہتر ہے کہ مرثیے کے اجزائے ترکیبی بیان کر دیے جائیں تاکہ ان کی روشنی میں مرثی سودا کا جائزہ لیا جاسکے۔  
مرثیے کے اجزائے ترکیبی حسب ذیل ہیں۔

۱- چہرہ۔ صبح کا منظر، رات کا سماں، دنیا کی بے ثباتی، باپ بیٹے کے تعلقات، سفر کی دشواریاں، اپنی شاعری کی تعریف، حمد، نعت، منقبت، مناجات وغیرہ تمہید کے طور پر۔

۲- سراپا۔ مرثیے کے ہیرو کے قد و قامت، خط و خال وغیرہ کا بیان۔

۳- رخصت۔ ہیرو کا امام حسین سے جنگ کی اجازت لینا اور میدان جنگ میں جانے کے لیے عزیزوں سے رخصت ہونا۔

۴- آمد۔ ہیرو کا گھوڑے پر سوار ہو کر شان و شوکت کے ساتھ رزم گاہ میں آنا، آمد کے سلسلے میں ہیرو کے گھوڑے کی تعریف بھی لکھی جاتی ہے۔

۵- رجز۔ ہیرو کی زبان سے اپنے نسب کی تعریف، اپنے اسلاف کے کارناموں کا بیان اور فن جنگ میں اپنی مہارت کا اظہار۔

۶- جنگ۔ ہیرو کا کسی نامی پہلوان سے یا دشمن کی فوج سے بڑی بہادری کے ساتھ لڑنا۔ جنگ کے ضمن میں ہیرو کے گھوڑے اور تلوار کی بھی تعریف کی جاتی ہے۔

۷- شہادت۔ ہیرو کا دشمنوں کے ہاتھ سے زخمی ہو کر شہید ہونا۔

۸- مین۔ ہیرو کی لاش پر اس کے عزیزوں، بالخصوص عزیز عورتوں کا رونا۔

یہاں یہ بتادینا ضروری ہے کہ اردو میں بہت کم ایسے مرثیے ہوں گے جو ان اجزائے ترکیبی کی جملہ شرائط پوری کرتے ہوں۔ عام طور پر مرثیوں میں یہ اجزا پائے جاتے ہیں لیکن بعض مرثیوں میں ان میں سے کچھ اجزا نہیں ہوتے اور بعض میں ترتیب مختلف

۱۔ نگار (جنوری، فروری ۱۹۵۷ء) ص ۱۰۵۔

۲۔ (الف) یہ تفصیل روح انیس (ص ۲۱۰، ۲۰) سے لی گئی۔

(ب) مزید مطالعے کے لیے ملاحظہ ہو۔ اردو مرثیہ، ص ۲۱-۷۶۔



ہوتی ہے۔ اردو میں اور خاص طور پر سودا کے ہاں ایسے مرثیوں کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ جن میں صرف حضرت امام حسین کی شہادت پر اظہار غم کیا گیا ہے۔

چہرہ: سودا سے قبل عام طور پر چہرے یا تمہید کا رواج نہیں تھا۔ مرثیہ گو براہ راست واقعات کو بلا بیان کرنا شروع کر دیتا۔ مگر سودا نے اکثر مرثیوں کی ابتدا تمہید سے کی ہے۔ مثلاً ایک مرثیے کے ابتدائی چار بند بطور تمہید کہے گئے ہیں۔ پہلا بند ملاحظہ ہو۔

نہیں ہلال فلک پر مہ محرم کا  
چڑھا ہے چرخ پہ تیغا مصیبت و غم کا  
دل اس طرح سے یہ گھائل کریگا عالم کا  
کہ واں نہ لگ سکے ٹانگا نہ پھاہا مرہم کا

ایک اور مرثیے کا صرف پہلا بند تمہید کا ہے۔

احوال روزگار مورخ لکھا کیا  
کوئی پڑھا کیا اسے کوئی سنا کیا  
تحریر جب سے واقعہ کر بلا کیا  
لمحہ کہیں ہیں پڑھ کے ملا عین نے کیا کیا

سودا نے ایک مرثیے کی جو تمہید باندھی ہے وہ ”چہرے“ کی جملہ شرائط پر پوری اترتی ہے۔ انھوں نے موسم گرما کا حال، حضرت امام حسین کے سفر کی دشواریاں چھ بندوں میں بیان کی ہیں۔ یہاں تین بند نقل کیے جاتے ہیں۔

کہا اساژھ نے یوں جیٹھ کے مہینے سے  
طیش یہ پوچھ نبی کے سرور سینے سے  
کیا ہے بادیہ پیا فلک نے کینے سے  
جسے نکال کے اس دھوپ میں مدینے سے

جو چار پایہ ہے جنگل میں ہپ ہپاتا ہے  
 پنکھیر دیا توں میں روکھونکے منہ چھپاتا ہے  
 گھر ان دنوں کوئی چیونٹی سے بھی چھڑاتا ہے  
 ہوا ہے کیا یہ عمل سرزد اس کینے سے  
 غرض میں کیا کہوں اس شکل سے شہ مظلوم  
 کرے تھا قطع منازل کٹانے کو حلقوم  
 وہ رو رو واں گیا آخر جہاں رہا محروم  
 تن اُس غریب کا چالیس دن دینے سے  
 یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ سودا کے ”چہرے“ ان کے تمام معاصرین سے بہتر ہیں۔  
 پتا نہیں شبلی نے کیسے لکھ دیا کہ ”چہروں“ کی جدت صمیر کی ہے۔ لہٰذا لاں کہ سودا سے قبل  
 مرثیہ گو شعرا کے ہاں ”چہرے“ کے محض ابتدائی نقوش ملتے ہیں اور سودا نے مکمل چہرے  
 لکھے ہیں۔  
 سراپا: سودا نے اس طرف بہت کم توجہ دی ہے۔ ایک مرثیے میں حضرت امام حسینؑ کے  
 متعلق لکھتے ہیں۔

بڑا کیا تھا محمدؐ نے جس کو گود میں پال  
 پھرے تھا ساقی کوثر کے دوش پر مدد سال  
 ایک اور مرثیے میں حضرت حسینؑ کی شہادت کے بعد ان کا تعارف ان الفاظ میں کراتے  
 ہیں۔

راکب دوش کا محمدؐ کے  
 آج نوک سناں پہ سر ہے سوار

دھوتے جن گیسوؤں کو پیغمبر  
 سو وہ آلودہ ہیں بگرد و غبار  
 آج فرزند ساقی کوثر  
 تشنہ دریا کے جا موے بکنار  
 آہ افسوس آج صید حرم  
 ہو گئے رن میں شامیوں کے شکار  
 جن کی خاطر بنا ہے ارض و سما  
 دو جہاں چشم میں ہے ان کی تار  
 خاک و خوں میں پڑا ہے میرا لال  
 کہیں ہیں فاطمہ پکار پکار  
 بدن نازنیں پہ اس کے آج  
 لگے تیغ ستم کے وار پہ وار  
 ہوئے وہ گیسو برچی کے جھبٹا  
 جن کو دھوتی تھی میں سنوار سنوار

رخصت: بعض مرثیوں میں سودا نے درد انگیز اور غمناک الفاظ میں رخصت کا منظر پیش کیا ہے۔ دشمنوں نے چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے۔ شدید گرمی کا موسم ہے۔ حرم کے تمام افراد کا پیاس سے بُرا حال ہے۔ تمام کوششوں کے باوجود جب پانی فراہم نہیں ہو سکتا تو حضرت عباس حضرت امام حسین سے رخصت طلب کرتے ہیں تاکہ پیاسے مرتے ہوئے بچوں اور عورتوں کے لیے پانی لاسکیں۔ اس واقعہ کو سودا کے الفاظ میں ملاحظہ کیجیے۔

طلب کی رخصت آ بھائی سے کرمیداں کی تیاری  
 کیا عرض اب جسے چاہو اسے سوچو عملداری

یہی آئی ہے دل میں لہرن عورات کی زاری  
دیا سر یا تو میں دریا پہ جایا مشک بھر لایا

سنا عباس سے جب اس کو شاہ دین و دنیا نے  
کروروں در کروروں اشک آنکھوں سے لگے آنے  
کہا جانِ برادر اپنے جیتے جی نہ دوں جانے  
کہے گی غلق سر بھائی کا آگے دے کے کٹوایا

غرض رخصت پہ یک دیگر میں یہ الحاح و زاری تھی  
کبھو جوں ابر باہم منہ پہ منہ رکھ اشکباری تھی  
کبھو مانند برق آپس میں ان کو بے قراری تھی  
مرخص اس طرح سالار دین نے اس کو فرمایا

آمد: سودا کے ہاں آمد کے مضامین بہت کم ہیں۔ حضرت عباس گھوڑے پر سوار ہو کر دریا  
کا رخ کرتے ہیں۔ انھیں دیکھتے ہی دشمن کی فوج صف آرا ہو جاتی ہے۔ سودا لکھتے ہیں۔

چلا عباس جب قریبوں زیں پر مشک کو دھر کر  
تولائے رو بہ میداں کافر اس کے قصد پر اکثر  
رکھا جن نے قدم تک آگے اپنا چھوڑ کر لشکر  
جہنم کو اسے دو ہیں اجل کے ہاتھ بھجوا یا  
جگہ سے اپنی کوئی خوف کے مارے نہ ہلاتا تھا  
چلے تھانیزہ اس جا سے جہاں سے تیر چلتا تھا

اگرچہ یہ بند آمد کی کوئی اچھی مثال نہیں ہے۔ لیکن مراٹھی سودا میں اس سے بہتر اور کوئی مثال بھی نہیں۔

رجز: رجز کے مضامین سودا کے ہاں بالکل نہیں ہیں۔

جنگ: سودا کو رزمیہ لکھنے پر پوری قدرت حاصل تھی۔ جس کا ثبوت وہ قصیدہ ہے جو انھوں نے نواب شجاع الدولہ بہادر کی شان میں کہا تھا۔ اس قصیدے میں سودا نے جنگ کا مکمل نقشہ کھینچ کر رکھ دیا ہے۔ لیکن مرثیوں میں انھوں نے اس طرف بہت کم توجہ دی ہے اسی لیے شبلی نے مرثیوں میں رزمیہ کا سہرا بھی حمیر کے سر باندھا ہے۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ رزمیہ کے ابتدائی نقوش سودا کے ہاں مل جاتے ہیں۔ حضرت عباس فرات سے مشک بھر چکے ہیں اور اب اہل بیت کے خیمے کی طرف آنا چاہتے ہیں کہ دشمنوں نے انھیں گھیر لیا۔ اس موقع پر حضرت عباس اور دشمنوں کی جنگ کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

نہ مانا جب تو پیٹھا فوج میں وہ اشجع عالم  
لگی تب صف بہ صف لشکر کی ہونے درہم و برہم  
جدھر کورخ کیا کشتوں کے پستے واں ہوئے اس دم

ادھر خوں کے بے نالے جدھر اس کا پڑا سایا

کہوں کیا جس طرح چھایا تھا ابر آہن کا اس جا پر  
سناں پر تنگ بر سے تھی پڑی اور تنگ پر تنجر  
نہ جانے آہ واویلا کہ اس میں کن نے واں آکر

حوالے تنگ کی اس کے کہ دست چپ لنگ آیا

بعد کے مرثیہ نگاروں نے اہل بیت کے گھوڑوں، تلواروں، نیزوں وغیرہ کی تعریف میں جو زور بیان صرف کیا ہے۔ اس کی مثال کسی اور صنف سخن میں نہیں ملتی۔ اردو قصیدوں

میں اس قسم کے مضامین کثرت سے ملتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں وہ اس جوش بیان، فنی مہارت اور جزئیات نگاری سے محروم ہیں۔ سودا کے قصیدوں میں بھی اس قسم کے بیشتر مضامین ملتے ہیں۔ انھوں نے اپنے مدوحین کے آلات حرب، گھوڑے اور ہاتھی وغیرہ کی تعریف کی ہے۔ مثلاً سیف الدولہ احمد علی خاں بہادر کے قصیدے میں سودا کہتے ہیں۔

سید میں کیا بیاں کروں تیری کہاں کا زور  
سینہ عدو کا توڑ کے نکلے ہے جب خدنگ  
بیٹھے زمین پر تو اسے پھر نہ پائیے  
گر سو کروڑ کوس تلک کھودیے سرنگ  
خلقت کا برو بخر کی ہیبت سے ہو یہ حال  
شمشیر گر علم کرے اپنی تو روز جنگ  
رہنے نہ دے صفائے برش اس کی تیغ کی  
باقی کسوئی طرح سے ضارب کے دل میں زنگ  
گر پشت آسماں پہ وہ آئے تو بھر حکم  
ہو خرق و التیام فلک دیکھ کر کے دنگ

روہیلہ سردار حافظ رحمت خاں اور نواب شجاع الدولہ میں جنگ ہوئی، جس میں حافظ رحمت خاں مارے گئے۔ سودا نے ایک قصیدے میں اس جنگ کے حالات اس طرح بیان کیے ہیں کہ یہ قصیدہ اردو کا بہترین رزمیہ ہو گیا ہے۔ شکست خوردہ فوج کا ایک سپاہی جنگ کے حالات سن رہا ہے۔

تھی سامنے ہمارے جو فوج ہراولی  
 ہوں گے وہ دس ہزار تلک پیادہ و سوار  
 سنتے ہیں اب ہر ایک سے اس فوج کی یہی  
 سرکردہ تھے سمیت فرنگی کے پانچ چار  
 ایدھر سے بان و رہکلا و توپ متصل  
 پڑتی تھی پر وہ بڑھتے ہی آتے تھے سرگزار  
 بڑھ بڑھ کے آخرش وہ لگے توپیں داغنے  
 اس پلے پر جہاں سے جزائر کے ہووے مار  
 تھیں کرتیاں تلگوں کی مانند لالہ زار  
 تھا دود توپ ابر سیاہ گھرگ بار  
 توپیں جو داغنے تھے فٹیلوں سے آن آن  
 رنجک مثال برق چمکتی تھی بار بار  
 گنجال مثل رعد کے کڑکے تھی دمدم  
 آواز شترنال تھی طاؤس کی جھنگار  
 بارود و گولہ توپ میں تھا یا وہ باد تھی  
 جن نے کہ قوم عاد اُڑائی تھی جوں غبار  
 ہر ایک جا یہی نظر آیا ہر ایک کو  
 گھوڑا ادھر جو تڑپے ہے ادھر پڑا سوار

لیکن مرعے میں اس قسم کے مضامین نہیں ہیں۔ یہ ضمیر اور ان کے بعد کے مرثیہ گو شعرا کی جڑت ہے۔

شہادت :- سودا نے جہاں کہیں بھی شہادت کے مضامین باندھے ہیں، بہت اختصار سے کام لیا ہے۔ کبھی ایک بند اور کبھی صرف ایک شعر ہی پر اکتفا کیا ہے۔ البتہ چند مرثیوں میں واقعہ شہادت تفصیل سے بیان کیا ہے۔ حضرت امام حسین کی شہادت کا ذکر ملاحظہ ہو۔

|                                         |                   |
|-----------------------------------------|-------------------|
| یہ کہہ کے شہر دیں نے کیا گھوڑے کو رخصت  | خیسے کی طرف کو    |
| من بعد نصیب اس کے ہوا جام شہادت         | از دستِ جفا جو    |
| داں سے جو گیا اسپ سونے پر دہ عصمت       | مل چہرے میں لہو   |
| پھر کیا کہوں تھا حق ہی اس احوال سے محرم | گزارا جو انھوں پر |

|                                    |                    |
|------------------------------------|--------------------|
| آیا جو نظر خانہ زیں شاہ سے خالی    | میں کیا کہوں اس آں |
| وحشت ہوئی اک وحشتِ محشر سے زالی    | از نالہ و انفاں    |
| خاک اتنی سرو شکل پہ ہر ایک نے ڈالی | کر بال پریشاں      |
| پچانے تھا کوئی نہ کسی کے تئیں باہم | از عترتِ اطہر      |

حضرت عباس کی شہادت کا نقشہ ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

جو تھامی مشک دانتوں سے تو کی بو چھار تیروں کی  
لگی چاروں طرف سے ہونے مارا مار تیروں کی  
ستم کیشوں نے کی پیکان اپنی پار تیروں کی  
کہ اس کو مشک سے اک پل میں کر غربال دکھلایا



سبب زخموں کے حالت اس پہ جب طاری ہوئی غش کی  
 ندا کرتے ہوئے کی یا ابا اور کئی اور کئی (؟)  
 صدا جو ہیں یہ شاہِ کربلا کے کان میں پہونچی  
 بسانِ ابر گریاں آپ کو اُس پاس پہونچایا

پر اس احوال کو راوی نے یوں اخبار میں لکھا  
 کہ جب تک پہونچے ہی پہونچے سرورِ سینہ زہرا  
 بہ طعن نیزہ تن کا گوشت اس کے لے گئے اعدا  
 نشانِ جز استخوان اس کا نہ شاہِ دیں نے کچھ پایا  
 کہیں کہیں سودا نے تحفیل کی مدد سے ”شہادت“ کو اور بھی درد انگیز بنانے کی کوشش کی  
 ہے۔ مثلاً ایک مرثیے میں حضرت امام حسین کی شہادت کے وقت ان کے اور شمر کے خنجر  
 کے مکالے دکھائے ہیں۔

قضا کی تیغ کا جب سب کو کھا چکا جوہر  
 رہا نہ اُس شہِ مظلوم کا کوئی یادور  
 زباں نکال کے بولا یہ شمر کا خنجر  
 کہ میں ہی اب تو ہوں اک آشنا ترے دم کا  
 کہے جو تو تجھے جد کے کئے میں لے جاؤں  
 جو مرضی ہووے تو والد کے پاس بٹھلاؤں  
 تراخی جو ہے کہہ اس کے ساتھ ملواؤں  
 ملاپ چاہے جو تو اس شہِ مکرم کا

خنن یہ سن کے لگا کہنے وہ شبہ آفاق  
انہوں کا دل کو مرے اس قدر نہیں ہے فراق  
رضائے حق کی ملاقات کا ہوں میں مشتاق

جو ہووے ایسے میں تو ہو ملاپ باہم کا

بین :- یہ سودا کا اصل میدان ہے۔ ان کے اکثر مرثیے صرف ”بین“ ہیں جن کا مقصد لوگوں کو واقعات کر بلا یاد دلا کر رلانا ہے۔ سودا نے تشبیہات و استعارات کا سہارا لے کر ان واقعات کو شدید درد انگیز بنانے کی کوشش کی ہے۔ عام طور پر اہل حرم کے مصائب سودا کے موضوع خنن ہوتے ہیں۔ حضرت امام حسین، حضرت عباس وغیرہ کی شہادت پر بھی اظہار غم و افسوس کیا گیا ہے لیکن نسبتاً کم۔ حضرت امام کی شہادت پر ”بین“ ملاحظہ ہو۔

کریں نہ اہل جہاں کس طرح سے شیون و شین  
سروں کو اپنے نہ پیٹے سو کیوں وہ کر کے بین  
ہوا ہے آج کے دن قتل کر بلا میں حسینؑ

یہ تعزیه ہے رموزِ خدا کے محرم کا  
بڑا کیا تھا محمدؐ نے جس کو گود میں پال  
پھرے تھا ساقی کوثر کے دوش پہ مہ و سال  
گیا جہاں سے پیاسا وہ فاطمہ کا لال

عطش ہے تن سے ہوئی روح کی سبب رم کا

ایک مرثیے میں سودا حضرت عابدؒ کی زبانی ان اندوہ ناک واقعات پر بین کرتے ہیں۔

عابدیں کہتے ہیں اے پروردگار  
ایک بھائی کو بھی رکھتا روزگار  
یکدگر اس وقت ہوتے نغمسار  
روتے آپس میں گلے لگ زار زار

لے برادر تا پدر عم ابن عم  
غرق لو ہو میں پڑے ہیں یک قلم  
بہ گئی دریائے خوں میں ہے ستم  
کشتی آل نبی آما نہج دھار

جا چچا نے برب آب فرات  
آب کی خاطر کیا قطع حیات  
باپ کے تھے نے کائے پاؤں ہات  
پانی کی تو بھی نہ پہونچی منہ میں دھار

باپ کو میرے محمد یک زماں  
دیکھتے تنہا نہ زیرِ آسماں  
ذبح کر ڈالا یہ بیکس کر کے واں

جس جگہ کوئی نہ یاور ہے نہ یار

بین دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک تو اہل بیت میں سے کسی فرد کی شہادت پر اس کے اعتراف بین کرتے ہیں اور دوسرے تمام مخلوق۔ یعنی حیوانات، جمادات اور نباتات اس ظلم و ستم پر اظہارِ غم کرتے ہیں۔ سودا کے ہاں بین کی دونوں قسمیں ملتی ہیں۔ اگرچہ دوسری قسم کی

مثالیں بہت کم ہیں۔ ایک مرچے کے ابتدائی تین بند یہ ہیں۔

میں تم سے کیا کہوں یارو یہ کیا سحر ہے آج  
کہ زیرِ چرخ جسے دیکھو چشمِ تر ہے آج  
ہر ایک سست جہاں میں یہی خبر ہے آج  
سیومِ نبی کے جگر کا نگر نگر ہے آج

جو پھول باغ میں ہیں آج سو ہیں اس کے پھول  
ہے زگس آج پیالے کا ارگچی کے اصول  
صلوٰۃ بھیجے ہے بوٹی بھی اس پہ ہو کے ملول  
چمن میں جو کوئی بلبل ہے نوحہ گر ہے آج

روئے ہے سنگ سے سرامِ آبشار چمن  
جگر کے خون سے لبریز ہے کلی کا دہن  
سوائے نالہ نہیں باغباں کے لب پہ سخن  
شمر نہالِ محمد کا خاک پر ہے آج

دعا: عام طور پر مرچے کے آخر میں مرثیہ نگار خدا سے کچھ دعا مانگتا ہے۔ بعد کے مرثیہ نگاروں کے اکثر مرچے دعا پر ختم ہوتے ہیں۔ سودا ایک مرچے کا اختتام اس طرح کرتے ہیں۔

اس ارادے پہ تو کر ختم اے سودا یہ کلام  
کہ تجھے حشر میں بخشائے وہ مظلوم امام  
شام سے صبح تک، صبح سے لے کر تا شام

سن کے عالم میں اسے عالمیاں روتے ہیں

ان کے علاوہ بھی اور بہت سے موضوعات ہیں جو مرثیوں میں پائے جاتے ہیں۔ ان میں اہل حرم کے مصائب، حضرت عابد کی بیماری اور حضرت قاسم کی شادی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان موضوعات پر جو کچھ مرثیہ گو شعرا نے کہا ہے۔ ان میں سے بیشتر کی تصدیق تاریخ سے نہیں ہوتی اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ شاعر کے ذہن اور تخیل کی پیداوار ہیں۔ شاعر نے ایک معمولی سی بات پر واقعات کی پوری عمارت تعمیر کر لی ہے۔ چوں کہ اردو شاعر عرب کی پہلی صدی ہجری کی تہذیب و تمدن سے نا آشنا تھے، اس لیے مرثیہ کے تمام افراد اپنے لباس، طور طریق اور عادات و اطوار کے اعتبار سے ہندوستانی ہیں۔ ان کے اسلحہ جنگ بھی اکثر وہی ہیں جو اٹھارویں صدی کے ہندوستان میں تھے۔ سودا بھی اس عیب کا شکار ہیں۔ انھوں نے حضرت قاسم کی شادی پر بہت سے مرثیے کہے ہیں۔ ان مرثیوں میں شادی کی جتنی رسوم بیان کی گئی ہیں۔ وہ سو فی صدی ہندوستانی ہیں مثلاً مشاطہ کا رقعہ نسبت لانا، دلہن کے مہندی لگانا، منگنی کا نشان آنا، سا جتن چوٹی، شادی پر شہنائی کا بجا، آتش بازی، آرسی مصحف، پان کھانا وغیرہ۔

سودا نے بعض مرثیوں میں جذبات سے کام لیا ہے۔ مثلاً ان کا ایک مرثیہ ”محرم کی چاندرات“ پر ہے۔ پندرہ اشعار کے اس مرثیے میں وہ تاثرات بیان کیے گئے ہیں جو محرم کی چاندرات کو ہی پیدا ہوتے ہیں۔ ایک مرثیے میں مسلمان اور نصاریٰ کے مکالمے ہیں، جن میں نصاریٰ کو بلا کے واقعات یاد دلا کر مسلمانوں کو شرم دلاتا ہے اور شکر ادا کرتا ہے کہ وہ مسلمان نہیں ہے۔ ایک مرثیہ میں حضرت امام حسینؑ کی لاش اپنے اعزہ کو وصیت کرتی ہے اور کر بلا کے واقعات پر تبصرہ کرتی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ سودا کا کوئی مرثیہ ایسا نہیں ہے جس میں مرثیے کے مذکورہ بالا تمام اہم اجزاء یک جا ہوں۔ لیکن یہ عیب سودا کا نہیں تمام مرثیہ گو شعرا کا ہے۔ انیس و دہر کے ہاں بھی مرثیے کے یہ سارے اجزاء نہیں ملتے۔ ان کے صرف چند مرثیے ہی ہر اعتبار سے مکمل کہے جاسکتے ہیں۔ مرثیہ نگاری کی تاریخ میں سودا کی اہمیت یہ ہے کہ انھوں نے سراپا، تمہید، رزمیہ وغیرہ کی۔ ابتدا کی مرثیہ کو مسدس کی شکل میں مقبول بنایا۔ سودا سے قبل یہ فن ایسے شاعروں تک محدود تھا کہ ذی علم طبقہ اس کی طرف توجہ نہیں دیتا تھا۔ سودا اور میر تقی

میر ہی نے اس فن کو آبرو بخشی اور یہ ثابت کیا کہ ہر مرثیہ گو کے لیے ضروری نہیں ہے کہ وہ بڑا شاعر بھی ہو۔

### شہر آشوب

ہیئت کے اعتبار سے شہر آشوب کی تعریف کرنا بہت مشکل ہے۔ کسی عہد میں کوئی پابندی نہیں رہی۔ رباعی، مخمس، مثنوی اور مسدس وغیرہ سب ہی میں شہر آشوب ملتے ہیں۔ شمالی ہند کے ابتدائی شاعروں نے جو شہر آشوب کہے ہیں۔ ان میں مختلف طبقات کی اقتصادی بد حالی کا بیان ہے۔ کسی سیاسی حادثے کا ذکر کیا گیا ہے یا ماضی کی خوش حالی، عیش و عشرت، مالی آسودگی اور ذہنی سکون کا ماتم ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ شہر آشوب کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ”در اصل کسی نظم کا شہر آشوب کی صف میں شامل ہونا اس بات پر موقوف ہے کہ اس میں چند بنیادی اوصاف اور شرائط موجود ہوں۔ اولین شرط اس نظم کی یہ ہے کہ اس میں کسی شہر (یا ملک) کے مختلف طبقوں کا تذکرہ ہو۔ علی الخصوص کاری گروں اور پیشہ وروں کا ذکر، دوسری صفت اس نظم کی یہ ہے کہ اس میں اقتصادی اختلال یا کسی حادثے کی وجہ سے سیاسی اور مجبسی پریشانی کا ذکر ہو، ابتدائی زمانے کے شہر آشوبوں پر پہلی صفت غالب تھی۔ مگر بعد میں دوسری صفت بھی شہر آشوب کے ساتھ لازم ہی ہو گئی۔ ۱۔

فارسی میں ابتدائی شہر آشوب رباعیوں اور قطعوں کی صورت میں لکھے گئے جن میں مختلف طبقوں اور پیشوں کے لڑکوں کے حسن و جمال کی تعریف کی جاتی تھی۔ مسعود سعد سلمان کے کلیات میں ایسے بانوے قطعے موجود ہیں۔ مسعود حسن رضوی ادیب کا خیال ہے کہ سلمان کو شہر آشوب کے موجب ہونے کا شرف حاصل ہے۔ مسعود صاحب نے ”نقوش“ لاہور (شمارہ ۱۰۲) میں شہر آشوب کے ارتقا پر تفصیلی بحث کی ہے۔

اورنگ زیب کی وفات کے بعد مغل حکومت میں جو زوال آیا تھا جس نے عوام کی زندگی کو

اجیرن کر دیا تھا اور جس پر تفصیلی بحث پہلے باب میں کی گئی ہے۔ سودا کے شہر آشوب اس زوال کی مکمل تصویر ہیں۔ ایک شہر آشوب میں سودا نے مختلف پیشہوروں اور امرا و رؤسا کی اقتصادی بد حالی کی عکاسی کی ہے۔ بقول سودا کوئی پیشہ ایسا نہیں ہے جس میں آمدنی کی صورت ہو۔

سپاہ گری معزز ترین پیشوں میں سے ایک ہے۔ مگر اس عہد میں اس پیشے کا بہت برا حال تھا۔ اگر سپاہی گھوڑا لے کر کسی کا ملازم بھی ہو جائے تو گھوڑے کے کھانے کے لیے کہاں سے لائے۔ گھوڑے کو ہر حال میں خوراک چاہیے۔ سپاہی اپنے ہتھیار گردی رکھ کر علف و دانہ حاصل کرتا ہے۔ تنخواہ کبھی نہیں ملتی۔ اس لیے وہ ہتھیار واپس نہیں آتے۔

گھوڑا لے اگر نوکری کرتے ہیں کس کی

تنخواہ کا پھر عالم بالا پہ نشان ہے

گذرے ہے سدا یوں علف و دانہ کی خاطر

شمشیر جو گھر میں تو سپر پیسے کے یاں ہے

امرا اور رؤسا کی خود مالی حالت خراب ہے۔ وہ تنخواہ دیں تو کیسے؟ لیکن جن ملازموں کے جسم میں جان ہے، وہ دھونس دیتے ہیں اور مختلف حربے استعمال کرتے ہیں اور تنخواہ وصول کر لیتے ہیں۔ لیکن بے چارے کمزوروں کی کوئی نہیں سنتا۔ اگر انسان کسی کی مصاحبت کر لے تو اور مصیبت ہے۔ وہ امیرا گزرات بھر جائے تو مصاحب کو بھی جاگنا پڑتا ہے۔ نیند کے مارے برا حال ہے مگر اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکتے۔ طبابت کے پیشے میں بھی کچھ اور پریشانیاں ہیں۔ نواب جو چاہتا ہے کھا لیتا ہے۔ پیٹ میں تکلیف ہونے پر طبیب مور و الزام ہوتا ہے۔ اگر نواب کو چھینک آجائے تو اس کی ذمہ داری بھی طبیب ہی پر عائد ہوتی ہے۔ گویا ان امرا کے طبیب علاج کرنے والے نہیں بلکہ موت سے لڑنے والے سپاہی ہیں۔ انسان اگر سودا گری کرنا چاہے تو یہ بھی ممکن نہیں۔ کیوں کہ:

سوداگری کیجیے تو ہے اس میں یہ مشقت  
 دکھن میں بکے وہ جو خرید صفہاں ہے  
 ہر صبح یہ خطرہ ہے کہ طے کیجیے منزل  
 ہر شام بہ دل وسوسہ سودوزیاں ہے  
 لے جا جو کسی عہدہ کی سرکار میں دے جنس  
 یہ درد جو سینے تو عجب طرفہ بیاں ہے  
 قیمت جو چکاتے ہیں سو اس طرح کہ ثالث  
 سمجھے ہے فروشنده پہ دزدیکا گماں ہے

غرض بڑی مشکل سے بھاؤ تاؤ ہوتا ہے۔ امیر ایک پروانہ عامل کے نام لکھ کر دے دیتا ہے۔ مگر ان کے خزانے میں پیسے ہی کہاں؟ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چیز واپس ملتی ہے اور نہ پیسہ۔ اگر کھیتی باڑی شروع کی جائے تو ہر وقت بارش نہ ہونے کی فکر اور قرتی کا خوف کھائے جاتا ہے۔ مختلف پیشوں کی تباہی کے ذکر کے بعد سودا شاعروں کا حال بیان کرتے ہیں۔

شاعر جو سنے جاتے ہیں مستغنی الاحوال  
 دیکھے جو کوئی فکر و تردد کو تو یاں ہے  
 مشتاق ملاقات انھوں کا کس و ناکس  
 ملنا انھیں ان سے جو فلاں ابن فلاں ہے  
 گر عید کا مسجد میں پڑھے جا کے دوگانہ  
 نیت قطعہ تہنیت خانِ زماں ہے



تاریخ تولد کی رہے آٹھ پہر فکر  
گر رحم میں بیگم کے سنے نطفہ خاں ہے  
اسقاط حمل ہو تو کہیں مرثیہ ایسا  
پھر کوئی نہ پوچھے میاں مسکین کہاں ہے

شہر آشوب کے آخر میں سودا کہتے ہیں کہ انسان اگر بالفرض ہفت ہزاری بھی ہو جائے تو  
وہنی آسودگی اور سکون ممکن نہیں بلکہ دنیا ہی کیا عقیقی میں بھی آسودگی نہیں مل سکتی۔

بالفرض اگر آپ ہوئے ہفت ہزاری  
یہ شکل بھی مت سمجھو تو راحت جاں ہے  
نک دیکھنا منصور علی خاں جی کا احوال  
چھاتی پہ کڑکے بجلی ہے اور شیر دہاں ہے  
آرام سے کٹنے کا سنا تو نے کچھ احوال  
جمعیت خاطر کوئی صورت ہو کہاں ہے  
دنیا میں تو آسودگی رکھتی ہے فقط نام  
عقبی میں یہ کہتا ہے کوئی اس کا نشان ہے  
سو اس پہ یقین کسی کے دل کو نہیں ہے  
یہ بات بھی گویندہ ہی کا محض گماں ہے  
یاں فکر معیشت ہے تو واں دغدغہ حشر  
آسودگی حرفیست نہ یاں، نہ وہاں ہے

دوسرے شہر آشوب میں سودا نے مغل حکومت، اس کے بادشاہ، شہزادے، امرا و روسا کی

زبوں حالی کا مرثیہ کہا ہے۔ ان کے سیاسی اقتدار کے کھوجانے، جھوٹی عزت و وقار اور اقتصادی بدحالی کا ماتم کیا ہے۔ سودا زندگی بھر جاگیردار طبقہ سے متوسل رہے۔ اس لیے ان کی ہمدردیاں سماج کے اس طبقے کے ساتھ ہیں۔ انھیں اس طبقے کی بربادی کا بہت صدمہ ہے۔ انھوں نے اس طبقے کے مختلف افراد اور اشیا کا مسئلہ اڑایا ہے اور اپنے طنز کے تیز نشتر ایک ایک ناسور پر چلائے ہیں۔ سودا خود کو اس طبقے کا ایک فرد سمجھتے ہیں۔ اس لیے یہ ناسور خود ان کی زندگی کے ناسور ہیں۔

فحش کے پہلے بند میں سودا بے روزگاری کی شکایت کرتے ہیں۔ اگر انسان گھوڑا خرید بھی لے تو ملازمت کس کی کرے۔ نوکری ڈھیروں یا تول تو بکتی نہیں جو بازار جا کر خرید لی جائے۔ پہلے امیر، دولت، مند نوکر رکھتے تھے اب جاگیر سے ان کی آمد بند ہو چکی ہے۔ مدتوں سے ملک میں سرکشوں کی سرگرمیاں جاری ہیں۔ پہلے جو ایک فحش بائیس صوبوں کا خاوند تھا۔ اب وہ کول (علی گڑھ) کا فوجدار بھی نہیں رہا۔ کئی بندوں میں سودا نے جاگیردار کی بدحالی کا نقشہ کھینچا ہے اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ وہ طبقہ جو صاحبِ حل و عقد تھا، جس کے دم سے ملک کی سیاست چلتی تھی۔ سیاست سے بیزار ہو گیا اور بقول سودا:

جو کوئی ملنے کو ان کے انھوں کے گھر آیا

ملے یہ اس سے گر اپنا دماغ خوش پایا

جو ذکر سلطنت اس میں وہ درمیاں لایا

انھوں نے پھیر کے اودھر سے منہ یہ فرمایا

خدا کے واسطے بھائی کچھ اور باتیں بول

مغل زوال کا اثر فوج پر براہ راست پڑا تھا۔ وہ سپاہی جن کی جاں بازیوں کے کارنامے سنہری لفظوں سے لکھنے کے قابل ہوتے تھے۔ اب تلواریں اٹھانے کے قابل نہیں رہے تھے۔ سودا نے سپاہیوں کی بزدلی کو ذرا مبالغے کے ساتھ پیش کیا ہے۔

بڑے جو کام انھیں تب نکل کے کھائی سے

رہیں وہ فوج جو موتے بھری لڑائی سے

پیادے ہیں سو ڈریں سر منڈاتے ٹائی سے  
سوار گر پڑیں سوتے میں چار پائی سے  
کرے جو خواب میں گھوڑا کسی کے نیچے اول  
مغل خزانہ خالی پڑا تھا۔ تمام صوبے خود مختار ہو چکے تھے۔ خالصہ بہت مختصر تھا اور جو تھا اس  
سے بالکل آمدنی نہیں تھی۔

نہ صرف خاص میں آمد نہ خالصہ جاری  
سپاہی تا مصدی سمجھوں کو بیکاری  
اب آگے دفتر تن کی میں کیا کہوں خواری  
سوال و خطی کو پھاڑ کر کے پنساری  
کسی کو آنولہ دے باندھ کر کسی کو کٹول

شہزادے قلعہ معلیٰ میں قاقوں مر رہے تھے۔ لیکن کوئی ان کی چیخ پکار سننے والا نہیں تھا۔ قلعہ  
کا خزانہ خالی تھا۔ قیمتی اشیاء اور شاہ اور ابدالی کے حملوں کی نذر ہو چکی تھیں اور مغل شہنشاہ  
کے پاس اتنا پیسہ بھی نہیں تھا کہ شہزادوں کو صرف ایک وقت ہی کھانا کھلا سکا۔

چا رکھی ہے سلاطینوں نے یہ توبہ دھاڑ  
کوئی تو گھر سے نکل آئے ہیں گریباں پھاڑ  
کوئی در اپنے پہ آدے دے مارتا ہے کواڑ  
کوئی کہے جو ہم ایسے ہیں چھائے ہمگی پھاڑ  
تو چاہیے کہ ہمیں سب کو زبردستی گھول

شہر دہلی جو کبھی عالم میں انتخاب تھا، اجڑا پڑا تھا۔ جہاں کبھی عیش و عشرت کی محفلیں جیتی  
تھیں، اب وہاں گیدڑ کی صدائیں بلند ہوتی ہیں۔ جس شہر کی حسین اور خوب صورت  
عمارتوں پر جنت کو بھی رشک آتا تھا۔ جہاں ایک ایک گھر چمن اور سبزہ زار تھا۔ آج وہاں  
کمر کمر گھاس ہے۔ عمارتیں شکستہ پڑی ہیں۔ کہیں کہیں مکان کا ستون نظر آتا ہے اور کہیں  
مرغول۔ جس شہر کے چراغاں کو دیکھ کر آسمان کے مہ و انجم حسد سے جلے مرتے تھے۔ آج  
وہاں کی تاریکی میں ہاتھ کو ہاتھ نہیں بھائی دیتا :

سخن جو شہر کی دیرانی سے کروں آغاز  
 تو اس کو سن کے کریں ہوش چغہ کے پرواز  
 نہیں وہ گھر نہ ہو جس میں شغال کی آواز  
 کوئی جو شام کو مسجد میں جائے بہر نماز  
 تو واں چراغ نہیں ہے بجز چراغ غول  
 خراب ہیں وہ عمارات کیا کہوں تجھ پاس  
 کہ جس کے دیکھے سے جاتی رہی تھی بھوک اور پیاس  
 اور اب جو دیکھو تو دل ہووے زندگی سے اداس  
 بجائے گل چمنوں میں کمر کر ہے گھاس  
 کہیں ستون پڑا ہے کہیں پڑے مرغول  
 یہ باغ کھاگئی کس کی نظر نہیں معلوم  
 نہ جانے کن نے رکھایاں قدم وہ کون تھا شوم  
 جہاں تھے سرو صوبہ وہاں اوگے ہے زقوم  
 بچے ہے زاغ و زغن سے اب اس چمن میں دھوم  
 گلوں کے ساتھ جہاں بلبلیں کریں تھیں کلول  
 یہ حالات تھے جن سے تنگ آکر ارباب فن اور اہل شہر نے ترک وطن کیا۔  
 غرض مال ہے اس گفتگو سے یہ میرا  
 کہ بے زری نے جب ایسا گھر آن کر گھیرا

تو کوئی قصد کرے نوکری کا بہتیرا

نہیں یہ فائدہ کچھ تادہ چھوڑ کر ڈیرا

کرے نہ عزم سوئے اصفہان و استنبول

گھوڑا دراصل فوجی طاقت کا نشان ہے۔ کیوں کہ اس عہد میں فوج کی شکست و فتح کا بہت زیادہ دارومدار گھوڑے پر تھا۔ انوری نے فارسی میں گھوڑے کی جھوکھی ہے۔ سودا نے بھی اس زمین میں گھوڑے کی جھوکھی۔ دراصل یہ جھوکھوڑے کی نہیں بلکہ مغل حکومت کے فوجی نظام کی ہے جو افسانوی انداز میں کہی گئی ہے۔ سودا نے اس جھوکھیہ قصیدے کا نام تضحیک روزگار رکھا ہے۔

سودا نے تب قصیدہ کہا سن یہ ماجرا

ہے نام اس قصیدے کا تضحیک روزگار

سودا کے ایک دوست تھے جو سو روپے کے ملازم تھے۔ چوں کہ ایماندار تھے اس لیے اوپر کی آمدنی نہیں تھی۔ ان کے پاس ایک گھوڑا تھا۔ گھوڑے کو دانہ اور گھاس نہیں ملتی تھی۔ سوکھ کر کاٹا ہو گیا۔

نطاقی کا اس کے کہاں تک کروں بیاں

فاقوں کا اس کے اب میں کہاں تک کروں شمار

مانند نقش نعل زمیں سے بجز فنا

ہرگز نہ اٹھ سکے وہ اگر بیٹھے ایک بار

اس مرتبہ کو بھوک سے پہونچا ہے اس کا حال

کرتا ہے راکب اس کا جو بازار میں گذار

قصاب پوچھتا ہے مجھے کب کرو گے یاد

امیدوار ہم بھی ہیں کہتے ہیں یوں ہمار  
 ہے پیر اس قدر کہ جو بتلائے اس کا سن  
 پہلے وہ لے کے ریگ بیاباں کرے شمار  
 لیکن مجھے ز روئے تواریخ یاد ہے  
 شیطان اسی پہ نکلا تھا جنت سے ہو سوار  
 اک دن گیا تھا مانگے پہ گھوڑا برات میں  
 دولہا جو بیابانے کو چلا اوس پہ ہو سوار  
 سبزے سے خط سیاہ و سیہ سے ہوا سفید  
 تھا سرو سا جو قد سو ہوا شاخ باردار  
 پہونچا غرض عروس کے گھر تک وہ نوجوان  
 شیخوخت کے درجے سے کر اس طرف گزار

سودا نے چالیس اشعار میں طرح طرح سے گھوڑے کی حالت بیان کی ہے اور اس کی  
 کمزوری اور لاغری کا مضحکہ اڑایا ہے۔ اس تعریف کے بعد قصہ شروع ہوتا ہے۔ ایک دن  
 نقیب نے مالک سے آکر کہا مرہٹے دہلی تک آپہنچے اور تم ابھی تک آرام سے بیٹھے ہو۔ اُن  
 کو بہت شرم آئی۔ اس لیے فوراً میدان کارزار کی تیاری کی۔ تمام ہتھیار سے لیس ہوئے  
 اور اسی گھوڑے پر جا بیٹھے۔ اس کے بعد کیا ہوا۔ اس کے بیان کرنے میں سودا نے کمال کر  
 دکھایا ہے۔ وہ صرف اپنے زور و تخیل سے ایک واقعہ پیدا کرتے ہیں اور بہت ہی ظریفانہ  
 انداز میں اس واقعہ کی تمام تفصیلات سناتے ہیں۔ اس ظرافت میں طنز کے تیز نشتر بھی چھپے  
 ہوتے ہیں جو ہمارے ناسوروں پر کام کرتے ہیں۔ سودا نے گھوڑے کے پردے میں اس  
 فوج کا مذاق اڑایا ہے جو دہلی کو حملہ آوروں کے ہاتھوں مٹنے دیکھتی رہی اور کچھ نہ  
 کر سکی۔ نادر شاہ، ابدالی، روہیلے، جاٹ اور سکھ دہلی کو لوٹ رہے تھے، قتل و غارت گری کر

رہے تھے۔ تمام مال و دولت جمع کر کے اپنے ساتھ لے جا رہے تھے مگر مغل فوج بے بس  
اور لاچار بنی سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھتی رہی اور کچھ نہ کر سکی۔ اب اُن کے میدان  
جنگ میں جانے کا قصہ سنئے۔

ناچار ہو کے تب تو بندھایا میں اس پہ زین  
تھیار باندھ کر میں ہوا جا کے پھر سوار  
جس شکل سے سوار تھا اس دن میں کیا کہوں  
دشمن کو بھی خدا نہ کرے یوں ذلیل و خوار  
چابک تھے دونوں ہاتھ میں پکڑے تھامنہ میں باگ  
تک تک سے پاشنہ کے مرے پاؤں تھے فگار  
آگے سے تو بڑا اوسے دکھلائے تھا سبکس  
پیچھے نقیب ہانکے تھا لاٹھی سے مار مار  
اس مضحکہ کو دیکھ ہوئے جمع خاص و عام  
اکثر مدبروں میں سے کہتے تھے یوں پکار  
ہیے اسے لگاؤ کہ تا ہووے یہ رواں  
یا بادبان باندھو پون کے دو اختیار  
کہتا تھا کوئی مجھ سے ہوا تجھ سے کیا گناہ  
کتوال نے گدھے پہ تجھے کیوں کیا سوار

بہر حال خدا خدا کر کے میدان جنگ پہنچے۔ وہاں جو حال ہوا، وہ بھی ملاحظہ فرمائیے:

یہ کہہ کے میں خدا سے ہوا مستعد جنگ  
اتنے میں مرہٹہ بھی ہوا مجھ سے آ دوچار  
گھوڑا تھا بسکے لاغر و پست و ضعیف و خشک  
کرتا تھا یوں خفیف مجھے وقتِ کارزار  
جاتا تھا جب ڈپٹ کے میں اس کو حریف پر  
دوڑوں تھا اپنے پاؤں پر جوں طفل نے سوار

جب دیکھا میں کہ جنگ کی یاں اب بندھی ہے شکل  
لے جوتیوں کو ہاتھ میں گھوڑا بغل میں مار  
دھر دھمکا واں سے لڑتا ہوا شہر کی طرف  
القصہ گھر میں آن کے میں نے کیا قرار

اس سلسلے کی چوتھی جھوشیدی فولاد خاں کو تو ال شاہجہاں آباد کی ہے جس میں سودا نے دہلی کی بدانتظامیوں کا مذاق اڑایا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ان بدانتظامیوں کا ذمہ دار فولاد خاں ہے جو چور اچکوں سے ملا ہوا ہے۔ فولاد خاں نے اور اس کے دو لڑکے ڈاکہ اندازی میں خود حصہ لیتے تھے جس شہر کے کو تو ال کا یہ حال ہو، اُس کا خدا ہی حافظ ہے۔ یہ بدانتظامی اور کو تو ال کی دیدہ دلیری مغل بادشاہ کی کمزوری اور لا چاری کی وجہ سے تھی۔ سودا نے حسب عادت ان واقعات کو مبالغے کے ساتھ پیش کیا ہے۔ جھوکی ابتدا میں سودا اُن دنوں کو یاد کرتے ہیں جب شہر میں نظم و نسق تھا۔ لیوں کے چور کا بھی ہاتھ کاٹا دیا جاتا تھا۔ جب

۱۔ فولاد خاں دہلی کا کو تو ال تھا۔ ۱۴ ربیع الثانی کو فولاد خاں کسی سبب سے گرفتار کیا گیا۔ اور وزیر الہما لک (عماد الملک) کے دیوان خانہ خاص میں محبوس ہوا۔ کو تو ال اس کی جگہ سیدی بلال کوٹی۔ اسی ماہ کی ساتویں کو ”تقدیر بسیار“ کے بعد پیر زنداں سے نجات پائی۔ اور پچاس ہزار روپے بطور مال امان مقرر ہوئے۔ لیکن ”موکلان وزیر الہما لک“ کی کشاکش سے نہ چھوٹا تھا کہ تیرہویں شعبان کو راہی عدم ہوا۔ فولاد خاں نے ۱۱ سال کی عمر پائی۔ لیکن دیکھنے میں پچاس ساٹھ سال سے زیادہ کا نظر نہ آتا تھا۔ بلکہ دندلاں باہم چٹاں منتظم بود کہ اصلاً احتجاج بہ ظلال میخاد۔ روشنی چشم بدستور و خواب و خورش بے فتور و قوت رجویت برقرار و پیشکش بائین جوانان نو خواستہ استوار بود و ایں خوارق روزگار است، (خلان مذکور جس کا رہنے والا تھا۔ اس نے سات بار حج کیا تھا) چندے ہاں تجارت اشغال و رزید و پس از آنکہ دار و ہندوستان شدہ۔ در سلک ملازمان..... محمد شاہ..... منتظم گشت، پیوستہ برقاہ و فراغت اوقات بسر می برد۔ مدت سی و چہار سال بخدمت کو تو ال رکاب سعادت قیام و رزیدہ نظم و نسق شائستہ پدید آورد۔ تاریخ شاہ عالم گیر ثانی (مصنف نامعلوم۔ قلمی) بحوالہ معاصر، حصہ ۲، ص ۱۱۶ (قاضی عبدالودود نے ایک قلمی تاریخ سے فولاد خاں کا حال نقل کیا ہے۔ یہ تاریخ مجہول الاسم ہے۔) ”دریں دلا حاجی فولاد خاں بکشت کے بطور خود زاہد بیک و صاحب بیک مغلان را کہ سرخیل ڈاکہ اندازاں بودند کا بودیدہ و نگیر کردہ آوردہ در چہترہ بہ جس سخت محبوس نمودہ، حکم بادشاہ حاصل نمودہ، گشت۔ چوں وقت تجھے می گذرد در فقائے او بہ وزیر الہما لک عرض کردند کہ دریں شہر مگر ہمیں دو کس ڈاکہ اندازی می کردند دیگرے نیست..... فولاد خاں خود ڈاکہ ہامیز نمودہ ہر دو پسرانش آنچہ افعال غارتیدن از ڈاکہ اندازی و دزد افشاری وغیرہ دارند در ہمہ عالم ظاہر است۔ ازیں معنی وزیر الہما لک مردم خود بکثرت نزد فولاد خاں فرستاد کہ بیارند۔ سوم ربیع الاول یک پاس گذشتہ بدلت تمام پیادہ پادستور گنہہ گاراں کشیدہ بردند۔



کو تو ال کو رشوت سے کوئی سروکار نہ تھا اور اس لیے شہر میں چور اچکے نہیں ہوتے تھے اور اب تو یہ حال ہے۔

دیکھی ہم نے جو راہ چاوڑی کی  
پشم ہے رہزنی تلاوڑی کی  
فولاد خاں جب سے کو تو ال ہوا ہے۔ شہر سے امن و امان مفقود ہو گیا ہے۔

کس طرح شہر کا نہ ہو یہ حال  
شیدی فولاد اب جو ہے کو تو ال  
چور کب اُس کا زور مانے ہے  
بال کالا وہ اس کو جانے ہے  
ان سے رشوت لیے یہ بیٹھا ہے  
اس کے دل میں یہ چور بیٹھا ہے  
بعضوں کا مفسدوں کے زور ہے یہ  
چور کا بھائی گٹھی چور ہے یہ

شہر کے تمام چور فولاد خاں سے ملے ہوئے ہیں جو روز صبح کو اس کا حصہ بھیج دیتے ہیں۔ شہر میں ہر طرف خوف و ہراس ہے۔ لوگوں نے رات کو سونا بند کر دیا ہے۔ محفل عیش و طرب ہو یا میخانہ، عبادت گاہ ہو یا بزم ہاؤ ہو۔ ہر جگہ لوگ ہوشیار بیٹھے رہتے ہیں۔

بزم میں شب ہر ایک پیر و جواں  
بیٹھے ہیں کر کے رزم کا ساماں  
شام سے صبح تک یہی ہے شور  
دوڑیو گٹھری لے چلا ہے چور

بے خطر ڈر سے اب کوئی نہ رہا  
اہل میخانہ میں بھی ہے ہو ہا  
نہ عبادت کو جاگتا ہے شیخ  
ڈر یہی چور آ نہ مارے میخ  
لطف یہ ہے کہ ان چوروں نے خود فواد خاں کا بھی یہی حال کر رکھا ہے۔

غلطی جب دیکھ کر کے یہ بیداد  
کرتے ہیں کوتوال سے فریاد  
بولے ہے وہ کہ میں بھی ہوں ناچار  
گرم ہے چوٹوں کا اب بازار  
کرتے ہیں مجھ سے اب بجا کر ڈھول  
میری پگڑی کا میرے سر پر مول

جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے کہ سودا کے یہ شہر آشوب اس عہد کی سیاسی اور سماجی زندگی کا آئینہ  
ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ سودا کے زور پر بیان اور قوت متخیلہ نے ان میں ضرورت سے زیادہ  
مبالغہ آمیزی کی ہے۔ لیکن جھوگوئی کی بنیاد اسی مبالغہ پر ہوتی ہے۔

### مثنوی نگاری

اصطلاح میں ان اشعار کو مثنوی کہتے ہیں جن میں دو دو مصرع باہم مقفی ہوں۔ لے اگرچہ  
لفظ ”مثنوی“ عربی ہے لیکن بحیثیت صنفِ سخن اس کی ایجاد فارسی میں ہوئی۔ اردو نے  
اسے فارسی ہی سے مستعار لیا۔ ان دونوں زبانوں میں مثنوی ایک اہم صنفِ سخن ہے، اس  
میں جن پر یوں کے قصے اور مافوق الفطرت واقعات سے لے کر عام انسانوں کے حسن و

عشق کی وارداتوں، خوشیوں اور غموں، میدانِ کارزار کے ہنگاموں، بزمِ طرب کی دلاویزیوں، شادی اور موت کی رسموں، اخلاقی قصوں، تصوف کے مسئلوں اور مذہبی تعلیم کا بیان کیا جاتا ہے۔ اس میں غزل کی سادگی، سوز و گداز، قصیدے کا جوش و خروش، بھوکی ظرافت نگاری، مرثیے کا نوحہ و غم وغیرہ سب ہی کچھ ہوتا ہے۔ شاید یہ کہنا غلط نہ ہو کہ کسی عہد کے سیاسی و سماجی حالات، معاشرت، رسم و رواج، رہن سہن کے طریقے، لباس و زیورات وغیرہ کے مطالعے کے لیے اس دور کی مثنویوں کا مطالعہ سب سے زیادہ اہم ہیں۔

فارسی میں شاہ نامہ، سکندر نامہ، حملہ حیدری، یوسف زلیخا، شیریں خسرو، لیلیٰ مجنوں اور مثنوی مولانا روم ایسی مثنویاں ہیں جنہوں نے اپنے مصنفین کو بقائے دوام کے دربار میں جگہ دلائی ہے۔

اردو میں مثنوی نگاری کی ابتدا دکنی ہی سے ہوئی تھی۔ نوں صدی ہجری میں میراجی شمس العشاق کی مثنوی ”شہادت التحقیق“ یا شہادت الحقیقت، خوش نامہ، خوش نغز، مرغوب القلوب ملتی ہیں۔ ان تمام مثنویوں میں تصوف کے مسائل بیان کیے گئے ہیں۔ اسی دور کے ایک شاعر نظامی کی عشقیہ مثنوی پدم راؤ کدم بھی دریافت ہوئی ہے۔ دسویں صدی ہجری کے شروع میں سید شاہ اشرف بیابانی نے مثنوی ”نوسر ہار“ تصنیف کی۔ اسی زمانے میں برہان الدین جانم نے ارشاد نامہ، وصیت الہادی، حجت البقاء، نسیم الکلام اور منفعت الایمان مثنویاں لکھیں۔ ایک اور شاعر فیروز بھی اسی عہد کا ہے۔ اس نے ایک مثنوی توصیف نامہ میراں محی الدین لکھی۔

گیارہویں صدی ہجری کی مثنویوں میں عبدال کی ابراہیم نامہ، وجہی کی مثنوی قطب مشتری، غواصی کی سیف الملوک اور بدیع الجمال، طوطی نامہ اور چندا اور لودک، نصرتی کی گلشن عشق، ابن نشاطی کی پھول بن وغیرہ مشہور ہیں۔

بارہویں صدی ہجری کے آغاز میں شمالی ہند میں اردو شاعری کا آغاز ہوا اور ہمیں ابتدا ہی

۱۔ دکنی مثنویوں سے متعلق معلومات دکنی مثنویاں، محمد اکبر الدین مدنی مجلہ عثمانیہ، دکنی ادب نمبر ۱۹۶۳ء، ۶۴-۶۵ سے لی گئی ہیں۔

سے اچھی مثنویوں کے نمونے ملنے لگتے ہیں۔ جعفر زبلی کے کلیات میں ظفر نامہ اور نگ زیب اور طوطی نامہ مثنویاں موجود ہیں۔ نواب صدر الدین قانز دہلوی کے کلام میں بھی چھوٹی چھوٹی مثنویاں مل جاتی ہیں۔ شاہ مبارک آبرو نے بھی ایک مثنوی کہی تھی۔ شاہ حاتم کے دیوان زادے میں پانچ مثنویاں بھی شامل ہیں۔

سودا اور میر دونوں اساتذہ فن نے اس طرف توجہ دی۔ لیکن یہ صنفِ سخن سودا کو اس نہ آسکی۔

میر نے اگرچہ مختلف موضوعات پر مثنویاں لکھی ہیں مگر شہرت اور مقبولیت عشقیہ مثنویوں کو سب سے زیادہ ملی۔ قائم، مصحفی اور راسخ عظیم آبادی نے میر کی عشقیہ مثنویوں ہی کی تقلید کی، جس کی وجہ صرف یہ ہے کہ میر کی غزل میں جو دروں بینی، سوز و گداز، خشکی و برہنگی، درد و غم کی دھیمی دھیمی آواز ہے وہی کچھ مثنوی میں بھی موجود ہے۔ سودا اس شدید داخلیت سے محروم رہے تھے۔ اس لیے وہ کوئی قابلِ تقلید مثنوی تصنیف نہ کر سکے۔

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے سودا کی مثنوی نگاری کے بارے میں رائے دی ہے۔ ”مرزا اقسام شاعری در مثنوی فکر معقول نداشت“۔ یہ تقریباً یہی بات عبدالغفور نساخ نے ان الفاظ میں لکھی ہے۔ ”سوائے مثنوی کے جمیع اصنافِ سخن پر قادر تھے“۔ سودا کی مثنویاں مختلف موضوعات کے تحت تقسیم کی جاسکتی ہیں۔

ہجو یہ:-

۱۔ مثنوی در ہجو پیل راجہ زپت سنگھ

۲۔ مثنوی در ہجو شیدی فولاد خاں کوتوال شاہ جہاں آباد

۱۔ امیر احمد علوی لکھتے ہیں۔ ”مرزا رفیع سودا نے چوبیس مختصر مثنویاں لکھیں۔ لیکن وہ قصیدہ گوئی اور طرافت نگاری کے بادشاہ تھے۔ مناظر کی مصوری، جذبات کی نقاشی میں ناموری نہ حاصل کر سکے“۔ نگار، جنوری فروری ۱۹۵۷ء، ص ۶۳۔

۲۔ سید عبداللہ لکھتے ہیں۔ ”اگر میر کی مثنویوں میں غلوں، سچائی اور الم انگیزی کے یہ نقوش نہ ہوتے تو ان کی مثنویوں اور سودا کی مثنویوں میں کچھ فرق نہ ہوتا“۔ تھہر میر دہلی، ص ۲۴۱۔

۳۔ گلشن بے خار، ص ۱۰۰۔

۴۔ سخن شعرا، ص ۲۲۳۔

۳۔ مثنوی درہجو امیر دولت مند بخیل

۴۔ مثنوی درہجو میر ضاحک

۵۔ مثنوی درہجو حکیم غوث

۶۔ مثنوی بطور ساقی نامہ درہجو میاں فوقی

۷۔ مثنوی حکایت ڈومنی

۸۔ مثنوی درہجو کوکی یعنی دختر دایہ

کلیات سودا مرتبہ آسی میں آخری دو کے علاوہ باقی سب شامل ہیں۔ غالباً آسی نے اپنے کلیات میں ان دو مثنویوں کو اس لیے شامل نہیں کیا کہ یہ ضرورت سے زیادہ فحش ہیں۔ لیکن یہ مطبع مصطفائی کے نسخے میں شامل ہیں۔ ہجو دختر دایہ ۳۱ اشعار پر مشتمل ہے۔ مثنوی کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے۔

واسطے طفل کے جو بہتر ہے  
شیر اگر ہے تو شیر مادر ہے  
نہ کہ ہر ایک کنجڑی بھڑیاری  
ایک خصم جس کا سو جگہ یاری  
مزید چار شعروں میں تمہید بیان کر کے سودا اصل موضوع پر آتے ہیں۔

ایسی ہی ایک چنانچہ دائی ہے  
خام پارہ ایک اس کی جائی ہے  
جب وہ لڑکوں میں کھیلنے جاتی  
اس کی ماں ڈھونڈ کر پکڑ لاتی

پیٹ کر سر وہ تب یہ کہتی تھی  
یہی کہہ کہہ کے چپ ہو رہتی تھی  
بیای جب یہ چھٹال جاوے گی  
آگ سرال میں لگاوے گی  
لڑکی وہ لڑکیوں میں جو کھیلے  
نہ کہ لونڈوں میں جا کے ڈنڈہ پیلے<sup>۱</sup>

یہ تو اس لڑکی کے بچنے کا ذکر تھا۔ اب سودا اس کی جوانی کا بیان کرتے ہیں۔

بچنے میں تو اس کا تھا یہ حال  
اب جوانی کا سینے قال و مقال  
نہ جوان چھوڑے ہے نہ یہ بالا  
کام کے دیو نے اسے پالا

اس شعر سے قائدہ اٹھا کر مولانا محمد حسین آزاد نے ایک لطیفہ بنادیا۔ لکھتے ہیں۔ ”آصف الدولہ مرحوم کی لڑکی لڑکی خورد سال تھی۔ نواب فرشتہ سیرت کی طبیعت میں ایک تو عموماً محل اور پے پروائی تھی۔ دوسرے اس کی ماں کا دودھ پیا تھا۔ ناز برداری نے اس کی شوقی کو شرارت کر دیا۔ ایک دن دوپہر کا وقت تھا۔ نواب سوتے تھے۔ ایسا غل مچایا کہ بد خواب ہو کر جاگ اٹھے۔ بہت بھنجلائے اور خفا ہوتے ہوئے باہر نکل آئے۔ سب ڈر گئے کہ آج نواب صاحب کو غصہ آیا ہے خدا خیر کرے۔ باہر آ کر حکم دیا کہ مرزا کو بلاؤ۔ مرزا اسی وقت حاضر ہوئے۔ فرمایا کہ بھی مرزا اس لڑکی نے مجھے بڑا حیران کیا ہے۔ تم اس کی جھوکہ دو۔ یہاں تو ہر وقت سالہ تیار تھا۔ اسی وقت قلدان لے کر بیٹھ گئے اور مثنوی تیار کر دی کہ ایک شعر اس کا لکھتا ہوں۔

لڑکی وہ لڑکیوں میں جو کھیلے  
نہ کہ لونڈوں میں جا کے ڈنڈہ پیلے  
بعض بزرگوں سے یہ بھی سنا ہے کہ دلی میں نالہ پر ایک دوکان میں بھٹیاری رہتی تھی۔ وہ آپ بھی لڑکا تھی مگر لڑکی اس سے زیادہ چٹکل ہوئی۔ آتے جاتے جب دیکھتے لڑتے ہی دیکھتے۔ ایک دن کچھ خیال آ گیا۔ اس پر یہ جھوکھی تھی۔ (آب حیات، ص ۱۷۰)

پوری مثنوی پڑھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں واقعات آزاد کے ذہن کی اختراع ہیں۔ مثنوی اتنی فحش اور مبتذل ہے کہ اس معصوم بچی کی جھوکھیں ہو سکتی۔ جس کی ماں کا آصف الدولہ نے دودھ پیا تھا۔ ابتدائی اشعار میں صاف طور پر دلی اور اس کی دختر کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس لیے بھٹیاری والا قصہ بھی غلط ہے۔ (خ-۱)

اس کے بعد سودا فحش باتوں پر اتر آتے ہیں۔ دوسری مثنوی ”حکایت ڈومنی“ چھ شعر کی ہے۔ ابتدا ان اشعار سے ہوتی ہے۔

حکایت یہ ایک ڈومنی سے ہے یاد  
بڑھاپے میں اوس کو ہوئی چھل زیاد  
جواں کوئی کرتا نہ تھا اوس کو یار  
کہ تقویم پارینہ ناید بکار  
بعد کے چار شعر بہت فحش ہیں۔ باقی ہجو یہ مثنویوں پر تبصرہ ”ہجو گوئی“ کے تحت کیا گیا ہے۔

مدحیہ:-

مثنوی در تعریف دیوان و اشعار مہربان خاں  
مثنوی در تعریف شکار کردن نواب آصف الدولہ بہادر مثنوی در مدح  
پہلی مثنوی کی ابتدا ان اشعار سے ہوتی ہے۔

صاحباً سیر کے ہیں یہ ایات  
فکر عالی کی آپ کی کیا بات  
یہ سفینہ ہے رشکِ ابر بہار  
ہر ورق اس میں قطعہ گلزار  
اس کے بعد دیوان کی جلد اور شیرازہ کی تعریف بہت ہی انوکھے انداز میں کی ہے۔

اس کے پھوں پہ جلد کی یہ بہار  
 در باغ بہشت کے ہیں کوار  
 صرف شیرازہ جو ہوا تیار  
 ہے رگ جان عاشقان زار  
 مہربان خاں کے کلام کی تعریف میں سودا نے حسب معمول مبالغے سے کام لیا ہے۔  
 چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

لعل سفتہ لب و دہن تیرا  
 در شہوار ہے خن تیرا  
 ہر غزل ہے تری کمال خن  
 نمک شوقی غزال خن  
 پڑھے دنگل میں جب رباعی تو  
 چو کڑی بھول جائے شاعر کو  
 اسی مثنوی میں سودا نے مہربان خاں کے استاد میر سوز کی تعریف کی ہے۔

شعر کے بحر میں ترا استاد  
 کشتی ذہن کو ہے بادِ مراد  
 ایک خدمت میں تیری اتنی عرض  
 کرنی اس خیر خواہ کو ہے فرض  
 اس کو ہر طرح تو غنیمت جان  
 پھر ملے گا نہ سوز سا انسان



مثنوی کے اختتام پر سودا نے مہربان خاں کو دعا دیتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ اس مثنوی کے لکھنے سے ہرگز یہ مدعا نہیں ہے کہ انھیں کچھ صلہ چاہیے۔

مثنوی شکار نامہ فنی لحاظ سے بہت کمزور ہے۔ میر کے شکار نامے اس سے کہیں زیادہ بہتر ہیں۔ سودا کا شکار نامہ دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی تصنیف زبردستی کی ہے۔ پوری مثنوی میں کہیں شکار کا کوئی منظر نظم نہیں ہوا۔ صرف اس انداز کی مبالغہ آرائی ہے۔

جہاں تو لے وہ اپنی شمشیر کو

تو رو بہا سمجھے ہے وہ شیر کو

بجز زیر تیغ اس کے پائے نہ اور

ہرن پاڑھے چیتل چکارے نے ٹھور

ہوئے شیر پیشوں میں اتنے شکار

کہ باہر پڑے تھے زحہ بے شمار

درندوں سے جب صاف جنگل کیا

تو خیمے میں تشریف فرما ہوا

رہے دیکھ حیراں صغیر و کبیر

جب آگے سے اٹھ بھاگے قالی کے شیر

نواب اس شکار میں کچھ زندہ ہاتھی گرفتار کر کے لائے تھے۔ یہ سب ہاتھی بہت خوب تھے۔ لیکن بقول سودا :

پر اک پیل کا ان میں ایسا جمال

زباں وصف میں جس کے میری ہے لال

کبھو پیل ایسا چشمِ جہاں  
 نہ آیا نظر زیرِ آسماں  
 وہ ہے قد و قامت میں اتنا بلند  
 لگا کہنے دیکھ اس کو ہر ہوش مند  
 بدانت اپنے یہ ہاتھی نہیں  
 ہوا دیکھ اس کو مجھے بالیقین  
 رہے جب نہ واں صید سو سو کردہ  
 تو زنجیر کو کھینچ لائے ہیں کوہ  
 تیسری مثنوی میں سودا نے کسی کی انگوٹھی کی تعریف کی ہے، جس پر مہر بنوائی گئی تھی۔ سات  
 شعروں کی اس مثنوی میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔ پہلا شعر یہ ہے۔  
 کھدا تیرے خاتم پہ جب تیرا نام  
 سند اس سے پانے لگے خاص و عام  
 اخلاقیہ:-

مثنوی در جو طفل ضائع روزگار لکڑی باز  
 مثنوی (اس کا کوئی عنوان نہیں دیا گیا)

پہلی مثنوی میں سودا نے ایک لڑکے کا قصہ بیان کیا ہے۔ یہ ایک غریب باپ کا بیٹا  
 تھا۔ جھوپڑی میں رہتے ہوئے خواب محلوں کا دیکھتا تھا۔ ایک دن اپنے باپ سے کہنے  
 لگا۔

موٹے جامے سے بھگو ذوق نہیں  
 چھوٹے چیرے کا دل کو شوق نہیں  
 پنکا گاڑھے کا کب تلک باندھوں  
 موٹی شلوار تا کجا پہنوں  
 جوتی چمڑے کی بھگو نہیں بھاتی  
 سوکھ کر پاؤں میں نہیں آتی

پھر لڑکا اپنے لباس، ہتھیار، گھوڑے وغیرہ کی فرمائش کرتا ہے۔ یہ مثنوی اس لحاظ سے بہت  
 اہم ہے کہ اس میں عہدِ سودا کے نوجوان کے لباس اور زیب و آرائش کے تمام ساز و سامان  
 کا ذکر کیا گیا ہے۔ جب لڑکے نے بہت کڑوی کیلی باتیں کہیں تو باپ نے جواب دیا۔

تب کہا باپ نے اے میری جان  
 حق نے قسمت کیا ہے سو ہے ندان  
 ہم غریبوں کی دال روٹی ہے  
 گاہ پتلی ہے گاہ موٹی ہے  
 گر مزے چاہتی ہے تیری زباں  
 حق نے دی ہے تجھے یہ زر کی کاں  
 اپنے اوپر کسی کو کر عاشق  
 یا ہو وہ پاکباز یا فاسق

نخرے سے اس کی گود میں جا لیٹ  
کھول چھاتی کو اور دکھا کر پیٹ

غرض باپ بیٹے میں جھگڑا اتنا بڑھا کہ لڑکا گھر سے نکل آیا۔ اسی محلے میں ایک پہلوان  
رہتے تھے۔ جو اسی قسم کے لڑکوں کی تاک میں رہتے تھے۔ یہ لڑکا کشتی کے بہانے سے ان  
کے پاس گیا۔ پہلوان زور کرانے کے لیے اکھاڑے میں لے گئے۔ یہاں سودا نے  
پہلوانی کی بہت سی اصطلاحیں نظم کی ہیں جو زبان پر کام کرنے والوں کے لیے بہت اہم  
ہیں۔ کشتی کے بعد جب لڑکا اکھاڑے سے آیا تو اُس نے اپنی اس نئی روش سے توبہ کر لی  
اور بقول سودا ”شعر پڑھتا یہ اپنے گھر کو چلا“۔

سنو لے لڑکو ہو نہ راہ سے کم  
اس نصیحت کو گوش جان سے تم  
باپ کے گھر کی چاٹ کے چٹنی  
کرد لذران یارو تم اپنی

اس مثنوی کا قصہ بہت کمزور اور غیر دل چسپ ہے۔ اندازِ بیان میں بھی کوئی خوبی  
نہیں۔ البتہ اس کی صرف یہ خوبی ہے کہ اس میں اُس دور کے لباس وغیرہ اور پہلوانی کی  
اصطلاحات کا ذکر آیا ہے۔

دوسری مثنوی میں بھی ایک قصہ بیان کر کے اخلاقی درس دیا گیا ہے۔ مگر پہلی مثنوی کی  
طرح اس کا قصہ بھی بہت کمزور ہے۔ البتہ یہاں سودا کا اپنا اندازِ بیان قائم ہے۔ مثنوی  
شروع اس طرح ہوتی ہے۔

ایک مشفق ہیں ہمارے مہرباں  
خوب صورت خوب سیرت فوجواں

ناگہاں اک روز ہم سے مل گئے  
 دیکھتے ہی شکل جوں گل کھل گئے  
 سودا نے غور سے دیکھا تو ان کی صحت بہت خراب تھی اور بقول سودا:  
 دیکھتا کیا ہوں کہ عالم اور ہے  
 گرد رخساروں کے خط کا دور ہے  
 مزید سات شعروں میں سودا نے ان کی خستہ حالی کا بیان کیا ہے۔ پھر سودا اس کی بربادی  
 اور تباہی کی وجہ دریافت کرتے ہیں۔ وہ بتاتا ہے۔

کہ خدائی کا ہے جب سے اتفاق  
 زندگی ہو گئی ہے جی پہ شاق  
 ہو جیو مشاطہ کا خانہ خراب  
 ہاتھ سے جس کے ہے اپنا جی کباب  
 ایسا بد صورت ملایا آدمی  
 کہیے کیا اپنی ہے قسمت کی کمی  
 بیاہ کی رات اور مجھ پر یوں کٹھن  
 چاند کوں لگتا ہے جیسے کہ گہن  
 آری مصحف لگا تب دیکھنے  
 آسمان اوپر لگا جب دیکھنے  
 جو ہیں پڑتی ہے مری اوس پر نگاہ  
 ہے گویا اک پارہ ایر سیاہ

کوئی اوس صورت کا دیکھانے سنا  
 دیکھتے ہی میں نے سر اپنا دھنا  
 سودا نے اس لڑکی کی بد صورتی اور دوست کی تباہ حالی کا ذکر ستاون اشعار میں کیا ہے۔  
 جب وہ دوست اپنا پورا قصہ سنا چکا تو سودا اُسے نصیحت کرتے ہیں۔  
 تب کہا میں عقل سے یہ دور ہے  
 کونسا اے یار یہ مذکور ہے  
 جب سے دنیا میں ہے انساں کی سرشت  
 کوئی روئے خوب ہے اور کوئی زشت  
 ماٹی کی صورت بناوے ہے کہار  
 کوئی بد صورت کوئی ہے تاجدار  
 دیکھ بد صورت کو مت ہنس کھلکھلا  
 اس میں ہو جاتا ہے صانع کا گلا  
 گنج کوئی مار سے خالی نہیں  
 دامن گل خار سے خالی نہیں  
 صورت اور سیرت کا باہم اتفاق  
 ایسا ہوتا ہے بہت کم اتفاق  
 کیجیے صورت کا بس کیا اعتبار  
 کوئی دن ہے یہ بھی جوں فصل بہار  
 اس کے بعد سودا نے اپنے عہد کے کچھ حسینوں کا ذکر کیا ہے۔

خوب صورت یار بھی اپنے گئے  
 مونس و غم خوار بھی اپنے گئے  
 جیسے عبدالحی تاباں ہو چکا  
 ساتھ اس کے اک سلیمان ہو چکا  
 یوسف مصری سے مصری کم نہ تھا  
 تلخی دوراں سے جس کو غم نہ تھا  
 نام تھا اک خوب صورت کا عزیز  
 جان سے زیادہ ہمیں وہ تھا عزیز  
 ہو چکا مالک بھی ملک حسن کا  
 تھا وہ بخشی الممالک حسن کا  
میر قطب قطب تارا ہو چکا  
 کیا کہوں میں زور پیارا ہو چکا  
 سانوروں میں اک گمانی زور تھا  
 ہند میں جس کے نمک کا شور تھا

اس کے بعد سودا بے ثباتی دنیا کا ذکر کر کے یہ ثابت کرتے ہیں کہ ہر چیز ناپائیدار ہے۔  
 کیسی کیسی صورتیں خاک میں مل گئیں۔ کیسے کیسے لوگ تر خاک چلے گئے۔ انسان کب  
 تک اور کس کس کا ماتم کرے اور آخر میں نصیحت کرتے ہیں کہ ان تمام باتوں کا مدعا یہ ہے  
 کہ دنیا سے دل مت لگا۔

آدی کو چاہیے وارستگی  
 صورتِ فانی سے کیا دل بستگی  
 زندگانی کا نہ ہو جب اعتبار  
 شکل و صورت کا تو ہے کب اعتبار  
 پائنداری ہے اوی کی ذات کو  
 بس ہے سودا، نفی کر اس بات کو

خطوط:-

مثنوی بطور خط

مثنوی بطور خط

ان دونوں مثنویوں میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔ یہ خط کے طور پر لکھی گئی ہیں۔ ان کے مطالعے سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ سودا کے دوستوں نے انھیں جو خطوط لکھے، یہ مثنویات ان ہی کے جواب کے طور پر لکھی گئیں۔

تنقیدی:-

مثنوی در بیان معانی بیت مثنوی مولوی روم۔

سبیل ہدایت

مولوی روم کا ایک شعر ہے۔

ہم چو سبزہ بارہا روئیدہ ام

ہم قصد و ہفتاد قالب دیدہ ام



بظاہر اس شعر کا مطلب یہی ہے کہ مولوی روم آواگون کے فلسفے کو تسلیم کرتے تھے جو اسلامی نقطہ نظر سے کفر ہے۔ اس شعر پر کافی بحث و مباحثہ ہو چکا ہے اور ہر شخص نے اپنے اپنے انداز سے اس کی تشریح کی ہے۔ سودا نے بھی اس کی تشریح ان اشعار میں کی ہے:

مدعا اگنے سے ہے نشوونما  
ہر جگہ کرنا خودی سے ہو فنا  
ہے غرض قالب سے دل ہر ایک کا  
خلقت خالق میں بد اور نیک کا  
لے کے انسانیت سے تا وحش و طیر  
دیکھنی قالب سے مطلب اون کی سیر  
یوں کلام مولوی دے ہے خبر  
یعنی میں جس دل میں دیکھا بیٹھ کر  
کچھ نظر آیا نہ غیر از اوس کی ذات  
اس قدر پایا محیط کائنات  
معنی ہم اس شعر کے سمجھے ہیں یوں  
اور کی فہمید میں کچھ اور ہوں

ظاہر ہے کہ اس شرح میں سودا نے زبردستی کی ٹھونس ٹھانس کی ہے۔ ورنہ مطلب وہی ہے جس پر لوگوں کو اعتراض ہے۔ دوسری مثنوی پر ہجو گوئی کے تحت تبصرہ کیا جا چکا ہے۔

منظر نگاری:

مثنوی موسم گرما

اس موضوع پر کلیات سودا میں صرف ایک مثنوی ہے۔ اس مثنوی میں وہی مبالغہ آرائی ہے

جو سودا کے قصیدوں اور ہجوؤں میں ملتی ہے۔ اسی لیے زبان و بیان کے لحاظ سے اعلیٰ درجے کی ہوتے ہوئے بھی حقیقت سے دور ہے۔ پھر بھی اس مثنوی کی یہ اہمیت ہے کہ موسم بہار کے علاوہ فطری منظر نگاری پر سودا کی پہلی کوشش ہے۔ غالباً اس مثنوی کو اچھی خاصی مقبولیت حاصل ہوئی تھی۔ کیوں کہ سودا کے شاگرد قائم نے اسی طرح موسم سرما پر ایک نظم کہی۔ بعد کے شاعروں نے مرثیوں میں فطرت نگاری کے اچھے نمونے پیش کیے ہیں۔ خاص طور پر موسم گرما کا حال بہت تفصیل سے بیان کیا ہے۔ مثنوی کی ابتدا میں سودا موسم بہار کی کیفیت بیان کرتے ہوئے یہ شکایت کرتے ہیں کہ اس دفعہ تو بہار کا موسم بھی اتنا گرم ہے کہ :

یہ پٹاخا چٹکتی وقت گلاب  
کف زگس پہ چھٹتی ہے مہتاب  
دست گل کا کیا کہوں میں رنگ  
اس میں ہت پھول کے سے پیگے ڈھنگ  
غنچے کھلتے ہیں یوں ہو آتشبار  
گویا پھٹتا ہے دلخنے میں انار  
نہیں گیندوں کے یہ چمن میں درخت  
دی ہے آتش ستاروں کو یک لخت  
گرمی کی شدت اس طرح بیان کی ہے۔

ہے حرارت گلوں کو اب یاں تک  
نہیں شبنم یہ نکلی ہے چمک

پانی کو بلبلیں پھریں بھگی  
 طفل غنچوں کو لگ گئی چنگی  
 گیا تالاب میں ہر ایک کنول  
 کنول کاغذی کی طرح سے جل  
 بوند کو دل صدف کا ترسے ہے  
 ابرنیاں سے آگ برسے ہے  
 ہے پسینے سے میخوروں کا یہ حال  
 باد گویا ہے آب در غربال

اس مثنوی کی سب سے بڑی خوبی تشبیہات و استعارات ہیں۔ فطرت نگاری کے لحاظ سے یہ مثنوی اعلیٰ درجے کی نہ ہو۔ لیکن سودا کے قادر الکلام ہونے کا ثبوت ضرور ہے۔

### عشقیہ:-

مثنوی قصہ در عشق پر شیشہ گر بزرگ پر بطور ساقی نامہ و دیگر حکایت شیخ و دعاء پادشاہ مثنویات سودا میں یہ واحد مثنوی ہے جس میں عشقیہ قصہ بیان کیا گیا ہے۔ ورنہ سودا کا یہ میدان نہیں ہے۔ مثنوی کی ابتدا حمد خدا سے ہوتی ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

مرا دل نام پر اوس کے ہے شیدا  
 کیا ہے جن نے حسن و عشق پیدا  
 کہیں نور چراغ خانہ ہے وہ  
 کہیں سوز دل پروانہ ہے وہ

کسو کے دل میں پاتا ہوں اسے درد  
 کسی سینے میں تاثیر دم سرد  
 کسی جاگہ میں عیسیٰ کا ہو وہ دم  
 کسی جا ہو سموم آکر پر از سم  
 سودا خدا سے دعا مانگتے ہیں۔

خدایا دے تو اپنے عشق کا درد  
 عنایت کر دل گرم و دم سرد  
 محبت کا دے اپنے داغ دل پر  
 بغیر از شمع ہے تاریک یہ گھر  
 خم دل میں شراب درد بھر دے  
 پیال چشم کی لبریز کر دے  
 تشق میں کر اپنے اس قدر غرق  
 نہ مجھ سے کفر و دیں میں ہو سکے فرق

مناجات اور دعا کے بعد بیس شعروں میں نعت ہے جس کے چار شعر یہ ہیں۔

محمدؐ باعث ایجاد افلاک  
 محمدؐ علت غائی لولاک  
 محمدؐ ہے مشیر عالم غیب  
 محمدؐ از دار حق ہے لاریب

محمدؐ عادل و کامل و عاقل  
 محمدؐ ہے جو کچھ تھا اوس کے قابل  
 اوس کی ذات سے اثبات حق ہے  
 ؛ کہ اوس کی ذات عین ذات حق ہے  
 اس کے بعد منقبت میں حضرت علیؑ کی تعریف کی گئی ہے۔

علی برحق امام رہنما ہے  
 علی ہی جانشین مصطفیٰ ہے  
 علی ہی شہسوارِ راہ دیں ہے  
 علی میرِ نبوت کا نگین ہے  
 کروں کیا مرتبے کی اوس کے تقریر  
 کہ تابع جس کی مرضی کے ہے تقدیر

۷۷ اشعار میں ساتی سے خطاب اور موسم بہار کا بیان کر کے سودا اصل قہقے پر آتے ہیں۔

حکایت ہے کہ اک عابد بآفاق  
 عبادت کرنے میں تھے حق کے وہ طاق  
 خدا کی یاد میں رہتے تھے دن رات  
 نماز و روزہ میں گزرے تھے اوقات

ان بزرگ کے زہد، عبادت گزاری، نیکی اور شرافت کی بہت زیادہ تعریف و توصیف کے  
 بعد سودا کہتے ہیں۔

ملے اک روز سودا سے وہ ناگاہ  
 کہا جھکو ہے قصدِ کعبۃ اللہ  
 نجات اپنی اگر جھکو نظر ہے  
 تو آمرزش کا موجب یہ سفر ہے  
 یہ بہتر ہے کہ چل ہمراہ میرے  
 جرائمِ غفو واں سب ہوں گے تیرے

سودا اُن کے ساتھ جانے کو تیار ہو گئے۔ اُن بزرگ اور سودا نے سامانِ سفر تیار کیا۔ ساز و سامان اور گھوڑا لے کر یہ لوگ روانہ ہوئے۔ ان کے ساتھ اس بزرگ کے مرید بھی تھے۔ کوئی ان کا عصا لیے ہوئے تھا۔ کسی کے ہاتھ میں مورچیل تھا، کسی کے پاس حضرت کا رومال تھا، کوئی پیکدان لیے ساتھ چل رہا تھا، کسی نے سر پر مصلا رکھا ہوا تھا۔ غرض اس طرح قافلہ روانہ ہوا۔ ابھی دو چار منزلیں طے کی تھیں کہ شومی قسمت سے ڈاکوؤں نے گھیر لیا اور سارا ساز و سامان لوٹ لیا۔ یہاں سودا نے طنز نگاری سے پورا پورا فائدہ اٹھا کر ان بزرگ کی پارسائی اور زہد کا مذاق اُڑایا ہے۔

پیادے کس طرح یہ کاٹتے راہ  
 عصا گر رہ گیا پاس ان کے سو آہ  
 نظر کر بعد غارت راہ کا رنج  
 لگے کرنے دل اپنے میں شش و پنج  
 نہ زاد راہ پاس ان کے نہ مرکب  
 اب ان سے عزم کعبے کا بندھے کب  
 توکل پر چلیں کعبے یہ کیا ذکر  
 انھیں اسباب کی اپنی پڑی فکر

کبھو عمامے کے جانے کا مذکور  
 کبھو تھا فکرِ پیراہن سے دل چور  
 سلیمانی کی گہ یاد آتی تسبیح  
 ہوئی جاتی تھی جس کے غم سے تشریح  
 کبھو کہتے کہ یارو کیا عصا تھا  
 بڑے حضرت کے میرے ہاتھ کا تھا  
 عقیق سرخ کا جو ناسداں تھا  
 اگر بکنا تو قیمت میں گراں تھا

اس بے سروسامانی کے عالم میں انھوں نے حج کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ جب انھوں نے سودا  
 کو اپنے ارادے سے آگاہ کیا تو:

جواب ان کو دیا سودا نے سکر  
 جو فرماتے ہو تم ہووے گا بہتر  
 پر اب اس حال سے گھر کیونکہ جاؤں  
 بھلا واں جا کے منہ کس کو دکھاؤں  
 کہا حضرت نے سن کر تم ہو گمراہ  
 نہیں مسئلے مسائل سے کچھ آگاہ  
 حرم کا فرض ہے مقدور پر طوف  
 گیا یاں مال آگے جان کا خوف

مریدوں اور اُن بزرگ نے یہ ہی طے کیا کہ واپس چلنا چاہیے۔ واپسی پر ایک منزل

پر ٹھہرے۔ چوں کہ سامان وغیرہ کچھ تھا نہیں۔ اس لیے سونے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ اُن  
بزرگ نے سودا سے فرمائش کی کہ وہ کوئی قصہ سنائیں۔  
سودا حکم کی تعمیل کرتے ہیں۔ حلب میں ایک شیشہ گر کا لڑکا تھا۔

حلب میں تھا پسر اک شیشہ گر کا  
نہایت لاڈلا مادر پدر کا  
بنایا حق نے سب سے دور اوس کو  
پرئی پہنچے نہ ہرگز حور اوس کو  
پدر سے سیکھتا تھا شیشہ سازی  
نہ تھا کچھ کام اوسے باعشق بازی  
قضا کا کیا کہوں آگے میں نیرنگ  
کہ ملا اوس پہ ناگہ عشق نے چنگ  
ہوا مائل وہ اک زرگر پسر پر  
دیا آئینہ دل اک نظر پر  
رہے وہ صبح سے تا شام بے خواب  
کہ جیسے چودھویں شب کا ہو مہتاب  
نہ فکر روزی اور نے خواہش قوت  
ہوا زرگر پسر کو دیکھ مہبوت

۱۔ سودا نے یہ قصہ تقریباً ۲۳۳ اشعار میں بیان کیا ہے۔ میں نے یہاں صرف وہ اشعار نقل کیے ہیں جن  
سے پورا قصہ سمجھا جاسکتا ہے۔ (خ-۱)



کہ یک شب پھاڑ کر اپنا گریباں  
 برنگ گل وہ گل روتا مداماں  
 چلا اس طرح گھر سے بے سروپا  
 کہ جاتا ہوں کدھر جا کر کروں کیا  
 کئی جب اس طرح سے وہ شب تار  
 ہوئی عالم میں صبح اوس دم نمودار  
 پدر بالیں تلک اوس کے جو آیا  
 تو بستر خالی اوس کا اوس سے پایا  
 پھر اگھر گھر میں وہ حیران و خاموش  
 گرا بستر پہ اوس کے ہو کے بے ہوش  
 کئے رمال کے یاں دن کو اوقات  
 منجم کے پڑے رہتے تھے گھر رات  
 انھوں کو ایک دن رجم ان پہ آیا  
 عمل اپنے سے ان کو یوں بتایا  
 نہ ہو تم زندگی سے اوس کی مایوس  
 طرف مشرق کے یاں سے ہے وہ سوکوس  
 پر ایسے اک بیاباں میں کہیں ہے  
 گذر انسان کا جس جا نہیں ہے

باپ اپنے کچھ دوستوں کو لے کر اس صحرا کی طرف چلا۔

غرض پہونچے یہ جوں توں بعد یک ماہ  
 نواہی بچ اس صحرا کے ناگاہ  
 نظر آیا عجب صحرا لق و دق  
 کہ دیکھے سے جگر ہو شیر کا شق  
 بیاباں تھا وہ ایسا وحشت انگیز  
 کہ وحشت جس کی تھی عالم میں خوں ریز  
 کہ ناگہ اک نسیم آئی اودھر سے  
 جہاں بیٹھا تھا وہ آوارہ گھر سے  
 نظر آیا اسے یوں اس کا دل بند  
 کہ اوس میں وحشت اوس صحرا سے دو چند  
 لگا کہنے کہ سن لے اے مری جاں  
 میں تیرے روم روم اوپر سے قرباں  
 کہے گا تو جو کچھ وہ ہی کروں گا  
 رضا میں تیری جیوں، مروں گا  
 پر اب بہر خدا چل گھر کو یاں سے  
 مجھے بیزار مت کر میری جاں سے  
 یہ کہہ کر اوس کے قدموں پر گرا جب  
 ہوا راضی وہ گھر کے چلنے کو تب

لڑکا گھر تو واپس آگیا۔ لیکن اس کی حالت وہی رہی۔ آخر  
 جب آیا تنگ وہ گھبرا کے اک روز  
 چلا پھر گھر سے بھرتا آو جاں سوز  
 چلے ساتھ اوس کے سب روتے ہوئے زار  
 کہ جوں شبنم سے نیکیں گرد گل خار  
 اس وقت لڑکے کے ہمدرد، ہوا خواہ اور والدین سب اُس کے ساتھ تھے۔ شہر شہر گلی گلی یہ  
 قافلہ اُس لڑکے کے پیچھے چلا رہا۔ آخر تنگ آکر:  
 تھکے جب سو طرح کی کر کے تدبیر  
 کیا ناچار اس وحشی کو زنجیر  
 لیکن اس کے جنون میں کوئی کمی نہیں آئی۔ ایک دن وہ زنجیروں سمیت فرار ہو گیا اور حسن  
 اتفاق سے راستے میں اُس کا محبوب مل گیا۔

سنی زنجیر کی جب اون نے آواز  
 کھلا ہے دل پہ اوس کے پردہ راز  
 ہوا سنتے ہی شوق اوس کو دوبالا  
 قدم پر اوس کے سر جاتے ہی ڈالا  
 لگا کہنے کہ میری جان عاشق  
 میں سرتاپا ترے قربان عاشق  
 اب اوٹھ کر یاں سے تو چل گھر کو میرے  
 کروں شانہ میں بالوں بچ حیرے

اس کے بعد شاہ عالم اور نواب وزیر الممالک آصف الدولہ کی مدح میں اشعار ہیں۔ بحیثیت مجموعی یہ غیر دل چسپ مثنوی ہے۔ بعض مقامات پر سودا نے ناقابل یقین بلکہ مضحکہ خیز اشعار کہے ہیں۔

### واسوخت

مختلف اصناف کی طرح واسوخت بھی اردو شاعری میں فارسی ہی سے آئی ہے۔ وحشی یزدی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ فارسی میں پہلا واسوخت اُس نے کہا تھا مگر واسوخت کی اصطلاح اردو میں وضع ہوئی ہے۔ فارسی میں وحشی نے اس کا عنوان مسدس اور مثنیٰ دیا تھا۔ اردو میں واسوخت نگاری کی ابتدا پہلے ہوئی اور اس کا نام واسوخت بعد میں پڑا۔ شاہ مبارک آباد کی واسوخت کا عنوان ”جوش و خروش“ ہے۔ حاتم نے ”سوز و گداز“ کے عنوان سے ایک ترکیب بند کہا ہے جو دراصل واسوخت ہے۔ غالباً میر پہلے شاعر ہیں جنہوں نے اس صنف کو واسوخت کا نام دیا۔ ۱۔

واسوخت کے اجزائے ترکیبی قہیدے اور مرثیے کی طرح مخصوص ہوتے ہیں جو اس طرح ہیں۔

۱۔ ابتدا میں عشق کی تعریف ہوتی ہے یہاں شاعر یہ بھی بتاتا ہے کہ پہلے وہ عشق و محبت کی دنیا سے بہت دور تھا۔

۲۔ پھر اپنے آغازِ عشق کا قصہ بیان کرتا ہے

۳۔ اُن دنوں کا ذکر کرتا ہے جب اُسے وصل یا رنجیب تھا۔

۴۔ محبوب کے خُسن کے ساتھ اس کی معصومیت، سادگی اور بھول پن کی تعریف کرتا ہے۔

۵۔ اس کے بعد اُس کی بے وفائی کا شکوہ اور اپنی خستہ حالی کا بیان کرتا ہے۔

۱۔ میں نے اس باب کے لکھنے میں اپنے عزیز شاگرد انیس حسن پچراہ دہلی کالج کے غیر مطبوعہ مقالہ ”اردو میں واسوخت نگاری“ سے استفادہ کیا ہے۔ جس کے لیے میں اُن کا شکر گزار ہوں۔ اُن کا مقالہ بہت جلد کتابی صورت میں شائع ہو رہا ہے۔ (خ-۱)

۶۔ آخر میں شاعر محبوب کو بُرا بھلا کہتا ہے۔ بعض اوقات اس کی بد صورتی کا بیان کر کے ایک نئے محبوب کی تعریف کرتا ہے اور پھر اُس سے اپنے تعلقات کا ذکر کرتا ہے۔

دکنی شاعری میں واسوخت کے اشعار ضرور مل جاتے ہیں لیکن مکمل واسوخت نہیں ملتا۔ غالباً بحیثیت صنفِ سخن واسوخت کی ابتدا شمالی ہندوستان ہی میں ہوئی۔ دورِ ایہام گویان میں آبرو اور حاتم دونوں کے ہاں واسوخت ملتے ہیں۔ چوں کہ آبرو عمر میں بڑے تھے۔ اس لیے قیاس یہی کہتا ہے کہ وہ اردو کے پہلے واسوخت نگار تھے۔

سودا نے بھی ایک واسوخت کہا تھا لیکن اس کے اجزائے ترکیبی وہ نہیں ہیں جو اوپر بیان کیے گئے۔ نہ صرف سودا بلکہ اس عہد کے کسی بھی شاعر کے ہاں ایسا واسوخت نہیں ملتا جس میں یہ تمام اجزائے ترکیبی موجود ہوں۔ ان اجزائے کا تعین غالباً بعد کے زمانے میں ہوا ہے۔ سودا نے واسوخت کے پہلے بند میں خدا سے دعا مانگی ہے کہ اُسے ”زلفِ خواباں“ کے جنجال سے نکال دے۔

یا الہی کہوں اب کس سے میں اپنا احوال  
زلفِ خواباں کی مرے دل کو ہوئی ہے جنجال  
یا رب اس بچ سے میرے دل شیدا کو نکال  
کاش اب موت ہو یا دور ہو یہ سر سے وہاں  
تجھ سوا غیر سے میں کیونکہ کہوں دل کا حال  
تیری ہی ذات سے میرا یہی ہر دم ہے سوال

ساز آباد خدایا دلی دیرانے را  
یا مدہ مہربتاں بچ مسلمانے را

اس کے بعد شاعر دل کو بُرا بھلا کہتا ہے جو لاکھ سمجھانے کے باوجود گرفتارِ محبت ہو کر رہا پھر

شاعر خود کو یہ کہہ کر سمجھاتا ہے۔

کیا کرے دل بھی بُرا ہے یہ محبت کا فسوں  
کب تلک دل سے میں اس کاوش بیجا کو کروں  
اس غم و درد و بلا بچ کہاں تک میں مروں  
آتش غم سے طرح شمع کے رو رو کے جلوں  
اب نہیں تاب زباں کو جو میں خاموش رہوں  
کیونکہ احوالِ دل اُس شوخ سے جا کر یہ کہوں

شرح ایں آتشِ جانسوز نکلتن تاکے  
سوختم سوختم ایں رازِ نہشتن تاکے

شاعر اپنے محبوب سے پوچھتا ہے کہ وہ وعدے کیا ہوئے۔ یہ عہد شکنی کیوں؟ اور

سچ کہو کس سے تمھاری نئی لاگی ہے لگن

کیا ہوا کس کو ٹھگا کس کا لیا ہاتھ میں من

تم کو حسین اور خوب رو ہم ہی نے تو بنایا ہے ورنہ:

خوبرویوں میں تجھے کن نے بنایا سجدار

ورنہ خواباں میں نہ کرتا تھا کوئی جھکو شمار

بلکہ پھرتا تھا تو ہر ایک کے گھر سو سو بار

اپنی مجلس میں نہ دیتا تھا کوئی جھکو بار

ایں زماں جائے تو دردیدہ مردم شدہ است

روے زیبائے تو از دیدہ من گم شدہ است

پھر سودا اپنے محبوب کو بتاتے ہیں کہ حسینوں کی دنیا میں کمی نہیں ہے۔

شیخہ دل کو مرے سنگِ ستم سے پھوڑا  
دل نے میرے بھی منہ اب تیری طرف سے موڑا  
تم جو کچھ ساتھ کیا میرے نہیں وہ تھوڑا  
مجھ کو بھاتا نہیں ہر دم کا ترا نکٹوڑا  
خوردیوں کا جہاں بچ نہیں کچھ توڑا  
شعر وحشی کا دل اپنے پہ یہ میں لکھ چھوڑا  
میدہم جائے دگر دل بدل آراے دگر  
چشم خود فرشِ کنم زیرِ کفِ پاے دگر

پھر سودا اُن غیروں کو برا بھلا کہتے ہیں جن کی صحبت میں رہ کر ان کا محبوب بگڑا ہے اور  
آخر میں اُس سے التجا کرتے ہیں۔

اس قدر کس لیے بیزار ہے مجھ زار سے تو  
مت چھپا منہ کو جن اپنے خریدار سے تو  
چشم پوشی تو نہ کر عاشقِ بیمار سے تو  
مجھ کو محروم نہ رکھ لذتِ دیدار سے تو  
سُن لے یہ بات میاں اپنے گرفتار سے تو  
دیکھ ایدھر بھی کبھی ایک نظر پیار سے تو

نگیے جانب سودا گہہ دگا ہے کافی است  
بلکہ از لطف باونیم نگا ہے کافی است

یہ واسوخت اردو واسوخت نگاری کے ابتدائی نقوش میں سے ہے اور اسی بنا پر اہمیت رکھتا ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ بعد کے زمانے میں اتنے اعلیٰ درجے کے واسوخت لکھے گئے ہیں کہ ان کے مقابلے میں یہ بہت معمولی اور سطحی سی تصنیف ہے۔

### رباعیات :-

فارسی اور اردو شاعری میں رباعی ایک اہم صنف ہے لیکن اسے وہ مقبولیت حاصل نہیں ہوئی جو غزل، قصیدہ، مرثیہ اور مثنوی کو رہی ہے۔ حالاں کہ بیشتر بڑے شاعروں کے کلیات میں کچھ نہ کچھ رباعیاں مل جاتی ہیں۔ بہت کم شاعر ایسے ہیں جن کا سرمایہ شعری صرف رباعیات ہی ہو۔ فارسی میں ابوسعید ابوالخیر، عمر خیام اور شاہ سرمد کی شہرت کی بنیاد رباعیوں پر ہے۔ فرید الدین عطار اور حافظ کے دیوان میں رباعیات کی تعداد اچھی خاصی ہے۔

دکنی اردو میں محمد قلی قطب شاہ، ملا دجینی، خواجہ شامی، نصرتی، ولی اور سراج اورنگ آبادی وغیرہ کے ہاں رباعیاں ملتی ہیں۔ شمالی ہند میں اٹھارویں صدی کے بیشتر شعرا کے دواوین میں رباعیاں موجود ہیں۔

سودا نے بھی اس صنفِ سخن پر طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے کلیات مطبوعہ مطبع مصطفائی میں ۸۰ رباعیاں ہیں۔ اس میں غزل کے دو اشعار کو بھی رباعی کی طرح شامل کر دیا گیا ہے اور احسن اللہ خاں بیان کی بھی ایک رباعی آگئی ہے۔ بعض مقامات پر رباعی کی مقررہ بحروں سے بھی انحراف نظر آتا ہے۔

رباعیوں میں سودا کا موضوع سخن وہی ہے جو عام طور پر ان کے پیش روؤں کی رباعیوں کا ہے۔ یہاں الگ الگ عنوانات کے تحت ان رباعیات کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

۱۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی، رباعیات اردو، لکھنؤ، ۱۹۶۳ء  
۲۔ تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو۔ ”سودا کا اجمالی کلام“۔



### عشقیہ:-

سودا نے سب سے زیادہ عشقیہ رباعیاں کہی ہیں۔ ان رباعیوں کے موضوعات وہی ہیں جو سودا کی غزل کے ہیں یعنی یہاں بھی کوئی خاص بات نہیں کہی گئی۔ ان رباعیوں کی خوبی صرف سودا کا انداز بیان ہے۔ ایک تشبیہ ملاحظہ ہو۔

ہے فوج سے غمزہ کے نہایت بیداد  
نت اٹھ ہے مرا خرمین طاقت برباد  
یہ حال رہے ہے دل کا جیسے دہقاں  
لٹتے ہوئے کھیت کی کرے ہے فریاد

اس رباعی میں تکرار الفاظ نے حسن پیدا کر دیا ہے۔

آیا ہوں بتنگ دُور رہتے رہتے  
لوگوں سے تھکا پیام کہتے کہتے  
روتا ہوں کہ سلی اشک جاری ہووے  
پہونچوں میں گلی میں اس کی بہتے بہتے

### متصوفانہ:-

متصوفانہ رباعیوں میں سودا نے مذہبی رواداری، بے ثباتی دنیا، قناعت اور صبر و استقلال کے مضامین باندھے ہیں۔ سودا کا عقیدہ ہے کہ خدا دیر و حرم میں نہیں خود انسان میں ہے۔ اسے خود سے باہر تلاش کرنا بے سود ہے۔

ایک رباعی ہے:

ہر سو تری تحقیق میں تھے ہم سرگرم  
 تھا گاہ یقین کعبے پہ کہ دیر پہ بھرم  
 پایا غرض آپ ہی میں تھے پر اون کو  
 سجدہ جو کیجیے تو نہیں رہتی شرم  
 ایک رباعی میں سودا شیخ کو طعنہ دیتے ہیں کہ حیران میں جا کر طواف کرنا جلا ہے کے تانے  
 بانے سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔

اے شیخ حرم تک تھے جانا آنا  
 یہ طوف جلا ہے کا ہے تانا بانا  
 پہچانے گا داں کیا او سے حیراں ہوں میں  
 جس کو حرم دل میں نہ تیں پہچانا  
 ایک رباعی میں سودا کہتے ہیں کہ وہ لوگ تو خدا کا شکر ادا کرتے ہی ہیں جنہیں اُس نے  
 زرو مال اور دولت و اقبال دیا ہے لیکن شاکر تو وہی ہے جو ہر حال میں خدا کا شکر کرے۔  
 کتنوں کا جہاں میں زرو مال ہے شکر  
 کتنوں کا ہی با دولت و اقبال ہے شکر  
 یوں شکر تو سب کرتے ہیں لیکن سودا  
 شاکر ہے وہی جس کو بہر حال ہے شکر

صوفی شاعروں کا یہ محبوب موضوع ہے کہ دنیا چند روز کی ہے۔ اس سے دل لگا کر کسی کو کچھ  
 نہیں ملا۔ عقل مندی یہی ہے کہ اس فاحشہ سے اپنا دامن چھڑا لیا جائے۔

دنیا ہمیں کہتی ہے کہ دل مجھ سے موڑ  
 مجھ فاحشہ پر تو نہ یہ جی جامہ توڑ  
 داڑھی کی سیاہی پہ سفیدی دوڑی  
 اب رات نہیں صبح ہوئی ہے بس چھوڑ  
 اس موضوع پر سودا کی یہ رباعی بہت مشہور ہے۔

سودا بچے دنیا تو بہر سو کب تک  
 آوارہ ازیں کوچہ بآں کو کب تک  
 حاصل یہی اس سے ناکہ تا دنیا ہووے  
 بالفرض ہوا یوں بھی تو پھر تو کب تک

اسی موضوع پر ایک مستزاد رباعی ہے۔

لولی سے میں دنیا کی کہانیوں جا کر  
 اب ایک کی ہو رہ نہ پھرا کر گھر گھر  
 بولی کہ جو کوئی مرد ہے سو تو جھکو  
 باندھی ہے جنھوں نے مرے رکھنے پہ کر  
 سن اے بے پرد  
 تیں صورت نزد  
 رکھتا ہی نہیں  
 سو ہیں نامرد

مذہبی:

دو تین رباعیاں ایسی بھی ہیں جو مذہبی مسائل اور موضوعات پر کہی گئی ہیں۔ مثلاً  
 جھکو ہر چند نہیں شیعہ و سنی سے کام  
 پر یہ سمجھا ہوں کہ اس دور میں تھے بارہ امام

اُن سوا ہو جو کوئی ہے وہ امامِ تسبیح  
اُس تلک جائے سے موقوف ہو اللہ کا نام

ایک اور رباعی ملاحظہ ہو۔

جس ذات کو آفاق میں کہتے ہیں احد  
وہ اور امام ایک ہیں نزدِ خرد  
گر ہندسہ داں ہے تو سمجھ لے تعداد  
کتنے ہیں احد کے بحسابِ ابجد

اخلاقی:-

اگر کوئی شخص کسی پر مہربانی کرے تو اسے مغرور نہیں ہونا چاہیے۔ اُس کا فرض ہے کہ اگر کسی کو کچھ دے تو اس طرح کہ سیدھے ہاتھ کی اُلٹے ہاتھ کو خبر نہ ہو۔

افسوس کریہوں میں نہیں یہ دستور  
مفلس پہ کرم کر کے نہ ہوویں مغرور  
جھکتا ہے اگر شاخِ ثمر دار کا ہاتھ  
پھل دے کے وہیں آپ کو کھینچے ہے دور

اسی طرح ایک رباعی میں سودا نے یہ تعلیم دی ہے کہ تو اگر بلندی میں چاند سے بھی دس گنا زیادہ ہے تو اپنے سے پست لوگوں کو دیکھ کر خرسند نہ ہو۔

گرمہ سے بلندی میں ہوا تو وہ چند  
پستوں کی طرف دیکھ کے مت ہو خرسند

جتنے کہ بلندوں کی ہیں نظروں میں پست  
پستوں کی بھی نظروں میں ہیں اوتنے ہی بلند

مدحیہ:-

چوں کہ سودا قصیدے کے شاعر ہیں۔ اس لیے ان کے قصیدوں کی طرح مدحیہ رباعیاں  
بھی کامیاب ہیں۔

ایوانِ عدالت میں تمہارے اے شاہ  
کیا ظلم کو ہے دخل عیاذاً باللہ  
شیشے کا جو داں طاق سے رہے ہے پاؤں  
پتھر سے نکلتی ہے صدا بسم اللہ

اگرچہ رباعی میں مبالغہ سے کام لیا گیا ہے۔ لیکن اندازِ بیان ایسا ہے کہ اس مبالغے پر  
حقیقت کو بھی قربان کیا جاسکتا ہے۔ ایسی ہی ایک رباعی اور ملاحظہ ہو۔

تجھ پاس گدا کب آ کے ایسا بولا  
جس کو نہ جواہر میں تو لے کر تو لا  
یاں تک تو ترے ہاتھ نے بخشے یا قوت  
جب طشت نے وقت فصد دامن کھولا

ہجویہ:-

سودا نے ندرت اور ساجد کی ہجو میں رباعیاں بھی کہی ہیں جو ”ہجو گوئی“ کے تحت نقل کی گئی  
ہیں۔ تین ہجویہ رباعیاں نقش ہیں جو مطبع مصطفائی کے نسخے میں شامل ہیں۔ آئی نے دو

رباعیاں تو بالکل ہی نقل نہیں کیں اور ایک رباعی لفظ کی ترمیم کے ساتھ نقل کی ہے۔

تعلیٰ:

تین رباعیاں ایسی بھی ہیں جن میں سودا نے تعلیٰ سے کام لیا ہے۔ ایک رباعی میں سودا نے خود کو فن شاعری کا پیغمبر اور خدا کے سخن بتایا ہے۔

سودا شعرا میں ہے بڑائی تجھ کو

تشریف سخن عرش سے آئی تجھ کو

عالم تجھے اس فن میں پیہر سمجھا

پوجا جہلا نے بہ خدائی تجھ کو

ایک اور رباعی میں سودا خود کو ”خاقانی ثانی“ اور ”نطق کا خلاق معانی“ بتاتے ہیں۔

سودا بہ جہاں اپنی زبانی تو ہے

آفاق میں خاقانی ثانی تو ہے

گو نطق کا ہر چند نہیں تو خالق

پر نطق کا خلاق معانی تو ہے

سودا کی رباعیاں دوسرے اور تیسرے درجے کی ہیں۔ ان میں وہی باتیں کہی گئی ہیں جو سودا غزل میں کہتے ہیں۔

پہیلیاں

ہندوستانی ادب میں پہلی کہنے کا رواج بہت قدیم ہے۔ اس کی قدیم ترین مثالیں ویدوں

میں ملتی ہیں، جن میں بعض کہانیوں اور پہیلیوں کو برہمودے ب্রہمودے کہا جاتا تھا۔<sup>۱</sup> سنسکرت میں پہیلی کو پڑھیلیکا پڑھیلیکا اور پہیلی کہنے کے فن کو پڑھیلی پڑھیلی کہا جاتا ہے۔ اردو لفظ پہیلی اسی کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ ہندوستان کی بعض زبانوں میں اسے بوجھول بھی کہا جاتا ہے۔ مگر اردو میں صرف پہیلی ہی رائج ہے۔

### پہیلی میں

- ۱- ایسا ایک لفظ استعمال کیا جاتا ہے جس کے کئی معنی ہوں۔
- ۲- یا ایک ہی لفظ کو دو بار مختلف معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔
- عہد قدیم کے ایک نقاد و دہڑی دہڑی نے اپنی کتاب کاویदर्श میں پہیلی کی تیس قسمیں بتائی ہیں۔ دہڑی سے پہلے صرف سولہ قسمیں مانی جاتی تھیں۔<sup>۲</sup>
- چھٹی صدی کے ایک نقاد بھامہ نے کاویالکار میں لکھا ہے کہ رام شرما چوتھ پہلے شاعر ہیں جنہوں نے پہیلی کہی۔<sup>۳</sup>
- بظاہر پہیلی کا مقصد بچوں کی تفریح طبع کے لیے کچھ سامان فراہم کرنا ہے۔ انھیں جواب تلاش کرنے میں بہت لطف آتا ہے۔<sup>۴</sup>
- پہیلی کی اہمیت یہ ہے کہ ایک مخصوص سماج کی تہذیب و تمدن، لباس، عام استعمال کی چیزیں، رہن سہن وغیرہ کے مطالعے کے لیے پہیلیوں سے بہت مدد ملتی ہے۔ مثلاً سودا نے بورانی، مٹی، ارگیا، کلنگر، شمشیر، سپر، باز، انار، آشپازی، حمام، گھڑیاں، ستار و طنبور، پاؤں، ہت پھول، بندوق، طبلہ، مردنگ وغیرہ کی پہیلیاں کہی ہیں۔

1- Monier Williams, Sanskrit-English Dictionary, England, 1899, P. 741.  
 ۲. دیپنند वर्मा, हिन्दी साहित्य कोश, बनारस, १९५८, पृ० ४६२ -- ३ वही।  
 ३. रामधन शर्मा कूटकाव्य, दिल्ली। १९६३ पृ०. १२--१३।  
 ۴. कृष्णलाल हंस, निमाड़ी और उसका साहित्य, इलाहाबाद, १९६०। पृ० ३११--३१२।

کلیاتِ سودا مرتبہ آسی میں ایک سونو پہیلیاں ہیں، جن میں فارسی اور عربی کے ساتھ ٹھیکہ ہندی الفاظ کا برجستہ استعمال کیا گیا ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ سودا کو ہندی زبان پر اچھا خاصا عبور تھا۔ یہ پہیلیاں ایک شعر سے لے کر چھ اشعار تک کی ہیں۔ چند دل چسپ پہیلیاں ملاحظہ ہوں۔

۱۔ گال پھولائے لینا تاکے  
جب منہ کھولے سر کو کانٹے  
(گلگیر)

۲۔ آدھا اتار سارا ہاتھی  
جن دیکھا اُن لایا چھاتی  
(ارگجا)

۳۔ رات سمیں اک میوہ آیا  
پھولوں پاتوں سب کو بھایا  
آگ دے وہ ہووے روکھ  
پانی دیے وہ جاوے سوکھ  
(اتار آتھبازی)

۴۔ ایک پرکھ میں ایسا دیکھا  
سیس کم سے وا کا لیکھا  
شاہ و گدا میں وا کا ناؤں  
بوجھ پہیلی یا چھانڈو گاؤں  
(تکلیہ)



## سودا تذکرہ نگاروں اور نقادوں کی نظر میں

سودا ان خوش نصیب فن کاروں میں ہیں جو اپنی زندگی ہی میں شہرت اور مقبولیت کی انتہائی بلند یوں پر پہنچ جاتے ہیں۔ ہندو پاک اور بعض غیر ملکی لائبریریوں میں کلام سودا کے لا تعداد قلمی نسخے ملتے ہیں۔ اردو شاعروں میں جتنے قلمی دیوان و کلیات یقیناً اور سودا کے ملتے ہیں شاید کسی اور کے نہیں۔ جو اس بات کا ثبوت ہے کہ ان دونوں کو دوسرے شعرا کی نسبت زیادہ مقبولیت حاصل رہی۔ یقیناً کی شہرت ایک مخصوص زمانے تک رہی۔ لیکن سودا کا شمار آج بھی ایوان اردو کے اہم ستونوں میں ہوتا ہے۔

شاید ”گلشن گفتار“ جنوبی ہند کا پہلا تذکرہ ہے جس میں سودا کا ذکر آیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک جنوبی ہند میں سودا سے بہت کم لوگ واقف تھے اور کم از کم تذکرے کے مولف خواجہ خاں حمید اور نگ آبادی کو تو سودا کے حالات کا بہت کم علم تھا۔ انھوں نے لکھا ہے۔

”.....سودا..... منصب دار بودہ۔ متوطن شاہ جہاں آباد۔ مرد سودا مزاج و کم سخن۔“

گلشن گفتار کا سنہ تالیف ۱۱۶۵ھ ہے۔ اسی سال میر کے نکاث اشعار کی اشاعت ہوئی۔ میر نے جن الفاظ میں سودا کی تعریف کی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کچھ حق دوستی بھی ادا کیا گیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

”.....غزل قصیدہ و مثنوی و قطعہ و مخمس و رباعی ہمہ را خوب می گوید

سر آمد شعرائے ہندی اوست۔ بسیار خوش گواست۔ بلاگردان ہر  
شعرش طرف لطف رستہ رستہ، درچمن بندی الفاظش گل معنی دستہ  
دستہ۔ ہر مصرع برجستہ اش را سرو آزاد بندہ، پیش فکر عالیشان طبع عالی  
شرمندہ، شاعر ریختہ، چنان چہ ملک الشعرائی ریختہ اور اشایدے

سید فتح علی حسینی گردیزی نے ”تذکرہ ریختہ گویان“ میں لکھا ہے:

”نکتہ دان بے ہتا میرزا محمد رفیع سودا مردے است سپاہی پیشہ و  
درست اندیشہ، حقا کہ رتبہ شعرش عالی است و سخن درد مندانه اش  
حالی، امروز در میدان گفتگو گویے سبقت از اقران و امثال خودی  
رباید و داد معنی یابی و رنگین خیالی می دهد“۔

شیخ محمد قیام الدین قائم کو سودا سے تلمذ تھا۔ وہ سودا کے بارے میں لکھتے ہیں:

”عندلیب خوش نغمہ گلشن روزگار گل سرسبد محافل اشعار یگانہ کشور  
افضل نقادہ دودمان کمال انتخاب نسخہ صاحب کمالے..... بالفعل  
مخاطب ملک الشعرائے کہ مہین پایہ سخنوران است اعزاز و امتیاز  
دارد“۔

لگ بھگ اسی زمانے میں جنوبی ہند میں ایک اور تذکرہ ”ریاض حسنی“ لکھا گیا اس کا  
مولف خواجہ عنایت اللہ خاں فتوت بھی سودا کے حالات سے کچھ زیادہ واقف نہیں معلوم  
ہوتا۔ اس نے لکھا ہے:

”معنی یاب بے ہتا مرزا محمد رفیع سودا، فخر سخن گویان جہاں آباد  
است بلبل طبعش از آئینہ نماے محمد میر میر گویا بندہ، چنان چہ سراپد:

۱۔ نکات الشعراء، ص ۳۱

۲۔ تذکرہ ریختہ گویان، ص ۶۷

۳۔ مخزن نکات، ص ۳۵-۳۶

سودا تو اس غزل کو غزل در غزل ہی لکھ

ہونا ہے تجھ کو میر سے استاد کی طرف ۱۔

اس شعر سے فتوت کو دھوکا ہوا۔ یہاں میر سے مراد میر تقی میر سے ہے جو سودا کے استاد نہیں ہم عصر ہیں۔

کچھی نرائن شفیق نے اپنا تذکرہ ۱۱۷۵ھ میں تالیف کیا۔ اس وقت تک میر اور گردیزی کے تذکرے جنوبی ہند میں پہنچ چکے تھے۔ انہی تذکروں سے شمالی ہند کے شعرا کو وہاں مقبولیت حاصل ہوئی۔ شفیق نے ان دونوں تذکروں سے استفادے کا اعتراف بھی کیا ہے۔ وہ شمالی ہند کے شاعروں میں سب سے زیادہ مدایح یقین کے ہیں۔ یقین کے بعد جن شاعروں کی عظمت کے وہ معترف ہیں۔ ان میں سودا بھی ہیں۔ سودا کے ترجمے میں انھوں نے لکھا ہے۔

”..... صیاد غزالان سخن و سرآمد نکتہ سخنان این فن است۔ شاہین  
زبان ناقص بیان را کہ پارہ کجے بیش نیست، چه جرأت کہ بہ ہوائے  
توصیف آن ہمارے اوج نازک خیالے، چناں کہ باید، بال  
کشاید..... و طوطیان ہندوستان شکر بیانی ازان آئینہ دل آموختہ۔  
گویا نزاکت مضامین دلچسپ چوں حسن بے یوسف بذاتش حسن  
اختتام پذیرفتہ..... اگر صریح کلکش را ہدم اعجاز مسیحا نگارم بجا، کہ دل  
مردگان را حلول جان تازہ ازاں متصور۔ و اگر چشمہ خضر در ظلمات  
الفاظ نوازش پندارم روا.....“۔ ۲

میر حسن کے والد میر ضاحک سے سودا کا زیر دست معرکہ ہوا تھا۔ دونوں طرف سے خوب  
خوب ہجوئیں کہی گئی تھیں۔ بلکہ سودا نے جو میر ضاحک کی ہجوئیں کہی تھیں۔ ان میں بعض  
ہجوئیں تو انتہائی فحش ہیں۔ اس سب کے باوجود میر حسن پر اس معرکہ کا کوئی اثر نظر نہیں

آتا۔ انھوں نے کھلے دل سے سودا کی شاعرانہ صلاحیتوں کا اعتراف کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

”استاد استادان کا مل وقادر۔ سرآمد شعراے زماں، درمیدان  
نزاکت بیان فکرش چوں مہر گرم تازست، و در عرصہ لطافت و  
قدرت و متانت سخن بازوے فطرت اوچوں تیر راست انداز  
ست..... استاد شعراے عصر و مقتداے بلغائے دہر، میدان بیان او  
وسیع و طرز معانی او بدیع..... در قصیدہ و ہجوید بیضا دارد۔ قصائد  
عذب و دل آواز و بیان ہجو بلند۔ نظمیں طرب انگیز است، مردے  
ست از معجزات روزگار، خوش خلق و نیک خود یار باش..... در علم  
موسیقی نیز ماہرست و تصانیف بسیار در نفسیہ ہم دارد۔ تاحال مثال او  
در ہندوستان بخت نشاں کے بر نہ خاستہ ہے۔“

اسد علی خاں تمنا اورنگ آبادی نے ”گل عجائب“ میں سودا کی بہت تعریف کی ہے۔ مگر اس  
تعریف میں انشا پر دازی کو زیادہ دخل ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

”نکتہ سنج دانش و ستگاہ، خوش ذہن والا جاہ، دانشور یکتا مرزا محمد رفیع  
سودا۔ در معنی پروری و مضمون گستری ممتاز است و صافی ذہن  
وجودت طبعش بے انبار،..... ہے۔“

شورش عظیم آبادی لکھتے ہیں۔

”شعرا بخوبی تمام می گوید و مضامین تازہ و الفاظ بہ فصاحت و رنگین  
ادامی نماید، غرض قصائد و مثنوی و غزلیات و مخمس و رباعی ہمہ خوب می  
گوید۔ اگر ملک الشعراے ریختہ گویان خیال کنم رواست و گر

۱۔ تذکرہ شعراے اردو، ص ۸۲-۸۳

۲۔ اسد علی خاں تمنا اورنگ آبادی، گل عجائب، اورنگ آباد، ۱۹۳۶ء، ص ۵۷

پہلو ان اشعرا گویم بجاست ۱۔

مولوی قدرت اللہ شوق رام پوری نے لکھا ہے۔

”از اکمل و اشہر شعراے ریختہ گوے ہندوستان ست در ریختہ گوئی  
عدیل و نظیر خود در خطہ ہندوستان نداشت و دم استادی و ملک  
اشعرائی می زند۔ در غزل و مثنوی و رباعی یکماے وقت خود بودہ،  
خصوصاً در قصیدہ گوئی بے مثال و بے عدیل بود ۲۔“

حسین قلی خاں عاشقی نے لکھا ہے کہ تمام ریختہ گوئیں امام فن اور پیغمبر سخن مانتے ہیں۔  
قصائد سودا کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ وہ عرفی کے قصیدوں سے پہلو مارتے ہیں۔  
انھوں نے سودا کے ذکر میں لکھا ہے۔

”..... جمیع ریختہ گویان ہندوے را امام ایں فن و پیغمبر سخن می  
دانستند۔ اگرچہ جملہ طرز کلام را استادی بود حاوی الا در مدح و قدح  
کہ مراد از ہجو و قصیدہ باشد اعجاز بکار بردہ و قصائد ریختہ بر قصائد ملّا  
عرفی شیرازی پہلو بہ پہلو گفتہ..... مثل او کسے ریختہ گور ایں مرتبہ  
دست ندادہ۔ و کسانیکہ دم ریختہ گوئی می زند و زباں بایں دعوے می  
کشایند خوشہ چین در راہ نمودہ او بند کہ بر آں قدم می نہند ۳۔“

شیخ محمد وجیہ الدین عشقی نے اپنے تذکرے میں سودا کی مدح میں زمین اور آسمان کے  
قلا بے ملا دیے ہیں۔ اُن کا بیان ہے۔

”..... مردے مغنم الوجود، از یکہ تازان میدان سخنوری بود، تا حال  
در ہندوستان مینو نشان چنین شاعرے زبردست در فن ریختہ پیدا  
نگردیدہ و چنین صاحب جوہرے از کتم عدم سربہ عرصہ شہود نکشیدہ طبع

۱۔ دو تذکرے (شورش) ص ۳۷۹

۲۔ تكملة اشعرا (کلمی) ص ۲۹۶

۳۔ نشر عشق (کلمی) ص ۲۶۶

بلند ہمت کش کند فکر را بہ کنگرہ کیوان رسانیدہ و بنائے ریختہ را چوں  
دیوار ریختہ اوج استحکام بخشیدہ۔ بے شائبہ ریب اگر اور اسرار مدایں  
فن خوانم رواست و اگر قصائد اور اہم پلہ قصیدہ مرصع کہکشاں داغ  
بجا۔ دیوانش مطبوع طبایع جمیع سخن سخنان رنگین کلام است و کلامش و  
روزبان ہر خاص و عام اے۔

شاہ حمزہ نے سودا کو داغ سخن ان الفاظ میں دی ہے۔

”..... غزل و مثنوی و قطعہ و مخمس و رباعی ہمہ خوب می گوید۔ علی  
الخصوص در قصیدہ گوئی بازار بحر سامری می کشد و قصائدش باقصائد  
عربی پہلوی زنند“۔

گلشن سخن کے مولف مردان علی خاں جتلا اُن کی مدح میں رقم طراز ہیں۔

”عجبہ زماں و سرخیل ریختہ گویان ہندوستان بودہ، در جمیع فنون نظم،  
خاصہ در قصائد دقت بسیار بکار بردہ، بر زبان نکتہ سخنان بہ مسلم الثبوتی  
مشہور..... الحق مرتبہ ریختہ گوئی بجائے رسانیدہ کہ شاہباز بلند پرواز  
فکرت بہ پیرامون اوئی تواند پرید.....“۔

حکیم قدرت اللہ قاسم کو بھی سودا سے بہت عقیدت ہے۔ وہ ترجمہ سودا میں لکھتے ہیں۔

”..... دے شاعرے بود فصاحت بیان شیریں مقال بلاغت  
نشاں، عدیم المثال معنی یاب فصاحت آئین نکتہ پیرا بلاغت آگس  
فارس میدان سخنوری شہسوار مضمار ہنر گسری عندلیب خوش نواے  
گلستان سخن طرازی، بلبل دبستان سراے بوستان نکتہ پردازی قادر،  
ہرگونہ سخن ماہر پیشترے از اصول فن جم غفیرے از زبان دانان اہل

۱۔ دوتذکرے (مثنوی)، ص ۳۸۰

۲۔ فص الکلمات (قلمی) ورق ۱۷۱ الف

۳۔ گلشن سخن (قلمی) ورق ۵۶ ب

خن استفادہ ..... نمودہ از گفتار شعر خوبی اشعارش کھینچتے دارد کہ  
سامعہ نکتہ پرداز صاحب فراست داند طرز کلام صحت انتظامش  
حلاوتے دارد کہ ذائقہ طبع خن سخ صاحب گفتار شناسد..... ۱۔

مصطفیٰ نے سودا کے ذکر میں اُن کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف تو کیا ہے۔ لیکن کچھ ٹیڑھی  
ترچھی باتیں بھی کی ہیں۔ اسی وجہ سے مصطفیٰ اور شاگردانِ سودا میں زبردست معرکہ ہوا تھا۔  
جس کا تفصیلی ذکر ”جھوگوئی“ کے باب میں کیا جا چکا ہے۔ مصطفیٰ نے جہاں سودا کو صائب  
وقت اور خاقانی لکھا ہے وہاں اُن پر جہل اور سرقہ کا بھی الزام لگایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

”شیر پیشہ سخدانی مرد میدان پہلوانی..... در عصر خویش سر آمد  
شعراے ریختہ گو گذشتہ، بعضے اور ادریں فن بہ ملک الشعرائی پرستش  
می کنند، بعضے بہ سبب دریافت اغلاط صریح و توارد صاف در بعضے  
اشعارش بہ جہل و سرقہ اش نیز نسبت می دهند، غرض ہرچہ بود در  
روانی طبع نظیر خود نداشت۔ غزلہائے آبدار و قصیدہ ہائے سحر کار و  
جوبہا و مثنویہائے متعددہ و غیر ہم نگاشتہ۔ خامہ خیالش بر صفحہ روز  
یادگار است۔ دیوانش بہ فرنگ و صفایان رسیدہ، دیگرے ایں شہرت  
در خواب ندیدہ۔ اگر در مثال بندئی اشعار غزل صائب و نقش گویم  
بجا است و اگر در علو مراتب معانی ابیات قصیدہ خاقانی گویم روا۔  
نقاش اول نظم قصیدہ در زبان ریختہ اوست حالا ہر کہ گوید پیر و تجویش  
خواہد بود..... وہ سبب آگاہی علم موسیقی مرثیہ و سلام کہ گفتہ بر سوز  
نہادن آنہا نیز قادر۔ غرض کہ شخص جامع الکمالات بود ہر جا کہ می  
رفت عزت و حرمت تمام می یافت ۲۔

شاید ہی کوئی تذکرہ نگار ایسا ہو جس نے سودا کی قصیدہ گوئی اور جھوگوئی کی تعریف نہ کی ہو۔  
بلکہ بعض مورخین نے بھی سودا کے اس فن کی تعریف کی ہے۔ سلطان علی حسینی صفوی نے

اپنی تاریخ ”معدن السعادت“ میں لکھا ہے۔

”..... شعر ہندی خوب می گفت، خصوصاً مدح و ذم کہ در اں باب  
یگانہ روزگار گشتہ آخر رفتہ رفتہ بدرجہ ملک الشعرائی رسید“۔

سید احمد علی خاں یکتا نے بھی سودا کی قصیدہ گوئی کے بارے میں وہی کچھ کہا ہے جو مصحفی  
نے لکھا تھا۔ ان کا بھی خیال ہے کہ استادانِ فارسی کے طرز پر اردو میں قصیدہ نگاری کی  
بنیاد سودا نے رکھی تھی۔ یکتا سودا کے بارے میں لکھتے ہیں۔

”..... رفتہ رفتہ لطافت ایں صناعت بہ تحقیق و تدقیق افع الفصحا وبلغ  
البلغا، خاقانی عصر، فردوسی زماں، انوری دہر، عرفی دوراں، وحید  
زماں، محقق یگانہ، ملک الشعراے ہند، سلطان ہر ظریف ورنہ..... بہ  
مرتبہ کمال رسید۔ تا آنکہ شانِ لطافت و صفائے آں بہ مذاق متاملان  
منصف بر شوکت فارسی چہ بیدہ۔ چرا کہ صورت قصائد را بہ طرز  
استادانِ فارسی اول کسے کہ بزبانِ ہندی بہ لوح ہستی حسن جلوہ وادہ،  
ہمیں نقاش معانی بودہ است..... بالجملہ آنچہ از محققان بہ تحقیق پیوستہ  
لیست کہ بمصرئی جواہر کلمات و نقادئی نقود الفاظ، از مردود و مقبول و  
متین و خفیف و مردوج و متروک، بہ قید کثرت محاورہ صحبت لغت کہ  
برزبان شرفا و نجبا و اعزہ جاری باشد و تالیف شعر بہ متانت تمام بہ طور  
قصائد اساتذہ از فارسی گویان، تعلق بہ مرزا محمد رفیع دارد“۔

یکتا کو سودا سے بہت زیادہ عقیدت ہے۔ انھوں نے دیباچے میں بھی سودا کا ذکر کیا ہے۔  
اوپر کا اقتباس دیباچہ دستور الفصاحت ہی سے لیا گیا ہے۔ تذکرے کی ابتدا سودا کے  
ترجے سے ہوتی ہے۔ انھوں نے سب سے زیادہ شاید سودا ہی کی تعریف کی ہے ”ج“۔

کچھ تذکرہ نگاروں نے غزلوں سے زیادہ سودا کے قصیدوں کی تعریف کی ہے۔ جس کا

۱۔ سلطان علی حسینی صفوی، معدن السعادت (قلمی) کلکتہ، ۳، ورق ۳۲۶ ب

۲۔ دستور الفصاحت، ص ۷۶

۳۔ ملاحظہ ہو۔ دستور الفصاحت، ص ۱۳-۱۸



مطلب ہے بعض ناقدین سودا کے قصیدوں کو غزلوں سے بہتر سمجھتے تھے نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کی رائے مختلف ہے۔ انھوں نے لکھا ہے:

”..... بافتون شاعری مناسبت تام دارد و بر اصناف سخن قدرت تمام  
و آنکہ بین الا نام شہرت پذیر است کہ قصیدہ اش بہ از غزل است  
حرفیست مہمل بہ زعم فقیر غزلش بہ از قصیدہ است و قصیدہ اش بہ از  
غزل اگر گوئی کہ غزل از اشعار پُر کن مملو است و قصیدہ از اں خالی  
زیادہ ازیں چہ تو اں گفت کہ قباحست ایں تحقیق پیر نظار گیاں دیوانش  
خالی و دخلۃ السر آنست کہ قدما را مانند فصحاے متاخرین پیرامون  
خاطر و جاگزین دل نہ ایں بود کہ ہر شعر دلپذیر آید و ہر بیت خاطر  
نشین لہذا در کلام ایناں رقص الجمل واقع شدہ، چہ در قصیدہ و چہ در  
و چہ غزل مع انہم اولون و الموجدون والا خاطر بہ جمیع فنون ہا احتذر  
للمتقہ مین و اللہ درمن قال العلم للمعاخرین پس بنا بریں مقدمات  
بریں بزرگان وار و گیر زہار سزاوار نیست ۱۔“

کچھ تذکرہ نگاروں نے سودا کی زبان کی غلطیوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ مثلاً  
عبد القادر چیف رام پوری نے اپنے روزنامے میں لکھا ہے۔

”مرزا رفیع السودا بہ قصیدہ گوئی و مضامین تازہ در مدح و قدح سرآمد  
روزگار خود بود، مگر پابند صحبت الفاظ زبان دیگر نبود، ”افتاد“ بجائے  
آفتابہ ”محل“ بہ سکون دوم بجائے متحرک و ”میرہن“ بہ سکون باو فتح  
را، بجائے فتح باو سکون را آورده است ۲۔“

کچھ اسی قسم کے اعتراضات انتہا نے بھی کیے ہیں۔ وہ دریائے لطافت میں لکھتے ہیں۔

”..... و ملک الشعراء زبان اردو مرزا محمد رفیع متخلص بہ سودا در

۱۔ کلشن بے خار، ص ۹۹-۱۰۰

۲۔ عبد القادر چیف رام پوری، روزنامہ عبد القادر (قلبی) رام پور، ورق ۷۴ الف

قصیدہ لپک و چھپک لفظ کلک را بہ معنی لشکر برائے ضرورت قافیہ  
ایراد نمودہ و کلک ہرگز لفظ اردو نیست ..... و لفظ تھوڑا کہ بہ معنی  
اندک آید باراً ہندی صحت دارد وہم چنین تھوڑی کہ مونث آں باشد  
مرزا مذکور خلاف باز است۔ یا گوری کہ بہ معنی چیز سفید روشن مونث  
باشد قافیہ کردہ شعر:

ساقِ سیمیں کو ترے دیکھ کے گوری گوری

شرم سے شمع ہوئی جاتی ہے تھوری تھوری

و باوادمجہول بغیر ہا گفتن ایں لفظ از قبیل تصرف ایں صاحبان است  
برائے قافیہ شعر خود، والا دراصل تھوڑا و تھوڑی باشد مثل ہاتھ بہ معنی  
دست کہ قافیہ ساتھ باشد، دراصل آں ہاء در تاء پنہاں است ایں  
صاحبان قافیہ بات وہیہات سازند ہاء را خلاف تلفظ جمہور  
کنند۔“

سعادت یار خاں رنگین نے بھی سودا کی زبان پر اعتراضات کیے ہیں۔ بلکہ انھوں نے بھی  
”گوری گوری“ اور ”تھوری تھوری“ والے شعر پر اعتراض کیا ہے۔ مجالس رنگین میں  
انھوں نے ایک واقعہ بیان کیا ہے۔ ایک دفعہ رنگین بنارس میں نواب نصیر الدین خاں کے  
ساتھ بیٹھے تھے۔ اس وقت کچھ اور لوگ بھی موجود تھے۔ بقول رنگین:

”..... ہر یک درخن گوئی دستگاہ خوب داشت، نواب موصوف ذکر  
شاعری مرزا رفیع برآوردند و تعریف می کردند شخصے در آں میاں کہ از  
بندہ کدورتے داشت خن تابایں جار ساینده کہ مثل او شاں ممکن نیست  
کہ پیدا شود گفتہ کہ شاعران سابق و حال در دسرناتق پیدا کردہ اندو  
گفت:

حریفان باد ہا خوردند و رفتند  
تہی خم خانہا کردند درختند  
گفتم ایں را ایں طور رشیدہ ام۔

حریفان باد ہا خوردند و مستند  
تہی خم خانہا کردند و مستند  
گفت کجا اند چون مکرر تکرار کرد ایں شعر سعدی خواندم  
جہاں را ندارند بے کتھا  
یکے چوں رود دیگر آید بجا  
گفت ایں در حق پادشاہاں ست گفتم ایں در حق شاعران باشد۔  
ہنوز ایں ابر رحمت دُر فشاں ست  
خم و خم خانہ بامہر و نشاں ست

گفت در کلام اوشاں غلطی محاورہ و خلل الفاظ اصلا نیست و لہجہ  
اردوئے معلیٰ را جلا و در اندو ملک الشعرا گذشتہ و حکم آیت وحدیث  
دارد دور اشعار ہائے دیگر شاعران چند نقصان ست، گفتم مقدمہ  
شاعری بسیار مشکل و رطب و یابس در کلام ہمہماست:

شعر گر اعجاز باشد بے بلند و پست نیست  
در ید بیضہ ہمہ انگشتجاہ یک دست نیست

گفت ایں سوائے مرزا رفیع در حق شاعران دگرست۔ ازیں سخن  
تاب نیاوردم و گفتم کہ مطلع و مقطع غزل اوشاں یاد دارم:

مگر آباد ہیں بے ہیں گانو  
تجھ بن اجڑے پڑے ہیں اپنے بھانو  
قیس و فرہاد کا نہیں کچھ ذکر  
اب تو سودا کا باجتا ہے نانو

قطع نظر از لفظ مگر و تجھ بن و بھانو قافیہ مقطع را باید دید کہ نام رانا نو  
گفتہ اند پس ایں کلام عربی و ترکی نیست کہ در فہم نیاید زبان روزمرہ  
است گفت کہ اگر درد یوان در یک غزل از غلطی سہوشدہ گفتہ شعر  
دیگر یاد دارم:

ساقی سیمیں کو تری دیکھ کے گوری گوری  
شع مجلس میں ہوئی جاتی ہے تھوری تھوری  
گفتہ بر قافیہ غور باید کرد گفت در زبان بھا کاڑے رارے می گویند و  
بدل می کنند گفتہ دروغ گورا حافظ نہ می باشد اوشاں در زبان ریختہ  
غزل می گفتند یاد در بھا کا مشق می کردند مطلع دیگر یاد دارم:  
عاشق تو نامراد ہیں بس اس قدر کہ ہم  
دل کو گنوا کے بیٹھ رہے مبر کر کے ہم  
گفتہ بر قافیہ ایں غور باید کرد۔

یہاں تو رنگین نے اشعار سودا پر صرف اعتراضات کیے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ خود کو  
سودا سے بڑا شاعر سمجھتے تھے۔ انھوں نے امتحان رنگین میں شاعروں کی چار قسمیں بتائی  
ہیں۔

- ۱- شاعر
- ۲- استاد
- ۳- ملک الشعرا
- ۴- علامہ

اردو میں شاعروں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ درد، میر، انشا، میر سوز، جرأت، مصحفی، میر حسن، نصیر اور ناسخ استاد ہیں۔ کیوں کہ یہ سب صاحب طرز ہیں۔ سودا ملک الشعرا ہیں۔ کیوں کہ وہ ایک سے زیادہ طرز پر قادر ہیں اور علامہ صرف رنگین ہیں کیوں کہ (۱) انھوں نے تمام یعنی ستائیس اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ (۲) سترہ زبانوں میں شعر کہے ہیں (۳) اور گیارہ بحروں میں مثنویاں کہی ہیں۔ تقریباً اسی قسم کے دعوے مصحفی نے کیے ہیں۔ انھوں نے تذکرہ ہندی میں سودا کو غزل میں صائب اور قصیدے میں خاقانی کہا ہے۔ لیکن اس سے پہلے عقد ثریا میں انھیں ”مرد کم علم“ بتا چکے ہیں۔ نظم میں بھی کبھی انھوں نے سودا کی فوقیت کو تسلیم کیا ہے اور کبھی یہ دعویٰ کیا ہے کہ ان کا قصیدہ سودا سے نفرت ہے۔ ایک قصیدہ میں کہتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ سودا نہیں اس عہد میں ہے  
یہ حرف بھی کیا محض غلط رکھتا ہے تشہیر  
سودا جو نہیں ہے تو نہ ہو میں تو ہوں بیضا  
سودا کی طرح مسند معنی پہ بہ توقیر  
پردیدۃ انصاف زبں کور ہیں مجھ کو  
دردی کش سودا بھی سمجھتے نہیں بے پیر

۱۔ استحقاقِ رنگین بحوالہ سعادت یار خاں رنگین، ص ۲۳۵-۲۳۶  
۲۔ عقد ثریا، ص ۳۲

سودا سے قصیدہ میں کہا نغزیکی نا  
کچھ اس کے سوا اور تو میری نہیں تقصیر ہے“  
ایک قصیدے میں یہ شعر بھی ہے۔

سودا تو یہاں کھیت رہا آدھی ہی رہ میں  
طے ہونہ سکا اس سے بھی صحراے طبیعت  
ایک اور قصیدہ میں خود کو میر اور مرزا پر ترجیح دی ہے۔

تلتا میں اس کے پلے میں ہوتا گر انوری  
مرزا و میر سے مجھے کیا ہے برابری  
مصطفیٰ نے تذکرہ ہندی میں جو سودا کے بارے میں لکھا تھا۔ اس کا جواب دیتے ہوئے  
سعادت خاں ناصر لکھنوی نے لکھا ہے۔

”ایسے استاد مسلم الثبوت کو میاں مصطفیٰ اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں  
کہ بہ سبب عدم دریافت اغلاط صریح دارد خیر ہرچہ بود در روانی طبع  
نظیر نداشت سعدی کیا خوب کہتا ہے:

نام نیکو رفتگاں ضالچ کن

تا بماند نام نیکت یاد گار

چند محاورے ٹھیکہ ہندی کے جو اس کے کلام میں واقع ہیں سب ان  
کا اور اہل زبان اردو کے ہیں۔ اور کتنے روز مرے ایسے ہیں کہ  
ہنوز دلی والے وہی بولتے ہیں چنانچہ لفظ شہران کی النہ پر اب  
بھی مذکر ہے۔ اس صورت سے الزام انکا متقدمین پر عائد نہیں

ہوسکتا ہے۔“

شاید آپ حیات پہلا تذکرہ ہے جس میں کلام سودا پر اتنی تفصیل سے تنقید کی گئی ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے تحقیق میں ضرور بے شمار غلطیاں کی ہیں لیکن اس سے انکار مشکل ہے کہ وہ ایک باکمال سخن فہم تھے۔ آپ حیات کے تمام صفحات ان کے فہم و ادراک اور تنقیدی شعور کا ثبوت ہیں۔ وہ سودا کے بارے میں لکھتے ہیں۔

”داسوخت، مخمس، ترجیع بند، مستزاد، قطعہ، رباعیاں، پہیلیاں وغیرہ اپنی اپنی طرز میں لا جواب ہیں۔ خصوصاً تاریخیں بے کم و کاست ایسی برخل و برجستہ واقع ہوئی ہیں کہ ان کے عدم شہرت کا تعجب ہے۔ غرض جو کچھ کہا ہے اسے اعلیٰ درجہ کمال پر پہنچایا ہے..... کل اہل سخن کا اتفاق ہے کہ مرزا اس فن میں استاد مسلم الثبوت تھے وہ ایسی طبیعت لے کر آئے تھے جو شعر اور فن انشا ہی کے واسطے پیدا ہوئی تھی..... ان کا کلام کہتا ہے کہ دل کا کنول ہر وقت کھلا رہتا تھا۔ اس پر سب رنگوں میں ہم رنگ اور ہر رنگ میں اپنی رنگ، جب دیکھو طبیعت شورش سے بھری اور جوش و خروش سے لبریز۔ نظم کی ہر فرع میں طبع آزمائی کی ہے اور کہیں رکے نہیں۔ چند صفتیں خاص ہیں جن سے ان کا کلام جملہ شعرا سے ممتاز معلوم ہوتا ہے۔ اول یہ کہ زبان پر حاکمانہ قدرت رکھتے ہیں۔ کلام کا زور مضمون کی نزاکت سے ایسا دست و گریباں ہے جیسے آگ کے شعلہ میں گرمی اور روشنی۔ بندش کی چستی اور ترکیب کی درستی سے لفظوں کو اس دروبست کے ساتھ پہلو بہ پہلو جڑتے ہیں گویا ولایتی طہنچے کی چاہیں چڑھی ہوئی ہیں۔ اور یہ خاص ان کا حصہ ہے۔ چنانچہ جب ان کے شعر میں سے کچھ بھول جائیں تو جب تک وہی لفظ وہاں نہ رکھے جائیں۔ شعر مزا ہی نہیں دیتا۔ خیالات نازک اور مضامین

تازہ باندھتے ہیں۔ اس باریک نقاشی پر ان کی فصاحت آئینہ کا کام دیتی ہے۔ تشبیہ اور استعارے ان کے ہاں ہیں مگر اسی قدر کہ جتنا کھانے میں نمک یا گلاب کے پھول پر رنگ۔ رنگینی کے پردے میں مطلب اصلی کو گم نہیں ہونے دیتے۔“

مولانا حالی نے سودا کے ایک شعر کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔

”.....نظیری کا شعر ہے:

بوے یارمن ازیں ست وفا می آید

گلم از دست بگیرد کہ از کار شدم

سودا کہتے ہیں:

کیفیت چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا

ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

اس میں شک نہیں کہ سودا نے اپنے شعر کی بنیاد نظیری کے مضمون پر رکھی ہے۔ بلکہ کہا جاسکتا ہے کہ تھوڑے سے تغیر کے ساتھ اس کا ترجمہ کر دیا ہے۔ لیکن بلاغت کے لحاظ سے سودا کا شعر نظیری سے بہت بڑھ گیا ہے۔ دوست کے یاد آنے سے بھی ممکن ہے کہ عاشق از خود رفتہ ہو جائے لیکن ساغر شراب کو دیکھ کر معشوق کی نشانی آنکھ کے تصور سے بے خود ہو جانا زیادہ قرین قیاس ہے۔ اس کے سوا ”از کار شدم“ میں وہ تقیم نہیں ہے جو اس میں ہے کہ ”چلا میں“ نہیں معلوم کہ آپ سے چلا یا دین و دنیا سے چلا۔ یا جگہ سے چلا یا کہاں سے چلا۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ”چلا میں“ ہمیشہ ایسے موقع پر بولا جاتا ہے جب آدمی مدہوش و بدحواس ہو کر گرنے کو ہوتا



ہے۔ اور ”از کارشدم“ میں یہ بات نہیں ہے۔ معطل ہونے۔ معزول ہونے، اپاہج اور گنہے ہونے کو بھی ”از کارشدم“ سے تعبیر کرتے ہیں۔“

لالہ سری رام لکھتے ہیں:

”شکوہ الفاظ، بلندی مضامین، رفعت خیال، نادر استعارات، بے بدل تشبیہات جس قدر سودا کے دفتر میں ہیں اُس رنگارنگی سے میر کا کلام محروم ہے۔ مرزا زبردست الفاظ کے سرمایہ دار ہیں۔ جن کی مدد سے وہ مبتذل اور پیش پا مضامین کو بھی رنگینی الفاظ سے مرصع بنا دیتے ہیں اور معمولی شعر میں بھی انتہا کا جوش پیدا کر دیتے ہیں..... اردو میں قصیدہ گوئی کا موجد اگر کسی کو کہہ سکتے ہیں تو وہ صرف میرزا ہی کی ذات ہے۔ جن کے زورِ قلم نے عالمِ سخن میں دھاک بٹھادی.....“

رام بابو سکسینہ نے ”تاریخ ادبِ اردو“ میں لکھا ہے:

”مرزا نے اکثر ہندی الفاظ کی درشتی کو دور کر کے فارسی کی آمیزش سے زبان میں شیرینی اور حلاوت پیدا کی۔ میر اور سودا ہی نے زبان کو ادبی زبان بنایا۔ اس کو ریختہ کا مرتبہ بخشا..... شاعری کی صنایعوں سے اس میں طرح طرح کی لطافتیں اور نزاکتیں پیدا کیں۔ فارسی سے بہ کثرت الفاظ و محاورات، استعارے اور تشبیہیں، طرزِ تخیل اور تلمیحات زبانِ اردو میں داخل کیے..... اس کے علاوہ نئی نئی ترکیبیں اور محاورے فارسی کی روش پر ایجاد کیے۔ جس میں سے بعض تو مقبول ہوئے اور بعض کو آئندہ نسلوں نے ناپسند اور متروک کیا..... ان کے اردو قصائد بڑے بڑے فارسی

۱۔ خواجہ الطاف حسین حالی، مقدمہ شعر و شاعری، علی گڑھ، ص ۱۶۱-۱۶۲  
۲۔ ثم خانہ جاوید، ص ۲۶۳۔

استادوں کے قصائد کے نثر کے ہیں اور بعض تو عرقی و خاقانی کے  
معرکہ آلا راقصیدوں کو بھلا دیتے ہیں۔ نزاکت خیال اور طرقلی  
مضامین میں وہ اکثر اہل عجم سے گوے سبقت لے گئے ہیں۔

مولوی محمد یحییٰ تنہا نے قصائد سودا کی تعریف کی ہے۔ لیکن ان پر کچھ اعتراضات بھی کیے  
ہیں۔ جن کی بنیاد مولانا حالی کے خیالات پر معلوم ہوتی ہے۔ مقدمہ شعر و شاعری میں حالی  
نے قصیدے میں مبالغہ کو ناپسند کیا ہے۔ تنہا لکھتے ہیں۔

”..... سودا پہلا شخص ہے جس نے قصائد کو درجہ تکمیل پر پہنچایا۔  
اس سے پیشتر بھی دیگر شعرا نے قصائد لکھے لیکن سودا نے جس عمدگی  
اور خوبی کے ساتھ اپنا اظہار خیال کیا ہے۔ اور دشوار قوائی اور مشکل  
ردیفوں میں جس آسانی کے ساتھ اپنے مطلب کو بیان کیا ہے اس  
کی نظیر محققین شعرا نے اردو کے کلام میں کیا ہے بلکہ نایاب ہے۔  
اس میں شک نہیں کہ سودا کے قصائد میں جہاں خوبیاں ہیں، نقائص  
بھی ہیں اور مبالغہ جو بد قسمتی سے شاعری کی جان سمجھا جاتا ہے وہ  
ان کے ہاں بدرجہ اتم موجود ہے۔ تاہم زبان پر قدرت اور ذہن  
رسا کی طباعی اور برائی ان سے ہویدا ہے..... نقائص سے قطع نظر  
آپ کے قصائد میں خوبیاں بھی بے حد ہیں۔ زور کلام، جوش اور  
روانی ایک دریائے زخار کی طرح آپ کے قصائد میں موجزن  
ہیں.....“

مولوی محمد مبین کتبی چریا کوٹی نے لکھا ہے کہ سودا ایسے مسلم الثبوت تھے کہ جن پر فن شاعری  
کو ہمیشہ ناز رہے گا۔ ان کی ہمہ گیری نے کسی صنفِ سخن کو نہیں چھوڑا۔ وہ لکھتے ہیں۔

”مرزا جب قصیدہ پیش کرتے ہیں تو شکوہ الفاظ کے ڈنکے بجا دیتے

۱۔ رام بابو سکینہ، تاریخ ادب اردو، مترجمہ مرزا محمد عسکری، لکھنؤ، ۱۹۵۲ء، ص ۱۱۲-۱۱۵  
۲۔ محمد یحییٰ تنہا، مرآۃ شعراء، لاہور، ص ۱۶۹-۱۷۰

ہیں۔ غزل سناتے ہیں تو دلوں میں چٹکیاں لیتے ہیں۔ مرثیہ پڑھتے ہیں تو سامعین کو خون کے آنسو رلاتے ہیں۔ جھو کرتے ہیں تو حریفوں پر ہستی تنگ کر دیتے ہیں۔ اردو شاعری اس جامعیت کا کوئی دوسرا شاعری پیش نہیں کر سکتی۔ بہر حال مرزا سودا اُن مسلم الثبوت اساتذہ میں ہیں جن پر فن شاعری کو ہمیشہ ناز رہے گا۔

مرزا کی ہمہ گیری نے کسی صنفِ سخن کو نہیں چھوڑا۔ قصیدے، غزلیں، مثنویاں، رباعیاں، قطعے، مستزاد، تاریخیں، پہیلیاں، ترجیع بند، مخمس، مرعبے، جویں سب کچھ کہیں اور خوب کہیں اے۔

رید احمد صدیقی نے اردو میں طنز و مزاح کی تاریخ کی ابتدا سودا سے کی ہے۔ انھوں نے سودا کی جھوگوئی کو ان کی باقی تمام شاعری پر ترجیح دی ہے۔ رشید صاحب لکھتے ہیں۔

”سودا کو اردو جھو و ہجا میں نہ صرف فضل تقدم حاصل ہے بلکہ ان کے کلام سے طنزیات کی بہترین صلاحیت و استعداد بھی نمایاں ہے، لیکن جیسا کہیں عرض کیا گیا ہے بہترین طنز کی اساسی شرط یہ ہے کہ وہ ذاتی عناد و تعصب سے پاک اور ذہن و فکر کی بے لوث برہمی یا شگفتگی کا نتیجہ ہو۔ اس معیار پر سودا کی جویں تمام و کمال پوری نہیں اترتیں۔ تاہم اس خاستان میں بھی طنز و مضحکات کے ایسے نمونے ملتے ہیں جن سے ان کی زندہ دلی اور شگفتہ مزاجی کا ہمیں پوری طرح معترف ہو جانا پڑتا ہے۔

سودا نے شعر و شاعری کی ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے لیکن ان کو جو خصوصیت ایک جھوگو ہونے کی حیثیت سے حاصل ہے وہ سب پر فوق ہے اور یہی ان کا طرہ امتیاز ہے۔“

کلیم الدین احمد لکھتے ہیں۔

”..... سودا میں وہ تمام خصوصیات موجود تھیں جو ایک بلند پایہ جھوگو کے لیے ضروری ہیں۔ وہ زندہ دل اور شگفتہ طبیعت واقع ہوئے تھے۔ بقول آزادان کے دل کا کنول ہر وقت کھلا رہتا تھا۔ وہ خود ہنستے تھے اور دوسروں کو ہنسا سکتے تھے۔ لیکن اس زندہ دلی کے باوجود جب وہ برہم ہوتے تو پھر ان کی برہمی کی انتہا نہ ہوتی۔ ان کی برہمی سے اُن کے معاصرین آشنا تھے۔ اور اس سے خائف رہتے تھے کیوں کہ ان کے ترکش میں طنز کے ہزاروں تیر تھے جن کی چوٹ بے پناہ تھی۔ لوگ اُن سے خائف رہتے تھے لیکن وہ کسی سے ہراساں نہ ہوتے۔ ان کا تخیل تیز رو اور بلند پرواز تھا وہ ایک لمحہ میں ہونٹوں، قیوس، مرتب کر سکتے تھے۔ ایک سے ایک رنگین و معشکہ خیز.....“

شوکت سبزواری کا خیال ہے کہ سودا کے ہاں تسخر زیادہ اور طنز کم ہے ان کی جھوٹوں میں معشکہ، پھلڑ پن، گالی گلوچ سب ہی کچھ ہے۔ انھوں نے جھو کے ذریعے اپنے دشمنوں سے انتقام لیا ہے۔ شوکت صاحب لکھتے ہیں۔

”سودا اردو کے پہلے طنز نگار شاعر ہیں۔ لیکن اُن کے یہاں تسخر زیادہ اور طنز کم ہے۔ سودا کی طنزیہ شاعری کا تمام تر سرمایہ ان کا جھو یہ کلام ہے۔ ویسے جھو بھی طنز ہی ہے لیکن جھو اور طنز میں ایک بنیادی فرق ہے۔ طنز صلاح و اصلاح ہے اور جھو جلے دل کے پھپھو لے پھوڑنا۔ سودا کے جھویات اسی رنگ میں ہیں۔ ان میں استہزا، تسخر، معشکہ، پھلڑ پن، گالی گلوچ سبھی کچھ ہے۔ ان میں سودا نے اپنے دل کی بھڑاس نکالی ہے۔ اپنے دشمنوں سے انتقام لیا ہے۔ اُن کا مقصد اصلاح نہیں۔ اس لیے ان کو طنز نہیں کہا جاسکتا۔

اس میں کسی کو رسوا کرنے کا جذبہ کارفرما ہے۔ لیکن سودا کی ہجویات دو طرح کی ہیں۔ کچھ ایسی ہیں جن میں کسی فرد واحد مثلاً فاجر مکین یا میرضاحک کی خبر لی گئی ہے۔ یہ تمسخر کی حد میں آتی ہیں۔ چند ایسی بھی ہیں جن میں شکایت روزگار یا اہل روزگار ہے یا جن میں پورے معاشرے یا اس کے کسی طبقے کو ہدف مطاعن بنایا گیا ہے۔ ان میں طنز ہے اور بڑا گہرا اور شوخ قسم کا۔ اور شاید سودا کے اسی کلام کی وجہ سے اس کو اردو کے طنز نگاروں میں شمار کیا گیا ہے۔“

ڈاکٹر سید عبداللہ نے میر اور سودا کے شہر آشوبوں کا موازنہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

”..... اس لحاظ سے میر اور سودا کے شہر آشوب اپنے زمانے کی سیاسی فضا کی کامیاب عکاسی کر رہے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ بعض جزئیات میں مبالغے کا رنگ ضرور پیدا ہو گیا ہے۔ مگر واقعات اور حادثات کی عام تصویر اصل کے قریب قریب ہے۔ سودا کا شہر آشوب جوش کے اعتبار سے میر کے شہر آشوب سے افضل ہے۔ سودا کے شہر آشوبوں کا میدان وسیع تر ہے۔ اثر کو دیر پا اور گہرا کرنے کی خاطر سودا نے جزئیات میں رنگارنگی پیدا کی ہے اور اثر آفرینی کے ذریعے پڑھنے والے پر حالات کا وہی اثر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے جس سے خود شاعر کا دل بھر پور ہے۔ میر کے ہاں سادگی اور خلوص ہے مگر میدان قدرے تنگ اور جزئیات کم ہیں تاہم میر بھی اپنے طور پر اس شہر آشوب میں کامیاب ہوئے ہیں۔“

غالباً یہ خیال غلط نہ ہوگا کہ اردو میں شہر آشوب کی صنف کو زندگی اور بقا بخشنے والے میر اور سودا ہی تھے۔ ان سے پہلے اس صنف میں جو کچھ لکھا گیا اس میں قوت اور جان نہ تھی۔ ان

کے بعد جو کچھ اس موضوع پر تصنیف ہوا وہ بیشتر نقالی تھی۔“

سودا کی خوش نصیبی ہے کہ انھیں جو مقبولیت اور شہرت اپنی زندگی میں حاصل ہوئی تھی۔ وہ آج تک باقی ہے۔ سودا نے بیشتر اصنافِ سخن پر طبع آزمائی کی ہے لیکن قصیدہ گوئی اور ہجو گوئی کے وہ امام اور خاتم ہیں۔ ممکن نہیں کہ ان اصنافِ سخن پر کتابیں لکھی جائیں اور ان میں سودا پر علاحدہ باب قائم نہ کیے جائیں۔ بلکہ شمالی ہند میں سب سے پہلے سودا ہی کا ذکر آتا ہے۔

# سودا کی تصانیف

سودا بہ جہاں اپنی زبانی تو ہے  
 آفاق میں خاقانی ثانی تو ہے  
 گو نطق کا ہر چند نہیں تو خالق  
 پر نطق کا خلاق معانی تو ہے





## نثر

### ۱- تذکرہ

قدرت اللہ قاسم واحد تذکرہ نگار ہیں۔ جن کے بیان سے پتا چلتا ہے کہ سودا نے اردو شاعروں کا ایک تذکرہ بھی لکھا تھا۔ قاسم نے مجموعہ نغز میں دو مقام پر اس تذکرے کا ذکر کیا ہے۔ ایک تو خان آرزو کے ترجمے میں ایک شعر کے بارے میں لکھا ہے۔

”مرزا محمد رفیع سودا ایں بیت را در تذکرہ خود بایں طور ثبت نموده ۱۔“

دوسرے سعدی کے ترجمے میں قاسم نے لکھا ہے۔

”.....مظنہ بیشترے از سخن پیرا خصوص سرآمد شعراے فصاحت آما  
مرزا رفیع سودا نظر بر اتحاد مخلص آنکہ ایں سعدی ہموں سعدی  
شیرازی است قدس سرہ کہ وارد دیار دکن شدہ و شعر ریختہ از طبع  
وقاد آں قدوہ محفلان ریختہ چناں چہ در تذکرہ خود اشعار ایں  
سعدی دکنی را علی اللہ عنہ بہ شیخ شیراز علیہ الرحمۃ و القفر ان نسبت  
نمودہ ۲۔“

ان بیانات سے یہی پتا چلتا ہے کہ سودا نے تذکرہ لکھا تھا۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ کسی

اور تذکرہ نگار نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ جب کہ یہ ممکن نہیں تھا کہ سودا تذکرہ لکھتے۔ اور ہم عصر تذکرہ نگار اس کا حوالہ نہ دیتے۔ قاضی عبدالودود آکھتے ہیں۔ ”میرا خیال ہے کہ سودا نے تذکرہ لکھا ہی نہیں۔ اس کے حق میں جو شہادت ہے وہ بالکل نا کافی ہے۔“ مجھے قاضی صاحب کے خیال سے بالکل اتفاق ہے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ سودا نے کسی بیاض میں کچھ شاعروں کے اشعار نقل کیے ہوں۔ جو قاسم کے ہاتھ آ گئی۔ ورنہ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ سودا جیسا مقبول و مشہور شاعر تذکرہ لکھے اور قاسم کے علاوہ کوئی اور اس کا ذکر تک نہ کرے۔ قاسم سے بعد کے کچھ تذکرہ نگاروں نے اس کا ذکر کیا ہے۔ تو ان کا مآخذ مجموعہ نغز ہی ہے۔ کیوں کہ کسی نے یہ نہیں لکھا کہ اس نے یہ تذکرہ خود دیکھا ہے۔

## ۲۔ شعلہ عشق

تذکرہ کی طرح شعلہ عشق کا وجود بھی مشکوک ہے۔ کیوں کہ غالباً مولانا محمد حسین آزاد واحد تذکرہ نگار ہیں۔ جو ہمیں بتاتے ہیں کہ سودا نے میر کی مثنوی شعلہ عشق کو نثر میں لکھا تھا۔ سودا کی اردو نثر پر رائے دیتے ہوئے آزاد لکھتے ہیں۔

”مرزا کی زبان کا حال نظم میں تو سب کو معلوم ہے کہ کبھی دودھ ہے کبھی شربت۔ مگر نثر میں بڑی مشکل ہوتی ہے۔ فقط مصری کی ڈلیاں چبانی پڑتی ہیں اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ نثر اردو ابھی بچہ ہے۔ زبان نہیں نکلتی۔ چنانچہ شعلہ عشق کی عبارت سے واضح ہے کہ اردو ہے مگر مرزا بیدل کی نثر فارسی معلوم ہوتی ہے۔ کتاب مذکور اس وقت موجود نہیں۔ لیکن ایک دیباچہ میں انھوں نے تھوڑی سی نثر بھی لکھی۔ اس سے افسانہ مذکور کا انداز معلوم ہو سکتا ہے۔“

ایک اور مقام پر آزاد نے اس مثنوی کا ذکر کیا ہے:

”میر کی مثنوی فعلہ عشق کے مضمون کو بھی مرزا رفیع نے نثر میں لکھا ہے۔ افسوس کہ اس وقت موجود نہیں ہے۔“

میرا خیال ہے کہ آزاد دروغ گوئی سے کام نہیں لے رہے۔ بلکہ انھیں غلط فہمی ہوئی ہے لیکن حقیقت یہی ہے کہ سودا کی اس نثر کا وجود مشکوک ہے۔ کیوں کہ وہ نثر کیسی بھی ہوتی۔ لیکن اہل اردو کے لیے بہت اہم تھی۔ اور یہ ممکن نہ تھا کہ ہم عصر تذکرہ نگار اسے نظر انداز کر دیتے۔

### ۳۔ دیباچہ سبیل ہدایت

مثنوی سبیل ہدایت پر سودا نے ایک مختصر سا اردو دیباچہ بھی لکھا تھا۔ جو مثنوی کے درمیان میں ہے۔ اس نثر کی اہمیت یہ ہے کہ اردو نثر کے بالکل ہی ابتدائی نمونوں میں ہے۔

## تنقید

### ۱۔ عبرت الغافلین

اس رسالے پر تفصیلی بحث جھوگوئی کے باب میں ”سودا اور مکین“ کے تحت کی گئی ہے۔

### ۲۔ سبیل ہدایت

اس مثنوی پر بھی جھوگوئی کے باب میں ”سودا اور میر تقی“ کے تحت بحث کی گئی ہے۔

## کلیاتِ سودا

سودا کے کلیات میں غزلیں، قصیدے، ہجویں، شہر آشوب، مثنویاں مرچے، رباعیاں، قطعے، پہیلیاں، ایک واسوخت اور فارسی کلام موجود ہے۔ کلیاتِ سودا کے قلمی نسخے بہت زیادہ ملتے ہیں۔ لیکن بیشتر نسخوں میں الحاقی کلام شامل ہو گیا ہے۔ البتہ دو نسخے ایسے ہیں جن میں الحاقی کلام بالکل نہیں۔ ایک تو آزاد لاہری علی گڑھ کے حبیب سنج سیکشن کا نسخہ (نسخہ حبیب) اور دوسرا انڈیا آفس لاہری کا نسخہ جسے رچرڈ جونسن کو پیش کیا گیا تھا۔ (نسخہ رچرڈ جونسن)۔

### نسخہ حبیب

کلیاتِ سودا کے اب تک جتنے بھی قلمی نسخے ملتے ہیں۔ ان میں سب سے قدیم نسخہ یہی ہے۔ اس میں کلام کی ترتیب اس طرح ہے۔

|     |         |    |
|-----|---------|----|
| ۲۶  | قصیدے   | ۱- |
| ۲۳۳ | غزلیں   | ۲- |
| ۱۲  | مخمس    | ۳- |
| ۷   | ہجویں   | ۴- |
| ۱۱  | رباعیاں | ۵- |
| ۱۲  | مطلعات  | ۶- |

ترقیے کی عبارت سے پتا چلتا ہے کہ صادق مرزا نے حافظہ نظارت خاں کی فرمائش سے اس نسخے کی کتابت اُس وقت کی تھی جب دہلی میں شاہ درانی اور مرہٹوں کے حملے ہو رہے تھے۔ ۱۷۱۷ھ (۱۷۰۳ء) کو اس کی کتابت مکمل ہوئی۔

### نسخہ رچرڈ جونس

یہ نسخہ ہے جسے سودا نے رچرڈ جونس کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ محترمی قاضی عبدالودود نے ماہنامہ ”صبا“ (جلد ۵، شمارہ ۱۱، ۱۲) میں لکھا ہے۔ ”یہ وہ نسخہ ہے جو سودا نے رچرڈ جونس، نائب ریڈیٹنٹ اودھ کو اپنی موت کے دو چار سال قبل دیا تھا۔“ شاید قاضی صاحب قبلہ کی نظر سے وہ قطعہ تاریخ نہیں گزرا جو سودا نے راجہ ٹکیٹ رائے کے باغ پر کہا تھا۔ اس شعر سے تاریخ نکلتی ہے:

سرحدوں بہارِ بریدم و گفتم

بگلشن تو الہی گزند دے نرسد

۱۱۹۳ھ = ۱۷۷۰-۱۷۶۳ھ

یہ قطعہ نسخہ جونس میں موجود ہے۔ سودا کا انتقال ۱۱۹۵ھ ہجری میں ہوا۔ اس کا مطلب ہے کہ کلیات سودا ۱۱۹۳ھ اور ۱۱۹۵ھ کے درمیان مرتب ہوا۔

کلیات میں سب سے پہلے سودا کی ایک قلمی تصویر ہے۔ جس میں سودا کے ایک ہاتھ میں کاغذ ہیں۔ دوسرے ہاتھ سے حقہ پی رہے ہیں اور پیچھے ملازم کھڑا ہے۔ تصویر کے بعد دو صفحے خالی ہیں۔ پھر ایک صفحہ کے بالکل اوپر انگریزی میں یہ عبارت لکھی ہے کہ رچرڈ جونس کو مصنف مرزا سودا کا تحفہ۔

اس کے بعد جونس کی شان میں قصیدہ شروع ہوتا ہے۔ جس کے تیس اشعار ہیں۔ قاضی عبدالودود نے یہ قصیدہ ”صبا“ جلد ۵، شمارہ ۱۱، ۱۲ میں، اور امتیاز علی خاں صاحب عریچی نے اردو ادب کے کسی شمارے میں شائع کر دیا ہے۔ اُس صفحے سے اگلے صفحے پر یہ عبارتیں ہیں۔

|                                                                                                     |                                                                                       |
|-----------------------------------------------------------------------------------------------------|---------------------------------------------------------------------------------------|
| دیوان سرکار نواب صاحب ممتاز الدولہ<br>مفتخر الملک حسام جنگ مسٹر رچرڈ<br>جانشن صاحب بہادر دام اقبالہ | دیوان مرزا رفیع سودا گزرائیدہ<br>میر حسین صاحب دریلدہ لکھنؤ<br>داخل کتب خانہ سرکار شد |
|-----------------------------------------------------------------------------------------------------|---------------------------------------------------------------------------------------|

پہلی عبارت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سودا نے خود نہیں بلکہ میر حسین نے پیش کیا تھا۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ سودا نے براہ راست نہیں بلکہ میر حسین کی معرفت گزرائنا تھا۔ میرے اس خیال کا ثبوت جانشن کی شان میں قصیدہ اور انگریزی عبارت ہے۔

یہ کلیات سودا کے معتبر ترین نسخوں میں ہے۔ اس میں وہ تمام الحاقی کلام نہیں ہے جو نسخہ مصطفائی اور نسخہ آسی میں ہے۔ لیکن سودا کے شاگرد فتح علی شیدا نے فدوی لاہوری کی جھوٹی کپی تھی جو اس میں شامل ہے۔ یہ جھوٹا نسخہ میں موجود ہے۔ مگر فرق یہ ہے کہ مطبوعہ نسخوں میں یہ شعر اس طرح ملتا ہے:

سب پہ کرے ہے وہ طعن جتنے کہ استاد ہیں  
 شعر پہ میرے بھی اب ان کو یہ ایراد ہیں  
 نسخہ جانشن میں اس کی بدلی ہوئی شکل ہے:

حضرت سودا تلک جو میرے استاد ہیں  
 شعر پہ ادن کے بھی اب ان کو یہ ایراد ہیں  
 اس طرح نسخہ جانشن میں یہ مقطع بھی موجود ہے:

بس چل اب آگے نہ کہہ کچھ انھیں شیدا خاموش  
 کیجیے اس سے سخن ہووے جسے عقل و ہوش

کلیات سودا کے مطبوعہ نسخے .

قاضی عبدالودود لکھتے ہیں۔ ”گارساں دتاسی نے اپنی تاریخ ادبیات (جلد ۳، ص ۷۰)

Primitiae Orientalis جلد ۳ کے حوالے سے لکھا ہے کہ ۱۸۰۳ء میں اعلان ہوا تھا کہ کلکتہ میں کلیات سودا تین جلدوں میں زیر طبع تھا۔ میر کا کلیات، وفات میر کے کچھ ہی بعد کلکتہ سے چھپ کر شائع ہوا تھا۔ اہل کلکتہ کو اگر کلیات سودا کی اشاعت کا خیال آیا ہو تو تعجب کی بات نہیں۔ میر شیر علی افسوس نے جو اُس زمانے میں کلکتہ میں تھے، لکھا ہے کہ میرا کچھ وقت کلیات سودا کی تصحیح میں صرف ہوا۔ مگر یہ نہیں بتاتے کہ اس کی ضرورت کیا تھی۔ دتاسی کا بیان ہے کہ افسوس، جوان اور محمد اسلم کا تصحیح کیا ہوا انتخاب کلیات سودا ۱۸۱۰ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کا امکان ہے کہ تصحیح کلیات سے اسی کی طرف اشارہ ہو۔ وہ کلیات جس کی طرف دتاسی نے اشارہ کیا ہے کہیں نہیں ملتا۔ یا تو ارادۂ، مطلقاً قوت سے فعل میں نہ آسکا۔ یا بعض اجزا چھپے جو محفوظ نہ رہ سکے۔“ اس کے شواہد موجود ہیں کہ کلیات سودا فورٹ ولیم کالج سے تین جلدوں میں شائع ہو رہا تھا۔ فورٹ ولیم کالج کونسل کی ایک رپورٹ مرتبہ ۴ مارچ ۱۸۰۳ء کے مطابق جو پانچ کتابیں مطبع میں بھیجی جا چکی تھیں۔ ان میں کلیات سودا بھی تھا۔ جو تین جلدوں میں مرتب کیا گیا تھا۔“ اگر یہ کلیات شائع ہو گیا ہوتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ دنیا میں اس کا کوئی نسخہ محفوظ نہ رہتا۔ یا کم از کم کوئی شخص اس کا مدعی نہ ہوتا کہ اس نے مطبوعہ کلیات دیکھا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اسے پریس بھیجا ضرور گیا تھا۔ مگر چھپ نہیں سکا۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستانی کتابوں کی تیاری اور طباعت پر بہت زیادہ روپیہ خرچ ہو رہا تھا۔ اور اس خرچ کا ذمہ دار خود گلکرسٹ تھا جو پوری تن دی سے اس کام میں مصروف تھا لیکن کالج کے ذمہ داران اتنا روپیہ خرچ کرنے کے حق میں نہیں تھے۔ اس کی پوری تفصیل محمد عتیق صدیقی نے ”گلکرسٹ اور اس کا عہد“ میں دی ہے۔ ۲۴ فروری ۱۸۰۴ء کو گلکرسٹ فورٹ ولیم کالج کی ملازمت سے مستعفی ہو گیا۔ اُس کے رخصت ہونے کے وقت تک کلیات سودا کی طباعت کا کام شروع ہی نہیں ہوا تھا یا کچھ اجزا چھپے ہوں گے۔ بعد میں اس کے جانشینوں نے اس کام کو رکوا دیا۔ بالکل ایسا ہی قرآن شریف کے ترجمے کے ساتھ ہوا تھا۔ البتہ ۱۸۱۰ء میں کلیات سودا کا ایک انتخاب شائع ہوا۔ جو میری نظر سے نہیں گزرا۔

۱۔ سورہ، ۲۹، ص ۴۸

۲۔ گلکرسٹ اور اس کا عہد، ص ۱۹۷

۳۔ گلکرسٹ اور اس کا عہد، ص ۱۸۶

### نسخہ مصطفائی

کلیات سودا کے اب تک جتنے مطبوعہ نسخے ملتے ہیں۔ ان میں قدیم ترین نسخہ یہی ہے۔ اس کلیات کی طباعت ۲۹ ربیع الثانی ۱۲۷۰ھ کو شروع ہوئی اور ۱۰ جمادی الثانی ۱۲۷۲ھ کو پایہ تکمیل کو پہنچی۔ یہ ۱۲ × ۷ ۱/۲ کے سائز پر ۲۸۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ قدیم انداز پر شائع ہوا تھا یعنی حاشیہ پر بھی اشعار دیے گئے تھے۔ پہلے صفحے پر صبح کا نام میر عبد الرحمن متخلص بہ آہی شاگرد رشید مومن خاں مرحوم دیا گیا ہے۔ مطبع کے متعلق لکھا گیا ہے۔ ”در مطبع مصطفائی محمد حسین خاں طبع نمود“۔ صفحہ ۲ اور ۳ پر ظہور علی ظہور کا لکھا ہوا فارسی دیباچہ ہے۔ اسی دیباچے میں ایک قطعہ تاریخ بھی ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ طباعت کا کام ۲۹ ربیع الثانی ۱۲۷۰ھ کو شروع ہوا تھا۔ صفحہ ۳ کی آخری سطروں سے سودا کے ایک شاگرد کا دیباچہ شروع ہوتا ہے جو عبرت الفالین پر لکھا گیا ہے۔ یہ دیباچہ کلیات سودا مرتبہ آہی میں بھی شامل ہے (ص ۳۳۶-۳۳۷)۔ ص ۴ سے شاگرد سودا کے قصیدہ شروع ہوتا ہے۔ جس کا مطلع ہے۔

کیا حضرت سودا نے کی اے مصطفیٰ تقصیر  
کرتا ہے جو بھو اوس کی تو ہر صفحے میں تحریر

صفحہ ۱۸ سے رسالہ عبرت الفالین شروع ہوتا ہے۔ صفحہ ۵۱ سے قصائد شروع ہوتے ہیں۔ صفحہ ۱۱۷ سے مثنویوں کا آغاز ہوتا ہے۔ فارسی دیوان کی ابتدا صفحہ ۱۷۵ سے ہوتی ہے۔ صفحہ ۱۸۸ سے غزلیات شروع ہوتی ہیں۔ صفحہ ۳۰۶ سے قطعے شروع ہوتے ہیں۔ صفحہ ۳۱۶ سے پہیلیاں اور پھر مخمس دیے گئے ہیں۔ ۳۶۹ صفحے سے دیوان مرثیہ کا آغاز ہوتا ہے۔ اختتام پر خاتمہ الطبع کی عبارت ہے۔ جس سے پتا چلتا ہے کہ ۱۰ جمادی الثانی ۱۲۷۲ھ کو غلام احمد کے نسخے کے مطابق طبع ہوا۔ غلام احمد نے جو کلیات مرتب کیا تھا اس کا دیباچہ حسب ذیل ہے۔

”بعد شکر ایزدواہب العطیات و نعت سید الموجدات بندہ غلام احمد“

۱۔ ”بھو گوتی“ کے باب میں اس شاگرد کے نام سے بحث کی جا چکی ہے۔



کہ مولف کلیات ہذاست مگر وہ کہ دیوانہاے افضل المتاخرین مرزا رفیع المتخلص بہ سودا بہ شوق نام ذوق مالا کلام محنت و دماغ سوزی از چند جاہم رسایندہ بہ ترتیب دل پذیر مرتب ساختہ یادگار روزگار گذاشت، چون این کلیات جامع تر از دیگر دواہین مشہور است، اکثر عزیزاں و صاحبان شوق بہ قیمت صد روپیہ طالب نسخہ بودند، لیکن دوری آں قبول طبع خاکسار میثناد و خدا شاہد این مقالست۔“

نسخہ مصطفائی اب بہت کم ملتا ہے۔ اس کا ایک نسخہ دہلی یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے۔

### نسخہ نول کشوری

مجھے اس کا علم نہیں کہ مطبع نول کشور سے کلیات سودا کا پہلا ایڈیشن کب شائع ہوا تھا۔ میرے پیش نظر چوتھا ایڈیشن ہے جو مئی ۱۹۱۶ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے دیباچہ نگار کا نام نہیں پتا چلتا۔ دیباچے میں بتایا گیا ہے کہ یہ کلیات مطبع نول کشور کانپور میں چھپا ہے۔ اس کلیات کی ترتیب بالکل وہی ہے جو نسخہ مصطفائی کی ہے۔ صرف سائز کا فرق ہے۔ یہ ۱۰×۶ ۱/۲ سائز پر ہے اور ۶۴۴ صفحات پر مشتمل ہے۔

### نسخہ آسی

یہ نسخہ عبدالباری آسی کا مرتب کیا ہوا ہے۔ پہلے کلیات سودا ایک جلد میں شائع ہوا تھا۔ آسی نے ترتیب بھی بدل دی اور دو جلدوں میں کر دیا۔ یہی وہ نسخہ ہے جو آج کل ہر لائبریری میں ملتا ہے۔ ایسے اشعار کی تعداد اچھی خاصی ہے جو نسخہ مصطفائی میں تو ہیں لیکن آسی میں نہیں۔ ان کے بارے میں آسی نے دیباچے میں لکھا ہے۔

”ان کا کلیات جہاں تک مجھے معلوم ہے پہلے مطبع مصطفائی میں طبع ہوا تھا۔ مگر وہ بہت زیادہ غلط ہے۔ پھر بھی رطب و یابس فحش اور غیر فحش کلام کا مجموعہ ہے۔ غالباً اسی کو دیکھ کر پہلی مرتبہ مطبع ہذا میں بھی طبع ہوا۔ کیوں کہ پہلا چھپا ہوا دیوان نہ صرف حرف بہ حرف اُس سے ملتا

ہے بلکہ سائز کی حیثیت سے بھی اوس کے برابر ہے۔ البتہ بعد کی ضرورت کا اقتضا سمجھ کر کسی صحیح نے حکمایا بلا حکم اس میں سے وہ شعر نکال دیے جو فحش اور قابل گرفت ہیں۔ جس دیوان کی تصحیح کا مجھے اتفاق ہوا وہ یہی نسخہ تھا۔ جس کو ان کانٹوں سے پاک کر دیا گیا تھا۔“

آسی کا یہ بیان درست ہے کہ انھوں نے جس نسخے کی تصحیح کی ہے وہ کانٹوں سے پاک تھا۔ کیوں کہ جتنے اشعار نسخہ نول کشوری میں نہیں ہیں۔ وہ آسی کے ہاں بھی غیر حاضر ہیں۔ حسب ذیل قصیدہ، جویں، قطعے، رباعیاں، مثنویاں اور مخمس نسخہ مصطفائی میں موجود ہیں۔ لیکن نسخہ نول کشوری اور نسخہ آسی میں نہیں۔

۱- قصیدہ در جہو مولوی ساجد متوطن کٹھیر کہ سخت متعصب بود:

ساجدا کیوں نہ یہ پرواز کرے تا بہ فلک  
پنچی پھمین سے یوں نطفے کی حلت جس تک

۲- در جہو طفل پتنگ باز:

ایک لونڈا پتنگ کا ہے کھلاڑ  
دور میں اوس کے ..... ہیں ہزار

۳- جھو کو کی یعنی دختر دایہ:

واسطے طفل کے جو بہتر ہے  
شیر اگر ہے تو شیر مادر ہے

رباعیاں

۴- لیتا ہے نفع جو دے دمڑی کا سوت (کذا)

۵- اے ساجد ملعون خدا سے ڈرتو

۶- بچا بلبل کا ہے یہ ساجد ملعون

قطع

۷- کیا شیخ منٹ میں ہے عنوان دیانت

- ۸- شاعر ہوا ہے فدوی کیا شاعروں کا تلاً  
۹- پکی جو سودا دے کن یہ گل کہ فدوی جس کو لجاو ندا ہے

مثنوی

- ۱۰- مولوی جی سے جو رو بھنگی ہے

قطعہ

- ۱۱- ہرگز ڈرانہ مجھ سے تو اے بے شعور بھڑوے (کذا)

مخمس

- ۱۲- کہتا ہے یہ سودا کہ اے غلامِ مقدر

- ۱۳- ندرت ہے ایک بھڑوا کا شو ہے ایک پدنا

مثنوی

- ۱۴- حکایت ڈونہی

ممکن ہے کچھ اور اشعار بھی غیر حاضر ہوں۔

ڈاکٹر محمد شمس صدیقی کا مرتبہ کلیات سودا

مجلسِ ترقی ادب، لاہور سے ڈاکٹر محمد شمس صدیقی کا مرتبہ تین جلدوں میں کلیات سودا  
۱۹۸۴ء میں شائع ہوا تھا۔

ہاجرہ ولی اللہ کا تحقیقی مقالہ

ہاجرہ ولی اللہ نے غزلیات سودا کے عنوان سے سودا کی غزلیات مرتب کر کے تحقیقی مقالے  
کے طور پر لکھتے ہوئے ورثی میں پیش کیا جس پر انھیں یونیورسٹی نے پی ایچ ڈی کی ڈگری  
تفویض کی۔

نسیم احمد کی مرتبہ غزلیات سودا

بنارس یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے ڈاکٹر نسیم احمد نے سودا کی غزلیات مرتب کر کے شائع  
کی ہیں۔

دیکھا نہ عالمی اس ہی کو طمان نک  
 شیشہ توڑی شہ کی ٹیٹھی کا منظر  
 شرمناک سی اونٹنا کی پیڑوی سی کلونج  
 اسکی حسد کی لمبی کا اکیلا کروں بیا  
 شہ صحت نظر کو گرا ہی بہر  
 جو دلولہ ہی کا سونہ ہی اسکی سہلہ  
 پہنچانی بہر کی نہ لاک کے سکودیر  
 ہی بہر مانہ اور جو اہل زمانہ عین  
 غفلت میں ہوا درپہر کا ہو غنی  
 پس کوئی کسی کی طرح امید  
 ہی اب کردہ ایک کتبہ کا یہی خطاب  
 ایا ہی شکر نگاہ اسکی سسہلا  
 غنچی کی ہی ہن ہی ہی چشم زائینک  
 کاسہ یہی کدال کی پتہ ارد کری ہی سنگ  
 سوہن کے جیسی خوشی کو پردی ہی کوڑھنک  
 پہنچی خوشہ دل تنہ کو دلی ہی شکر  
 جو باکو ہی اسکی سوی کلمہ نہنک  
 خالی نہیں فساد ہی اسکی ہی جو ترک  
 اور اسکو کہہ نکلتی زمین پر نہیں درک  
 اوکا جہان میں شہر و کلا ہی بہر  
 جیسی کو با یک ملکیت ہی آئی نہنک  
 جیسی کا ایک ہونا ہی جیسی جیسی نہنک  
 ممتاز دلوں فرجہاں و سام نہنک  
 سسہلا ہی آئی کی اگر جہاں نہنک

جوہری کو چار غیبی صفتیں خلق جلو کی اوسکی دیکھ چہ ہر شے اس کے  
دل میں غائبانہ ہی حاصل نہیں ہو رہی مت کہ حضور جا کی تیار کر لی میں دیکھ

تیری وہ ذات کو تو نہیں ہی شکر  
کُرسی میں تیری پایہ اور کاکای ہنسک

باعث ہوتی رہی دست کرکھائی دہریں خالی جو دُری لیکھی میں سی میں ناگہانک  
خونین عدد کی تیغ کی تیری شناوری ہی اس طرح کہ بحر میں بری چچی بن ہنسک  
سامی نامی سپر کی تیری جسکو ہونہار اودہر نہ روکان فلک لک کر ہی خدک  
سخت پیدا دیا کی تیری جسکی سامہنی موج ہوا ہی سب ہوا کی قدم میں لنگ  
تو وہ حقیق قدرت شہدائی کام میں چکسی بیان خلق میں تیری اگر شکرک  
شاہن کی جابی بریں جو چشم ہوا کر تباہ کی دل ہی کلی تیری دید کی دیکھ  
دور از ادب ہی طوطی اسکی اعرض سودا کمال دل کی دعائے سی اور شک

یا رب تمام دوست بہن تجھی فیضیاب

جاری ہی جتنا کہ جان چ آگے

## نسخہ رچرڈ جونسن اور نسخہ حبیب کا اشاریہ

چوں کہ نسخہ رچرڈ جونسن ۱۱۹۳ھ اور ۱۱۹۵ھ کے درمیان مرتب ہوا تھا۔ اس لیے اس میں نسخہ حبیب کے مقابلے میں زیادہ کلام ہے یہ دونوں کلیات سودا کے معتبر ترین نسخے ہیں۔ نسخہ رچرڈ جونسن میں فتح علی شیدا کی کئی ہوئی ہجو فندی شامل ہے لیکن ہجو میں شیدا ہی کا تخلص ہے۔ غزل کے تین اشعار اور ہیں جو ان دونوں نسخوں میں ملتے ہیں اور دیوان یقین میں بھی موجود ہیں۔ اس پر تفصیلی بحث ”الحاقی کلام“ کے تحت کی گئی ہے۔ یہاں دونوں نسخوں کا اشاریہ دیا جاتا ہے۔ اختلاف نسخہ کو عام طور پر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ نسخہ رچرڈ جونسن بنیاد ہے۔ جس مصرع کے آگے ”حبیب“ لکھا گیا ہے اس کا مطلب ہے کہ وہ غزل یا قصیدہ وغیرہ نسخہ حبیب میں بھی موجود ہے۔ بعض وجوہ سے کلام کی ترتیب بدل دی گئی ہے۔ نسخہ رچرڈ جونسن میں ترتیب اس طرح ہے۔ قصیدے، غزلیں، مخمس، رباعیاں، فردیات، غزلیات نام تمام، مثنویاں، قطعے، فارسی کلام۔

### غزلیں

- ۱- مقدور نہیں اس کی تجلی کے بیاں کا (حبیب)
- ۲- ہر سنگ میں شرار ہے تیرے ظہور کا (حبیب)
- ۳- دامن صبا نہ چھو سکے جس شہسوار کا (حبیب)

یہ شعر دونوں نسخوں میں نہیں۔ لیکن آتی میں ہے۔

چشم کرم سے عاشق وحشی اسیر ہو  
الفت ہے دام آہوے دل کے شکار کا

- ۴- ٹوٹے تری نگہ سے اگر دل حباب کا (حبیب)
- ۵- نجانے حال کس ساقی کو یاد آتا ہے شیشے کا (حبیب)
- ۶- ہر موہ پر ہے ترے لخت دل اس رنجور کا (حبیب)
- ۷- رطوبت داغ دل میری کی ہے گرداب آتش کا (حبیب)
- رچڑچونس اور آسی میں مقطع ہے  
جلاتی ہے جگر بن یا راتناے خوری سودا  
پیے ہیں جام گویا بزم میں احباب آتش کا  
حبیب میں اس مقطع کے بجائے دوسرا مقطع ہے۔  
ہو اے رنگ پر میرے نہ چھوٹے کیوں کے اے سودا  
جلے ہے داغ دل ایسا کہ جوں مہتاب آتش کا  
تو ہی اے رات سن اب سوز نگ اس چھاتی کا (حبیب)
- ۸- گلہ لکھوں میں اگر تیری بے وفائی کا (حبیب)
- ۹- کھینچا نہ میں چمن میں آرام یک نفس کا (حبیب)
- ۱۰- آسی اور رچڑچونس میں جو مقطع ہے وہ حبیب میں نہیں۔ اس کے بدلے یہ ہے۔  
سودا کے سوز دل کو بے سوز دل نہ سمجھ  
پردانے کا سمجھنا کیا ہوش ہے گس کا  
چمن ہے کس کی گرفتار زلف و کا کل کا
- ۱۱- ہو یہ دیوانہ مرید اس زلف چھٹ کس پیر کا (حبیب)
- ۱۲-

- ۱۳- جی مرا مجھ سے یہ کہتا ہے کہ نل جاؤں گا (حبیب)
- ۱۴- اے دیدہء خانماں تو ہمارا ڈبوسکا (حبیب)
- ۱۵- تیرے کوچے سے جو میں آپ کو چلتا دیکھا
- ۱۶- نہ کھینچ اے شانہ ان زلفوں کو یاں سودا کا دل اٹکا (حبیب)
- ۱۷- دل مت چلک نظر سے کہ پایا نہ جائے گا (حبیب)
- ۱۸- کعبہ جاوے پوچھتا ہے کب چلن آگاہ کا
- ۱۹- سالہا ہم نے صنم نالہ شب گیر کیا (حبیب)
- ۲۰- دل میں تیرے جو کوئی گھر کر گیا (حبیب)
- ۲۱- قاصدا شک آگے خبر کر گیا (حبیب)
- ۲۲- دل مرا پند کو نہ سمجھے گا
- ۲۳- بہنا کچھ اپنی چشم کا دستور ہو گیا
- ۲۴- قابو میں ہوں میں تیرے گواہ جیا تو پھر کیا (حبیب)
- ۲۵- چمن میں صبح جب اس جنگجو کا نام لیا (حبیب)
- ۲۶- کہاں نطق فصیح از طبع ناخجار ہو پیدا
- ۲۷- آدم کا جسم جب کہ عناصر سے مل بنا (حبیب)
- ۲۸- ملک آئین جب سے تمس لوٹا (حبیب)
- ۲۹- تجھ قید سے دل ہو کر آزاد بہت رویا (حبیب)
- ۳۰- بے وجہ نہیں ہے آئینہ ہر بار دیکھنا (حبیب)



- ۳۱- کب دل شکستگاں سے کر عرضِ حال آیا (حبیب)
- ۳۲- رنگ اڑتا ہے دیکھ اس کے تئیں لالہ رخاں کا
- ۳۳- سحر جو باغ میں دلدار ایک بار آیا
- ۳۴- اسیری کی جولنت سے پڑا ڈھب آشنائی کا
- ۳۵- اجل نے عہد میں تیرے ہی تقدیر سے یہ پیغام کیا
- ۳۶- جنھوں کی نظروں میں ہم سبک ہیں، دیا انھیں کو وقار اپنا
- ۳۷- دل یار کی ہرگز نہ سر زلف سے چھوٹا
- ۳۸- سیہ کاری ہے مانند گلے ہر چند کام اپنا (حبیب)
- ۳۹- زخم کا دل کے تروتازہ ہے انگور سدا (حبیب)
- ۴۰- سودا غزل چمن میں تو ایسی ہی کہہ کے لا (حبیب)
- ۴۱- طبیعت سے فرومایہ کی شعر تر نہیں ہوتا
- ۴۲- نگاہ مست نے ساقی کی عالم کو چھکا ڈالا
- ۴۳- پھرے ہے شیخ یہ کہتا کہ میں دنیا سے منہ موڑا (حبیب)
- ۴۴- قاتل کا ہاتھ ہرگز ہتھیار تک نہ پہنچا
- آسی میں یہ مطلع زائد ہے۔
- افسوس کام غم کا اظہار تک نہ پہنچا
- یہ لخت دل بھی چشمِ خوں بار تک نہ پہنچا
- ۴۵- ساقی چمن میں چھوڑ کے مجھ کو کدھر چلا

- ۴۶- جو گزری مجھ پہ مت اس سے کہو ہوا سو ہوا (حبیب)
- ۴۷- اب تلک اشک کا طوقاں نہ ہوا تھا سو ہوا (حبیب)
- ۴۸- وہ ہم نہیں جو کریں سیر بوستاں تنہا (حبیب)
- ۴۹- اعمال سے میں اپنے بہت بے خبر چلا
- ۵۰- حال دل سے مرے جب تک وہ خبردار نہ تھا (حبیب)
- ۵۱- جب بزم میں بتاں کی وہ رشک مہ گیا تھا (حبیب)
- ۵۲- جگہ تھی دل کو ترے دل میں اک زمانہ تھا
- ۵۳- میں دشمن جاں ڈھوڑ کے اپنا جون کالا (حبیب)
- ۵۴- بلبل نے جسے جا کے گلستان میں دیکھا (حبیب)
- ۵۵- والدہ کو تری چشم کے آزار ہی رہا (حبیب)
- ۵۶- آنکھوں سے اشک جتنا آتا تھا شب نہ آیا
- ۵۷- جو چلن چلتے ہو تم کیا اس سے حاصل ہوئے گا
- ۵۸- چھٹنا ضرور رکھ پہ ہے زلف سیاہ کا
- ۵۹- پایا وہ ہم اس باغ میں جو کام نہ آیا
- ۶۰- نور اخذ ہنر کرنے میں دل کا میں گنوا یا
- ۶۱- باغ میں جس دم خرام اس سرو قامت نے کیا
- ۶۲- دل اپنا چاہتا ہے وہ جنوں از غیب ہو پیدا
- ۶۳- نہ شکوہ یار کا لب تک دلا پیرانہ سر لے جا

- ۶۴- باہر رکھوں نہ بزم سے اے رشکِ باغِ پا
- ۶۵- ترکش اولینڈ سینہ عالم کا چھان مارا
- ۶۶- ڈروں ہوں بہہ نہ جاوے شہر، بندھا گرتا روئے کا
- ۶۷- شب کو جو چھپا مہ تو سحر کہنے یہ لاگا
- ۶۸- کیا جانیں کس کی خاک ہو رکھ ہوش نقشِ پا
- ۶۹- یاں پھر اس شرم سے عیسیٰ نے گزارا نہ کیا
- ۷۰- کرتا ہوں سیر جب سے باغِ جہاں بنایا
- ۷۱- جامِ خالی سے جو ساقی نے مجھے ڈھکایا
- ۷۲- نالہ سینے سے کرے عزمِ سفر آخر شب
- ۷۳- نلک جاگ لے تو چھوڑ کے غافل پلنگ و خواب (حبیب)
- ۷۴- مجھ اشک میں جوں ابراثر ہوے گا یارب (حبیب)
- ۷۵- بھنگ پی بھنگ خیال اس کا ہے افلاک پرست
- ۷۶- بزمِ غم خونِ جگر پہ مرے مہمان تھی رات
- ۷۷- ہندو ہیں بت پرست مسلمان خدا پرست
- ۷۸- نظر آجائے ہے جیسی کہ ہندوستان میں صورت (حبیب)
- ۷۹- عشق اپنے کی فلک نے جہاں میں پوائی بات
- ۸۰- مانے ہے کسے واقفِ اسرارِ محبت
- ۸۱- لاگے ہے کس کے منہ پہ بایں زورِ پشت دست

- ۸۲- سودا گرفتہ دل کو نہ لاؤ سخن کے بیچ (حبیب)
- ۸۳- یارو میں کیا عہد اسے مانو تم بیچ
- ۸۴- شمع میں ہر چند ہے سر سے گزر جانے کی طرح (حبیب)
- ۸۵- آہ کس سرو میں قمری ہے قد یار کی طرح (حبیب)
- ۸۶- تجھ بن بہت ہی کثرتی ہے اوقات بے طرح
- ۸۷- لطف نشاط بادہ حسن ظہور صبح
- ۸۸- لے آئے در پہ ترے جو ستم کشاں فریاد (حبیب)
- ۸۹- کھینچ کر پوست کرے گردش ایام سفید
- ۹۰- اشک کو کب ہے شناسائی گھر سے پیوند
- ۹۱- خرمی پھرتی ہے یوں دل پہ مرے غم سے دور (حبیب)
- ۹۲- بلبل کو کیا تڑپتے میں دیکھا چمن سے دور (حبیب)
- ۹۳- جوش سے میرے جنوں کے کیا خوش آتی ہے بہار (حبیب)
- ۹۴- دیکھا جوادھر خدا سے ڈر کر (حبیب)
- ۹۵- یہ نہ ہو مہر کہ تاشب رہے گھر سے باہر
- ۹۶- کام آیا نہ کچھ اپنا تین زار آخر کار
- ۹۷- باندھی جھنجھلا کے کر شوخ نے کیس میرے پر
- ۹۸- بکھرائی ہے وہ زلف سید فام جہاں پر
- ۹۹- گردم سے جداتن کو رکھا دیر ہوا پر

- ۱۰۰- پھینکے جو کماں دار مرا تیر ہوا پر
- ۱۰۱- دی بچ دل کو سادہ لوح اس زلف نے پا کر
- ۱۰۲- تو جسے چاہے وہ یارب تجھ سے ہو بیباک تر
- ۱۰۳- دل نا آشنائے نالہ سے صدر وہ جس بہتر
- ۱۰۴- دل نہ کر منت زراہ بے قراری بیشتر
- ۱۰۵- سمندر کر دیا نام اس کا ناحق سب نے کہہ کہہ کر
- ۱۰۶- منزل کے پہنچنے سے درے قافلہ دے چھوڑ
- ۱۰۷- دیکھا میں نخل وادی ایمن ہر ایک جھاڑ (حبیب)
- ۱۰۸- بے خبر در در محبت سے ہے وہ یار ہنوز
- ۱۰۹- انکار قتل سے تو کرے ہے بجن ہنوز (حبیب)
- ۱۱۰- شبنم کرے ہے دامن گل شست و شو ہنوز
- ۱۱۱- کس کے ہیں زیر ز میں دیدہ نمناک ہنوز (حبیب)
- ۱۱۲- بے ہودہ اس قدر نہیں آتا ہے کام ناز
- ۱۱۳- ماہ نو تجھ یاد ابرو میں ہے سینے کا خراش
- نرائن میں ایک غزل ہے جس کا مطلع ہے۔
- رہتا ہے تیرے غم میں دل زار زار زار
- نکلے ہے آہ آہ شرر بار بار بار
- قاضی عبدالودود نے بھی اسے سودا ہی کی تسلیم کی ہے۔ (سورہ، ۲۹ ص ۶۲) لیکن یہ میر سوز کی ہے اور ان کے دیوان میں موجود ہے۔

- ۱۱۴- دوری ہے تری اپنے دل زار کو آتش
- ۱۱۵- دیں شیخ و برہمن نے کیا یار فراموش
- ۱۱۶- سینے میں ہوا نالہ و پہلو میں دل آتش
- ۱۱۷- گو آپ نے نہ مجھ غریب کے بالیں تک آئی شمع (حبیب) (کذا)
- ۱۱۸- لطف اس چہرے کے آگے کوئی یاں رکھتی ہے شمع (حبیب)
- ۱۱۹- سردمہری سے بتاں کی مٹ گیا ہے سوزِ داغ (حبیب)
- ۱۲۰- کس طرح دل میں چھپاؤں تجھ کو ہیں سینے میں داغ
- ۱۲۱- اے لالہ گو فلک نے دیے تجھ کو چار داغ (حبیب)
- ۱۲۲- دیکھوں ہوں یوں میں اس ستم ایجاد کی طرف
- (رچہ ڈیوئسن میں دو اور آسی و حبیب میں سات شعر ہیں)
- ۱۲۳- بلبل نہ چمن ہے گل گزار کا عاشق
- ۱۲۴- خط آچکا پہ مجھ سے وہی ڈھنگ اب تک (حبیب)
- ۱۲۵- پھونک دی ہے عشق کی تپ نے ہمارے تن میں آگ (حبیب)
- ۱۲۶- کب لگ سکے ہے اوس سے کوئی رنگ اور نمک
- ۱۲۷- کرتی ہے میرے دل میں تری جلوہ گری رنگ (حبیب)
- ۱۲۸- رہے اس فصل ہم اے بلبل و گل ناتواں یاں تک
- ۱۲۹- شاعروں میں کب رکھے ہے شیر کی تقریر جنگ
- ۱۳۰- عدد ہے دوری سے ایک اور شمار ہے ایک

- ۱۳۱- سخن عشق نہ گوش دل بیتاب میں ڈال (حبیب)
- ۱۳۲- یکدست اگر زمانہ جہاں میں لٹائے گل (حبیب)
- ۱۳۳- کھینچ شمشیر چاؤ دل کے نکال (حبیب)
- ۱۳۴- اس چمن کی سیر میں آیا ریویں مل کے مل
- ۱۳۵- قاتل کے دل سے آہ نہ نکلی ہوں تمام (حبیب)
- ۱۳۶- نہ غرض کفر سے رکھتے ہیں نہ اسلام سے کام (حبیب)
- ۱۳۷- مبداء جو بلا کا ہے سو ہے وہ نظر چشم
- ۱۳۸- اب اس طرف تری دل گرمی شعلہ خود معلوم (حبیب)
- ۱۳۹- کیا عجائی ان نے میرے دل کے کاشانے میں دھوم (حبیب)
- ۱۴۰- عاشق تو نامراد ہیں پر اس قدر کہ ہم (حبیب)
- ۱۴۱- ہیں صفائے بادہ و درویش پیمانہ ہم (حبیب)
- ۱۴۲- دھن کے سر یولا، گئے جب یار کے کاشانے ہم (حبیب)
- ۱۴۳- لے دیدہ تر جدھر گئے ہم (حبیب)
- ۱۴۴- تو کیوں جیتی رہی بلبل چمن میں دیکھ کر شبنم (حبیب)
- ۱۴۵- ملائم ہو گئیں دل پر برہ کی ساعتیں کڑیاں (حبیب)
- ۱۴۶- نہ غنچے گل کے کھلتے ہیں نہ زگس کی کھلیں کلیاں (حبیب)
- ۱۴۷- بلبل چمن میں کس کی ہیں یہ بدشرایاں (حبیب)
- ۱۴۸- باتیں کدھر گئیں وہ تری بھولی بھالیاں (حبیب)

- ۱۴۹- نہ اشک آنکھوں سے بہتے ہیں نہ دل سے اٹھتی ہیں آہیں
- ۱۵۰- تو نے سودا کے تئیں قل کیا کہتے ہیں (حبیب)
- ۱۵۱- نہ اپنا سوز ہم تجھ سے بیاں جوں شمع کرتے ہیں (حبیب)
- ۱۵۲- عاشق فائیں اپنی بہبود جانتے ہیں
- ۱۵۳- سمجھ کے باندھا تھا آشیاں ہم رہے گا باب و تاب گلشن
- ۱۵۴- یار آزرده ہوارات جوئے نوشی میں
- ۱۵۵- باتیں کتنی ہی نہیں منہ لگنے سے منظور ہمیں (حبیب)
- ۱۵۶- ڈرتے ڈرتے جو ترے کوچے میں آجاتا ہوں (حبیب)
- ۱۵۷- واشد ہو خرمی سے یہ کیا حساب تجھ بن
- ۱۵۸- نگر آباد ہے بے ہیں گاؤں (حبیب)
- ۱۵۹- گلشن میں یار بن مجھے شرب مدام میں (حبیب)
- ۱۶۰- گر کیجیے انصاف تو کی زور و فامیں
- ۱۶۱- عقل اس ناداں میں کیا تیرا جود یوانہ نہیں
- ۱۶۲- چنی اٹھ کر میں تجھے رات کروں یا نہ کروں
- ۱۶۳- پوچھ کر چشم کریں ہم جو فشارِ دامن
- ۱۶۴- غم کی مے ہم نے جو شب دل کی بھری شیشے میں (حبیب)
- ۱۶۵- ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں (حبیب)
- ۱۶۶- سجدہ کیا صنم کو میں دل کے کنشت میں (حبیب)



- ۱۶۷- مژہ اوس چشم کی کھٹکے ہے دل مفتوں میں (حبیب)
- ۱۶۸- عاشق کی کہے چشم روئے بن تر ہوں میں
- ۱۶۹- چشم تر میرے سے کیا رکھتی ہے مطلب آستیں (حبیب)
- ۱۷۰- بلبل تصویر ہوں جو نقش دیوار چمن (حبیب)
- ۱۷۱- غیر کے پاس یہ اپنا ہی گماں ہے کہ نہیں (حبیب)
- ۱۷۲- اسباب سے جہاں کے کچھ اب پاس گو نہیں (حبیب)
- ۱۷۳- کہے ہے توبہ پہ زاہد کہ تجکو دین تو نہیں (حبیب)
- ۱۷۴- پیارے تمہارا پیار کس انسان پر نہیں (حبیب)
- ۱۷۵- جو کچھ ہوسو ہو مجھے بھاگتا تیرے در سے کارگو نہیں (حبیب)
- ۱۷۶- جی تک تو دے کے لوں کہ تو ہو کارگر کہیں (حبیب)
- ۱۷۷- نے بلبل چمن نہ گل نو دمیدہ ہوں (حبیب)
- ۱۷۸- کیوں میں تسکین دل اے یار کروں یا نہ کروں
- ۱۷۹- اسی کو چہچہا کہیے جو یہ قلقل ہے ششے میں
- ۱۸۰- چمن کا لطف سیر اور رونق محفل ہے ششے میں
- ۱۸۱- تجھ بن یہ چمن ہر خس و ہر خار پریشاں
- ۱۸۲- خانہ دل کہ ہو خون ہونے کا آئیں جس میں
- ۱۸۳- گدا دست اہل کرم دیکھتے ہیں
- ۱۸۴- لخت جگر آنکھوں سے ہر آن نکلتے ہیں

- ۱۸۵- خوبوں میں دل دہی کی روش کم بہت ہے یاں
- ۱۸۶- شکل گل میں نے تمام اپنا کیا تن دامن
- ۱۸۷- مسبت سحر و توبہ کن شام کا ہوں میں
- ۱۸۸- تیرے پہلو سے جو مجلس میں بٹے جاتے ہیں
- ۱۸۹- زندگی محبوب کیا کیا اس میں ہیں محبوبیاں
- ۱۹۰- کوسوں کا نہیں فرق وجود اور عدم میں
- ۱۹۱- لازم ہے یزم میں وہ سخن برزباں زبوں
- ۱۹۲- چیز کیا ہوں جو کریں قتل وہ اکھیاں مجھ کو (حبیب)
- ۱۹۳- ظلم کے تیرے ہیں گواہ خانہ بہ خانہ کو بہ کو (حبیب)
- ۱۹۴- محسب آیا یزم میں ساقی لے آ شراب کو
- ۱۹۵- کیجیے نہ اسیری میں اگر ضبط نفس کو (حبیب)
- ۱۹۶- خطا اوس کے سادہ لوحوں کے پرستاروں سے مت پوچھو (حبیب)
- ۱۹۷- شیخ نے اوس بت کو جس کو چپے میں دیکھا شام کو
- ۱۹۸- آلودہ زقطرات عرق دیکھ جیہیں کو
- ۱۹۹- بادشاہت دو جہاں کی بھی جو ہووے مجھ کو
- ۲۰۰- بس ہو تو رکھوں آنکھوں میں اوس آفت جاں کو
- ۲۰۱- مرے ناسے کے خاطر مرغ جاں سے کون بہتر ہو (حبیب)
- ۲۰۲- خواہی رہ صد سالہ ہو تو خواہ یہیں ہو (حبیب)

- ۲۰۳- اس دل کو دے کے لوں دو جہاں یہ بکھونہ ہو (حبیب)
- ۲۰۴- دلدار اوس کو خواہ دل آزار کچھ کہو (حبیب)
- ۲۰۵- غیر پہنت ہے کرم ہم پہ ستم واہ واہ (حبیب)
- ۲۰۶- آہنچ ساقی کہ پھر ایام کب آتے ہیں یہ (حبیب)
- ۲۰۷- شیخ تو کعبے کو پہنچے ہے کرامات کی راہ
- ۲۰۸- یاں نہ ذرہ ہی چمکتا ہے فقط گرد کے ساتھ (حبیب)
- ۲۰۹- شخی تھی جام کی سو گئی جانِ جم کے ساتھ (حبیب)
- ۲۱۰- مجھ سے پہ لیے پھر نالکوار بہت تھفہ (حبیب)
- ۲۱۱- جب خوش ہو تو دے گالی اک بار سو یہ تھفہ (حبیب)
- ۲۱۲- تجھ حسن کا یوں مجھ کو مری جان ہے شعلہ
- ۲۱۳- حسن سے اس کے اسے دے ہے خبر آئینہ (حبیب)
- ۲۱۴- میکدہ ہی میں نہ اے بادہ کشاں ہے شیشہ (حبیب)
- ۲۱۵- ہے زلف میں دل میرا مت کیہ چھو تو شانہ (حبیب)
- ۲۱۶- خلقت کے نہ خلق اپنا پایا میں پسندیدہ
- ۲۱۷- غم کا ہے پسر خواندہ اور درد کا پالیدہ
- ۲۱۸- ہوں سرمہ کوری سے وہ چشم تر آلودہ (حبیب)
- ۲۱۹- کہاں وہ نور کا شمس و قمر میں ہے شعلہ
- ۲۲۰- نیم جاں ہیں یہ تری چشم کے بیمار کئی (حبیب)

- ۲۲۱- ہمارے کفر کے پہلو سے دین کی راہ یاد آوے
- ۲۲۲- غنچے سے مسکرا کے اسے زار کر چلے
- ۲۲۳- سودا کی مرے جس کو تدبیر نظر آئی
- ۲۲۴- جو طیب اپنا تھا دل اوس کا کسی پر زار ہے
- ۲۲۵- جھڑکی تو مدتوں سے مسادات ہو گئی (حبیب)
- ۲۲۶- تو ہی کچھ اپنے سر پہ نہ یاں خاک کر گئی (حبیب)
- ۲۲۷- اب کے بھی دن بہار کے یوں ہی چلے گئے (حبیب)
- ۲۲۸- مارے کو تیری زلف کے لاکھوں جتن کیے (حبیب)
- ۲۲۹- دلا تو یار کو شمس و قمر لگا کہنے
- ۲۳۰- نہیں ہے بحث کا طوطی ترا دہن مجھ سے
- ۲۳۱- آتش جو عشق کی ہے سو نورِ بصر میں ہے
- ۲۳۲- کچھ یہ بھی پیشِ وحشِ کامل زمین ہے
- ۲۳۳- صورت میں تو کہتا نہیں ایسا کوئی کب ہے
- ۲۳۴- جدی جدی یہ جہاں آن بان ہے سب کی
- ۲۳۵- فکر میں ہجر کی دل وصل کا دن کھوتا ہے
- ۲۳۶- ہم ہیں وارستہ محبت کی مددگاری سے
- ۲۳۷- جب اپنے بندِ قیام نے جان کھول دیے (حبیب)
- ۲۳۸- سادوں کے بادلوں کی طرح سے بھرے ہوئے (حبیب)

- ۲۳۹- وعدہ لطف و کرم گرنہ وفا کیجیے (حبیب)
- ۲۴۰- ہر سحر قتل تری چشم کا اک مفتون ہے (حبیب)
- ۲۴۱- سر و گلشن ہے نہ کچھ مفتون ہے (حبیب)
- ۲۴۲- جب اون آنکھیوں کا غمزہ بر سر بید آتا ہے
- ۲۴۳- گوہر کو جوہری اور صراف زر کو پرکھے
- ۲۴۴- تری آنکھیوں نے زگس سے چمن میں یار ایسی کی
- ۲۴۵- خورشید و مہ نے پیارے تجھ پر یہ بیڑائی
- ۲۴۶- گر تجھ میں ہے وفا تو جفا کار کون ہے (حبیب)
- ۲۴۷- دل لے کے ہمارا جو کوئی طالب جاں ہے (حبیب)
- ۲۴۸- میری آنکھوں میں تو بستا مجھے تو کیوں رلاتا ہے (حبیب)
- ۲۴۹- اس قدر سادہ و پرکار کہیں دیکھا ہے
- ۲۵۰- کیا جانیے کہ کس کے دل کا لہو پیا ہے (حبیب)
- ۲۵۱- ارض و سما شفق نے لہو میں بھر دیا ہے (حبیب)
- ۲۵۲- نسیم ہے ترے کوچے میں اور صبا بھی ہے (حبیب)
- ۲۵۳- سودا جو سنا ہے کسی کا نام یہی ہے (حبیب)
- ۲۵۴- جو گل ہے یاں سوا اس گل رخسار ساتھ ہے
- ۲۵۵- لینا جو حیشہ دل منظور ہے تو یہ ہے
- ۲۵۶- چہرہ مر یض لب کا ترے زرد ہے سو ہے (حبیب)

- ۲۵۷- درد میرے استخوان کا کیا ترے دم ساز ہے (حبیب)
- ۲۵۸- ہمیں کسی سے گراظہار درد آتا ہے (حبیب)
- ۲۵۹- مجھے تجھ زلف کے سنبل سمجھنے میں تامل ہے
- ۲۶۰- اس چال کے نبھنے کا کچھ اسلوب نہیں ہے
- ۲۶۱- نہیں جوں گل طلب ابرسیا ہے گا ہے
- ۲۶۲- جس دن تری گلی کی طرف تک پون ہے (حبیب)
- ۲۶۳- کسی کا درد دل پیارے تمہارا ناز کیا سمجھے
- ۲۶۴- کہوں میں کس سے کہ مطلب مراد اکیچھے (حبیب)
- ۲۶۵- مونہہ لگاوے کون جھگو گر نہ پوچھے تو مجھے (حبیب)
- ۲۶۶- سود جوں شمع نہیں گرمی بازار مجھے (حبیب)
- ۲۶۷- اس قدر اب کے ہوا مست ہے دیرانے کی (حبیب)
- ۲۶۸- نہ تاب لاسکے خورشید عشق کی چپ کی (حبیب)
- ۲۶۹- جو بادہ تو نہ پیچے جام لالہ ہونہ سکے (حبیب)
- ۲۷۰- ممکن ہے تیر خوردہ ٹپ کر سنجھل سکے (حبیب)
- ۲۷۱- ماریں گے ایک دو کو یا آپ مر رہیں گے (حبیب)
- ۲۷۲- نے ضرر کفر کو نے دین کا نقصاں مجھ سے (حبیب)
- ۲۷۳- تصور میں ترے کہیو صبا اوس لا ابالی سے (حبیب)
- ۲۷۴- ختم گل امید جن اس شورہ زار سے (حبیب)

- ۲۷۵- مر جاں کا نخل ہوں نہ پھلوں برگ و بار سے (حبیب)
- ۲۷۶- شکوہ ہے دورِ ظالم کرنا مروتوں سے (حبیب)
- ۲۷۷- گود خیزِ عشق میں یاروں کے پکی ہے (حبیب)
- ۲۷۸- کوئی کرتا رہے اوس سے جو یہ مذکور بہتر ہے (حبیب)
- ۲۷۹- بلبلِ نالاں و درِ عشق کچھ معقول ہے
- ۲۸۰- خشک رہنے سے ہمارا دیدہ تر پاک ہے (حبیب)
- ۲۸۱- عارضی سامانِ حرمت کب ہمیں درکار ہے
- ۲۸۲- قاتل سے کیوں جھگڑتے ہو کیا مجھ سے میر ہے (حبیب)
- ۲۸۳- خاک پر بھی تیرے دیوانے کی یہ تدبیر ہے (حبیب)
- ۲۸۴- گل پھینکے ہیں اوروں کی طرف بلکہ شربھی (حبیب)
- ۲۸۵- نہ مجھ سے کہہ کہ چمن میں بہار آئی ہے (حبیب)
- ۲۸۶- بہار بے سپر جام و یار گزرے ہے (حبیب)
- ۲۸۷- اس دل کی تہ آہ سے کب شعلہ بر آوے (حبیب)
- ۲۸۸- افعی کو یہ طاقت ہے کہ اوس سے بہ سر آوے (حبیب)
- ۲۸۹- نسیم گر قدم دوستی بجالاوے (حبیب)
- ۲۹۰- الہی بزمِ بتاں سے وہ شمع نکل جاوے (حبیب)
- ۲۹۱- گو غنچہ ساں گرہ میں دنی جمع زر کرے (حبیب)
- ۲۹۲- بدلاترے ستم کا کوئی تجھ سے کیا کرے (حبیب)

- ۲۹۳- ساقی ہمیں تری شب دیکھ کے گوری گوری (حبیب)
- ۲۹۴- کافر جو ہو مجھ سا او سے دل اپنے میں جاوے (حبیب)
- ۲۹۵- دل میں بسنے کی تری جگہو نیٹ ہے شادی (حبیب)
- ۲۹۶- تجھ تیغ تلے کہہ تو ستم سے کہہ سر دھو دے (حبیب)
- ۲۹۷- خط نقص صفائی رخ دلدار نہ ہو دے (حبیب)
- ۲۹۸- جس دم وہ صنم سوار ہو دے (حبیب)
- ۲۹۹- بھر نظر تجکو نہ دیکھا کبھو ڈرتے ڈرتے (حبیب)
- ۳۰۰- اے آہ تری قدر اثر نے تو نہ جانی (حبیب)
- ۳۰۱- برہمن بنگلے کے شیخ بیت اللہ کے صدقے (حبیب)
- ۳۰۲- اے لالچی تو کیسہ غیروں کا مت ٹٹولے (حبیب)
- ۳۰۳- جوں غنچہ تو چمن میں بند ببا کو کھولے (حبیب)
- ۳۰۴- خاتم کے جوں نگیں ہمیں کس کام کے لیے
- ۳۰۵- نکل نہ چوکھٹ سے گھر کی پیارے جو پٹ کے اچھل ٹھٹک رہا ہے
- ۳۰۶- تیری واسوخت سے خالی میں نہ پایا کوئی
- ۳۰۷- ہم آج ایک صنم میں غرور دیکھا ہے
- ۳۰۸- وہی جہاں میں رموز قلندری جانے
- ۳۰۹- تجھ عشق سے سودا کا انکار نظر میں ہے
- ۳۱۰- کس سے جا انکا ہے دل میرا عجب دیوانہ ہے



- ۳۱۱- عارض پہ حسن خط سے دمک کیا ہے نور کی
- ۳۱۲- یاں صورت و سیرت سے بت کون سا خالی ہے
- ۳۱۳- بولونہ بول شیخ جی ہم سے کڑے کڑے
- ۳۱۴- مگر وہ دید کو آیا تھا باغ میں گل کی
- ۳۱۵- میرے ملنے کی اوس کو تب ہوس ہووے اگر ہووے
- ۳۱۶- خوب واقف ہیں محبت کے وہ سر رشتے سے
- ۳۱۷- دل اس سینے میں ہے یا قطرہ سیما ہے
- ۳۱۸- نہیں وہ بولتے اون میں خبر جن کو ہے کچھ دہر کی
- ۳۱۹- چاہنا بزم قعیش کا ہوسنا کی ہے
- ۳۲۰- عاشق کو نہ کر پیار جی سے
- ۳۲۱- کچھ تازہ تعلق نہیں اس دل کوالم سے
- ۳۲۲- غفلت میں زندگی کو نہ کھو کر شعور ہے
- ۳۲۳- پنہ کو دور کر مرے سینے کے داغ سے
- ۳۲۴- جب نظر اس کی آن پڑتی ہے
- ۳۲۵- زمانہ تجھ سے اگر ہونا ساز کر تو اس سے زمانہ سازی
- ۳۲۶- ہر لحظہ اب بہ نشوونما خط یار ہے
- ۳۲۷- دل کسی سے کہ جب پلٹتا ہے
- ۳۲۸- درد دل کس کو کہوں میں وہ کہاں ہے تو ہے

- ۳۲۹- ہم سے لالچ پہ ارادہ کچھ اگر اس کا ہے
- متفرقات غزلیات نامہ تمام
- ۳۳۰- مسیحاں کے اٹھ جاوے جو کہیے کچھ دوا کیجیے
- ۳۳۱- تو تک جگر تو مرے مرغ نامہ بر کا دیکھ
- ۳۳۲- اگر دنیا میں اب یوں ہی تھن رسم وفا ہوگا
- ۳۳۳- ساقی ہماری توبہ تجھ پر ہے کیوں گوارا
- ۳۳۴- کیا تاب ہے جو مونہہ پہ ترے آوے آفتاب (حبیب)
- ۳۳۵- نہ جائے سر سے مرے تاباں ہواے شراب (حبیب)
- ۳۳۶- کیوں اسیری پہ مری صیاد کو تھا اضطراب (حبیب)
- ۳۳۷- کیا خوشی ہم کو کہ اپنی ہے یہ حیرانی کی طرح
- ۳۳۸- یہ زندگی مری وحشت کا تک ہے صیاد
- ۳۳۹- جام گل تیرے سے اب بلبل کو مستی ہے بہار ۲
- ۳۴۰- شیخ تک چشم عشق سے کریر ۲
- ۳۴۱- ساقی گئی بہار ہی دل میں یہ ہوں
- (رچرڈ جونس اور آسی میں دو اور حبیب میں ایک شعر ہے)
- ۳۴۲- آشیاں کو مت اجڑا کر کے فریاد و خروش
- (حبیب اور رچرڈ جونس میں دو اور آسی میں تین شعر ہیں)
- ۳۴۳- ابھرے ہے کیا حجاب نمط اے حریر پوش ۲ (حبیب، رچرڈ جونس دو شعر)

- ۳۴۴- گو آپ نہ مجھ غریب کے بالیں تک آئی شمع ۴
- ۳۴۵- پروانہ رات شمع سے کہتا تھا رازِ عشق (حبیب، رچرڈ جونس، دو شعر)
- ۳۴۶- رخ سے دیکھوں ہوں میں اوس زلف سیہ قام تلک ۳
- ۳۴۷- ہووے نہ ملک عشق سے کم رسمِ داغِ دل (حبیب، رچرڈ جونس، دو شعر)
- ۳۴۸- تیرے ہی دیکھنے کے نہ آوے جو کام چشم
- (حبیب، رچرڈ جونس میں دو شعر اور آسی میں پوری غزل ہے)
- ۳۴۹- کس کس طرح کی دیکھیں اس باغ کی فضائیں (رچرڈ جونس، حبیب، دو شعر)
- ۳۵۰- خلش کروں نہ کسی سے اگر چہ خار ہوں میں ۲
- ۳۵۱- عاشق کی بھی کٹتی ہیں کیا خوب طرحِ راتیں
- (حبیب تین شعر، رچرڈ جونس دو شعر)
- ۳۵۲- موسمِ گل ہے ولے کچھ یہ دل اب شاد نہیں (حبیب، رچرڈ جونس، دو شعر)
- ۳۵۳- ظاہر میں دیکھنے کا کچھ اسباب ہی نہیں ۲
- ۳۵۴- بھگو نہیں ہے دل میں تری راہ کیا کروں ۲
- ۳۵۵- الہی ہے سکتِ نعم البدل کی بھگو دینے کی
- مجھے اس کے عوض تو کچھ ندے پر پھیرے دل کو ۱
- ۳۵۶- اب دردِ دل سے موت ہو یا دل کو تاب ہو (حبیب، رچرڈ جونس، دو شعر)
- ۳۵۷- تجھ بن تو دو جہاں سے کچھ اپنے تئیں نہ ہو ۲
- (حبیب، رچرڈ جونس، دو شعر)

- ۳۵۸- بوؤں میں تخم دل کو جہاں واں زقوم ہو (حبیب، رچرڈ جونس، دو شعر)  
 ۳۵۹- اے نالہ مت سبک ہو نکل کر جگر سے تو (حبیب، رچرڈ جونس، دو شعر)  
 ۳۶۰- لٹی مے، اٹھ گیا ساقی مرا بھی پر ہو پیانہ ۲  
 ۳۶۱- تیری اون الفتوں کے زمانے کدھر گئے ۲ (حبیب، رچرڈ جونس، دو شعر)  
 ۳۶۲- جو ہے جلاجلوں کا ہے غم خوار وہ کوئی ۲  
 ۳۶۳- ہمت کہاں کہ منت دونوں نہ لیجیے ۳ (حبیب، رچرڈ جونس، تین شعر)  
 ۳۶۴- اٹھایا کوہ رستم نے اگر تو سخت ناداں ہے (حبیب، رچرڈ جونس، تین شعر)  
 ۳۶۵- حیران ہوں شمع کس کے لیے سوزناک ہے (حبیب، رچرڈ جونس، دو شعر)  
 ۳۶۶- حیراں ہوں شمع کس کے لیے سوزناک ہے (حبیب، رچرڈ جونس، دو شعر)

حسب ذیل نا تمام غزلیں صرف حبیب میں ہیں

- ۳۶۷- قاصد کو اپنے ظالم جو کچھ میں دوں بجا ہے  
 ۳۶۸- یاں چشم سرمہ سا کا مارا کوئی جیا ہے  
 ۳۶۹- نہیں ممکن اسیروں کی کوئی فریاد کو پہنچے (تین شعر)  
 ۳۷۰- مرے خون ناحق کی دے کر گواہی  
 (دو شعر، آسی میں یہ شعر باعیاات کے تحت دیے گئے ہیں)  
 ۳۷۱- سودا یہ کرے گانت اس طرح کا رونا  
 ۳۷۲- حلق کی خلقت سے آگے ترا دیوانہ تھا  
 ۳۷۳- بال و پر ہونے نہ پائے تھے نمودار ہنوز

- ۳۷۴- کیا کیجیے کہ ہم سے کچھ بات نہیں بن آتی (دو شعر)  
 ۳۷۵- وہی ہیں دن وہی راتیں وہی فجر وہی شام  
 ۳۷۶- خانہ پرورد چمن ہیں آخر اے صیاد ہم  
 ۳۷۷- کرے نیک منفعل کوئی مرے بیدرد قاتل کو  
 ۳۷۸- بہار باغ ہو مینا ہو جام صہبا ہو  
 ۳۷۹- اب شہدِ زندگی کی نہیں ہے ہوس مجھے  
 ۳۸۰- سینے کو دشمنوں کو نگہ تیری توڑ دے (دو شعر)

### فردیات

- ۳۸۱- دیدہ بیدار آب سے تجھ بن ہمیں کیا کم ہے جام  
 ۳۸۲- جب تک ہے جہاں میں گل و گلزار سلامت  
 ۳۸۳- میکشاں روح ہماری بھی کبھی شاد کرو  
 ۳۸۴- کون کہتا ہے نہ اوروں سے ملا کر مجھ سے مل  
 ۳۸۵- اوس دل پہ تجھے رحم جفا کا نہیں ہے  
 ۳۸۶- میں کہتا ہوں دل اپنے کو کہ نیک و نام سے گزرے  
 ۳۸۷- تبسم دیکھ تیرا کیوں نہ دل بیتاب ہو جاوے  
 ۳۸۸- یار ہے بے قدر جب ہو آشنادس نہیں کا  
 ۳۸۹- خط مرغ نامہ بر نے تجھے کون سادیا  
 ۳۹۰- فائدہ کیا خط تجھے لکھ لکھ اگر روتا ہوں میں

۳۹۱- سن کے یہ کہتا ہے میرے نالہ جانکاہ کو

## مخمس

-۱

-۲- بہر جامی روم از خویش می جوشد تماشائے

-۳- کہ در و موے نہ گنجید ز بسیاری دل

-۴- کہ سر بکودہ و بیاباں تو درودہ مارا

-۵- سوزم گرت نہ بنم، میرم چو رخ نمائی

-۶- مخمس بر غزل میر۔ تو بھی ہم غفلوں نے آ کے کیا کیا کیا کچھ

-۷- کیا کام کیا دل نے دیوانے کو کیا کہیے

-۸- مخمس بر غزل تاباں۔ ترے پاس عاشق کی عزت کہاں ہے

-۹- مخمس بر مصرع خود۔ طاقت نہیں رہی ہے مجھے انتظار کی

-۱۰- مخمس بر غزل خود۔ جھڑکی تو مدتوں سے مساوات ہو گئی

-۱۱- گویا چمن میں جزدیم عیسیٰ صبا نہیں

-۱۲- مخمس بر غزل خود۔ ہونے سے دوستوں میں بہم پیار رہ گئے

-۱۳- مخمس درویرانی شاہ جہاں آباد۔ بتا کہ نوکری بکتی ہے ڈھیریوں یا تول

-۱۴- دیکھنے کے مجھے مانع ہیں طہیان گل و صبح

-۱۵- ہر کہ عیب دگراں پیش تو آورد و شمر د

-۱۶- عینک بھی جوڑے ساتھ منگاتے ہیں شیخ جی

- ۱۷- کہتے ہیں حورو ملک شیخی تم زور بنے
- ۱۸- اک مسخرا یہ کہتا تھا کو احلال ہے
- ۱۹- مخمس درہجو ندرت۔ گھوڑے کو دو نہ دو لگام منہ کو تنک لگام دو
- ۲۰- مخمس درہجو ندرت۔ آبروے ریختے از جوش سودا ریختے
- ۲۱- مخمس درہجو ندرت۔ لولو کرا ٹھوٹ لچ دے پارے پارے مدنا
- ۲۲- مخمس در تریض بعض شعرا۔ مونہ پرورش شانہ میں تو ہو موصل
- ۲۳- مخمس درہجو فدوی۔ کہ فدوی جگ میں کہاتا ہے الو بنے کا
- ۲۴- مخمس درہجو ضاحک۔ روٹی تو کسی طور کا کھائے مچھندر
- ۲۵- مخمس درہجو ضاحک۔ بولا کہ کیوں بے ضاحک بکرا کوئی منگایا
- ۲۶- مخمس درہجو ضاحک۔ جا صبا زاہد سے کہہ بعد از سلام

### مثنویاں

- ۱- میرادل نام پر اس کے ہے شیدا
- ۲- مثنوی در بیان شدت گرما (حبیب)
- ۳- مثنوی درہجو فیل (حبیب)
- ۴- مثنوی در بے نعمی شا جہاں آباد (حبیب)
- ۵- مثنوی درہجو بخیل
- ۶- مثنوی درہجو بسیار خوار کہ عبارت از ضاحک باشد
- ۷- مثنوی درہجو فونی (حبیب)

- ۸- مثنوی در تعریف دیوان مہربان خاں  
 ۹- مثنوی در ہجو فدوی (یہ شیدا کی تصنیف ہے)  
 ۱۰- مثنوی در ہجو حکیم غوث (حبیب)

یہ مثنویاں رچرڈ جونسن میں نہیں ہیں حبیب میں ہیں

- ۱- ہے خدا کا یہ ایک شمرہ نور  
 ۲- ہجو کو دک اتر وضائع روزگار

### رباعیات

- ۱- خاوند وہ ایسا ہے کہ عالم کو دے  
 ۲- ہر سوتیری تحقیق میں تھے ہم سرگرم  
 ۳- ایوان عدالت میں تمہارے یا شاہ (حبیب)  
 ۴- مومن نہیں زنا سے میرے آگاہ (حبیب)  
 ۵- سودا جو کوئی ہے مئے وحدت سے مست  
 ۶- سایا تیرا اے نخل امید کہہ دہ  
 ۷- نادیدنی از بسکہ ہے روئے عالم (حبیب)  
 ۸- تجھ پاس گدا کب آ کے ایسا بولا (حبیب)  
 ۹- دکھ تفرقہ کا یاروں کے کچھ مت پوچھو  
 ۱۰- آنکھوں سے پڑا اشک مرے ڈھلتا ہے (حبیب)  
 ۱۱- کوتاہ نہ عمرے پرستی کیجیے (حبیب)



- ۱۲- آنکھیں کہیں بھوؤں سے کہ حصہ کیجیے (حبیب)
- ۱۳- ہر نوں کو اے آخون شکار، میرے (حبیب)
- ۱۴- دلو کہے آخون بلاؤ مجھ کو (حبیب)
- ۱۵- گر ہجو پہ سودا کی او سے رغبت ہے (حبیب)
- ۱۶- سودا پئے دنیا تو بہر سو کب تک
- ۱۷- ہے فوج سے غمزے کی ہمیشہ بیداد
- ۱۸- مونہہ پھیرے ہے گودیکھ کے ہم کو عالم
- ۱۹- ہے زیرِ فلک جتنے کہ یہ موجودات
- ۲۰- گرمہ سے بلندی میں ہوا تو وہ چند
- ۲۱- اے نفسِ دنی حرف تو میرا کر گوش
- ۲۲- دنیا ہمیں کہتی ہے کہ دل مجھ سے موڑ
- ۲۳- اے دوست تجھے دل میں تو پاتا ہوں سرور
- ۲۴- افسوس کریہوں میں نہیں یہ دستور
- ۲۵- ہستی یہ تری وہم کا اک ریشہ ہے
- ۲۶- سودا شعرا میں ہے بڑائی تجکو
- ۲۷- سودا بہ جہاں اپنی زبانی تو ہے
- ۲۸- اس باغ پر از میوہ میں جو آیا ہے
- ۲۹- سودا دہن یار کے ہوتے رکھ ہوش

- ۳۰- باریک و طویل اتنا ہوا کس کے پوت
- ۳۱- سودا کی ہے یہ عرض یقین اس کو جان
- ۳۲- ناطق تو نہ تھا جب تو نے تھا تب کچھ
- ۳۳- اے شیخ حرم تک تجھے آنا جانا
- ۳۴- ہے حرص و ہوا تن کے ترے ہر مو میں
- ۳۵- میں دیر و حرم ڈھونڈ کے یار و ہارا
- ۳۶- چاہی تھی بتوں کی آشنائی ہم نے
- ۳۷- کتنوں کا جہاں میں بہ زر و مال ہے شکر
- ۳۸- جب سے چمن حسن میں تو در آیا
- ۳۹- اوس چشم و مژہ سے دل دیا تھا اٹکا
- ۴۰- اوس آتشیں خو سے دل یہ کس کا اٹکا
- ۴۱- کیا جانے بسا ہے آج کس کے جاکر
- ۴۲- کل آگے جنھوں کے دکھ سے وقفا پایا
- ۴۳- تیشہ سے جو کو بکن نے سر کو پکا
- ۴۴- دکھ دل کا کوئی جو تجھ سے کہہ کہہ رووے
- ۴۵- دلی سے میں دنیا کی کہا یوں جاکر

### قطعات

- ۱- یوں سنا ہے کہ خسرو یک عمر (حبیب)

- ۲- در تہنیت عید۔ نوید زیر فلک یوں ہوئی ہے شہرہ عام
- ۳- در تہنیت عید۔ علی الصباح جو نکلا میں بندہ خانے سے
- ۴- در تہنیت عید۔ فلک جناب در بار گاہ میں تیرے
- ۵- در تہنیت سالگرہ۔ بے شمار ترے عمر سال عالم کے
- ۶- در تہنیت۔ رہے فلک پہ درخشندگی میں تائیزاں
- ۷- در تہنیت سالگرہ۔ جو سال عمر ازل سے ترے مقرر ہیں
- ۸- در تہنیت و تاریخ عروسی مہرباں خاں۔ مباح اس دوست کو جا تہنیت دے
- ۹- در دعائیہ۔ جہاں میں آب و ہوا کی موافقت تجھ کو
- ۱۰- در موعظہ۔ بحر تصنیف سودا سے مفتی
- ۱۱- قطعہ آخری۔ عروس شیخ سے پوچھا یہ ایک زاہد نے
- ۱۲- قطعہ آخری در تعریض بعضے شعرا۔ میں ایک فارسی داں سے کہا کہ اب مجھ کو
- ۱۳- در تعریض میر۔ ایک مشفق کے گھر گیا تھا میں
- ۱۴- در تہنیت فتح روہیلہ۔ الہی ذات سے تیری جہاں میں
- ۱۵- در مضحکہ مشتمل بر تاریخ۔ چشم و چراغ جن کے ملا کٹھیر کے تھے۔
- ۱۶- کہا کلام یہ سودا سے ایک عاقل نے
- ۱۷- تہنیت عید۔ ہر ایک عید مد و خور نے سیم و زر لیکر
- ۱۸- تاریخ عروسی۔ اہل تجیم جہاں تک ہیں اب آفاق کے بچ
- ۱۹- در تہنیت عید۔ صباح عید بے دل میں خوشی سے مالا مال

- ۲۰- تہنیت عید۔ یہ روز عید ہے آفاق میں ہے رسم قدیم
- ۲۱- تاریخ ولادت۔ صبح دم آج دل خلاق کا
- ۲۲- تہنیت عید النبیؐ۔ جہاں میں شادی عید النبیؐ ہے آج کے دن
- ۲۳- کھیت رہنے سے یار و حافظ کے
- ۲۴- چل قلم کہہ حسن رضا خاں سے
- ۲۵- تہنیت عید النبیؐ۔ خوشی جہاں میں ہے عید النبیؐ کی آج کے روز
- ۲۶- جگو ہر چند نہیں شیعہ و سنی سے کام
- (حبیب میں یہ قطعہ رباعیات کے تحت دیا گیا ہے۔)
- ۲۷- در غرر دوست داشتن سگ۔ ایک عاقل نے یہ سودا سے کہا از سر پند
- ۲۸- قصیدہ و تاریخ بناے مسجد۔ باعند لیب گلشن ایماں برابر است
- ۲۹- تاریخ تولد۔ مبارک باد ایں فرزند ولید
- ۳۰- قطعہ تعریف چاہ۔ چشمہ از حکم آصف الدولہ
- ۳۱- قطعہ تعریف چاہ۔ شد بہ حکم آصف الدولہ بنا
- ۳۲- تکیہ رائے مہاراجہ ساخت بتانے

### قصیدے

- ۱- قصیدہ درد مدح رچرڈ جونسن
- دیکھانہ جائے اس سے روئے لگر خاں پر رنگ (یہ قصیدہ کسی مطبوعہ کلیات میں شامل نہیں)

- ۲- قصیدہ درنعت حضرت رسالت علیہ السلام  
ہو واجب کفر ثابت ہے وہ تمغائے مسلمانی (حبیب)
- ۳- قصیدہ درنعت و منقبت  
چہرہ مہروش ہے ایک سنبل مشکفام دو (حبیب)
- ۴- قصیدہ در منقبت امیر المومنین  
بسان دانہ روئیدہ ایکبار گرہ (حبیب)
- ۵- قصیدہ در منقبت امیر المومنین  
سنگ کو اتنے لیے کرتا ہے پانی آسماں (حبیب)
- ۶- قصیدہ در منقبت امیر المومنین  
یار و مہتاب و گل و شمع بہم چاروں ایک
- ۷- قصیدہ در منقبت امیر المومنین  
اوٹھ گیا بہمن و دے کا چمنستاں سے عمل
- ۸- در منقبت سید الشہد اعلیہ السلام  
سوائے خاک نہ کھینچوں گامنت دستار (حبیب)
- ۹- در منقبت کاظمین علیہ السلام  
ہے پرورش خن کی مجھے اپنی جاں تلک (حبیب)
- ۱۰- در منقبت امام رضا  
اگر عدم سے نہ ہو ساتھ فکر روزی کا

- ۱۱- در منقبت امام عسکری  
عیب پوشی ہولباسِ چرک سے کیا ننگ ہے (حبیب)
- ۱۲- در منقبت صاحب الزماں  
جوں غنچہ آسماں نے مجھے ہیر عرض حال (حبیب)
- ۱۳- قصیدہ در مدح عالم گیر ثانی  
رکھے ہمیشہ تری تیغ کار کفر تباہ (حبیب)
- ۱۴- در مدح عالم گیر ثانی  
ہے اشتہار تجھ سے مرا اے فلک جناب
- ۱۵- در مدح عالم گیر ثانی  
کہے ہے کاتبِ دوراں سے منشیِ تقدیر (مصطفائی اور آسی میں یہ قصیدہ عماد  
الملک کی مدح میں ہے جو ٹھیک معلوم ہوتا ہے کیوں کہ اس قصیدے میں یہ شعر  
بھی ہے۔
- سنا نہیں ہے کہ عازی دیں عماد الملک  
جو میر بخشی تھا واں کا سواب ہوا ہے وزیر
- ۱۶- در مدح نواب عماد الملک  
فجر ہوتے جو گئی آج مری آنکھ جھپک (حبیب)
- ۱۷- در مدح نواب شجاع الدولہ  
خوں مرے دل میں نہیں تشنہ ہے گو تیرا ناز

- ۱۸- درصفت تیر اندازی  
احکام پر تیرے نہ کرے کیوں کے کام تیر
- ۱۹- درمدح نواب شجاع الدولہ  
آیا عمل میں تیغ سے تیرے وہ کارزار
- ۲۰- درمدح آصف الدولہ  
تیرے سائے تلے ہے تو وہ نہنت
- ۲۱- درمدح آصف الدولہ  
کیا تجکو بھی مسند دیوان وزارت
- ۲۲- درمدح نواب مرحوم  
اشجار کا بستان جہاں کے ہے عجب ڈھنگ
- ۲۳- قصیدہ بہاریہ درمدح نواب سیف الدولہ  
برج حمل میں بیٹھ کے خادر کا تاجدار (حبیب)
- ۲۴- درمدح نواب سیف الدولہ  
ہنجوش کا ہودل تو رہے دہر سے بتنگ (حبیب)
- ۲۵- درمدح نواب سیف الدولہ  
ہے سخن سخ اک جوان متین (حبیب)
- ۲۶- درمدح نواب وزیر آصف الدولہ  
کیا قلم کو رقم سے ہے منظور

- ۲۷- در مدح نسبت خاں  
کل حرص نام شخصے سودا پہ مہرباں ہو (حبیب)
- ۲۸- در مدح نسبت خاں  
تا شیر گردش آج کواکب کے صبح کو (حبیب)
- ۲۹- در مدح آصف الدولہ  
گر فلک اب یہ مہرباں ہووے
- ۳۰- در مدح نواب آصف الدولہ  
سودا پہ جب جنوں نے کیا خواب دغور حرام
- ۳۱- در نعت  
رُخِی میں ترا اور گلستاں ہے برابر
- ۳۲- در تعریف بہ یکے از معاصرین و مدح شاہ خراسان  
مستغنی ذاتی نہ مہوس کے ہوں تسخیر
- ۳۳- در نعت  
مکر خلا سے کیوں نہ حکیموں کی ہوزباں
- ۳۴- شہر آشوب  
اب سامنے میرے جو کوئی پیرو جواں ہے (حبیب)
- ۳۵- ہجو مولوی ساجد خارجی  
سنا ہے میں یہ کسی نے بہ مدعاے فساد



۳۶- در ہجو اسپ

ہے چرخ جب سے ابلق ایام پہ سوار (حبیب)

۳۷- ہجو مولوی ساجد خارجی

ساجد اکیوں نہ وہ پرواز کرے تابہ فلک (مصطفائی میں یہ ہجو ہے لیکن آسی میں نہیں)

۳۸- در مدح طیب

علم ظنی ہے طبابت تو یہ سن رکھ ہدم

### غزلیات فارسی

۱- زد شعلہ بر دل از نفس سرود ماغ ما

۲- چوں دل نتواند کہ کند ترک و قارا

۳- گر بہ لکنت واکند یار آں دو لعل بستہ را

۴- اے کہ در چشم بہر صورت تو منظوری بیا

۵- من بساط عیش خود را برنجشم تا کجا

۶- کس بروں ز اں کو چہ نتوان کرد ایں دلدادہ را

۷- تنہا نہ موج خندہ زندہ بر بقائے ما

۸- آں شعلہ کہ در خرمن موسیٰ شریر دوست

۹- غم ز ایام جوانی یادگار ماندہ است

۱۰- سخن ز ما بہ جہاں وز دیگر اں گہرست

- ۱۱- سیر رہش زمانہ چو جانہائی گداشت
- ۱۲- دانم کہ عشق ہم چوئے قابل تو نیست
- ۱۳- جویر آئینہ از تاب رخس سوخته است
- ۱۴- ساختم از حال دل آگاہ و یار از دست رفت
- ۱۵- افسوس پائے عیش جہاں را قیام نیست
- ۱۶- بہ چہرہ راہ خط مشکبار نتواں بست
- ۱۷- عشق تو ز پروانہ ماتانہ گس سوخت
- ۱۸- در پردہ بہ مانا سزاوار تو باشد
- ۱۹- در کشوری کہ ناز و ادای فروختند
- ۲۰- شادم اگر بہاے دلم یار بکنند
- ۲۱- مشہور دلم چو بہ ہدم دو چار نالد و گرید
- ۲۲- ہر یکے خواہاں دل از جنس خواہاں می شود
- ۲۳- گردنم را چو باں تیغ سرو کار افتد
- ۲۴- در دم زدوای تو فزوں شد شدہ باشد
- ۲۵- تا کار من دل شدہ با سلسلہ افتاد
- ۲۶- آنا تکہ بدست تو دل زار فروشد
- ۲۷- نے گلے در باغ رنگ و بوے او در خواب دید
- ۲۸- سودے ازیں جہان خرابی ندید کس

- ۲۹- زان دید کہ برد جلوہ صیاد در قفس
- ۳۰- در میکدہ ماچور سیدی زحرم باش
- ۳۱- جان ستم رسیدہ من داد خواہ دل
- ۳۲- گہ کہہ راز کوئے تو بہتر نہ گفتہ ام
- ۳۳- بچشم مردماں از رہگذار سرمہ می آیم
- ۳۴- دل را کشید جاناں تا در بر تبسم
- ۳۵- در قتل گہم آئی و من روئے تو پیغم
- ۳۶- ہرگز بجہاں ما غم دستار نداریم
- ۳۷- از دلم چوں آہ آتشناک می آید بروں
- ۳۸- لالہ بے دود چراغست چہ می بینی تو
- ۳۹- دارم من آشنائی کز روز آشنائی

## سودا کا الحاقی کلام

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ مطبوعہ کلیات سودا میں بہت سا کلام دوسرے شاعروں کا ہے۔ یہاں سودا کے تمام الحاقی کلام کی نشان دہی کی گئی ہے۔  
مندرجہ ذیل غزلیں میر سوز کی ہیں: ۱۔

- ۱- دلا دریاے رحمت قطرہ ہے آب محمد کا
- ۲- جب خیال آتا ہے اس دل میں ترے اطوار کا
- ۳- مل کے اُس بد خو سے اے دل جب تو رسوا ہوے گا
- ۴- قدر داں بن ہے بہت حال برائے شے کا
- ۵- لگے ہے جام جو منہ دل ہے آب شے کا
- ۶- تہی لانا مجالس میں نہیں دستور شے کا
- ۷- کریں شمار بہم دل کے یار داغوں کا

۱۔ انجمن ترقی اردو، علی گڑھ میں دیوان سوز کے تین قلمی نسخے ہیں۔ جن کے نمبر حسب ذیل ہیں۔

|           |           |           |
|-----------|-----------|-----------|
| ۸۹۱، ۵۵۱۱ | ۸۹۱، ۵۵۱۱ | ۸۹۱، ۵۵۱۱ |
| س ۴۲ دس   | س ۴۲ دس   | س ۴۲ دس   |
| ن ۳       | ن ۲       | ن ۱       |

ان تینوں نسخوں سے کلیات سودا مرتبہ آئی کا مقابلہ کیا گیا ہے۔ اردوے معنی کے ”میر سوز“ نمبر اور قاضی عبدالودود کے ایک مقالے ”کلیات سودا کا پہلا مطبوعہ نسخہ“ (سویہ، ۲۹) سے بھی مدد لی گئی ہے۔

- ۸- عشق تھا یا کیا تھا جس سے دل اٹکا ہی رہا
- ۹- چہرے پہ نہ یہ نقاب دیکھا
- ۱۰- جب بادہ خونِ دل ہو تو سیرِ چمن گجا
- ۱۱- نہ دانہ ساتھ لے صیاد تین نے دام لیتا جا
- ۱۲- افسوس تم اوروں سے طورات کو تھا
- ۱۳- عشاق تیرے سب سے پرزار تھا سو میں تھا
- ۱۴- دیکھ کر جو مر گئے ہیں تیری پوروں پر حنا
- ۱۵- کہتی ہے میرے قتل کو یہ بے وفا حنا
- ۱۶- نے رستم اب جہاں میں نے سام رہ گیا
- ۱۷- نہیں پیکاں یہ جو ہر نامہ اُن نے تیر پر لکھا
- ۱۸- موتی کو بھی ترا کرے احیا پیام لب
- ۱۹- کھولی گرہ جو غنچے کی تو نے تو کیا عجب
- ۲۰- کر حذر میرا نہیں ہے شیشہ خالی محاسب
- ۲۱- ہوئے ہیں غنچوں کے دل بے قرار تیرے ہات
- ۲۲- دین و کفر آنکھوں نے تیری کر دیا اے یار مست
- ۲۳- رہتے تھے ہم تو شاد نہایت عدم کے بیچ

۱۔ کلیاتِ سودا مرتبہ آسی میں یہ شعر بھی شامل ہے۔

اسی مضمون سے معلوم اس کی سر دہری ہے  
مرا نامہ جو اس نے کلیدِ کشمیر پر لکھا  
لیکن یہ شعر دیوانِ سوز کے کسی نسخے میں نہیں ہے۔ مجموعہ "نثر" (جلد ۱، ص ۶۵) عمدۃ منتجبہ (ص ۱۰۶) اور سخن  
شعرا (ص ۳۷) میں اعظم خاں اعظم شاگرد محمد نصیر الدین نصیر سے منسوب ہے۔

- ۲۴- جان عشاق کی لے چھوڑے یہ کر پیار کے بیچ
- ۲۵- ہوا ہے داغ مراد دل اتار کے مانند
- ۲۶- لذت بے رنج ملتی ہے زمانے سے بعید
- ۲۷- میں چاہتا نہیں دنیا میں عز و جاہ بلند
- ۲۸- مجھ ساتھ تری دوستی جب ہو گئی آخر
- ۲۹- صبا حریف لے آئی ہے تو مرے دل پر
- ۳۰- پیوں ہوں خون دل اتنا، تجھے گماں ساغر
- ۳۱- تپ جائے کیوں کہ عشق کی اے یار تجھ بغیر
- ۳۲- کانٹے دل کو ہیں ابرو یار کے تلواریں
- ۳۳- کرتا ہوں ترک عشق میں یوں پیش و پس ہنوز
- ۳۴- کب ہم کو ہے بہار میں گلزار کی ہوس
- ۳۵- بلبل کو ہے ترے سر دیوار کا ہلاں
- ۳۶- یوں دیکھ مرے دیدہ پُر آب کی گردش
- ۳۷- رکھتے ہیں ترے زلف کے ہر تار کا خلش
- ۳۸- آرام پھر کہاں ہے جو ہر دل میں جاے حرص
- ۳۹- دیکھ لینا ہم کو تیرا یار ہے جب تب غرض
- ۴۰- سر سبز حسن رکھتی ہے تیرا بہار خط
- ۴۱- تیری آنکھوں کی طرح سے نہ رکھے جام نشاط

- ۴۲- سمجھے تھے ہم جو دوست تھے اے میاں غلط
- ۴۳- اشک کے قطرے سے نیساں کا اثر رکھتی ہے شمع
- ۴۴- مڑگاں کی گرخلش کا بدل ڈھنگ ہے وسیع
- ۴۵- آتش ہے مرا بوجھ، سمندر نہ درے داغ
- ۴۶- نالے سے میں اپنے نہیں اے رشکِ پری داغ
- ۴۷- عشق کی ہووے تو ہو ہم کو اسیری کا دماغ
- ۴۸- اب ہو تو نہ ہرگز رہے کنعان میں یوسف
- ۴۹- میں بتاؤں تم کو یاروگر کرو تذہیر ایک
- ۵۰- سنبل و زلف سیہ کا کل و شب چاروں ایک
- ۵۱- رونے سے میرے تابہ کجادل سے آئے اشک
- ۵۲- مرا لگتا نہیں اے باغباں تیرے چمن میں دل
- ۵۳- جب تو چمن سے گھر کو چلا کر کے دید گل
- ۵۴- جاتا ہے دل تو جائیو ہشیار آج کل
- ۵۵- سنا ہے اب تو خط آیا ہے، کس اسلوب دیکھیں ہم
- ۵۶- پیتا ہوں یاد دوست میں ہر صبح و شام جام
- ۵۷- کرے ہے عشق کی گرمی سے دل آند آتش میں
- ۵۸- لڑیں ہیں کیوں ترے مڑگاں وابر و یار آپس میں
- ۵۹- قیس کی آوارگی ہے دل میں سمجھو تو کہوں

- ۶۰- عاشق ترے ہم نے کیے معلوم بہت ہیں
- ۶۱- کر دے ہے مہر بد کیوں افلاک ایک پل میں
- ۶۲- آپ کو تو کو سمجھتا ہے کہ وہ دانا نہیں
- ۶۳- اتنا ستم نہ کیجیے مری جان جان جان
- ۶۴- جانا ہوں ترے در سے بس اے یار رہا میں
- ۶۵- بہار اس کی نہیں لگتی ہے اک پاسک آنکھوں میں
- ۶۶- امید ہو گئی کچھ گوشہ گیری دل میں
- ۶۷- دل کو یہ آرزو ہے صبا کوے یار میں
- ۶۸- بلبل کہیں، پتنگ کہیں اور ہم کہیں
- ۶۹- مت پھر تو ساتھ غیر کے، آمان، ہر کہیں
- ۷۰- یاد میاں اب دل میں تیری دے باتیں نہیں آتی ہیں
- ۷۱- آنکھوں کو تک سنبھالو یہ مارتی ہیں راہیں
- ۷۲- چاہ کے غرق تھے ہے یہ گماں ترے ہیں
- ۷۳- اس سرو قد کی دوستی میں کچھ ثمر نہیں
- ۷۴- امید وصل جز طمع خام کچھ نہیں
- ۷۵- مجھے معلوم یوں ہوتا ہے میری بھی پھنسی آنکھیں
- ۷۶- دماغ اصلاح دینے کا نہیں کہہ دو ہلائی کو
- ۷۷- چہ بے گنہ چہ گنہ گار یہ نہ ہو وہ ہو



- ۷۸- یوں نہ چاہے گا دل آگاہ یہ دودھ نہ ہو
- ۷۹- حال دل پوچھے ہے کیا مجھ سے مرا اے یار تو
- ۸۰- لہو اس چشم کا پوچھے سے ناصح بند کیوں کر ہو
- ۸۱- کر رکھا تیغ نگہ نے دل نگار آئینے کو
- ۸۲- تمہارے فہم میں پیارے جو ہم ہیں غیریوں سمجھو
- ۸۳- لینے لگا ہے اب تو مرا نام گاہ گاہ
- ۸۴- نہ دے عاشق نہ دے معشوق جن میں ہونہ کچھ خامی
- ۸۵- بولا وہ جسے تیری تصویر نظر آئی
- ۸۶- یار کا جلوہ مرے کیا شہرہ آفاق ہے
- ۸۷- سنگ پر چینی کو پلگو گر صدا منظور ہے
- ۸۸- میں تجھ سے کہہ نہیں سکتا سخن اے یار نازک ہے
- ۸۹- کیا کہیے جو اس شوخ کی اوقات ہوئی ہے
- ۹۰- محیط دل ہوئی اے شوخ تیری چاہ پھرتی ہے
- ۹۱- جرم کے غصہ کی تدبیر بہت اچھی ہے
- ۹۲- عاشق تھا کبھی تجھ پہ پھر دل تو وہی ہے
- ۹۳- کیا کہیے اپنا حال جو کچھ ہے سو ہے سو ہے
- ۹۴- گزشتہ حسن کا اب تک نشان باقی ہے
- ۹۵- کیا کہیے وہ بت آہ کس آئین حاکمیں ہے

- ۹۶- دل جنسِ فروشنده بازار ہنر ہے
- ۹۷- پھوٹے وہ آنکھ جس میں نہ ذرہ بھی نم رہے
- ۹۸- ناصح جفاے عشق اگر میں سہی سہی
- ۹۹- پیار کی آج اپنے سرشام خبر لے
- ۱۰۰- اے تڑپ چین تو بل کو کہیں تل بھر دے
- ۱۰۱- دنیا تمام گردشِ افلاک سے بنی
- ۱۰۲- جب اس چمن سے چھوڑ کے ہم آشیاں چلے
- ۱۰۳- جاتے ہیں لوگ قافلے کے پیش و پس چلے
- ۱۰۴- یار جس سے خوش رہے بھگو وہ آئیں چاہیے
- ۱۰۵- یا تو جاتے رہے اے یار ہمیں دنیا سے
- ۱۰۶- نہ تیرے پاٹ دامن کا نہ اس کی آستیں ڈوبی
- ۱۰۷- بیوفائی کیا کہوں دل ساتھ تجھ محبوب کی
- ۱۰۸- معتقد ہر گز نہیں ہیں کفر اور اسلام کے
- ۱۰۹- کہوں کیا بات اس بے پیر دل کی
- ۱۱۰- صورت ہمیں اس مہر کی پہچان اگر آوے
- ۱۱۱- لاکھ طوفاں بہ جہاں ہم کو فلک دکھلا دے
- ۱۱۲- وہ غل ہے جس کا موجب تو ہے در نہ شور بہتر ہے
- ۱۱۳- یارب کہیں سے گرمی بازار بھیج دے

- ۱۱۴- جب سے کہ چشم خلق صنم تجھ سے جا لگی  
 ۱۱۵- مری آنکھوں میں یار و اشک ایسا موج مارے ہے  
 ۱۱۶- ہم کو حنا جو قتل کر اور آپ بچ رہی  
 ۱۱۷- ”مطلعات“ کے تحت کلیات سودا مرتبہ آسی میں یہ مطلع بھی ہے۔

کس نے روم لی قسمت میں کوئی شام لے آیا  
 ہمیں لے کچھ نہ آیا ایک تیرا نام لے آیا

قائم کا شعر:

نسخہ آسی میں یہ شعر بھی شامل ہے:

کعبہ اگرچہ ٹوٹا تو کیا جائے غم ہے شیخ  
 کچھ قصر دل نہیں کہ بنایا نہ جائے گا

یہ شعر نسخہ رجز و جنس میں نہیں۔ جب کہ پوری غزل موجود ہے۔ یہ شعر دراصل محمد قیام الدین قائم کا ہے۔ انھوں نے مخزن نکات میں اپنے ترجمے میں یہ شعر نقل کیا ہے۔  
 اور ان کے دیوان میں بھی یہ شعر موجود ہے۔ مگر دل چسپ بات یہ ہے کہ نسخہ حبیب میں بالکل اسی مفہوم کا یہ شعر ہے۔

کعبہ ڈھا تو غم نہ کراے شیخ بت شکن

دل برہمن کا ہے کہ بنایا نہ جائے گا

یہ شعر کسی اور مطبوعہ یا غیر مطبوعہ نسخے میں میری نظر سے نہیں گزرا۔ میرا خیال ہے کہ قائم کے شعر کی مقبولیت دیکھ کر سودا نے اپنا یہ شعر قلم زد کر دیا ہوگا۔

۱ مخزن نکات، ص ۷۹

۲ دیوان قائم، مرتبہ ڈاکٹر خورشید الاسلام، دہلی، ۱۹۶۳ء، ص ۷

## مجنوب کا کلام:

کچھ اشعار ایسے ہیں جو مطبوعہ کلیات سودا میں بھی ملتے ہیں اور بعض تذکرہ نگاروں نے انہیں میرزا غلام حیدر مجنوب سے منسوب کیا ہے۔ مطبوعہ نسخہ سودا میں یہ غزل ہے۔

ہم نے بھی دیر و کعبہ سے دن چار کی ہوس

یہ غزل سودا کے کسی معتبر دیوان میں نہیں ہے۔ میر حسن نے اس غزل کا ایک شعر:

گھر امن کا اسی کو ملا آسماں تلے

جس نے جہاں میں آن کے مسار کی ہوس

مجنوب کے نام سے درج کیا ہے۔ اے جس کا مطلب ہے کہ یہ غزل مجنوب کی ہے۔ مگر یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ کیوں کہ مجنوب کا دیوان کہیں نہیں ملتا۔

وہ غزل جس کا مطلع ہے۔

خاک و خوں میں صورتیں کیا کیا نہ رلیاں دیکھیاں

اے فلک باتیں تری کوئی نہ بھلیاں دیکھیاں

میر حسنؒ، قاسم سلمہ و سرورؒ نے یہ غزل مجنوب سے منسوب کی ہے۔ مطبوعہ کلیات سودا میں یہ دو شعر ہیں۔

چا ہو مدد جو غیر سے اغیار کے لیے

تو میں بھی یار کم نہیں دو چار کے لیے

۱۔ تذکرہ شعرائے اردو، ص ۱۷۱

۲۔ تذکرہ شعرائے اردو، ص ۱۷۱

۳۔ مجموعہ نثر، ۲، ص ۱۵۵

۴۔ عمدۃ المنتجبہ، ص ۶۶۳

طوبی تلے میں بیٹھ کے روؤں گا زار زار  
جنت میں تیرے سایہ دیوار کے لیے  
میر حسن بے قاسم سلمہ سرورؒ اور قدرت اللہ شوقؒ نے یہ دونوں اشعار مجذوب کے نام  
سے درج کیے ہیں۔

کب کسی دل سوختہ سے ساز کرتی ہے حنا  
ان دنوں ہاتھوں پہ تیرے ناز کرتی ہے حنا  
یہ غزل نوحہ حبیب اور نوحہ رچرڈ جونسن دونوں میں نہیں ہے۔ قدرت اللہ شوق نے اس  
غزل کے دو اشعار مجذوب کے ترجمے میں نقل کیے ہیں۔ ۵۔ جس کا مطلب ہے یہ غزل  
مجذوب کی ہے۔

### فتح علی شیدا

مطبوعہ کلیات میں غزل جس کا مطلع ہے۔

وے صورتیں الہی کس ملک بستیاں ہیں  
اب دیکھنے کو جن کے آنکھیں ترستیاں ہیں

سودا کے ایک شاگرد فتح علی شیدا کی ہے۔ میر حسن نے شیدا کے نمونہ کلام میں اس غزل کا  
مطلع اور ایک شعر نقل کیا ہے۔ ۱۔ عشقی نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے کہ میر حسن یہ غزل  
شیدا کی بتاتے ہیں۔ لیکن بعض اہل سخن ذوقی سے منسوب کرتے ہیں۔ ۲۔ ان دونوں میں

۱۔ تذکرہ شعرائے اردو، ص ۱۷۰

۲۔ مجموعہ نغز، ۲، ص ۱۵۵

۳۔ عمدۂ منتجبہ، ص ۶۶۴-۶۶۵

۴۔ طبقات اشعرا (قلمی) ورق ۱۶۸ ب

۵۔ طبقات اشعرا (قلمی) ورق ۱۶۸ ب

۶۔ تذکرہ شعرائے اردو، ص ۹۷

۷۔ دو تذکرے (عشقی)، ۲، ص ۱۸

سے یہ کس کی غزل ہے۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ البتہ یہ سودا کی نہیں ہے۔ کلیات سودا میں ایک اور غزل ہے۔

میں تو ملوں گا نا صبح باتیں یہ تینوں جان کے

گو کہ عدو ہیں خو بردل کے جگر کے جان کے

قاسم نے یہ غزل مجذوب سے منسوب کی ہے اور لکھا ہے کہ میں نے یہ غزل کلیات سودا میں بھی دیکھی ہے۔ اغلب ہے کہ غلطی سے اس میں شامل ہو گئی ہو یا ممکن ہے کہ واقعی سودا کی ہو۔

### انعام اللہ خاں یقین

مطبوعہ کلیات سودا میں ایک غزل ہے۔ جس میں یہ تین شعر بھی شامل ہیں۔

بدلاترے ستم کا کوئی تجھ سے کیا کرے

اپنا ہی تو فریفتہ ہووے، خدا کرے

قاتل ہماری لاش کی تشہیر ہے ضرور

آئندہ تا کوئی نہ کسو سے وفا کرے

خلوت ہو اور شراب ہو، معشوق سامنے

زاہد تجھے قسم ہے جو تو ہو تو کیا کرے

ان تینوں شعروں کے ساتھ بہت دل چسپ معاملہ ہے۔ کلیات سودا میں نو شعروں کی غزل ہے۔ جس میں یہ اشعار ہیں۔ دیوان یقین میں پانچ شعروں کی غزل میں یہ اشعار ہیں۔ دونوں کے پہلے دو شعر بالکل اسی طرح ہیں البتہ تیسرے شعر کا پہلا مصرع سودا کے ہاں اس طرح ہے۔

### گر ہو شراب و خلوت و محبوب خوب رو

میر نے نکات اشعار میں یہ شعر ”بدلاترے ستم کا کوئی تجھ سے کیا کرے“ سودا کے ذکر میں نقل کیا ہے۔ ۱ فتح علی حسینی گردیزی نے سودا کے ترجمے میں اس غزل کے چار شعر دیے ہیں جن میں دو شعر یہ بھی ہیں۔ ”قاتل ہماری نعش کی تشبیر ہے ضرور“ اور ”گر ہو شراب و خلوت و محبوب خوب رو“ ۲ نسخہ حبیب میں یہ پوری غزل موجود ہے۔ مگر نسخہ رچرڈ جونس میں نہیں۔ سودا نے ایک مجلس میں اس غزل کو تقصیم کیا تھا جس میں یہ تینوں شعر بھی موجود ہیں۔ اور یہ مجلس کلیات سودا میں شامل ہے۔ یہ تمام شہادتیں اس حق میں ہیں کہ یہ تینوں اشعار سودا کے ہیں۔ اس کے برعکس یہ تینوں اشعار یقین کی ایک غزل میں بھی موجود ہیں۔ ۳ یقین پانچ اشعار کی غزل کہتے تھے۔ یہ غزل بھی پانچ اشعار کی ہے۔ مطبوعہ دیوان کے علاوہ میں نے دیوان یقین کے جتنے بھی قلمی نسخے دیکھے ہیں ان میں یہ اشعار موجود ہیں۔ مزید برآں یہ کہ کبھی نرائن شفیق نے تینوں شعر یقین کے نام سے درج کیے ہیں۔ ۴ اور لکھا ہے کہ فتح علی خان نے یہ دو شعر اور میر نے مطلع سودا کے ترجمے میں لکھا ہے مگر میں نے یقین کے اکثر دیوانوں میں یہ اشعار دیکھے ہیں۔ واللہ اعلم۔ لیکن ”نچ بستی“ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اشعار یقیناً یقین کے ہیں۔ جو کوئی ان دونوں صاحبان کی طرزِ سخن گوئی سے واقف ہے وہ دونوں کی زبان پہچانتا ہے۔ (فارسی سے ترجمہ) ۵

میر تقی میر

مطبوعہ کلیات سودا میں مطلعات کے تحت یہ مطلع بھی دیا گیا ہے۔

اعجاز منہ تکتے ہے ترے لب کے کام کا

کیا ذکر ہے مسج علیہ السلام کا

۱ نکات اشعار، ص ۳۹

۲ تذکرہ ریختہ گو بیان، ص ۷۹

۳ دیوان یقین، مرتبہ مرزا فرحت اللہ بیگ، علی گڑھ، ۱۹۳۰ء، ص ۳۹

۴ چمنستان اشعار، ص ۱۹۵

۵ ایضاً

یہ مطلع میر تقی میر کا ہے اور ان کے دیوان سوم میں موجود ہے۔<sup>۱</sup>

### شیخ قلندر بخش جرأت

کلیات سودا میں ”افراد“ کے تحت جو اشعار دیے گئے ہیں۔ اُن میں مطلع جرأت کا ہے۔

کل جو بیٹھا پاس میں اک جاترے ہم نام کے  
رہ گیا بس نام سنتے ہی کلیجہ تھام کے<sup>۲</sup>

### قصائد

۱۔ نسخہ آسی میں ایک قصیدہ ”مثنوی در تعریف چاہ مومن خاں“ بھی شامل ہے۔ یہ قصیدہ احسن اللہ خاں بیان شاگرد مرزا مظہر جان جاناں کا ہے۔ میری نظر سے دیوان بیان کے دو قلمی نسخے گزرے ہیں۔ یہ قصیدہ دونوں میں موجود ہے۔<sup>۳</sup>

### ہجویات

۲۔ ”مثنوی در ہجو فدوی متوطن پنجاب کہ در اصل بقال بچہ بود“۔ کلیات آسی میں شامل ہے۔ میر حسنؒ نے علی لطفؒ نے اس کا مصنف میر فتح علی شیدا کو بتایا ہے۔ ابوالحسن امیر الدین نے شیدا کے ترجمے میں لکھا ہے کہ انھوں نے سودا کے حریف فدوی لاہوری کی ہجو میں ایک مثنوی لکھی ہے۔ جو فدوی کے ترجمے میں نقل کی جائے گی۔<sup>۴</sup> لیکن فدوی کے ترجمے میں یہ ہجو نہیں دی گئی۔ بظاہر ابوالحسن کا اشارہ اسی ہجو کی طرف ہے۔ شیخ چاند نے بہت تفصیلی بحث کے بعد ثابت کیا ہے کہ یہ مثنوی فتح علی شیدا کی ہے۔

۱۔ کلیات میر مرتبہ عبدالباری آسی، لکھنؤ، ۱۹۴۸ء، ص ۳۷۴

۲۔ کلیات شیخ قلندر بخش جرأت، لکھنؤ، ۱۸۸۳ء، ص ۱۵۲

۳۔ دیوان بیان (قلمی) آصفیہ اور دیوان بیان (قلمی) سالار جنگ

۴۔ تذکرہ شعرائے اردو، ص ۱۲۰

۵۔ تذکرہ گلزار ابراہیم مع تذکرہ گلشن ہند، ص ۱۹۰

۶۔ تذکرہ مسرت افزا، بحوالہ معاصر، حصہ ۷، ص ۱۱۵



ہے۔<sup>۱</sup> لیکن مصحفی اسے سودا ہی کی تصنیف بتاتے ہیں۔<sup>۲</sup> قاضی عبدالودود کا بھی یہی خیال ہے کہ یہ سودا کی تصنیف ہے۔<sup>۳</sup> یہ مثنوی رچرڈ جونس میں بھی شامل ہے اور اس میں یہ دو شعر اس طرح ہیں۔

حضرت سودا تلک جو مرے استاد ہیں  
شعر پہ ان کے بھی اب ان کو یہ ایراد ہیں

~~~~~

بس چل اب آگے نہ کہہ کچھ انھیں شیدا خاموش
کچھ اس سے سخن ہووے جسے عقل و ہوش
یہ دونوں شعر اس حقیقت کا ثبوت ہیں کہ یہ مثنوی فتح علی شیدا ہی کی ہے۔
۳۔ مثنوی درہجوچ میرزا فیضو۔

جس کا پہلا شعر ہے۔

آہ داویلا ز دست روزگار

توش خانوں میں یہ غم ہے روبکار

یہ جھو سودا کے کسی معتبر کلیات میں نہیں۔ لیکن کریم الدین نے سودا کے ترجمے میں نقل کی ہے۔^۴ جو غلط ہے۔ دراصل اس کے مصنف احسن اللہ خاں بیان ہیں۔ یہ جھو ان کے قلمی دیوان میں موجود ہے۔^۵

۱۔ سودا، ص ۱۱۱-۱۱۲

۲۔ تذکرہ ہندی، ص ۱۶۶

۳۔ سوریا، ۲۹، ص ۵۱

۴۔ طبقات اشعرا، کریم الدین، ص ۱۰۳

۵۔ دیوان بیان (قلمی) سالار جنگ

بعض تذکرہ نگاروں نے احسن اللہ خاں بیان کے ترجمے میں اس مثنوی کا ذکر کیا ہے۔ ۱۔

۴۔ ”مسدس در جو مرزا علی“۔ اس کا پہلا بند ہے۔

اک قصہ میں سنا تھا مردم سے یہ قصہ را
بیت الحلا گیا تھا مرزا علی بچارا
ناگاہ کھڑی اوپر گیڈر نے جا پچھاڑا
تب رو کے اُس جگہ پر لوٹنے کے تئیں پکارا

دل می رود ز دسم صاحب دلاں خدا را

درد اکہ راز پنہاں خواہ شد آشکارا

کلیات سودا کے مطبوعہ نسخے میں اس مخمس کے تین بند موجود ہیں۔ لیکن یہ میر حسن کا مخمس ہے اور ان کے قلمی دیوان میں پورا نقل ہوا ہے۔ ۲۔
۵۔ مخمس جس کا پہلا مصرع ہے۔

نشو و نماے باغ جہاں سے رمیدہ ہوں

سودا کا نہیں۔ اگرچہ مطبوعہ کلیات میں شامل ہے۔ نسخہ حبیب اور نسخہ رچرڈ جونسن میں بھی
مخمس نہیں ہے۔ قیام الدین قائم نے سودا کے شاگرد بند را بن راقم کے ترجمے میں اس
مخمس کے سات بند نقل کیے ہیں۔ ۳۔ غالباً غلط فہمی کی وجہ سے۔ سودا کی غزل ہے جسے
راقم نے اس مخمس میں تضمین کیا ہے۔

۶۔ مخمس جس کا پہلا مصرع ہے:

مے کشو بحثو ہو کیوں مجھ دل انگار کے ساتھ

۱۔ مثلاً تذکرہ شعرائے اردو، ص ۲۷۔۔ مجموعہ نفوز، ۱، ص ۱۲۳ وغیرہ۔

۲۔ دیوان میر حسن (قلمی) رام پور

۳۔ مخزن نکات، ص ۵۷-۵۸

اس میں قاتم کی غزل تصمین کی گئی ہے۔ لیکن مقطع میں سودا کا نام ہے۔ اس مخمس کا مصنف کون ہے یہ کہنا بہت مشکل ہے۔ نسخہ حبیب اور نسخہ رچرڈ جونسن دونوں میں یہ مخمس نہیں ہے۔ جب تک کسی معتبر ذرائع سے تصدیق نہیں ہو جاتی۔ اسے سودا کی تصنیف نہیں کہا جاسکتا۔

رباعیات

۷۔ یہ رباعی احسن اللہ خاں بیان کی ہے۔

کیا زلف میں اس شوخ کے تھی دہکی صبح
جوں شام سے ہوتی ہے کسی شب کی صبح
جب زلف کو میں ہاتھ لگایا اودھر
ہمسایہ پکارا کہ ہوئی کب کی صبح

یہ رباعی نسخہ حبیب اور نسخہ رچرڈ جونسن میں نہیں۔ جب کہ دیوان بیان میں موجود ہے۔ ۱۔

۸۔ افسوس کہوں میں کس سے اپنے گھٹ کی
قالب سے پھرے ہے روح بھکی بھکی
اس آنکھ نے چین جی سے کھویا سودا
یہ خانہ خراب جس سے انکی انکی

یہ رباعی بھی دونوں قلمی نسخوں میں نہیں ملتی جب کہ مطبوعہ نسخے میں شامل ہے۔ قدرت اللہ شوق نے اسے غلام حیدر مجذوب کے ترجمے میں نقل کیا ہے۔ ۲۔

مثنویاں

۹- مثنوی تعریف چھڑی۔ جس کا پہلا شعر ہے۔

ہوتی ہے دنیا میں جو کچھ تحفہ چیز
سب سے ہے سودا کو یہ لاٹھی عزیز

میر حسن اسے فضل علی ممتاز شاگرد سودا کی تصنیف بتاتے ہیں۔ انھوں نے ممتاز کے ترجمے میں لکھا ہے۔ ”یک مثنوی، مسٹی بہ لاٹھی نامہ خوب گفتہ کہ سلسلہ اور اتابہ عصاے کلیم رسائیدہ“۔ اور اس مثنوی کے کچھ اشعار بھی نقل کیے ہیں۔ پہلا اس طرح ہے:

ہوتی ہے دنیا میں جو کچھ تحفہ چیز
سب سے ہے ممتاز کو لاٹھی عزیز

علی ابراہیم ممتاز کے کلام کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ”مثنوی در تعریف لاٹھی بہ بحر مخزن اسرار گفتہ، فکرش استوارست“۔ ابراہیم نے بھی مثنوی کے اشعار نقل کیے ہیں۔

قیام الدین قائم کی سات مثنویاں کلیات سودا میں شامل ہو گئی ہیں۔ دیوان قائمؒ کا ایک قلمی نسخہ رضا لاہیری رام پور اور ایک انڈیا آفس لاہیری میں ہے۔ میں نے صرف رام پور کا نسخہ دیکھا ہے۔ جس میں یہ تمام مثنویاں موجود ہیں۔ انڈیا آفس لاہیری کے نسخے کے لیے ثار احمد فاروقی کے ایک مقالے سے استفادہ کیا گیا ہے۔ یہ تمام مثنویاں قائمؒ کی ہیں۔

۱۰- مثنوی در ہجو موسم سرما

سردی اب کی برس ہے اتنی شدید
صبح نکلے ہے کانپتا خورشید

۱۔ تذکرہ شعرائے اردو، ص ۱۶۰

۲۔ گلزار ابراہیم مع گلشن ہند، ص ۲۳۶

۳۔ دیوان قائمؒ (قلمی) رام پور

۴۔ مثنویات قائمؒ چاند پوری، نقوش، لاہور، دسمبر ۱۹۶۱ء، ص ۲۵۳-۲۶۱

-۱۱ حکایت

سلف کے زمانے کا تاریخ داں
یہ لکھتا ہے احوال وارفنگاں

-۱۲ حکایت

سنا ہے کہ اک مرد آزادہ طور
جز اپنے نہ رکھتا تھا اسباب اور

-۱۳ حکایت

سنا جائے ہے ایک مہوس کا حال
کہ رکھتا تھا نت کیمیا کا خیال

-۱۴ حکایت

الہی شعلہ زن کر آتشِ دل
تپ دل دے بقدر خواہشِ دل
-۱۵ درجہ طفل پتنگ باز

ایک لوٹا پتنگ کا ہے کھلاڑ
دور میں اوس کے ہیں ہزار

یہ مشہور نسخہ مصطفائی (ص ۱۴۷-۱۴۸) میں شامل ہے۔ لیکن آسی میں نہیں۔

-۱۶ حکایت

سنا ہے کہ ایک مرد اہل طریق
نہایت ہی واقع ہوا تھا خلق

یہ مثنوی بھی نسخہ مصطفائی (ص ۱۶۰-۱۶۱) میں شامل ہے۔ لیکن آسی میں نہیں۔

آسی میں اٹھارہ مرثیے ایسے ہیں جس میں مہرباں خاں نام بطور مصنف آیا ہے۔ بظاہر یہ مہرباں خاں رند ہیں۔ ان کے متعلق مشہور ہے کہ میر سوز ان کو اشعار کہہ کر دیا کرتے تھے۔ ایشیا نکل سوسائٹی کلکتہ میں دیوان رند کا ایک نسخہ ہے۔ جس میں وہ تمام اشعار ہیں جو دیوان میر سوز میں موجود ہیں۔ اس لیے ممکن ہے کہ سودا نے مہربان خاں کے نام سے مرثیے کہے ہوں اور بعد میں اپنے دیوان میں شامل کر لیے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کسی اور نے کہے ہوں اور غلطی سے کلیات سودا میں شامل ہو گئے۔ بہر حال مزید تحقیق کے بغیر یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ یہ مرثیے کس کے زائیدہ فکر ہیں۔ زیر بحث مرثیے یہ ہیں۔

- ۱- کہتا ہے غم ہمیں نہ کسی دم سے پوچھیے
- ۲- لگا وطن سے جو ہونے رواں حسین غریب
- ۳- کرتی ہیں بانو یہ زاری یا رسول
- ۴- غم ہے مجنوں حسین و دل عالم وادی
- ۵- گیا گودی میں جب مرجھائے اصغر
- ۶- مقبول حق ہے جس کو کچھ غم حسین کا ہے
- ۷- ہائے دے حیدر کے پیارے کیا ہوئے
- ۸- سن اے گردوں اگر تو دوں نہ ہوتا
- ۹- ہے ایک روایت زروایات پر از غم
- ۱۰- کافراں آل محمد پہ ستم کیا کیا
- ۱۱- اے قوم نکل سنو تو بھلا ہائے ہائے
- ۱۲- بانویوں کہتی ہیں سرور کیا ہوا

- ۱۳- ماں اصغر کی کہتی ہے رو رو بچے کے سو جانے کو
- ۱۴- کیوں مضطرب الحال نسیم نری ہے
- ۱۵- بیٹ نبی فاطمہ کہتی ہیں اے ذوالجلال
- ۱۶- رووے وہ آل نبی سے جسے محبت ہے
- ۱۷- دل خیر النساء جس دم کراہا
- ۱۸- دل جو پوچھا میں اپنے کیوں نہیں ہے تجکو چین

سودا کا غیر مطبوعہ کلام

اس عنوان کے تحت سودا کا ایسا کلام یکجا کیا گیا ہے جو نسخہ حبیب اور نسخہ رچرڈ جونس میں موجود ہے لیکن کسی مطبوعہ کلیات میں نہیں ملتا۔ اس میں مزید دو قلمی نسخوں کے زائد اشعار بھی شامل کر لیے گئے ہیں۔ ان دونوں نسخوں کا تعارف قاضی عبدالودود نے کرایا ہے۔ پہلا نسخہ ۱۲۱۲ فصلی میں کتابت ہوا تھا۔ اس پر قاضی صاحب کا مضمون (سورہ ۲۹) میں شائع ہوا تھا۔ اس نسخے کا حوالہ ”زاین“ کے نام سے دیا گیا ہے۔ دوسرا نسخہ خدا بخش لاہوری پٹنہ کا ہے۔ (خدا بخش) اس پر قاضی صاحب کا مضمون (نوائے ادب، جولائی ۱۹۶۱ء) شائع ہوا تھا۔ میں نے اصل نسخے نہیں دیکھے بلکہ انہی مضامین سے استفادہ کیا ہے۔

اشعارِ غزلیات

- ۱۔ سوچا ہے کیا جنوں نے گریبان کو مرے
لیتا ہے اب حساب جو یہ تار تار کا (حبیب، رچرڈ جونس، خدا بخش)
 - ۲۔ جو کہ ظالم ہو وہ ہرگز پھولتا پھلتا نہیں
ہبز ہوتے کھیت دیکھا ہے کبھو شمشیر کا (حبیب، رچرڈ جونس، خدا بخش)
 - ۳۔ آتی ہے تجھ گلی سے پریشاں صدائے آہ
شاید کسی کا شیشہ دل چور ہو گیا (رچرڈ جونس، حبیب میں یہ غزل نہیں)
- مصطفائی اور آسی میں اسی قافیے کا دوسرا شعر ہے جو رچرڈ جونس میں نہیں۔ شعر یہ ہے۔
جانی بھرا تھا اس صدفِ مڑگاں سے دل مرا

۴۔ پر زخم یہ اٹھائے کہ بس چور ہو گیا
 کن نے دیکھا نہ تجھے یوں کہ گلی میں تیری
 ہاتھ اپنے وہ سرو سینہ پہ مارا نہ کیا (رچرڈ جونسن، حبیب میں یہ غزل نہیں)
 مصطفائی اور آسی میں ایک غزل کا مقطع ہے

جلاتی ہے جگر ہن یار اتنا بے خوری سودا
 پیے ہیں جام گویا بزم میں احباب آتش کا
 حبیب میں یہ مقطع دوسرا ہے۔

۵۔ ہواے رنگ پر میرے نہ چھوٹے کیوں کے اے سودا
 جلے ہے داغ دل ایسا کہ جوں مہتاب آتش کا
 مصطفائی اور آسی میں ایک مقطع ہے۔

پردانہ شمع رو پر کیوں کر نہ ہووے سودا
 شعلے کے گرد پھر ناکب کام ہے مگس کا
 حبیب میں اسی قافیے کا دوسرا مقطع ہے

۶۔ سودا کے سوز دل کو بے سوز دل نہ سمجھے
 پروانے کا سمجھنا کیا ہوش ہے مگس کا
 (حبیب)

۷۔ اگر دنیا میں اب یونہیں بجن رسم وفا ہوگا
 تو کس امید پر کوئی کسی سے آشنا ہوگا
 (رچرڈ جونسن، حبیب)

جو یہ منظور ہے تم کو مراد لے کے جی لینا
 گیا اک مجھ ساد دنیا سے ترے صدقے گیا ہوگا
 (رچرڈ جونسن، حبیب) (کذا)

- ۸۔ یاں تک میرے مشہد سے ہے تشنہ لہی پیدا
(حبیب) اوس سمت جو ہو گذرا جلا د بہت رویا
- ۹۔ نخل حیات اپنا گلشن میں باغباں نے
(حبیب) بویا تو تھا ہوس کر، لیکن نہ پال آیا
- ۱۰۔ کعبہ ڈھا تو غم نہ کر اے شیخ بت شکن
(حبیب) دل برہمن کا ہے کہ بتایا نہ جائے گا
- ۱۱۔ سودا سے یہ کہا میں ”دل اس طرح سے کھونا؟“
(نراین) کہنے لگا کہ ”ناداں، کیا پوچھتا ہے ہونا؟“
- ۱۲۔ گر سلطنت سلیمان ہے گی محیط عالم
(نراین) ہم نے بھی اپنے دل کا گھیرا ہے ایک کونا
- حسب ذیل غزلیں صرف نرائن میں ہیں۔

- ۱۳۔ لہو ہے جوش میں، خونخوار سے یہی کہنا
اجل تو یار کی تلوار سے یہی کہنا
- ۱۴۔ عیب ڈرے ہے، بہر وجہ رو بہ صحت ہے
طعیب عشق کے بیمار سے یہی کہنا
- ۱۵۔ صبا میں کیا کروں؟ نہیں چھوڑتا مجھے صیاد
قفص میں بند ہوں، گلزار سے یہی کہنا
- ۱۶۔ نہ جی کو امن، نہ دل کو ہے چین اے قاصد
پیام جا کے مرے یار سے یہی کہنا
- ۱۷۔ غرور حسن سے گر اپنے وہ نے نہ یہ بات

- تو اس کے تو در و دیوار سے یہی کہنا
 ۱۸۔ بہار جاتی ہے ساقی پہنچ توے لے کر
 زبانی سودا کے خمار سے یہی کہنا
 ۱۹۔ پہلو سے میرے صبح دلدار اٹھ گیا
 روزِ وصال کر کے شب تار اٹھ گیا
 ۲۰۔ آہ و فغاں کی آج جو آتی نہیں صدا
 شاید ترا جہاں سے یہ بیمار اٹھ گیا
 ۲۱۔ لائق نہ تھا یہ سینہ ترے زخم تیغ کا
 پر اس طرف بھی ہاتھ ترا یار اٹھ گیا
 ۲۲۔ بدنام تو عبث مجھے کرتا ہے نامحا
 مدت ہوئی بتوں سے سروکار اٹھ گیا
 ۲۳۔ تو رہ جہاں میں اے گل گلزار کیا ہے غم
 مجھ سا جو تیرے کوچے سے اک خار اٹھ گیا
 ۲۴۔ غیروں کو دیکھ بیٹھے ہوئے بزم میں تری
 جب کچھ نہ بس چلا تو میں ناچار اٹھ گیا
 ۲۵۔ وعدے سے پھیر دینے کو دل لے گیا تھا شوخ
 سودا نے جب کہ مانگا کر انکار اٹھ گیا
 ۲۶۔ تمنا کی انگلیاں نے جھن ہٹا کا دل جھٹ پٹ لیا
 کیونکر ملے ہٹا کو وہ اب ظالماں نے بٹ لیا
 ۲۷۔ دستا نہیں کوئی اور سو ہٹا کو ست کاں جائیں ہم؟
 سب جگ کے اب خواہاں نہیں ہٹا تم کو چھٹ لیا

- ۲۸۔ ہنسنا کو نا صح مت ڈرا جیو جان کے جانے سیتی
جب اس گلی میں پگ رکھا پہلے ہمن سرکٹ لیا
۲۹۔ وہ دل کہ قیمت جس کی میں ملتا تھا ہمن کو دو جگ
افسوس ظالم نے پیٹ مولاں میں ہم سے گھٹ لیا
۳۰۔ مستی ہمن کو اس سبب زیادہ رقیباں سے ہوئی
جب لے چکا پیالہ بجن اس کا ہمن تلچھٹ لیا
۳۱۔ مجلس میں عشاق کی اس شوخ نے مدھ کی جگہ
(کذا)
دل کے رکت کا گھونٹ پر گھونٹ آن کر غٹ لیا
(کذا)
۳۲۔ زلفاں کو سا جن کی ہمن سودا یہ دل دیتے بنی
وہ بالکاں کیا قہر ہیں آخر اسے کر لٹ لیا
۳۳۔ آنکھوں سے جب کہ آنسو گرنگ ہو کے نکلا
سینے سے میرے نالہ دل تنگ ہو کے نکلا
۳۴۔ کیا دل پر اپنے تخی لیا م کی کہوں میں
سمجھا تھا جس کو شیشہ وہ سنگ ہو کے نکلا
۳۵۔ یاں تک خیال دل میں اس زلف کا گھٹا ہے
آنسو تلک زمیں سے شبرنگ ہو کے نکلا
۳۶۔ دشمن حواس کا ہے، اس دلربا کا کوچہ
آیا جو اس گلی میں چت بھنگ ہو کے نکلا
۳۷۔ راہ طلب میں ماندا چل دو قدم ہوا یہ
گویا کہ میں ہزاروں فرسنگ ہو کے نکلا
۳۸۔ زاہد بہت ہی نازاں تھا صومعے پر اپنے

- میخانہ دیکھ میرا وہ دنگ ہو کے نکلا
 ۳۹۔ کہتے تھے ہم تو، سودا کر پاس آبرو کا
 آخر تو اس کے گھر سے بے تنگ ہو کے نکلا
 ۴۰۔ سانجھ کو آئے تھے گلشن میں، سویرا نہ لیا
 باغباں باغ میں ہم تیرے بھیرا نہ لیا
 ۴۱۔ عشق لایا تھا دل و دین تلک اس کی نذر
 جی سوا حسن نے کچھ یار کے میرا نہ لیا
 ۴۲۔ پہنچ کر منزل مقصود کو تو نے افسوس
 آسرا دیکھ کے دیوار کا ڈیرا نہ لیا
 ۴۳۔ غیرت عشق میں دل دے کے کوئی لیتا ہے؟
 ہم سے گو یار نے سو بار اسے پھیرا، نہ لیا
 ۴۴۔ آج کس منہ (سے) تو کرتا ہے بڑائی سودا
 ان نے اب تک تو کبھی نام بھی تیرا نہ لیا
 ۴۵۔ اوس مکھڑے کے حضور کے بھاوے آفتاب
 یہ دل لگو نہیں، گرمی کہاں پاوے آفتاب (حبیب، رچرڈ جانسن، خدا بخش، نراین)

یہ غزل صرف نراین میں ہے اور کسی نسخے میں نہیں۔

- ۴۶۔ آہ سوزاں نے کیا داغ جگر آخر شب
 شمع کا تابہ قدم پہنچے ہے سر آخر شب
 ۴۷۔ پوچھتے کیا ہو مرے دیدہ تر کا احوال
 شام کو اشک ہے تو خون جگر آخر شب
 ۴۸۔ خون ہوں رشک سے ظالم کہ ترے کو میں نسیم

- کرے ہے بھر کے دم سرد گزر آخر شب
۴۹۔ ساقیا جام کو دے غسل کہ ہے صبح کو عید
بچنی اس ماہ کی آ مجھ کو خبر آخر شب
۵۰۔ یار سودا سے کہے ہے تیں ہوں کس طرح، کہ وہ
(کذا)
گھورے ہے مجھ کو باندازِ دگر آخر شب
۵۱۔ بہادر یائے خوں مجھ چشم سے یاں تک کہ مڑگاں کی
(حبیب، زاین)
لگی ہے ملنے یارو پنجہ مرجان میں صورت
۵۲۔ جب تک ہے جہاں میں گل و گلزار سلامت
(حبیب، خدا بخش)
یارب وہ رہے گوشہ دستار سلامت
یہ تین شعر صرف زاین میں ہیں۔
- ۵۳۔ ہاتھ سے جس کے گریباں ہے مرا چاک پرست
آستیں اس کی نہیں دیدہ نمناک پرست
۵۴۔ اس قدر داد طلب کس کی ہے خود سے ظالم
کہ گریبان ہے شعلے کا سدا چاک پرست
۵۵۔ ناتوانی کا ہماری ہو نہ جہاں شرح و بیاں
برق واں آن کے ہو دے خس و خاشاک پرست
یہ غزل صرف خدا بخش میں ہے۔

۱۔ اس زمین میں میر سوز کی بھی غزل ہے۔ مقطع کا دوسرا مصرع سوز اور سودا دونوں کے ہاں موجود ہے۔ میر سوز کا مقطع ہے۔

سنو کہتا ہے رہوں سوز کے گھر کیونکر راہ
گھورے ہے مجھ کو بہ اندازِ دگر آخر شب

- ۵۶۔ کرتا ہوں تیرے ظلم سے ہر بار الغیاث
یکبار تیرے دل میں نہیں کار الغیاث
- ۵۷۔ تیری نگہ کو دیکھ کے گردش میں آساں
کرتا پھرے ہے شعبدہ دور الغیاث (کذا)
- ۵۸۔ مغرور حسن کا ہے تجھے یہ کہاں خبر
یعنی کہ کون ہے پس دیوار الغیاث
- ۵۹۔ سودا میں کہتا ہوں کہ یہ پرہیز عشق سے
رسوا ہے کیوں تو کوچہ و بازار الغیاث
- ۶۰۔ ترکِ خواہاں کیوں کہ ہو مجھ سے کہ ان کا ناصحا
رشتہ الفت جگر میں ہے سلیمانی کی طرح (رچڑ جونسن)
- ۶۱۔ پاؤں پڑنے میں ہے کیا لطف کسی کے خوں خوار
سر پہ رہ خلق کے ہو کر گل و گلزار کی طرح (کذا)
- ۶۲۔ شور رہتا ہے مرا کوچے میں تیرے چار فصل
یہ جنوں کب ہے بہاری اور دیوانے کی طرح (حبیب)
- ۶۳۔ نو خطاں کی ہے سدا حق میں ہماری یہ دعا
کیجیو یارب تو اس آغاز کا انجام سفید (رچڑ جونسن، نراین)
- ۶۴۔ چاندنی دیکھے جو وہ کر کے در و بام سفید
ماہ بھی بزم میں اس کی ہو پھراک جام سفید (نراین)

- ۶۵۔ یہ زندگی مری وحشت کا تنگ ہے صیاد
(حبیب، رچرڈ جونسن، نراین لہ) قفس مجھے ترے چنگل سے تنگ ہے صیاد
- ۶۶۔ تنگ اس برس تو کر آزاد، پھر سمجھ لینا
(حبیب، رچرڈ جونسن، نراین لہ) چمن میں اب کے عجب آب و رنگ ہے صیاد
- ۶۷۔ شیخ تنگ چشم عشق سے کر سیر
(حبیب، رچرڈ جونسن) کعبہ سے کم نہیں ہمارا دیر
- ۶۸۔ دیوے تھا غیر کو زکوٰۃ حسن
(حبیب، رچرڈ جونسن) میں کہا کیا ہے کہنے لاگا خیر
یہ تین شعر صرف نراین میں ہیں۔

- ۶۹۔ کی تھی تجھ پاس نہ آنے کی تو تدبیر بزور
پر لے آئی مجھے آخر کو یہ تقدیر بزور
- ۷۰۔ یہ خدا ساز ترا صفحہ رو ہے، در نہ
کب مصور سے کھنچے ناز کی تصویر بزور
- ۷۱۔ سخت بیدل ہوں کہ جکڑی ہے تری الفت کی
عشق ظالم نے مرے پاؤں میں زنجیر بزور
یہ اشعار صرف نراین میں ہیں۔

- ۷۲۔ دھوم سے سنتے ہیں اب کے سال آتی ہے بہار
دیکھئے کیا کچھ ہمارے سر پہ لاتی ہے بہار

۱۔ قاضی عبدالودود نے نثر نراین سے تین شعر نقل کیے ہیں۔ اس میں یہ مطلع بھی ہے۔
افک گلگوں کو نہیں لعل گہر سے پیوند وہ رکے سنگ سے نسبت یہ گہر سے پیوند
یہ غزل سودا کی نہیں بلکہ مرزا احسن علی احسن کی ہے۔ کیونکہ یہ مطلع گلشن بے خار (ص ۲۱) عمدۂ منتخبہ (ص ۵۷)

- ۷۳۔ شاید عزمِ یار کی گلشن میں پہنچی ہے خبر
گل کے پیراہن میں پھولی نہیں ساتی ہے بہار
۷۴۔ دیکھنے دے باغباں اب گلستاں اپنا مجھے
خانہ زنجیر میں مہماں بلاتی ہے بہار
۷۵۔ شور یہ غنچوں کی واشد کا نہیں اے عندلیب
اب چمن میں طمطراق اپنا دکھاتی ہے بہار
۷۶۔ کیوں پھنسا گلشن میں یوں جا کر عبث اے عندلیب
میں نہ کہتا تھا کہ اے وہ دیکھ آتی ہے بہار
۷۷۔ جھومتی گلشن میں اب کے سال آتی ہے بہار
سبزی خط سے تری شاید کہ ماتی ہے بہار
۷۸۔ آج آتی ہے صبا سیتی مجھے بوئے گلاب
کیا کسی بلبل کا دل شاید جلاتی ہے بہار
۷۹۔ ہر گھڑی ٹپکے ہے شبنم برگ برگ گل سیتی
کرد وانا ہم کو اب ٹسوے بہاتی ہے بہار
۸۰۔ ہر پر بلبل پہ جلوہ ہے پر طاؤس کا
اب کے کیا نیرنگ گلشن میں دکھاتی ہے بہار
۸۱۔ کس کی آنکھوں کے نشے سے آج ماتی ہے بہار
اس برس زگس پہ کیا دھو میں مچاتی ہے بہار
۸۲۔ سچ پر پھولوں کی ظالم مجھ کو ہو ہے بے کلی
گل نہیں، تجھ بن انگاروں پہ لٹاتی ہے بہار

(کذا)

۱۔ سخن شعرا (ص ۱۳) میں احسن کے ترجمے میں نقل ہوا ہے۔ کلیات سودا کے کسی معتبر نسخے میں۔ یہ غزل نہیں ملتی۔

(رجڑ جونس)

۸۳۔ دل پرویا تو ہے تجھ زلف میں ہم نے لیکن
تاب گوہر کی نہ لاوے گا یہ تار آخر کار
آسی میں ایک غزل کا مقطع ہے۔

نسیم اس باغ میں سودا نہیں پاتی گذر اب تو
رکھے ہے رخت گل کو غنچے بچے نہ تہ کر
لیکن رجڑ جونس میں یہ مقطع اس طرح ہے۔

۸۴۔ بہار اس باغ سے رکھتی ہے کیا عزم سفر سودا
جو رخت اپنا چمن میں غنچہ نے رکھا ہے نہ تہ کر

۸۵۔ آہ کیوں کرتے ہو اس کے تیں ناحق نہ تیغ
آخر اے سنگدلاں سمجھو تو جاں رکھتی ہے شمع
یہ غزل رجڑ جونس اور خدا بخش دونوں میں ہے۔

۸۶۔ خط کے آنے پر بھی وہ ملتا نہیں ہو سید نہ صاف
گرد سے ہوتا تو ہے یارب ہر اک آئینہ صاف

۸۷۔ خوش کوئی ناداں ہوا، دوراں سے تو کیا گو کہ ہو

غم سے دل طفل دبستاں کاشب آدینہ صاف
۸۸۔ چشم کم سے تیرہ بختوں کی نہ دیکھ افتادگی

سایہ چڑھ جاتا ہے تابام فلک بے زینہ صاف

۸۹۔ جمع زر کرنے سے اپنی سر بلندی تو نہ چاہ

لے گیا قارون کو تا تحت الثری گنجینہ صاف

۹۰۔ عکس خوب وزشت جوں یکساں ہے آئینہ کے بیچ

- دوست و دشمن سے ہے یوں اپنا دل بے کینہ صاف
 ۹۱۔ گویا ہم آپ کو دنیا کے الجھیرے سے پاک
 گھڑی جو یار کی دل میں ہے وہ تو کی نہ صاف
 ۹۲۔ شیخ کی داڑھی کو سودا رند تو کہتے ہیں پشم
 مجھ کو ادن کے منہ پر آتا ہے نظر پشینہ صاف
 ۹۳۔ اس کارواں کا بار ہے گویا کہ دردِ دل
 آواز ہر جرس کی ہے جوں آہِ سرِ دل
 (حبیب، خدا بخش)
 ۹۴۔ کرتی ہے قطع مزرعہ امید تیغِ یاس
 اے تف کہ اسے فلک تجھے کچھ بھی ہے دردِ دل
 (حبیب، خدا بخش)
 ۹۵۔ چشمِ خورشید کو غریفے سے تیرے دن سروکار
 رات ہے دیدہ شبنم کو لبِ بام سے کام
 (حبیب)
 ۹۶۔ تیرے آگے او سے خورشید کا مونہ خوش نہیں آتا
 چمن سے ورنہ کیوں جاتی رہی وقتِ سحر شبنم
 (حبیب)
 ۹۷۔ ظاہر میں دیکھنے کا کچھ اسباب ہی نہیں
 آوے مگر وہ خواب میں سو خواب ہی نہیں (حبیب، رچرڈ جونس، نراین، خدا بخش)
 ۹۸۔ سجدہ کروں نہ کیوں کے تری تیغ کے تلے
 ایسی نمازِ عشق کو محراب ہی نہیں (حبیب، رچرڈ جونس، نراین، خدا بخش)
 ۹۹۔ مجھ کو نہیں ہے دل میں ترے راہ کیا کروں
 پر بے اثر ہے عشق مرا آہ کیا کروں (رچرڈ جونس، نراین، خدا بخش)
 ۱۰۰۔ سن کر ہزار شکل مرا حال یوں کہا
 تُو تو کسی طرح نہیں دل خواہ کیا کروں (رچرڈ جونس، نراین، خدا بخش)

۱۰۱۔ لہو کا ترے ہے یہ تھنہ لب کہ ہوئے ہے آبِ رواں کو تب
 کوئی بلبلانہ میں دیکھا اب کہ وہ جوشش لب جو نہیں
 (حبیب)
 یہ غزل صرف خدا بخش میں ہے۔

۱۰۲۔ ہوئیں ہیں پشت لب پہ جب سے سوار موچیں
 گلے سے نیز بازی کرتی ہیں یار موچیں
 ۱۰۳۔ جوں کرک سبزہ واری کی ناک بیچ پر ہو
 عفت پہ کر رہی ہیں ایسی بہار موچیں
 (کذا)

۱۰۴۔ زیادہ اسے بڑھا کر اب قہر کیا کرو گے
 جھینگڑ کی شکل ہیں تو کاندھوں کی بار موچیں
 ۱۰۵۔ جتنا کوئی اکھاڑے اکھڑے نہ پشم ان کی
 حق نے تمہیں دیے ہیں کیا استوار موچیں
 (کذا)

۱۰۶۔ کلا تھا تو بنا قد ہے تمام ڈنڈی
 کھوڑچ ہے ناک منہ پر اور بیگی تار موچیں
 (کذا)

۱۰۷۔ بانیں سپید رکھو اور داسنے سیہ تم
 بیگی عجب طرح کی لیل و نہار موچیں
 ۱۰۸۔ نظر آتی ہیں بن ساقی چمن میں تاک کی چھا ہیں
 روئیں آباغباں باہم گلے میں ڈال کے باہیں
 (حبیب، نراین)

۱۰۹۔ کشمیر سی جاگہ میں ناشکر نہ رہ زاہد
 جنت میں تو اے گیدی مارے ہے کیوں لاتیں
 (حبیب)
 ۱۱۰۔ تارِ نگاہ و سوزن مرگان یار بن

- (رچرڈ جونسن) اپنا جو دل پھٹے تو کسی سے رفو نہ ہو
- ۱۱۱۔ فرصت کہاں کہ ربط کریں گل سے اے نسیم
- (حبیب) ہیں اس چمن میں آشناک تیرے دم کے ساتھ
- ۱۱۲۔ جو ہے جلا جلوں کا ہے غم خوار وہ کوئی
- (حبیب، رچرڈ جونسن، نراین) بالیں پہ شمع رات کو میرے بہت روئی
- ۱۱۳۔ تیری صفائے رنگ کو پہنچا نہ ایک برگ
- (حبیب، رچرڈ جونسن، نراین) شبنم نے گرد عارض گل سے بہت دھوئی
- ۱۱۴۔ مری آنکھوں میں تو بتا مجھے تو کیوں رلاتا ہے
- (حبیب) سمجھ کر دیکھ تو اپنا کوئی بھی گھر جلاتا ہے
- ۱۱۵۔ ہم بھی کبھی دکھاویں گے ندیوں کو اپنی موج
- (حبیب، نراین) جو کچھ بھری ہے دل میں گر آنکھوں کی رہ بھی
- ۱۱۶۔ خالی خمیں کر اٹھ گئے اس بزم سے حریف
- (حبیب) بیٹھے ہیں ایک شیشہ دل ہم بھرے ہوئے
- ۱۱۷۔ افسردگی ہماری منت دیکھ چشم کم سے
- (حبیب) شمشیر کی طرح سے یہ دل بجھا ہوا ہے
- یہ دو غزلیں صرف نراین میں ملتی ہیں۔

- ۱۱۸۔ ہمیں کسی سے کر اظہار درد دانائی
- کہی نفس ہے بہ تقریب سرو دانائی
- ۱۱۹۔ کسی کی ہے مہ نو داد خواہ ابدو پر
- کہ شہر شہر ملے منہ کو گرد دانائی

۱۲۰۔ جلوں ہوں رشک سے میں شعلہ ساں گلی میں تری

جو رنگ کاہ نظر مجھ کو گرد دانائی ؟

۱۲۱۔ نہ پوچھ حال ہمارا کہ ایسی باتوں کی

کوئی سنے سے ترے دل کو درد دانائی ؟

۱۲۲۔ خبر دل اپنے کی پوچھے ہے اس سے جا سودا

تری گلی سے جو یہ رہ نور دانائی

۱۲۳۔ کشور میں حسن کے ہیں احکام شاہ اُلے

کرتے ہیں بے گنہ یار عذر گناہ اُلے ؟

۱۲۴۔ اثباتِ خوں پہ میرے، دیتے جو تھے گواہی

منہ دیکھتے ہی اس کا بولا گواہ اُلے

۱۲۵۔ کب بیٹھنے وہ دے ہے مجلس میں اپنی ہم کو

گھر سے گئے جو سیدھے، کریک نگاہ اُلے

۱۲۶۔ رنداں یہ کر رہے تھے افسوس کیا کہے مرد

گھر کو پھر آئے جس دم ہو کر تباہ اُلے

۱۲۷۔ سودا تو اس کی خوبی مت کہہ کسو کے آگے

اپنے لیے بیاد اب تو مت بساہ اُلے

اشعار ذیل فردیات کے تحت زاین میں دیے گئے ہیں۔ بقول قاضی عبدالودود صاحب ان میں دوسرے شعرا کے بھی اشعار ہیں۔

۱۲۸۔ کفن میرے پہ یارو یہ لکھنا

کسو سے دل کو کوئی مت لگانا

۱۲۹۔ دل کو سمجھاؤ ناں، ستانا ہے

- اس کو کچھ مت کہو دوانا ہے
 ۱۳۰۔ دل ہوا شوخ سے جایار خدا خیر کرے
 بے طرح کا ہے ستم گار خدا خیر کرے
 ۱۳۱۔ سرمہ دے کر نہیں رجھاتے ہو
 کیا سجن توتیا لگاتے ہو
 ۱۳۲۔ پیالہ برہ کا جب سے پیا ہم کو پی گیا
 اس کے نشے کی بات کہوں کیا کہ جی گیا
 ۱۳۳۔ دل کو تو ہر طرح سے دلاسا دیا کروں
 آنکھیں تو مانتی نہیں ہیں اس کو کیا کروں
 ۱۳۴۔ ہر ایک کی پاؤں کی آواز سے جیتے ہیں
 اس وعدے کی شب ہم کس انداز سے جیتے ہیں
 ۱۳۵۔ لگ چلنے کو تو آتے ہیں مجھ کو ہنر کئی
 پر نازِ خو سے یار کی ہیں دل میں ڈر کئی
 ۱۳۶۔ چھوٹ جاویں غم کے ہاتھوں سے جو نکلے دم کہیں
 حیف ہے یہ زندگی جو تم کہیں اور ہم کہیں
 ۱۳۷۔ دن تو تیرے ہی تصور میں گزر جاتا ہے
 رات کو خواب میں بھی تو ہی نظر آتا ہے
 ۱۳۸۔ ہم تمہارے ہجر میں ، تم غیر پاس
 ہم کہاں اور تم کہاں، کیا قہر ہے
 مثنوی درقصہ عشق پر شیشہ گر بزرگ بطور ساقی نامہ
 اسی کا جلوہ حسن زلف مہ رد

اسی کی نافرمانی میں ہے بلکہ
اس شعر کے بعد چڑھو جنس اور خدا بخش میں یہ شعر زائد ہے۔

۱۳۹۔ کسی جا غلوت مریم کی ہو شیخ
کسی جا بر سر تہمت وہ ہو جمع
مثنوی کا ایک شعر ہے۔

وہ بارہ ہیں ستونِ عرشِ اعظم
رہا ہے سب کچھ ان کی ذات سے مقیم
اس شعر کے بعد چڑھو جنس اور خدا بخش میں یہ شعر زائد ہے۔

۱۴۰۔ کروں ایسے ہوں جب حامی محشر
بیاد ساقی و ساغرِ سخن سر
مثنوی میں یہ شعر ہے۔

تجھے بھی ہو کہیں الفت تو آدیکہ
یہ تخمِ عشق کی نشو و نما دیکھ
اس شعر کے بعد خدا بخش میں ۱۷ اشعار اور ہیں جو مطبوعہ نسخوں میں نہیں۔

۱۴۱۔ محبت کا کھلا ہے آخرش باغ

ہوا گل سے جگر لالے کا یوں داغ

۱۴۲۔ کہ جیسے آگ لگ کر اک شرر سے

جلے ہے دورا گھر ایک گھر سے

۱۴۳۔ نہ حاصل عشق کی دولت ہو بے رنج

کہ ہے مارِ سیہ کے سامنے گنج

- ۱۳۳۔ جب اس نے یہ بلا سر اپنے پر لی
دل زرگر پر میں نب جگہ کی
- ۱۳۵۔ کرشمہ تھا یہ الفت کے اثر کا
کہ دل پگھلا دیا زرگر پر کا
- ۱۳۶۔ گداز ایسا ہوا دل کا تب و تاب
کھٹالی میں طلا جیسے کہ ہو آب
- ۱۳۷۔ نہ دن کو چین اسے نے شب کو آرام
نہ تھا جز نالہ و فریاد کچھ کام
- ۱۳۸۔ اسی حالت میں اک دن یہ گیا سو
بہ خواب آیا نظر وہ آئینہ رو
- ۱۳۹۔ کہ یوں کہتا ہے وہ اس سے بھد درد
دل گرم اپنے سے بھر کر دم سرد
- ۱۴۰۔ محبت کا مری تجھ میں اثر ہے
تجھے کچھ حال سے میرے خبر ہے
- ۱۵۱۔ خن میرا (یہ) شکوے سے نہیں ہے
کہ دور اس امر سے شکوہ کہیں ہے
- ۱۵۲۔ کرے گو شمع داغ اس کا سراپا
پتنگے کو شکایت سے نہیں جا
- ۱۵۳۔ جو مہ سے ہے جگر کڑے کتاں کا
اسے شکوہ نہیں اپنے زیاں کا
- ۱۵۴۔ ہوا ہے یہ گلستاں جب سے ایجاد

ترانہ گل کو ہے بلبل کی فریاد
 ۱۵۵۔ وہی اے دوست میرا مدعا ہو
 مرے حق میں جو کچھ تیری رضا ہو
 ۱۵۶۔ مری زنجیر پا میں جو کڑی ہے
 محبت تیری ہی میں یہ گھڑی ہے
 ۱۵۷۔ مجھے خاک آپ کو بادِ سحر جان
 جدھر تو چاہے مجھ کو پیشتر جان

قطعات

در معملہ مشتمل بر تاریخ (رجز و جونس)

۱۵۸۔ چشم و چراغ جن کے ملا کٹھیر کے تھے
 نابود کی خدا نے جس دن وہ قوم ساری
 ۱۵۹۔ ملا نے وہ جو دشمن تھے آل سے نبی کے
 لایا تعصب اون کا سران کے پہ یہ خواری
 ۱۶۰۔ یوں مومنوں کے دل میں حق کی طرف سے گزرا
 مغز ان کا جوتیوں سے جھاڑو کہ ہیں یہ ناری
 ۱۶۱۔ تب سات سات جوتی ہر ایک کے لگائی
 اور مولوی عمر کو دو اگلی سب سے ماری
 ۱۶۲۔ ہاتف نے بہر تاریخ اوس دم پڑھا یہ مصرع
 کیا مولوی عمر کو ہوئی ہے کفش کاری
 ۱۶۳۔ حسن تو پس پردہ نہانت و نہاں نیست

چوں شلعہ فانوس عیانت و عیاں نیست
 ۱۶۴۔ باسفیہاں چنیں روش نازم نالہ را
 ورنہ این از عہدہ افلاک می آید بروں
 ۱۶۵۔ ہم نشیں حال و لم از گریہ من ظاہر است
 آستیں تابی تکام خاک می آید بروں

قصیدے

در منقبت امیر المومنین (رجز جو سن)

۱۶۶۔ جوہری ہوئے جو بازار سخن کا سو کہے
 قدر و قیمت میں ہیں باہم یہ رقم چاروں ایک
 اس شعر کے بعد یہ شعر ہے۔

۱۶۷۔ شیشے موتی سے نہیں کام کسو کے ان کو
 ہو کے اس بات پہ کھاتے ہیں رقم چاروں ایک
 قصیدہ در مدح حضرت امام ضامن
 کہاں سے پردہ ظلمات بچ جا کر خضر
 شراب عمر ابد سے یہ زندگی پاتا

اس شعر کے بعد یہ شعر ہے۔

۱۶۸۔ شرار آب میں رہتے ہیں گوہر آتش میں
 زبسکہ امن ترے عدل نے جہاں میں کیا
 قصیدہ در مدح شجاع الدولہ

حافظ یہ چاہے عہدے سے اس کے برآؤں میں

پیادے کو دے کے تین روپے نو روپے سوار
اس کے بعد یہ شعر ہے

۱۶۹۔ کہتے تھے اوس کو حافظ زر دوست خلق میں

رکھتا تھا ناد ہندی میں ایسا وہ اشتہار

در مدح نواب آصف الدولہ

(رچڑ جونس)

وہ جو تیرے کمان کی ہے پر

کس کو اس کو اٹھانے کا مقدور

اس کے بعد یہ شعر ہے

۱۷۰۔ یاد میں جس کی تیرگی آدے

کوہ نظروں میں خانہ زبور

قصیدہ در مدح نواب آصف الدولہ

(رچڑ جونس)

اپنی تری جناب میں اتنی ہی عرض ہے

کس کس کا ملتی ہوں کہا کر ترا غلام

اس شعر کے بعد یہ شعر ہے۔

۱۷۱۔ مت رکھ روا یہ مجھ پہ کہ عمال کے تین

تیری سلامتی میں کروں مجرہ و سلام

ہجو ساجد (رچڑ جونس)

عدو میرا جو ہوا دشمن خدا ہے وہ

خدا کی دشمنی کرنا تو عین ہے الحاد

اس شعر کے بعد جو سن میں سات شعر ہیں۔

- ۱۷۲۔ مگر یہ کہتے ہیں اکثر تمہارے یاں کذاب
 ہوئی ہے اس لیے حضرت سے یہ حدیث ارشاد
 ۱۷۳۔ نکاح تازہ کی دل میں علی کی خواہش تھی
 نبی نے بیٹی کی رنجش کی دیکھ یہ بنیاد
 ۱۷۴۔ حدیث یہ کہی تائیں کے اس کو باز رہے
 علی اس امر سے اور فاطمہ کا دل ہوشاد
 ۱۷۵۔ سو یہ لکھا نہیں اوس جا لکھے جہاں یہ حدیث
 پیسبر اپنے یہ بہتاں میں سمجھے ہوں گے خوار
 ۱۷۶۔ کیا میں فرض جو یوں بھی بقول ان کے ہو
 نبی کے حق میں جو کہتے ہیں یہ بغیر اسناد
 ۱۷۷۔ خدا شعور دے تو وہ اسی کو غور کریں
 کہ جب علی کے سنانے کو ہووے یوں ارشاد
 ۱۷۸۔ تو دوائے ان پہ جن اشخاص سے سوائے علی
 گئیں ہوں فاطمہ دنیا سے لے کر دل میں عناد

قصیدہ در مدح رچڑ جو سن

- ۱۷۹۔ دیکھانہ جائے اس سے روئے مگر خاں پہ رنگ
 غنچے کے بھی دہن سے ہے چشم زمانہ تنگ
 ۱۸۰۔ شیشہ نہ توڑے شہ کی مئے عیش کا فقط
 کاسہ پہ بھی گدا کے یہ وارد کرے ہے سنگ

- ۱۸۱۔ گر خاک سے اوٹھا کے یہ دیوے کسی کو اوج
 سو یوں کہ جیسے چوٹی کر پردے ہے یہ کوڑھنگ
 ۱۸۲۔ اس کے حسد کی تلخی کا اب کیا کروں بیاں
 پہنچے جو شہد لب تیں کر دے اسے شرنگ
 ۱۸۳۔ مشب صدف میں قطرہ کو کرتا ہے یہ گہر
 جو یا کو بھیجے اس کے سونے کلمہ نہنگ
 ۱۸۴۔ جو ولولہ ہے اس کا سوفتنہ ہے اس کے ساتھ
 خالی نہیں فساد سے اس کی ہے جو ترنگ
 ۱۸۵۔ پہنچاتے یہ کرے نہ فلک تک کسی کو دیر
 اور اس کو کچھ ٹپکتے زمیں پر نہیں درنگ
 ۱۸۶۔ ہے یہ زمانہ اور جو اہل زمانہ ہیں
 ان کا جہاں میں چشم مروت کا ہے یہ رنگ
 ۱۸۷۔ مفلس پدر ہو اور پدر جس کا ہو غنی
 بیٹے کو باپ کی ولدیت سے آئے نک
 ۱۸۸۔ پس اب کوئی کسو سے رکھے کس طرح امید
 بیٹے کا باپ سے ہو زمانے میں جب یہ ڈھنگ
 ۱۸۹۔ ہے اب مگر وہ ایک کہ جس کا یہ ہے خطاب
 ممتاز دولہ فخر جہاں و حسام جنگ
 ۱۹۰۔ پا جائے شکل مہر نگہ اس کی سی چلا
 سینے پہ آئینے کے اگر چھا رہا ہو رنگ
 ۱۹۱۔ جو ہر سے گو کہ چارہی غصہ کے سب ہیں خلق

- جلوے کو اوس کے دیکھ ہیں جو ہر شناس دنگ
 ۱۹۲۔ دل مدح غائبانہ سے حاصل نہیں سرور
 مت کر حضور جا کے ثنا کرنے میں درنگ
 ۱۹۳۔ تیری وہ ذات، گو تو نہیں ہے شہ فرنگ
 کرسی میں تیری پایہ اورنگ کا ہے ڈھنگ
 ۱۹۴۔ باعث یہ تیرے دست کرم کا ہے دہر میں
 خالی جو در ہے لے کے چمن سے ہیں تابہ نک
 ۱۹۵۔ خوں میں عدو کی تیج کی تیری شادری
 ہے اس طرح کہ بحر میں پیرے ہے جوں نہنگ
 ۱۹۶۔ سائے تلے سپر کی ترے جس کو ہو پناہ
 اودھر نہ روکمان فلک کا کرے خدنگ
 ۱۹۷۔ سرعت یہ باد پا کی تری جس کے سامنے
 موج ہوا ہے اسپ ہوا کے قدم میں لنگ
 ۱۹۸۔ تو وہ خلیق لذت شہد آئے کام میں
 چکھے بیان خلق میں تیری اگر شرنگ
 ۱۹۹۔ شائق کی جائے ہر بن موچشم ہو اگر
 تب اس کے دل سے نکلے تیرے دید کی انگ
 ۲۰۰۔ دور از ادب ہے طول سخن اس کے اب عوض
 سودا نکال دل کی دعائیہ سے انگ
 ۲۰۱۔ یارب تمام دوست رہیں تجھ سے فیضیاب
 جاری ہے جب تک کہ جہاں بچ آب گنگ

تہنیت عید (رچرڈ جونسن)

- ۲۰۲۔ صبح عید ہے دل ہیں خوشی سے مالا مال
 ۲۰۳۔ جو کوئی خلقتِ انساں سے ہے بزرِ فلک
 مصمم آج کے دن دل میں اس کے ہے یہ خیال
 ۲۰۴۔ کہ پہنچے اس درِ دولت سراپے لے کے نذر
 جو تجھ جناب میں مقبول ہو خوشا احوال
 ۲۰۵۔ کوئی تو سیم، کوئی زر، کوئی گہر، کوئی لعل
 ہر ایک ہے شرفِ اندوز یاں بایں منوال
 ۲۰۶۔ ہوا ہے بندہ بھی حاضر درِ سخن لے کر
 پے حصولِ سعادت بدر گہ اقبال
 ۲۰۷۔ اگرچہ تو ہے مسکنِ باصف الدولہ
 ترا فردِ سلیمان سے بھی ہے جاہ و جلال
 ۲۰۸۔ تری تھلکی طالع ہے وہ کہ چرخِ اوپر
 غلامِ داغی ہے اختر کا تیرے بدر کمال
 ۲۰۹۔ علوئے جاہ کے آگے ترے نہیں کچھ قدر
 کسو طرح کا کوئی نذر یاں کرے زرو مال
 ۲۱۰۔ مگر یہ نذر ہے شایاں اس آستاں کے ہی
 نشاطِ عید جو لایا ہے عزّۃ شوال
 ۲۱۱۔ یہی جناب میں حق کی دعا ہے سودا کی

- جہاں ہو جب تیں اے میرے قبلہ آمال
 ۲۱۲۔ رہے محبوں پہ سایا ترا سپر کی طرح
 سدا بخون وعدہ تیج جوں شفق میں ہلال
 قصیدہ تاریخ بنائے مسجد در فارسی
 ۲۱۳۔ باعندلیب گلشن ایماں برابر است
 گلبانگ مرغ خامہ ام اللہ و اکبر است
 ۲۱۴۔ دارم من از لباس حرم صوف در مداد
 ہر سو کہ او رواں شود اسلام رہبر است
 ۲۱۵۔ بر صفحہ پائے خامہ من کج نمی قد
 کز رشتہ محبت حق تار مسطر است
 ۲۱۶۔ بین السطور ادکہ بہر صفحہ نقش زد
 از چاک جیب صبح سعادت منور است
 ۲۱۷۔ حرف زبان کلک من از کثرت جلا
 نحویت بر درق چو در آئینہ جوہر است (؟)
 ۲۱۸۔ در خاطر م چو جلوہ، دہد شلوخی خیال
 می بزمش کہ جامہ احرام در براست
 ۲۱۹۔ چشم اگر بہ سبزہ خطا بتاں قد
 بے آہوے حرم بہ نظر نوک نشتر است
 ۲۲۰۔ بازوئے شاہباز خیالم کہ در ہواست
 بر مرغ رو بہ قبلہ نشیں سایہ گستر است
 ۲۲۱۔ از استماع نظم کلام دریں مقام

(رچڑ جونس)

- ہر رند جہ در برد عمامہ بر سر است
 ۲۲۲۔ ریش زحہ شرع بروں آنقدر کہ شیخ
 او را بدست گیرد و گوید دُم خراست
 ۲۲۳۔ چوں محاسب سوار شود در رکاب او
 سگے برائے شیشہ بہ دست قلندر است
 ۲۲۵۔ شادی غزہ رمضان زیر آسمان
 نزد مغال زغزہ شوال خوشتر است
 ۲۲۶۔ بنی بہ زیر ابروے پیوستہ بتاں
 در چشم خلق جلوہ محراب و منبر است
 ۲۲۷۔ تابشود بہ مدرسہ بانگ و صلوة را
 شد در پے معالجہ گریہ من گراست (?)
 ۲۲۸۔ خواہان سیمہ بسکہ بود خلق دانہ اش
 از در شاہوار بہ قیمت گراں تر است
 ۲۲۹۔ در فکر بوریاست گدا از پے نماز
 مصروف بر عمارت مسجد توکلر است
 ۲۳۰۔ دیدیم تازہ مسجد نورانی کرد (کذا)
 در اقتباس نورمہ و مہر اختر است
 ۲۳۱۔ آبے کہ ریختند بہ تعمیر آں مکان
 پیدا است از صفائے کہ او آب گوہر است
 ۲۳۲۔ ہر سنگ اور عکس کواکب بہ وقت شب
 در چشم روزگار زترصیع بہتر است

- ۲۳۳- یارب پہ مسجد است کہ گردِ حریم اد
 ارواحِ اولیائے مکمل کتوبر است
- ۲۳۴- فرماں روا مسیح بہ معمار آں بناست
 دل را فزائے او کہ چنین روح پرور است؟
- ۲۳۵- آید صدا ز گنبدش از جنبشِ نسیم
 بگر کہ شان رفتم از عرش برتر است
- ۲۳۶- دل را تعجب است کہ گلدستہ ہائے او
 ہم در بہار و ہم بہ خزاں نازہ و تراست
- ۲۳۷- وصفِ کتابہ اش چہ نویسم کہ در نظر
 چوں سر نوشت صاحبِ ایمان منور است
- ۲۳۸- حاجت وراں حرم بہ فردغِ چراغ نیست
 شب تا سحر تجلی حق شمع منبر است
- ۲۳۹- فی الفور می رسد بدیہ خانہ قبول
 آں جا برائے مرغِ دعا فیض شہر است
- ۲۴۰- بر سطح او مقابلِ محراب حوض نیست
 چشم پر آب جانبِ ابروے دلبر است
- ۲۴۱- دیدم چونکس قہ ز زمین او در آب
 پنداشتم کہ مہر بہ کوثر شادور است
- ۲۴۲- کرسی اور زمرتہ انبیا بلند
 صحنش بہ وسعتِ کرم حق برابر است
- ۲۴۳- جاروبِ صحنِ شکلِ خطوطِ شعا عیست (۲)

- جاروب کش بہ صورتِ سلطانِ خاور است
 ۲۴۳۔ ہر چند جائے رفتہ بے دیدہ ام ولے
 دل را ازاں صفا کہ بروید باور است
 ۲۴۵۔ آیند در شمار نگہ (کذا) ذرہ ہائے خاک
 عکسے اگر دراں زہو اے مکذّر است
 ۲۴۶۔ چاہے بایں لطافت و خوبی بہ کنج اوست
 آبش چناں قریب کہ بال برابر است
 ۲۴۷۔ مردم بہ گرد او ہمہ وقت از پے وضو
 چوں صورت صفِ مژدہ دیدہ تر است
 ۲۴۸۔ نقاشی عمارتِ آں سجدہ گاو خلق
 ورتازگی نہ باغِ جناں ہم فزوں تر است
 ۲۴۹۔ نقاشِ او کہ رنگ طراز است چوں بہار
 کلکش بہر گلے کہ ز دیوار تا در است
 ۲۵۰۔ نوے کشیدہ کردہ موجِ نسیم صبح
 برعارضِ نگار چو زلفِ معنبر است
 ۲۵۱۔ بیروں زحّد وصف بود دستکاریش
 ہر دم بہ کلک صنعتِ اوصنع دیگر است
 ۲۵۲۔ از بس دراں احاطہ صفا را بکار برد
 مطلع بہ وصف او ز گہر ہم فزوں تر است
 ۲۵۳۔ یک سمت نقشِ لالہ دیک سو صنوبر است
 از عکسِ یک دگر بہ قراین برابر است

- ۲۵۴۔ آنجا کسے کہ پیش نماز است وصف او
در گوش ہوش از ہمہ اوصاف برتر است
- ۲۵۵۔ در فرض صبح و شام زہر سورہ خواندیش
نحوے بہ دل صدائے قرأت موثر است
- ۲۵۶۔ ہر کس کہ بود منکر قرآن شنید و گفت
لاشک کلام حق بہ زبان پیبر است
- ۲۵۷۔ گویند عرشیاں کہ صد اے مؤذنش
در گوش ماز نغمہ داؤد خوشتر است
- ۲۵۸۔ خوش بلبلیست او کہ سحر گہ ترانہ اش
در باغ دیں بہ مدح خدا و پیبر است
- ۲۵۹۔ خوش لہجہ طوطیست نطیش کہ نطق او
بہر ضیافت صلیحا شہد و شکر است
- ۲۶۰۔ لاریب ہم چو خانہ بود خانہ خدا
کانجا گدا و شاہ بہ یک سجدہ ہمسراست
- ۲۶۱۔ ہر کس در اں مقام دو رکعت نماز خواند
فردا بہ - باوصواب دو صد حج اکبر است
- ۲۶۲۔ ہر گہ دو کعبہ گشت کندرو کدام سو
زیں وجہ مرغ قبلہ نما سخت مضطر است
- ۲۶۳۔ سودا اگر کسے بہ قسم گوید این سخن
در رتبہ آں مکاں زحرم پایہ کمتر است

۲۶۵۔ فحھے کہ واقفست زشان بزرگیش

اورا کے از زبان کس ایں حرف باور است

۲۶۶۔ بودم دریں خیال در آنجا کہ ظاہرا

بالکعبہ ایں رواق مقدس برابر است

۲۶۷۔ ناکہ بہ سجدہ از پے تاریخ خایے (?)

سر را نہاد و گفت کہ از کعبہ بہتر است

یہ رباعی صرف خدا بخش میں ہے۔

۲۶۸۔ اے دوست پے دفع عدو میبوشی

و ز غصہ شب و روز تو خوں میتوشی

۲۶۹۔ تا کشتن نفس خویش ممکن باشد

حیف است کہ بر کشتن دشمن کوشی

یہ پہلی صرف خدا بخش میں ہے۔

۲۷۰۔ ایک پرکھ کے انجھر تین

تین میں چار اوکن پر بین

۲۷۱۔ ادہ اچھر بن من موہ ڈالے

مدھ اچھر بن بن جی کو پالے

۲۷۲۔ انت اچھر بن دیوے دکھ

سب اچھر سدوں کو سکھ

خدا بخش لائبریری میں کلیات سودا کا ایک قلمی نسخہ ہے۔ جس میں فاخرکیں کی ججو میں سودا کی ایک مثنوی ہے۔ جو کسی مطبوعہ نسخے میں نہیں ملتی۔ مثنوی اردو میں ہے لیکن تمہید کے طور پر جو نثر ہے وہ فارسی میں ہے۔ قاضی عبدالودود نے اس کے بارے میں لکھا ہے:

”اس کے ساتھ جو تمہید نثر ہے وہ بھی ظاہر اسودا کی لکھی ہوئی ہے۔“
برائے تنبیہ مرزا فاخر صاحب: مردم کو یوں دیکھنے نقل می کرد کہ مرزا فاخر صاحب خود برابر شیخ
علی حزیں می شمارند، و تمام وضع نشست و برخاست اور اپیش گرفتہ اند، بلکہ خود را در فضل و کمال
از و بہتری دانند و اکثر اشعار فارسی اور اصلاح می دہند، چنان چہ ایں بیت مثنوی حسب حال
ایشانست، مثنوی در ہجو مرزا فاخر کہیں۔

- ۲۷۳۔ ایک نقل اس پہ مجھ کو آئی یاد
سچ ہو وہ یا کسی کا ہو ایجاد
۲۷۴۔ ایک ملا بہ عہد شاہ جہاں
نہ تو عالم ہی وہ نہ سچ مداں
۲۷۵۔ بین بین اس کو کچھ کچھ آتا تھا
لڑکے کتب میں وہ پڑھاتا تھا
۲۷۶۔ بس کہ تھا وہ شعور سے معذور
لڑکے تھے اس سے خرم و سرور
۲۷۷۔ اس سے دہشت کو تھی نہ دل میں راہ
صحن کتب تھا ان کی بازی گاہ
۲۷۸۔ ایک جو اُن میں تھا فہیم و ذکی
مصلحت اُن نے لڑکوں سے یوں کی
۲۷۹۔ یارو ہم کھیلے سو طرح کا کھیل
دیکھے ہم نے سبھی وہ بیجا کھیل

۱۔ معاصر، حصہ ۱، ص ۷۳۔ اس مثنوی کے بارے میں قاضی صاحب لکھتے ہیں۔ ”ایک مثنوی ایسی تھی جو کلیات
مطبوعہ میں شامل نہیں اور جہاں تک مجھے علم ہے کہیں اور بھی نہیں چھپی۔ دہاسی نے فرانسیسی زبان میں اس کا
ترجمہ البتہ کیا ہے۔ جو اس کی تاریخ ادبیات ہندی و ہندوستانی جلد ۱ (ترجمہ ہقا) میں موجود ہے۔“ قاضی
صاحب کا خیال درست نہیں۔ مثنوی جان شیکسپیر منتخبات ہندی، لندن، ۱۸۲۵ء، ص ۲۰، میں شامل ہے۔

- ۲۸۰۔ کھیل اب میں نیا نکالا ہے
سارے کھیلوں سے وہ نرالا ہے
- ۲۸۱۔ لڑکے بولے بھائی جی فرماؤ
کیا ہے وہ کھیل تم ہمیں بھی بتاؤ
- ۲۸۲۔ کہا اس نے کہ بادشاہ و وزیر
لڑکے جو بنتے ہیں صغیر و کبیر
- ۲۸۳۔ اس میں چنداں تو یارو لطف نہیں
کھیل اس سے یہ خوب تر ہے کہیں
- ۲۸۴۔ میاں جی کو کسی طرح پھسلاؤ
مل کے شاہ جہاں سب ان کو بناؤ
- ۲۸۵۔ ہنس کے وہ بولے ہوئے یہ کس طرح
کہا اس نے کہ تم سنو اس طرح
- ۲۸۶۔ صبح مکتب میں پڑھنے جو آئے
منہ میاں جی کا تک کے رہ جائے
- ۲۸۷۔ پوچھیں جو کیا ہے دیکھنے کا سبب
کہے قدرت خدا کی دیکھوں ہوں اب
- ۲۸۸۔ ہوگئی شب میں آپ کی صورت
کچھ سے کچھ حق کی ہے یہ کیا قدرت
- ۲۸۹۔ کیا کہوں میں کہ آج کیسی ہے
شکل شاہ جہاں کی جیسی ہے
- ۲۹۰۔ بحر حیرت میں ہوں یہ دیکھ کے عرق

- سرِ مو کچھ رہا نہ باہم فرق
 ۲۹۱۔ پر یہ ہے شرط جائے جو اُن کے پاس
 کہے کھا کھا قسم بلا دسواں
 ۲۹۲۔ تم تو سمجھو ہو ان کا عقل و شعور
 بنیں گے جو بناؤ گے بہ سرور
 ۲۹۳۔ مطلب ان نے جو کچھ کہ ٹھہراے (کذا)
 لڑکوں سے بات سب وہ بن آئے
 ۲۹۴۔ نہ رہا اس کو یہ بنا یاں تک
 شکل شاہ جہاں کی ہونے میں شک
 ۲۹۵۔ نہ کہ ٹھہرا ہے اس کے دل میں خیال (کذا)
 ہوگا شاہ جہاں کا جب کہ دصال
 ۲۹۶۔ اس کے ارکان نہ لاکے تابِ فراق
 میرے دیدار کو ہو سب مشتاق
 ۲۹۷۔ آئیں گے دیکھنے کو میرے گھر
 بس مرے واسطے ہے یہ بہتر
 ۲۹۸۔ کہ میں پیدا کروں وہ خصلت و خو
 خلق شاہ جہاں سمجھ مجھ کو
 ۲۹۹۔ کریں مجرا، سلام اور تسلیم
 نہ کروں میں فرشتے کی تعظیم
 ۳۰۰۔ غرض آفاق میں جسے ہو عقل
 سمجھے ان کے مطابق اب یہ نقل

- ۲۸۰۔ کھیل اب میں نیا نکالا ہے
سارے کھیلوں سے وہ نرالا ہے
- ۲۸۱۔ لڑکے بولے بھائی جی فرماؤ
کیا ہے وہ کھیل تم ہمیں بھی بتاؤ
- ۲۸۲۔ کہا اس نے کہ بادشاہ و وزیر
لڑکے جو بنتے ہیں ضعیف و کبیر
- ۲۸۳۔ اس میں چنداں تو یارو لطف نہیں
کھیل اس سے یہ خوب تر ہے کہیں
- ۲۸۴۔ میاں جی کو کسی طرح پھسلاؤ
مل کے شاہ جہاں سب ان کو بناؤ
- ۲۸۵۔ ہنس کے وہ بولے ہوئے یہ کس طرح
کہا اس نے کہ تم سنو اس طرح
- ۲۸۶۔ صبح کتب میں پڑھنے جو آئے
منہ میاں جی کا تک کے رہ جائے
- ۲۸۷۔ پوچھیں جو کیا ہے دیکھنے کا سبب
کہے قدرت خدا کی دیکھوں ہوں اب
- ۲۸۸۔ ہوگئی شب میں آپ کی صورت
کچھ سے کچھ حق کی ہے یہ کیا قدرت
- ۲۸۹۔ کیا کہوں میں کہ آج کیسی ہے
شکل شاہ جہاں کی جیسی ہے
- ۲۹۰۔ بحر حیرت میں ہوں یہ دیکھ کے عرق

- سر سو کچھ رہا نہ باہم فرق
 ۲۹۱۔ پر یہ ہے شرط جائے جو اُن کے پاس
 کہے کھا کھا قسم بلا دوسواں
 ۲۹۲۔ تم تو سمجھو ہو ان کا عقل و شعور
 بنیں گے جو بناؤ گے بہ سرور
 ۲۹۳۔ مطلب ان نے جو کچھ کہ ٹھہراے (کذا)
 لڑکوں سے بات سب وہ بن آئے
 ۲۹۴۔ نہ رہا اس کو یہ بنا یاں تک
 شکل شاہ جہاں کی ہونے میں شک
 ۲۹۵۔ نہ کہ ٹھہرا ہے اس کے دل میں خیال (کذا)
 ہوگا شاہ جہاں کا جب کہ وصال
 ۲۹۶۔ اس کے ارکان نہ لاکے تابِ فراق
 میرے دیدار کو ہو سب مشتاق
 ۲۹۷۔ آئیں گے دیکھنے کو میرے گھر
 بس مرے واسطے ہے یہ بہتر
 ۲۹۸۔ کہ میں پیدا کروں وہ خصلت و خو
 خلق شاہ جہاں سمجھ مجھ کو
 ۲۹۹۔ کریں مجرا، سلام اور تسلیم
 نہ کروں میں فرشتے کی تعظیم
 ۳۰۰۔ غرض آفاق میں جسے ہو عقل
 سمجھے ان کے مطابق اب یہ نقل

۳۰۱۔ بنے یہ شیخ اپنے یوں بہ گماں
 جیسے ملا بنا تھا شاہ جہاں
 ۳۰۲۔ شیخ کے سے نہ بخت ہیں نہ کمال
 شیخ ہونا انھیں ہے امر محال^۱

۱۔ اس مثنوی کے ساتھ جو تہمیدی نثر فارسی میں ہے۔ جان شیکسپیر نے اس کا اردو ترجمہ دیا ہے۔ ”لوگ کہتے ہیں کہ ایک شخص نقل کرتا تھا کہ مرزا قاضی صاحب اپنے تئیں شیخ علی حزیں کے برابر جانتے ہیں اور سب وضع ان کی نشست و برخاست کی اختیار کی ہے بلکہ اپنے تئیں فضل و کمال میں ان سے بہتر جانتے ہیں اور اُن کے اکثر اشعار پر اصلاح کی ہے۔ چنانچہ یہ مثنوی حب مال مرزا صاحب کے ہے۔“

سودا کے شاگرد

ہو کے استاد دبستانِ سخن میں سودا
شعر کے قاعدہ دانانِ جہاں پر آیا

شمالی ہند میں اردو شاعری کی ابتدا ہی سے استاد کی بہت زیادہ اہمیت رہی ہے۔ ہر شاعر کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنے عہد کے کسی استاد فن کے سامنے زانوئے ادب نہ کرے۔ استاد عروض و قوافی کے فن پر اچھا خاصا عبور رکھتا تھا۔ وہ فن شعر گوئی کے اصولوں سے شاگردوں کو واقف کرتا۔ استاد کی یہ اہمیت بیسویں صدی کے آغاز تک رہی اور اس آخری عہد کے اہم ترین استادوں میں داغ، امیر مینائی اور سیما ب اکبر آبادی ہیں۔ اٹھارویں صدی اور نصف انیسویں صدی میں تو متمول لوگ گھروں پر بچوں کی تعلیم کے لیے جو اتالیق مقرر کرتے اس کے فرائض میں فن شعر گوئی کی تعلیم بھی شامل تھی۔ کیوں کہ اس دور کی تہذیب میں سخن گو ورنہ کم از کم سخن فہم ہونا ضروری تھا۔

اگر کوئی شاعر کسی استاد کا تلمذ اختیار نہ کرتا تو اس کی ادبی زندگی کے آغاز میں اسے بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔ اس کے اشعار کم رتبہ اور پایہ اعتبار سے ساقط سمجھے جاتے۔ ادبی معرکوں میں اسے ”بے استادہ“ ہونے کا طعنہ دیا جاتا۔ میر نے ذکر میر میں کہیں یہ نہیں لکھا کہ انھوں نے کسی استاد فن سے کسب کمال کیا تھا۔ البتہ سعادت علی نامی ایک معمولی سے شاعر کا ذکر کیا ہے جس نے انھیں ریختہ گوئی کی ترغیب دی تھی۔ مگر میر یہ بات اس وقت کہہ سکے تھے جب اُن کی استادی مسلم ہو چکی تھی۔ اور ان کا شمار صفِ اول کے ریختہ گو شعرا میں ہونے لگا تھا۔ ورنہ جب تک لوگوں کے دلوں پر اُن کی شاعری کا سکہ نہیں بیٹھا تھا۔ انھیں جبراً و قہراً خان آرزو کو اپنا استاد کہنا پڑا تھا۔ تاکہ خان آرزو کے رعب سے مخالفین کے منہ بند رہیں۔

ایسا ہی حادثہ غالب کے ساتھ گزرا تھا۔ ادبی معرکہ میں انھوں نے عبدالصمد نامی ایک ایرانی نژاد شخص کو اپنا استاد بنایا ہے۔ لیکن اب یہ بات پایہ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ عبدالصمد کا کوئی

۱۔ میر نے نکات اشعار میں خان آرزو کو اپنا ”استاد و مرشد“ لکھا ہے۔ نکات اشعار، ص ۴۰، لیکن ذکر میر میں خان آرزو کے بارے میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔ ”خالوے من بادیہ پیائے طبع شد یعنی در لشکر شجاع الدولہ۔ بایں توقع رفت کہ بردار این اسحاق خاں شہید آں جاہ مسجد، نظر بر حقوق سابق رعایے خواہند کرد۔ جز بادستش نیامد۔ لکھنؤ زمانہ خورد و ہم آں جائز د۔“ (ذکر میر، ص ۷۵)

خارجی وجود نہیں تھا۔ اس کی اختراع محض مخالفوں کو خاموش کرنے کے لیے کی گئی تھی۔

اٹھارویں صدی میں خان آرزو اور مرزا مظہر جانجناں دو اہم فارسی شاعر ہیں۔ ان دونوں کی تربیت نے بڑے بڑے اردو استاد پیدا کیے۔ خان آرزو کے شاگردوں میں شرف الدین مضمون، شاہ مبارک آبرو، غلام مصطفیٰ خاں بکرنگ ایسے شاعر ہیں جن کا شمار ”دورہ ایہام گویان“ کے اساتذہ میں ہوتا ہے۔ اسی طرح مرزا مظہر کے شاگردوں میں انعام اللہ خاں یقین، احسن اللہ خاں بیان، میر باقر حزیں اپنے عہد میں بہت مشہور و مقبول رہے۔ یہ لوگ ایہام گوئی کے خلاف تحریک کے علم بردار مانے جاتے ہیں۔ بڑے شاعروں میں شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہو جس کے تلامذہ کی فہرست اچھی خاصی طویل نہ ہو۔

اگر ایک شاعر کے لیے یہ بات قابل فخر تھی کہ وہ کسی بڑے استاد کا شاگرد ہے تو استاد کے لیے بھی یہ بات باعث افتخار تھی کہ اس کے شاگردوں کی فہرست طویل ہے۔ حاتم نے ”دیوان زادہ“ کے دیباچے میں اپنے ۴۵ شاگردوں کے نام درج کیے تھے۔ تلامذہ غالب میں مالک رام صاحب نے ۱۴۶ شاگردوں کا ذکر کیا ہے اور وہ الگ ہیں جن کے نام کتاب شائع ہونے کے بعد تحقیق ہوئے۔

شاہ کمال نے جرات کے بارے میں لکھا ہے:

”ہفتہ میں دو روز یعنی چار شنبہ اور یک شنبہ اصلاح کے لیے مقرر تھے۔ تمام شاگرد جمع ہوتے اور اپنی غزلیں پڑھتے۔ ہر ایک کی اصلاح ہوتی۔ ایسی محبت اور جلسہ شہر میں کہیں نہیں ہوتا تھا۔“
(فارسی سے ترجمہ)

مولانا محمد حسین آزاد نے ناسخ کے بارے میں لکھا ہے:

”آپ تکیہ سے لگے بیٹھے رہتے تھے۔ شاگرد (جن میں اکثر امیر زادے شرفا ہوتے تھے) باادب بکھونے کے حاشیہ پر بیٹھتے جاتے۔

دم مارنے کی مجال نہ تھی۔ شیخ صاحب کچھ سوچتے کچھ لکھتے۔ جب کاغذ ہاتھ سے رکھتے تو کہتے ہوں! ایک شخص غزل سنانی شروع کرتا۔ کسی شعر میں کوئی قابل تبدیل ہوتا یا پس و پیش کے تغیر سے کام نکلتا تو اصلاح فرماتے۔ نہیں تو کہہ دیتے یہ کچھ نہیں نکال ڈالو یا اس کا پہلایا دوسرا مصرع اچھا نہیں۔ اسے بدلو۔ یہ قافیہ خوب ہے۔ مگر اچھے پہلو سے نہیں بندھا۔ طبیعت پر زور ڈال کر کہو۔ جب وہ شخص پڑھ چکتا تو دوسرا پڑھتا۔ اور کوئی بول نہ سکتا تھا۔“

استاد اپنے شاگردوں سے بہت محبت کرتا تھا۔ ان کی تربیت میں پوری کوشش کرتا۔ شاگرد بھی سعادت مندی سے پیش آتے۔ یہ استاد کی محبت کا نتیجہ تھا کہ بعض شاعروں کا تخلص استاد کے تخلص کے ہم وزن یا اس جیسا ہوتا تھا۔ اس کی مثالیں شاگردانِ جرأت میں بہت ملتی ہیں۔ ان کے بعض شاگردوں کے تخلص تھے۔ اُلفت، غیرت، رخصت، حقیقت، محنت، محبت، مروت، قوت اور شوکت وغیرہ۔

ایسا بھی ہوتا تھا کہ کوئی شاعر کسی استاد کا شاگرد ہے۔ استاد سے کسی بات پر اُن بن ہوئی اور اس نے کسی اور کا تلمذ اختیار کر لیا۔ ایسے جھگڑوں میں کبھی کبھی شاگرد اپنے پہلے استاد کی جھو بھی کہنے سے باز نہ رہتا۔ قائم کے پارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے سودا کا تلمذ ترک کر کے ان کی جھو کہی تھی۔ جس کا جواب سودا نے بھی ایک جھو سے دیا تھا۔

ادبی معرکوں میں یہ شاگرد بہت کام آتے تھے۔ انشاء کے شاگردوں ہی نے مصحفی کے خلاف لکھنؤ کی سڑکوں پر جلوس نکالا تھا۔ مصحفی نے سودا کی وفات کے بعد ان پر کچھ اعتراضات کیے تھے۔ جن کا جواب شاگردانِ سودا نے دیا۔ کافی دن تک مصحفی اور شاگردانِ سودا میں معرکہ رہا۔ ایسے معرکوں میں اگر شاگرد میں صلاحیت ہوتی تو وہ خود استاد کے حریف کا مقابلہ کرتا۔ ورنہ استاد اس کے نام سے کہہ کر دیتا۔ ایسا بھی ہوتا تھا کہ حریف کو نیچا دکھانے کے لیے استاد اپنے شاگردوں کو اعلیٰ درجے کی غزلیں کہہ کر دیتا۔ جو مشاعرے میں پڑھی جاتیں اور ان شاگردوں کی کامیابی کو حریف استاد کی ناکامی سمجھا جاتا۔ کبھی کبھی استاد اپنے کسی عزیز

نمونہ کلام:

الٹا سحر صبا نے جو گوشہ نقاب کا
دیکھ اس کو رنگ زرد ہوا آفتاب کا

.....
کل طلب میں سے کی یوں ہم یار منہ کھولے رہے
نزع میں پانی کو جوں بیمار منہ کھولے رہے
دل کو خواہش ہے یہ کس کے تیر کی یارب کہ اب
شکل پکیاں ہو کے جوں سو فار منہ کھولے رہے
سخت مشکل ہے وہ خوگر منہ پہ رکھنے سے نقاب
اور چاہیں چشم یہ دل دار منہ کھولے رہے
جام سے ساقی کے آگے لائے جوں مجلس کے بیچ
غیروں کو پیہم دیے اور یار منہ کھولے رہے
اکثر دلوں نے پی اور اکثر قطرے کو ترسا کیے
لڑھ گئے دو چار اور دو چار منہ کھولے رہے
خون احسن کا نہ چائے جب تلک کب ہو نیام
اژد ہے کی طرح وہ تلواریں منہ کھولے رہے

.....
دھکائیے جا اُن کو جو مرگ سے ڈرتے ہیں
ہم ہیں ترے پروانے جی دینے پہ مرتے ہیں
تم غیر کے ہاتھوں سے واں جام چڑھاتے ہو

یاں حلق میں لوہو کے سوگھونٹ اترتے ہیں
 ہو دست پہ سرِ عالم کب لیں ہیں مرا مجرا
 سوناز سے ہاتھ اپنا ٹک سینے پہ دھرتے ہیں
 کھلتے ہیں اسیروں کے صد عقدہ غم دل سے
 تجھ مکھڑے پہ زلفوں کے جب بال بکھرتے ہیں
 پھر فصل بہار آئی جو ہوئے سو ہو احسن
 مغ پاس گر وہم بھی دستار کو دھرتے ہیں

.....
 کہا جو میں نے کہ رُخ کو ترے قرنہ لگا
 بگڑ کے بولا کہ چل بے ادھر نظر نہ لگا
 رہی جوتن میں مرے جان اک رتق باقی
 لگا کہ زخم کہا حیف کارگر نہ لگا
 اسی لیے تو میں تجھ سے خفا ہوں اے احسن
 گھڑی گھڑی مرے پاؤں کو چشم پر نہ لگا

.....
 ہوں لے آئی تھی، اس جنگ جو کے پاس مجھے
 نگہ لڑی تو رہے پھر نہ کچھ حواس مجھے

.....
 ہجر میں کیوں کر نہ ہوئے آہ و زاری بیشتر
 ہے قرار اس دل میں کم اور بے قراری بیشتر
 روز ہجراں ہی میں تنہا کچھ نہیں روئے ہیں ہم

شاگرد کو باقاعدہ غزلیں کہہ کر دیا کرتا۔ یوں بھی ہوتا کہ اگر کسی نوجوان نے کوئی اچھی غزل پڑھی تو اسے استاد کا کلام تصور کیا جاتا۔ خواہ وہ اس نوجوان کا خون جگر ہی کیوں نہ ہو۔ انعام اللہ خاں یقین اور دیا شکر نسیم پر یہی الزامات ہیں کہ یقین کا دیوان مرزا مظہر کا کیا ہوا ہے اور نسیم کی مثنوی گلزار نسیم آتش کی تصنیف ہے۔

یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ صف اول کے بیشتر شاعروں کے نام سے ان کے اساتذہ کے نام زندہ ہیں ان شاعروں نے اساتذہ سے تربیت حاصل کی۔ لیکن بہت جلد ان سے بہت آگے نکل آئے۔ اس کے برعکس یہ بھی دلچسپ بات ہے کہ جن شاعروں پر اردو ادب کو ناز ہے ان کے شاگردوں میں شاذ و نادر ہی کوئی ایسا ہوا ہے جو استاد سے آگے بڑھنا تو کیا استاد کا ہم پلہ ہو۔

سودا کے شاگردوں میں صاحب اقتدار بھی تھے اور غریب لوگ بھی۔ ایسے شاگردوں کی تعداد اچھی خاصی ہے جو صاحب دیوان تھے لیکن قائم کے علاوہ ایک بھی ایسا شاعر نہیں جس نے حیات جاوید پائی ہو۔

احسن، مرزا احسن علی

سید علی حسن خاں اور ضیفؒ نے انھیں دہلوی لکھا ہے۔ مصحفی لکھتے ہیں کہ احسن پہلے خواجہ محمد یونس خاں سے متوسل تھے۔ پھر نواب وزیر مرحوم (نواب شجاع الدولہ) کے دربار میں ملازم ہو گئے۔ آج نواب سرفراز الدولہ مرزا احسن رضا خاں بہادر کی سرکار میں ممتاز ہیں۔ سید میر حسن نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے کہ آج نواب شجاع الدولہ کی سرکار میں ملازم ہیں۔ مصحفی نے نواب آصف الدولہ کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ جب کہ شیفتہ لکھتے ہیں کہ وہ نواب آصف الدولہ کے دربار میں پیشہ شاعری پر ملازم تھے۔ نسخہ نے بھی یہی لکھا ہے۔ ممکن

۱۔ بزم سخن، ص ۱۰۱

۲۔ تذکرہ ضیفؒ، ص ۱۳

۳۔ تذکرہ ہندی، ص ۱۷

۴۔ تذکرہ شعرائے اردو، ص

۵۔ گلشن بے غار، ص ۲۱

ہے احسن بہت کم عرصے کے لیے نواب آصف الدولہ کے ملازم رہے ہوں۔ اس کا بھی امکان ہے کہ ان دونوں تذکرہ نگاروں کو غلط فہمی ہوئی ہو۔ کچھ تذکرہ نگار اُن کی خوش نویسی کی تعریف کرتے ہیں۔^۱ معاصر تذکرہ نگار اُن کے بہت مداح ہیں۔ کمال لکھتے ہیں کہ لکھنؤ میں مرزا احسن رضا خاں صاحب کے سرکار میں اُن سے اکثر ملاقات ہوتی تھی۔ وہ ”جوانِ جوش فکر و خوش خلق و خوش مزاج“ ہیں۔^۲ میر حسن انھیں ”خوش خلق اور نیک خو“ بتاتے ہیں۔^۳ مصحفی ان کی شعر گوئی کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ قوتِ شاعری چنانکہ شاعر را باید در قصیدہ وغیرہ پیدا کرد۔ چون فی الجملہ طالب علمی ہم دارِ شعر را بہ متانت و زانت تمام می گوید و احتیاطِ محاورہ و صحبتِ زبانِ بسیاری کند۔^۴ میر حسن لکھتے ہیں۔ ”قصیدہ و غزل خوب می گوید“ مصحفی نے ایک قصیدے میں ان کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

مرے شفیق ہیں اول جو میرزا احسن

کمال ساتھ متانت کے ہے انھوں کا کلام

کلیاتِ سودا کے مصطفائی نسخے میں ایک قصیدہ ہے جس کے مصنف کے بارے میں صرف یہ بتایا گیا ہے کہ وہ سودا کا ایک شاگرد ہے۔ قصیدے کا مطلع ہے۔

کیا حضرت سودا نے کی اے مصحفی تقصیر

کرتا ہے جو جو اس کی تو ہر صفحے میں تحریر

قاضی عبدالودود نے ثابت کیا ہے کہ اس قصیدے کے مصنف احسن ہی ہیں۔^۵ ان کے دیوان کا قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگالہ کے کتب خانے میں موجود ہے۔^۶

۱۔ مصحفی انھیں ”خوش تحریر“ لکھتے ہیں (تذکرہ ہندی، ص۔ ۱۷)۔ شیفہ لکھتے ہیں۔ ”بہ حسن خط وہ ہکوے بیان مشہور است۔“ (گلشنِ بے خار، ص۔ ۲۱) مزید ملاحظہ ہو۔ عمدہ منتخبہ، ص۔ ۵۶، تذکرہ شعراے اردو، ص۔ ۱۶

۲۔ مجموعہ الانتخاب، ورق ۲۶ ب

۳۔ تذکرہ شعراے اردو، ص۔ ۱۶

۴۔ تذکرہ ہندی، ص۔ ۱۷

۵۔ تذکرہ شعراے اردو، ص۔ ۱۶

۶۔ اردو ادب، اکتوبر ۱۹۵۰ء ص۔ ۱۷۹ جے ایضاً

نمونہ کلام:

الٹا سحر صبا نے جو گوشہ نقاب کا
دیکھ اس کو رنگ زرد ہوا آفتاب کا

.....
کل طلب میں سے کی یوں ہم یار منہ کھولے رہے
نزع میں پانی کو جوں بیمار منہ کھولے رہے
دل کو خواہش ہے یہ کس کے تیر کی یارب کہ اب
شکل پیکاں ہو کے جوں سو فار منہ کھولے رہے
سخت مشکل ہے وہ خوگر منہ پہ رکھنے سے نقاب
اور چاہیں چشم یہ دل دار منہ کھولے رہے
جام سے ساقی کے آگے لائے جوں مجلس کے بیچ
غیروں کو پیہم دیے اور یار منہ کھولے رہے
اکثروں نے پی اور اکثر قطرے کو ترسائیے
لڑھ گئے دو چار اور دو چار منہ کھولے رہے
خون احسن کا نہ چائے جب تلک کب ہو نیام
اژد ہے کی طرح وہ تلواریں منہ کھولے رہے

.....
دھمکائیے جا اُن کو جو مرگ سے ڈرتے ہیں
ہم ہیں ترے پروانے جی دینے پہ مرتے ہیں
تم غیر کے ہاتھوں سے واں جام چڑھاتے ہو

یاں حلق میں لوہو کے سوکھونٹ اترتے ہیں
 ہو دست پہ سر ظالم کب لیں ہیں مرا مجرا
 سوناز سے ہاتھ اپنا لگ سینے پہ دھرتے ہیں
 کھلتے ہیں اسیروں کے صد عقدہ غم دل سے
 تجھ کھڑے پہ زلفوں کے جب بال بکھرتے ہیں
 پھر فصل بہار آئی جو ہوئے سو ہو احسن
 مغ پاس گر و ہم بھی دستار کو دھرتے ہیں

.....
 کہا جو میں نے کہ زخ کو ترے قمر نہ لگا
 بگڑ کے بولا کہ چل بے ادھر نظر نہ لگا
 رہی جو تن میں مرے جان اک رتق باقی
 لگا کہ زخم کہا حیف کارگر نہ لگا
 اسی لیے تو میں تجھ سے خفا ہوں اے احسن
 گھڑی گھڑی مرے پاؤں کو چشم پر نہ لگا

.....
 ہوس لے آئی تھی، اس جنگ جو کے پاس مجھے
 نگہ لڑی تو رہے پھر نہ کچھ حواس مجھے

.....
 ہجر میں کیوں کر نہ ہوئے آہ و زاری بیشتر
 ہے قرار اس دل میں کم اور بے قراری بیشتر
 روز ہجراں ہی میں تنہا کچھ نہیں روئے ہیں ہم

النا سحر صبا نے جو گوشہ نقاب کا
دیکھ اس کو رنگ زرد ہوا آفتاب کا

کل طلب میں سے کی یوں ہم یار منہ کھولے رہے
نزع میں پانی کو جوں پیار منہ کھولے رہے
دل کو خواہش ہے یہ کس کے تیر کی یارب کہ اب
شکل پیکال ہو کے جوں سو فار منہ کھولے رہے
سخت مشکل ہے وہ خوگر منہ پہ رکھنے سے نقاب
اور چاہیں چشم یہ دل دار منہ کھولے رہے
جام سے ساقی کے آگے لائے جوں مجلس کے بیچ
غیروں کو پیہم دیے اور یار منہ کھولے رہے
اکثروں نے پی اور اکثر قطرے کو ترسا کیے
لڑھ گئے دو چار اور دو چار منہ کھولے رہے
خون احسن کا نہ چائے جب تلک کب ہو نیام
اثر ہے کی طرح وہ تلوار منہ کھولے رہے

دھمکائیے جا اُن کو جو مرگ سے ڈرتے ہیں
ہم ہیں ترے پروانے جی دینے پہ مرتے ہیں
تم غیر کے ہاتھوں سے داں جام چڑھاتے ہو

یاں حلق میں لوہو کے سوگھونٹ اترتے ہیں
 ہو دست پہ سر ظالم کب لیں ہیں مرا مجرا
 سوناز سے ہاتھ اپنا ٹک سینے پہ دھرتے ہیں
 کھلتے ہیں اسیروں کے صد عقدہ غم دل سے
 تجھ مکھڑے پہ زلفوں کے جب بال بکھرتے ہیں
 پھر فصل بہار آئی جو ہوئے سو ہو احسن
 مخ پاس گر وہم بھی دستار کو دھرتے ہیں

.....
 کہا جو میں نے کہ رخ کو ترے قرنہ لگا
 بگڑ کے بولا کہ چل بے ادھر نظر نہ لگا
 رہی جو تن میں مرے جان اک رتق باقی
 لگا کہ زخم کہا حیف کارگر نہ لگا
 اسی لیے تو میں تجھ سے خفا ہوں اے احسن
 گھڑی گھڑی مرے پاؤں کو چشم پر نہ لگا

.....
 ہوس لے آئی تھی، اس جنگ جو کے پاس مجھے
 نگہ لڑی تو رہے پھر نہ کچھ حواس مجھے

.....
 ہجر میں کیوں کر نہ ہوئے آہ و زاری بیشتر
 ہے قرار اس دل میں کم اور بے قراری بیشتر
 روز ہجراں ہی میں تھا کچھ نہیں روئے ہیں ہم

الٹا سحر صبا نے جو گوشہ نقاب کا
دیکھ اس کو رنگ زرد ہوا آفتاب کا

.....
کل طلب میں سے کی یوں ہم یار منہ کھولے رہے
نزع میں پانی کو جوں بیمار منہ کھولے رہے
دل کو خواہش ہے یہ کس کے تیر کی یارب کہ اب
شکل پیکاں ہو کے جوں سو فار منہ کھولے رہے
سخت مشکل ہے وہ خوگر منہ پہ رکھنے سے نقاب
اور چاہیں چشم یہ دل دار منہ کھولے رہے
جام سے ساقی کے آگے لائے جوں مجلس کے بیچ
غیروں کو پیہم دیے اور یار منہ کھولے رہے
اکثر دلوں نے پی اور اکثر قطرے کو ترسائیے
لڑھ گئے دو چار اور دو چار منہ کھولے رہے
خون احسن کا نہ چائے جب تلک کب ہو نیام
اژد ہے کی طرح وہ تلوار منہ کھولے رہے

.....
دھمکائیے جا اُن کو جو مرگ سے ڈرتے ہیں
ہم ہیں ترے پروانے جی دینے پہ مرتے ہیں
تم غیر کے ہاتھوں سے واں جام چڑھاتے ہو

یاں حلق میں لوہو کے سوگھونٹ اترتے ہیں
 ہو دست پہ سرخالم کب لیں ہیں مرا مجرا
 سوناز سے ہاتھ اپنا ٹک سینے پہ دھرتے ہیں
 کھلتے ہیں اسیروں کے صد عقدہ غم دل سے
 تجھ مکھڑے پہ زلفوں کے جب بال بکھرتے ہیں
 پھر فصل بہار آئی جو ہوئے سو ہو احسن
 منہ پاس گر وہم بھی دستار کو دھرتے ہیں

.....
 کہا جو میں نے کہ رُخ کو ترے قرینہ لگا
 بگڑ کے بولا کہ چل بے ادھر نظر نہ لگا
 رہی جوتن میں مرے جان اک رتق باقی
 لگا کہ زخم کہا حیف کارگر نہ لگا
 اسی لیے تو میں تجھ سے خفا ہوں اے احسن
 گھڑی گھڑی مرے پاؤں کو چشم پر نہ لگا

.....
 ہوں لے آئی تھی، اس جنگ جو کے پاس مجھے
 نگہ لڑی تو رہے پھر نہ کچھ حواس مجھے

.....
 ہجر میں کیوں کر نہ ہوئے آہ و زاری بیشتر
 ہے قرار اس دل میں کم اور بے قراری بیشتر
 روزِ ہجراں ہی میں تنہا کچھ نہیں روئے ہیں ہم

وصل کی راتیں کلیں یوں ہی ہماری بیشتر
 کیوں تفکر دین و دنیا دل ہمارا بھول جائے
 یاد رہتی ہے اس میں پیارے تمہاری بیشتر
 بیشتر تھی ہم کو اس سے دوستی اک طرح کی
 اب تو بتلا دے ہے تلوار و کناری بیشتر
 بن کے خاک اب اس کے کوچے سے بھلا کیوں کراٹھے
 ہے مزاج اپنے میں احسن خاکساری بیشتر

.....
 کل بوسے کے سوال پر کیا کیا نہ کہہ گیا
 میں اس کے آگے اپنا سامنہ لے کے رہ گیا

.....
 نہ نالہ ہے دل میں، نہ آہِ حزیں ہے
 کوئی دم ہے یاں، سو دم واپس ہے
 گئے دن جو آنکھوں سے بہتے تھے دریا
 ادھر دیکھ لو، خشک اب آستیں ہے
 گیا دل جو کہ کوچہ میں چیں جہیں کے
 نہ پھر واں سے نکلا، عجب سرزمین ہے
 قدم رکھ نہ اپنا مرے دل سے باہر
 کہا مان میرا، یہ گھر دل نشیں ہے
 نہ کھینچ آسمان پر سر اپنا تو احسن
 سمجھ آخرش سب کا مدفن زمیں ہے

یارو وہ صنم کیوں نہ کرے کام خدا کا
رام اُس کا خدا ہے تو میں رام خدا کا

دل ہو دیدار سے مایوس تو مسرور نہ ہو
چشم میں روشنی طور سے بھی نور نہیں
بزم میں اس کی جو ہوتی ہے کبھی سرگوشی
دل دھڑکتا ہے کہ میرا کہیں مذکور نہ ہو

اسد، میرامانی

میر حسنؔ اور عشقیؔ نے ایک شاعر میر اسد علی اسد شاگر د سودا کا ذکر کیا ہے۔ غالباً میرامانی اور میر اسد علی دونوں ایک ہی شاعر ہیں۔ کیوں کہ میر حسن اور عشقی دونوں نے اسد کی ایک جھو ”جھو گنجفہ“ کا ذکر کیا ہے۔ مصحفی نے میرامانی کے ترجمے میں اس جھو کی تعریف کی ہے۔ اکثر تذکرہ نگاران کا نام میرامانی ہی بتاتے ہیں۔ مصحفی لکھتے ہیں۔ ”اکثر شاہجہاں آباد میں فقیر (مصحفی) کے مشاعرے میں آتے تھے۔ شاہجہاں آباد کے رہنے والے تھے۔ بعض لوگ انہیں اکبر آباد کا بتاتے ہیں۔ ان کے ایک ہمسائے میر ذوالفقار علی سے معلوم ہوا کہ وہ عازم لکھنؤ ہوئے تھے کہ خود کو پورب پہنچادیں۔ چونکہ ان کی موت نے امان نہ دی، راستے میں سرانے بانکر موتو میں رات کے وقت چوروں کے ہاتھوں مارے گئے۔ ان کی عمر پچاس سال

۱۔ یہ اشعار تذکرہ شعرائے اردو، تذکرہ ہندی، عیار اشعراء (قلمی) مجموعہ الانتخاب (قلمی)، گلشن بے خارا اور گلشن ہند (علی لطف) سے لئے گئے۔

۲۔ تذکرہ شعرائے اردو، ص ۱۳

۳۔ تذکرہ عشقی (دو تذکرے)، ص ۵۶

۴۔ مثلاً مجموعہ نفوس (ص ۱، ص ۵۹)، تذکرہ ضیغم (ص ۳۵) طبقات اشعرائے ہند (ص ۶۴)، عیار اشعراء (ص

۱۵)، تذکرہ آزرده (ص ۴)، بزم سخن (ص ۱۲، ۱۳) وغیرہ۔

کے قریب ہوگی۔“ (فارسی سے ترجمہ) ذکا لکھتے ہیں کہ دہلی سے لکھنؤ جا رہے تھے کہ راستے میں رہزنوں کے ہاتھوں مارے گئے۔ لیکن ضیغم لکھتے ہیں ”اسد تخلص میرا مانی دہلی میں پیدا ہوئے۔ وہیں نشوونما پائی۔ مرزا رفیع سودا کے فن شعر میں شاگرد ہوئے تھے۔ دہلی کی تباہی کے بعد مرشد آباد پہنچے۔ وہیں انتقال کیا۔ مگر راقم تذکرہ ہذا کو ایک نام تمام بوسیدہ تذکرہ مولف سراپا خن کے والد کا لکھا ہوا مل گیا تھا۔ جس میں لکھا تھا کہ آپ ۱۲۰۸ھ سے قبل لکھنؤ کی راہ میں کسی مقام پر رہزنوں کے ہاتھ سے مارے گئے۔“ ۱

میر حسن نے لکھا ہے کہ ”حالات کی خرابی کی وجہ سے مرشد آباد چلے گئے۔“ ۲ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسد لکھنؤ پہنچنے سے پہلے مرشد آباد گئے۔ وہاں سے لکھنؤ آتے ہوئے مارے گئے۔ مرشد آباد سے دہلی آئے اور پھر دہلی سے لکھنؤ کے راستے میں قتل ہوئے۔ اسد کچھ عرصے نواب افضل خاں کے ملازم رہے تھے۔ یہی وہ اسد ہیں جن کا شعر ہے۔

اسد اس جفا پر بتوں سے وفا کی

مرے شیر شہابش رحمت خدا کی گئے

اور جس سے جل کر غالب نے اپنا تخلص اسد سے غالب کیا تھا۔ مصحفی ان کے بارے میں بڑی اچھی رائے رکھتے ہیں۔ لکھتے ہیں۔ ”جوانے بود ظریف مزاج و خندہ روے دیوانے ضخیم ترتیب دادہ، در قصائد و غزل و مثنوی ماہر خصوصاً مثنوی گنجفہ را بسیار بہ تلاش گفتہ ۵۔“ قاسم لکھتے ہیں۔ ”وے جوانے بود خوش طبع شیریں زباں بذلہ سنخ طیب بیاں خلعت و یار باش، خوش فکر پاکیزہ تلاش۔“ ۶

۱۔ تذکرہ ہندی، ص ۱۶

۲۔ تذکرہ ضیغم، ص ۴۵

۳۔ تذکرہ شعرائے اردو، ص ۱۳

۴۔ تذکرہ ہندی، ص ۱۶

۵۔ تذکرہ ہندی، ص ۱۶

۶۔ مجموعہ نثر، جلد ۱، ص ۵۹

کلام:

پی کر شراب درد تیر جام دے گیا
 وہ شوخ ہم کو بوسہ بہ پیغام دے گیا
 آیا جو میکشی کو چن میں وہ بادہ نوش
 ہر ایک گل کے ہاتھ میں اک جام دے گیا
 کل لڑ گیا کہ اور پہ عاشق ہے تو اسد
 آیا ہے جب وہ یاں تو اک الزام دے گیا

تھا بے خبر تو ہم سے ملے تھا وہ شوخ چشم
 آئینہ دیکھتے ہی کچھ آنکھیں بدل گیا
 جوں توں اسد کو لائے تھے اس کی گلی سے ہم
 خانہ خراب راہ میں آکر مچل گیا

مانے ہے کوئی وہ بہت گمراہ کسی کو
 گو آکے سفارش کرے اللہ کسی کو
 پروانے پڑے جلتے ہیں روتی ہیں کھڑی شمع
 یارب نہ شب وصل ہو کوتاہ کسی کی
 پھنس قید میں، گر چاہ میں ہو گرگ کا طمعہ
 جو چاہے اسد کر، پہ نہ کر چاہ کسی کی

آدم تو کیا کہ جن و ملک ہیں ترے اسیر
 مارا ہے دام زلف نے تیری جہان پر
 اس مہر و ش کے چہرے پہ چپک کے داغ سے
 دن کو ستارے رہنے لگے آسمان پر
 مت دیجو اپنے معصیٰ رخسار کی قسم
 رکھ جاوے گا ابھی کوئی ہاتھ اس قرآن پر

رقیب مونہہ لگے اور میں نہ کر سکوں پا بوس
 یہ کیا غضب ہے بس ایسا ہوں میں گیا گزرا
 یہ دوس لگی کہ نیستائیں جلتے ہے سر تا سر
 مگر اسد کوئی صحرا میں دل جلا گزرا

ہوں میں قربان ہر بہانے کے
 خوب ڈھب یاد ہیں نہ آنے کے
 کیا ہی رہتا ہے زلف سے برسر
 ہاتھ اب چوم لیجے شانے کو کے
 بر نہ آوے ترے سکوں سے اسد
 اتفاقات ہیں زمانے کے

بہگل، مرزا بھجوبیک

بہت غیر معروف شخصیت ہیں۔ دہلی کے رہنے والے اور سپاہی پیشہ تھے۔ اشپرنگرنے ذکر کے حوالے سے لکھا ہے کہ مغل نسل کے تھے اور ایک دیوان اُن سے یادگار ہے۔ قاسم ان کے بارے میں لکھتے ہیں ”..... سپاہی پیشہ بہ اندیشہ نیک ذات حمیدہ صفات بخش مطبوع و دلچسپ و کلامش مرغوب و الفت انگیز است۔“ کریم الدین نے تقریباً قاسم ہی کے الفاظ دہرا دیے ہیں۔

کلام:

نہ ہوتا گر کسو سے آشنا دل
تو کیا آرام سے رہتا مرا دل
اسے ہر وقت خواہاں کیوں نہ چاہیں
رکھے ہے آرسی کی سی صفا دل
خدا جانے ہوا کیا اس کو بہگل
ابھی تو تھا بھلا چنگا مرا دل

طرزِ سخن کو میرے کہتا ہے سن وفا سے
آتی ہے بولے الفت بہگل ترے سخن سے ۵

۱۔ یادگار شعرا، ص ۳۷

۲۔ مجموعہ نغز، ص ۱۰۶

۳۔ طبقات شعرا، ہند، ص ۱۵۵، ۱۵۶

۴۔ قاسم نے لکھا ہے بعض لوگ یہ غزل تاباں سے منسوب کرتے ہیں۔ (مجموعہ نغز، ص ۱۰۶)

۵۔ یہ اشعار عمدہ منتخبہ اور مجموعہ نغز سے لیے گئے۔

جرات، مرزا مغل

سرور نے ان کا تخلص جیل لکھا ہے۔ جو بظاہر کاتب کا سہو معلوم ہوتا ہے۔ یہ حمید الدین خاں نیچے کے صاحبزادے عبدالباقی خاں کے لڑکے تھے۔ قاسم ان کے بارے میں لکھتے ہیں۔ ”مردے بود بسیار قابل و نیک کردار نہایت خوشدل و شیریں گفتار تھے۔“ بریلی میں انتقال ہوا۔

کلام

بھلا تو مجھ سے تو کہہ کیا ہوا تجھے اے دل
جو اس طرح سے تو رہتا ہے میرے لال پڑا
نپٹ ہی آج پریشاں ہے حال سنبل کا
چمن پہ آہ یہ کس زلف کا وبال پڑا

.....
کیوں نہ ہو دیں جان و دل سے ہم ثارِ آئینہ
عکس ہے مکھڑے کا تیرے ہم کنارِ آئینہ
رو برو ہوتے ہی مفتوں کر لیا اس شوخ کو
دیکھو تک غور سے جرات تو کارِ آئینہ

.....
جوں برگِ گل جھڑے ہیں گلشن میں زیرِ گلبن

۱۔ عمدۃ المتجدد، ص ۲۰۹۔

۲۔ طبقات شعراء ہند، ص ۱۸۶۔

۳۔ مجموعہ نغز، ص ۱۶۶۔

۴۔ ایضاً اور سخن شعراء، ص ۱۰۱۔

لختِ جگر پڑے ہیں یوں آس پاس میرے
غیروں کا گرمیوں شکوہ یاروں کروں عبث ہے
سودشمنوں کا دشمن دل ہے یہ پاس میرے لے

جینا، جینا بیگم

بہت کم تذکروں میں ان کا ذکر ملتا ہے۔ یہ مرزا بابر کی صاحبزادی اور جہاندار شاہ کی محل
خاص تھیں لے ذکا اور قاسم نے اُن کے تلمذ کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ البتہ ابوالفضل محمد
عباس رفعت نے انہیں شاگردِ سودا لکھا ہے۔ لے

کلام:

یہ کس کی آتشِ غم نے جگر جلایا ہے
کہ تا فلک مرے شعلے نے سر اٹھایا ہے

ڈبڈبائی آنکھ آنسو تھم رہے
کاسے زگس میں جوں شبنم رہے

آیا نہ کبھی خواب میں بھی وصلِ میسر
کیا جایے کس ساعتِ بد آنکھ لگی تھی

۱۔ یہ اشعار مجموعہ نغمے لیے گئے ہیں۔

۲۔ مجموعہ نغمہ، ص ۱۷۸۔

۳۔ تذکرہ ماہور خشاں، ص ۱۳۔

نہ دل کو صبر نہ جی کو قرار رہتا ہے
تمہارے آنے کا نت انتظار رہتا ہے

یا الہی یہ کس سے کام پڑا
دل تڑپتا ہے صبح و شام پڑا

روٹھنے کا عبث بہانہ تھا
مدعا تم کو یاں نہ آتا تھا

حجام، عنایت اللہ

ان کا عرف کلو تھا۔ قاسم غالباً واحد تذکرہ نگار ہیں، جنہوں نے لکھا ہے کہ ”در مقطع ہر غزل پرورشِ تخلص می کند۔“ حالانکہ خود قاسم نے تقریباً گیارہ مقطع نقل کیے ہیں جن میں حجام تخلص ہے اور کوئی مقطع ایسا نہیں ہے جس میں پرورش باندھا گیا ہو۔ غالباً انہیں غلط فہمی ہوئی۔ حجام سہارنپور کے رہنے والے تھے۔ دہلی میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ میر حسن لکھتے ہیں کہ ”متصل مدرسہ غازی الدین خاں دکانِ سخن را گرم داشتہ شد۔“ غالباً میر حسن کا مطلب ہے کہ مدرسہ غازی الدین کے قریب رہتے تھے۔ یہ حجام پیشہ تھے۔ لیکن بقول مصحفی دوسرے موتر اشوں کی طرح یہ کبھی بازار میں گھومتے تھے اور نہ دکان پر بیٹھتے تھے۔ ہمیشہ خانہ نشین رہتے۔

۱۔ یہ اشعار مجموعہ نغز اور تذکرہ ماہ درخشاں سے لیے گئے۔

۲۔ عمدہ نتیجہ، ص۔ ۲۲۹۔ تذکرہ شورش (دو تذکرے) ص۔ ۲۱۷، عیار اشعار (ماہیکر و قلم)، ص۔ ۲۱۶

۳۔ مجموعہ نغز، ۱، ص۔ ۱۹۸

۴۔ تذکرہ کمال (قلبی) ورق ۲۵۳، ب۔ گلشن بے خار، ص۔ ۵۶

۵۔ تذکرہ شعراء اردو، ص۔ ۵۰

۶۔ تذکرہ ہندی، ص۔ ۷۷

اکثر تذکرہ نگاروں نے انہیں شاگرد سودا لکھا ہے۔ شاہ کمال نے سودا سے ان کے تلمذ کا کوئی ذکر نہیں کیا بلکہ لکھا ہے کہ میاں محمد قائم اور دوسرے شعرا کی صحبت میں تربیت پائی۔^۱

ہم عصر تذکرہ نگار اُن کے مداح ہیں۔ مصحفی لکھتے ہیں۔ ”چوں طبعش از ابتدا موزوں افتادہ بود با وجود کم علمی شعر ہندی را بخوبی سرانجام می دهد و معنی ہائے نازک تر از موزے می باید، چنانکہ در اکثر مشاعرہ ہا مورد تحسین و آفریں یاراں بودہ..... وضع و شریف شاہجہاں آباد اورا بسیار دوست می دارند“۔^۲ قاسم لکھتے ہیں ”..... اما در ویش نہاد صاحب شعور، بیشتر اوقات مشغول بہ حق می ماندہ و مثنوی مولوی معنوی علیہ الرحمۃ می خواند و مولہ سماع بود و وجدی فرمود“۔^۳

حجام مولانا محمد فرالدین کے مرید تھے۔ مصحفی لکھتے ہیں کہ حجام چھٹیوں کے دن یعنی سہ شنبہ اور جمعہ کو مولانا کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ ان کے خط کی اصلاح اور خضاب لگاتے۔ مولانا کی صحبت کا اثر ہے کہ حجام مشائخانہ لباس پہنتے ہیں۔ اسی لیے اہل محلہ انہیں شاہ جی کہتے ہیں۔^۴

قدرت اللہ شوق نے لکھا ہے کہ ”حجام مدت سے فرخ آباد میں مقیم ہیں۔“ میری نظر سے کوئی اور تذکرہ نہیں گزرا جس میں ان کے قیام فرخ آباد کا ذکر ہو۔ اس کے برعکس مصحفی جو ان سے آشنائی کے مدعی ہیں، لکھتے ہیں۔ ”ان کی عمر پینتیس سال سے اوپر ہوگی۔ چھ سال ہوئے شاہجہاں آباد میں وفات ہوئی“۔^۵

میں نے ایسا کوئی تذکرہ نہیں دیکھا۔ جس میں ان کے صاحب دیوان ہونے کا ذکر ہو۔ لیکن قاسم نے جس انداز سے شعر پیش کیے ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ دیوان سے انتخاب کیے گئے ہیں۔

۱۔ تذکرہ کمال (قلمی) ورق ۲۵۳

۲۔ تذکرہ ہندی، ص۔ ۷۷

۳۔ مجموعہ نغز، ۱، ص۔ ۱۹۷

۴۔ تذکرہ ہندی، ص۔ ۷۸

۵۔ ایضاً

کلام:

روز رخسار کے لیتا ہے مزے خواباں کے
بہتر اس سے کوئی حجام ہنر کیا ہوگا

.....
ہر دم نظر آتے ہیں نئے یار تمہارے
ہم جی چکے گر ہیں بھی اطوار تمہارے
ہے جی میں تمنا کہ اون آنکھوں سے یہ پوچھوں
بچتے نہیں کس واسطے پیار تمہارے
اک روز نصیبوں سے کہیں واں تیں پہنچوں
پھر سر ہے مرا اور در و دیوار تمہارے
اؤں کاوش مڑگاں کا گلہ ہم سے عبث ہے
اے آنکھ! یہ بولے ہوئے ہیں خار تمہارے
اس شوخ کے کوچے میں نہ جایا کرو حجام
جھین جائیں گے اک دن کہیں ہتھیار تمہارے

.....
حجام پڑا سخت حیا ناک سے پالا
کچھ اور تو کیا بات جو وہ منہ سے نکالے
لگ چلے جو اس شوخ سے رستے میں تو اے
جھنجھلا کے یہ کہتا ہے کہ چل دور رزائے

.....
کن سلوکوں سے ہم ان کے پاس اے ہدم گئے

وہ گئے ہم سے اور ان کے دل سے بس اب ہم گئے
ہے یہ زخمِ عشق اے حجام کب اچھا ہوا
واسطے ان کے عبث تم ڈھونڈنے مرہم گئے

فلک کے جور کے مارے ہوؤں سے یہ کوئی پوچھے
کہ ہوزیر زمیں بھی دکھ میں یا آرام کرتے ہو
رقیبوں پر میاں پڑتا ہے تب سو سو گھڑے پانی
بلا حجام کو جس روز تم حمام کرتے ہو

بھول اس کی گلی میں جا رہا تھا
کل مرنے میں مرے کیا رہا تھا

حسن، میر محمد حسن دہلوی

میر نے ان کا نام میر حسن لکھا ہے۔ انہیں نوکر پیشہ بتایا ہے اور لکھا ہے کہ اکثر میرے گھر پر
مشاعرے میں تشریف لاتے ہیں۔ گردیزی نے ان کا پورا نام میر محمد حسن دہلوی لکھا ہے
اور وہی دو مطلعے نقل کیے ہیں جو میر نے نکات الشعر میں دیے ہیں۔ عشقی اور نساخ نے بھی
ان کا ذکر کیا ہے۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ بہت غیر معروف شخصیت ہیں۔ مجھے ان دو شعروں
کے علاوہ اور کچھ نہیں ملا۔

لگتا ہے آج مجکو یہ سارا جہاں خراب

۱۔ یہ اشعار مجموعہ نفوس، تذکرہ ہندی اور عمدہ منتخب سے لیے گئے ہیں۔

۲۔ نکات الشعر، ص۔ ۱۳۵

۳۔ تذکرہ ریختہ گویان، ص۔ ۱۳۵

شاید کہ مر گیا ہے کوئی خانماں خراب
قاتل اگر کہے کہ سکتا ہی چھوڑیو
خنجر تو ایک دم کے لیے منہ نہ موڑیو

راقم، بندر ابن

اکثر تذکرہ نگاروں نے ان کا وطن دہلی بتایا ہے۔ لیکن شیفتہ لکھتے ہیں بعضے انہیں مٹھرا کا باشندہ لکھتے ہیں اور بعضے دہلی کا بتاتے ہیں۔ لیکن ان کا نام دیکھ کر یہی اندازہ ہوتا ہے کہ مٹھرا کے ہوں گے کیوں کہ وہاں نام اسی طرح رکھے جاتے ہیں۔

شیفتہ نے تلذذ کے متعلق بھی لکھا ہے کہ کسی نے انہیں مرزا مظہر کا شاگرد بتایا ہے اور کوئی شاگرد سودا لکھتا ہے۔ عبدالغفور نساج نے انہیں دونوں (یعنی مظہر و سودا) کا بتایا ہے۔ لیکن کچھ تذکرہ نگار انہیں تلمیذ سودا بتاتے ہیں۔ اس سلسلہ میں میر کی روایت ہے کہ مشق شعر مرزا رفیع سے کرتے ہیں۔ اس سے قبل فقیر (میر) سے بھی مشورہ کرتے تھے۔ بقول راقم محرر پیشہ تھے۔ اسی رعایت سے انہوں نے اپنا تخلص راقم رکھا تھا۔ میر حسن انہیں ذات کا کھتری بتاتے ہیں۔ عشقی نے لکھا ہے کہ وہ بہت کوتاہ قد تھے۔ میر حسن نے بھی یہی

۱۔ نکات اشعار، ص ۱۳۵

۲۔ گلشن بے خار، ص ۸۲، راقم نے ان کا وطن مٹھرا لکھا ہے۔ مخزن نکات، ص ۵۵

۳۔ گلشن بے خار، ص ۸۳

۴۔ سخن شعراء، ص ۱۷۹

۵۔ مثلاً چمنستان شعراء، ص ۵۱۲۔ تذکرہ گلزار ابراہیم مع تذکرہ گلشن ہند، ص ۱۳۷، عمدۃ بنتجہ، ص ۲۹۹ مجموعہ

نفر، ص ۲۶۳۔ تذکرہ شعراء اردو، ص ۷۳ وغیرہ۔

۶۔ نکات اشعار، ص ۱۳۳

۷۔ مخزن نکات، ص ۵۵

۸۔ تذکرہ شعراء اردو، ص ۷۳

۹۔ تذکرہ عشقی (دو تذکرے)، ص ۳۲۶

لکھا ہے کہ بسیار پست قد و بلند فکر است“ یہ اکثر تذکرہ نگاروں نے ان کی تعریف کی ہے۔ قائم لکھتے ہیں ”قوت حافظہ کمال کی ہے۔ سوشعروں کا قصیدہ ایک بار سن کر یاد کر لیتے ہیں اور اسے دہرانے میں تامل نہیں کرتے۔ شورش لکھتے ہیں۔ بسیار خوش فکر و خوش گو است، مضمون را بآئین شائستگی بند“۔ کلامش فصیح و بلیغ است“۔ یہ محسن کہنے پر پوری قدرت رکھتے تھے۔ قائم، میر حسن اور عشقی نے ان کی محسن گوئی کی تعریف کی ہے۔ لکھ صاحب دیوان تھے۔

کلام:

دل کنج قفس میں کر فریاد بہت رویا
ہننے کے تئیں گل کے کر یاد بہت رویا

اے تر سے چشم گریاں کم نہیں
موج دریا ہے کنج آستیں

قطعہ

مرگاں سے دل بچے تو کلڑے کرے ہے ابرو
یہ کہہ کے میں نے اُس سے جب دل کی داد چاہی
کہنے لگا کہ ترکش جس وقت ہوئے خالی
تکوار پھر نہ کھینچے تو کیا کرے سپاہی

۱۔ تذکرہ شعراے اردو، ص ۷۳

۲۔ مخزن نکات، ص ۵۵-۵۶

۳۔ تذکرہ شورش (دو تذکرے)، ص ۲۲۵

۴۔ مخزن نکات، ص ۵۶، تذکرہ شعراے اردو، ص ۷۳، تذکرہ عشقی (دو تذکرے)، ص ۲۲۶

۵۔ عیار اشعرا (مائیکرو فلم) ص ۱۷۰، اور مخزن شعرا، ص ۱۷۹

قطعہ

اے باغباں نہیں ترے گلشن سے کچھ غرض
عجوبہ قسم ہے چھینڑوں اگر برگ و بر کہیں
اتنا ہی چاہتا ہوں کہ میں اور عندلیب
آپس میں دردِ دل کہیں تک بیٹھ کر کہیں

پہنچا نہ آہ درد کو میرے کوئی طبیب
یارب عجب طرح کا کچھ آزار ہے مجھے

دیکھا نہ ہو جسے میں کوئی سرزمین نہیں
پر تنہم دل ہو سبز جہاں سو کہیں نہیں
سننے تھے ہم جہان میں اہل کرم کا ہاتھ
آیا جو دید میں تو کم از آستیں نہیں

مری بد شرایینوں سے کریں توبہ میکساراں
رہے وہ عمل کہ ہووے سب نجات یاراں
سنا کن نے حال میرا کہ جوں ابر وہ نہ رویا
رکھے ہے مگر یہ قصہ اثرِ دعائے باراں

بچوں ہوں میں اس پاس یہ دل نیم نگہ کو
اس پر بھی ستم ہے جو خریدار نہ ہووے

کام عاشقوں کا کچھ تجھے منظور ہی نہیں ہے
کہنے کو ہے یہ بات کہ مقدور ہی نہیں
کہتا تھا کون یہ کہ خوشی ہے جہاں کے بچ
اس بات کا تو یاں کہیں مذکور ہی نہیں

سننے ہیں ہم کہ ہوتی ہے جگ میں دوام صبح
ہوگی کبھی اے چرخ ہماری بھی شام صبح

معصیت میری بہت ہے کہ تری بخشش بیش
اپنی رحمت پہ نظر کر میرے عصیاں کو نہ دیکھ

صیاد کب تو چھوڑے گا مجھ کو قفس سے آہ
کھلے ہے میرے دل میں بہت خارخارباغ

رونے میں اس قدر تو جگر اے جگر نہ کر
دیکھا نہ تو نے کچھ کہ دل و دیدہ کیا ہوے

۱۔ اس مصرع پر میر حسن نے اعتراض کیا ہے کہ عین کے گرنے سے مصرع ناموزوں ہو جاتا ہے۔ اگر یہ مصرع اس طرح ہوتا اچھا ہے۔ ”میرا تو کام کچھ تجھے منظور ہی نہیں۔“ تذکرہ شعراے اردو، ص ۷۳۔

ٹامے کا مرے اس سے لے کر جواب پھرنا
 پر واسطے خدا کے قاصد شتاب پھرنا
 اک دے بھی دن تھے یارب جو تھا ہمیں میٹر
 گلشن میں ساتھ اس کے پیتے شراب پھرنا

کچے کیا دردِ دل بلبل گلوں سے
 اڑا دیتے ہیں اس کی بات ہنس کر
 جو چاہے گوہر مقصود اے دل
 صدف کی طرح تو پاسِ نفس کر

یاں تک قبول خاطر کیجیے تری جفا کو
 تا سب کہیں کہ راقم رحمت تری وفا کو

دیکھا میں رات جا کر احوال چشمِ راقم
 برسات کی اندھیری پتلی کی تھی سیاہی

جو کہ مائل ہے تیغِ ابرو کا
 تشنہ لب ہے وہ اپنے لہو کا
 تیرے اعضا میں تجھ کمر سے میاں
 فرق ہر گز نہیں سرِ مو کا

راقم ہوتا نہیں وہ ہم آغوش
کیوں کے ہو دور درد پہلو کا

ہے زلف میں تیری جاے عاشق
زنجیر ہے اور پاے عاشق

رضا، مرزا احسن رضاؒ

ان کا عرف میرزا جیونؒ تھا۔ والد کا نام مرزا جان تھا۔ بزرگ خوارزم سے ہندوستان آئے تھے۔ شاہ کمال ان سے ذاتی تعلقات کے مدعی تھے۔ وہ لکھتے ہیں۔ رضا شاہ جہاں آباد کے رہنے والے تھے۔ نواب شجاع الدولہ کے عہد سے لکھنؤ میں مقیم تھے۔ صاحب دیوان تھے اور بہت خوش فکر، انھوں نے اپنے ہاتھ سے لکھ کر اپنا دیوان مجھے دیا تھا۔ جو موجود ہے۔ مشق سخن مرزا سودا سے کرتے تھے۔ مجھ سے بہت اتحاد و ربط تھا۔ بچپن سے سالہا سال اس زمانے تک لکھنؤ میں ملاقات رہتی تھی۔ ہم ایک ساتھ رہتے تھے۔ میں انہیں لکھنؤ چھوڑ کر آیا ہوں۔ خدا انہیں سلامت رکھے۔ بعض تذکرہ نگار انہیں میر نظام الدین ممنون کا شاگرد بتاتے ہیں۔ سرور لکھتے ہیں کہ وہ پہلے میاں نصیر (غالباً شاہ نصیر) سے اصلاح لیتے

- ۱۔ یہ اشعار نکات اشعار، مخزن نکات، مجموعہ نثر اور تذکرہ شعراے اردو سے لیے گئے۔
- ۲۔ قاسم (مجموعہ نثر، ۱، ۲۷۰) کریم الدین (طبقات شعراے اردو، ص ۲۲۶) نے اُن کا نام مرزا احمد رضا لکھا ہے جو ٹھیک نہیں۔
- ۳۔ نسخ نے ان کا نام مرزا جیون لکھا ہے۔ سخن شعرا، ص ۱۸۵۔
- ۴۔ عمدہ منتخبہ (ص ۲۹۳) میں ان کے والد کا نام مرزا خان دیا گیا ہے۔ جو غالباً ہوکا تب ہے۔ کیوں کہ سخن شعرا (ص ۱۸۵) اور گلشن بے خار (ص ۸۶) میں مرزا جان دیا گیا ہے۔
- ۵۔ تذکرہ کمال (قلمی) ورق ۳۲۶۔
- ۶۔ گلشن بے خار، ص ۸۶، سخن شعرا، ص ۱۸۵۔

تھے۔ بعد میں ممنون کا تلمذ اختیار کر لیا۔

کلام:

یہ یقین ہے کہ اس کی موت آئی
جس کو ملتا ہے یار ہر جائی
ہجر کی رات کیوں کے گزرے گی
یہ تو ساتھ اپنے آفتیں لائی

جو اب یاں سے تشریف لے جائے گا
ہمیں بھی کبھی یاد فرمائیے گا
یہ دل ہل رہا ہے ترے ساتھ پیارے
بھلا کس طرح اس کو بہلائیے گا
چلا جب کہا میں نے کیا حال میرا
لگا کہنے تجھ کو بھی بلوائیے گا
وہ ہرچند روٹھا ہے پر اس کو پیارے
یہاں تک کسی طرح سے لائیے گا
رضا یہ زمیں ہے نہایت شکفتہ
غزل در غزل اس کو کہلائیے گا
ترے در سے پیارے اگر جائیے گا
بہت دل کے ہاتھوں سے دکھ پائیے گا

نہ کہیے کہ عاشق نہیں جان دیتے
 تماشا تمہیں یہ بھی دکھائیے گا
 ستانا کسی کا نہیں خوب ہرگز
 عزیزو یہ بات اس کو سمجھائیے گا
 سمجھتے ہو تم خوب غیروں سے ملنا
 کیے کو بہت اپنے پچھتائیے گا
 کبھی اے عزیزو قدم رنجہ کر کر
 اگر اس کے کوچے تلک جائیے گا
 رضا مرچلا ہے جدائی میں تیری
 مرا یہ پیام اس کو پہنچائیے گا

.....

ہر ایک دوست ہے تیرے لیے عدد میرا
 خدا کی یہ بھی ہے قدرت ہوا نہ تو میرا
 کیا تھا گریہ کہ تا کم ہو اس کی آتشِ قہر
 بھڑکنے اور لگا مجھ پہ شعلہ خو میرا
 ہو نفع مجھے اس میں کہ یا ہو دے خسارا
 اب ملک محبت کالیا میں نے اجارا
 چپکے ہے دُرِ گوشِ بے زلف ترا یوں
 جس طرح جھلک جائے کہیں ابر میں تارا
 صورت ترے بیمار کی اب ایسی ہوئی ہے
 کہتے ہیں اطبا نہیں تقدیر سے چارا

کس کام میں ہو آہ کہ ناکام ہیں مرتے
 پھر آئے ہو کیا جب کہ ہوا کام ہمارا
 اس مرگ کے صدقے کہ دم نزع وہ بولے
 لو کام کیا میرے یہ خنجر نے تمہارا
 منہ پر ترے قطرہ نہ عرق کا ہے چمکتا
 حیرت ہے کہ خورشید میں نکلا ہے ستارا

.....
 کیا کیا نہ برق چمکے ہے ہر ہر شرار سے
 نکلے ہیں شعلے ایسے دل داغ دار سے
 مانگے ہے تیری چشم مرادل، کروں ہوں نذر
 دھمکائے کیوں ہے غمزہ خنجر گزار سے
 دست جنوں قصور نہ کر یہ بھی ہیں گراں
 لپٹ رہ گئے ہیں میرے گریباں کے تار سے

.....
 دل میں حسرت رہ نہ جائے منہ دکھایا چاہیے
 ہے وداع جان اپنی اب تو آیا چاہیے
 بے طرح دل کو قلع ہے کوئی دم میں ہم چلے
 دوستو بیٹھے ہو کیا ان کو لایا چاہیے

.....
 ضعف سے ہم نہیں سنبھلتے ہیں
 لب ہلانے میں دم نکلتے ہیں

غیر سے گرم اختلاط ہیں وہ
 ہم یہ سنتے ہیں اور جلتے ہیں
 خانہ دل رہے نہ کیوں روشن
 داغ جیسے چراغ جلتے ہیں
 درد سے دل کے آہیں بھرتے ہیں
 نہ تو جیتے ہیں ہم نہ مرتے ہیں
 داغ دیں تازہ کیوں نہ لالہ رخاں
 نت نیا غیر گل کترتے ہیں!

شرف، شیخ شرف الدین حسین

سرور نے انہیں لکھنؤ کا باشندہ لکھا ہے۔^۱ لیکن شیفتہ^۲ اور نساخ^۳ نے انہیں دہلوی بتاتے ہیں۔ شیفتہ لکھتے ہیں قدم شریف کے راستے پر ان کا گھر تھا اور داروغلی کروڑہ ان سے متعلق تھی۔^۴ لیکن شاہ کمال لکھتے ہیں کہ غلام حسین خاں کروڑہ کے رشتہ داروں میں تھے۔ لکھنؤ میں فقیر سے بہت ملاقات ہوتی تھی۔^۵ ممکن ہے یہ دہلی کے رہنے والے ہوں اور بعد میں لکھنؤ چلے گئے ہوں۔ قاسم ان کے بارے میں لکھتے ہیں۔ جو انے است خلیق و خوش گو، محبت منش، نیک خو، گو نہ از علم بہرہ درو قد رے از چاشنی سخن با خبر اگر سلام و مرثیہ گوید، گا ہے بہ تکلیف اجبارش ہمت در میدان غزل گفتن پوئند“ یکے کمال اور نساخ نے انہیں شاگرد سودا لکھا ہے۔

۱۔ یہ اشعار تذکرہ ہندی اور عمدہ منتخبہ سے لیے گئے۔

۲۔ عمدہ منتخبہ، ص ۳۷۴

۳۔ گلشن بے خار، ص ۱۰۸

۴۔ سخن شعرا، ص ۲۳۵

۵۔ گلشن بے خار، ص ۱۰۸

۶۔ تذکرہ کمال (قلمی) ورق ۵۲۶ ب

۷۔ مجموعہ ملفوظات، ص ۳۳۱

کلام:

اب دن پھرے ہمارے یہ ہم پر عیاں ہوا
وہ مہ جہیں جو رات کو پھر مہرباں ہوا

ہمیں اس خاکساری پر بھی تو ناشاد مت کچھ
ہو اے ہجر سے ہم کو کبھی برباد مت کچھ

لوٹے چن میں گل کے خزاں یوں بہار حیف
اور عندلیب جیتی رہے تو ہزار حیف

مانند مرغ قبلہ نما گر چہ مضطرب
پھرتا ہوں اپنے گھر میں پہ عزت گزیدہ ہوں

شیدائے میر فتح علی

یہ سید زادے تھے۔ اکثر تذکرہ نگاروں نے انہیں شمس آباد منو کا بتایا ہے۔ مگر میر سوز نے انہیں متنبی کر لیا تھا۔ آصف الدولہ کے ہاں خاص سپاہیوں اور مصاحبوں میں شامل تھے۔ پانچ سو روپے تنخواہ ملتی تھی۔ میر حسن ان کے مداح ہیں لکھتے ہیں۔ ”جو انے بہ کمال اخلاق

۱۔ یہ اشعار عمدہ منتخبہ گلشن بے خار، مجموعہ نغز اور سخن شعرا سے لیے گئے۔

۲۔ مجموعہ نغز، ۱۱، ص ۳۵۶

۳۔ گلزار ابرار، ص ۱۶۵، سخن شعرا، ص ۲۶۳، عمدہ منتخبہ، ص ۳۷۲، ذخیرہ

۴۔ حیدر بخش حیدری، گلشن ہند (فونوٹیسٹ ملوکہ ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو) ص ۴۸

۵۔ مجموعہ نغز، ص ۳۵۶، نیز ملاحظہ ہو عیار اشعرا (قلمی) ۱۲۶، ب

متواضع، مؤدب“۔ یہ تذکرہ نگاروں نے ان کے کلام کی تعریف کی ہے۔ عشقی لکھتے ہیں۔
 ”کلامش از حالت یاس و سوز درونی خالی نیست“۔ یہ ابوالحسن امیرالدین لکھتے ہیں۔ ”طبع
 موزوں و دردمند دارد از کلامش بے دل سوزی و شیدائی می آید۔“ قاسم لکھتے ہیں۔ ”شعرش
 بہ غایت پختہ و با کیفیت است۔ دیوانش تا الیوم سہ ہزار بیت تحمیناً بر صفحہ روزگار ثبت
 افتادہ“۔ یہ فدوی سے ادبی معرکہ ان ہی کا ہوا تھا۔ جس کی تفصیل ہجو گوئی کے تحت بیان کر دی
 گئی ہے۔

کلام:

کیا دل پر اپنے سختی ایام کی کہوں میں
 سمجھا تھا جس کو شیشہ وہ سنگ ہو کے نکلا
 راہ طلب میں ماندا چل دو قدم ہوا یہ
 گویا کہ میں ہزاروں فرسنگ ہو کے نکلا

رکھ دل کو مرے اے مرے صیاد قفس میں
 ٹھہرے ہے کوئی مرغ ہو اگیر سردست

وہ صورتیں الہی کس ملک بستیاں ہیں
 اب دیکھنے کو جن کے آنکھیں ترستیاں ہیں

۱۔ تذکرہ شعرائے اردو، ص ۹۶۔

۲۔ تذکرہ عشقی (دو تذکرے) ص ۲۸۔

۳۔ تذکرہ مسرت افزا بحوالہ معاصر، حصہ ۷، ص ۱۱۵۔

۴۔ مجموعہ نغز، ص ۳۵۶۔

میں تو ملوں گا ناصحابا تمیں یہ تینوں جان کے
گو کہ عدو ہیں خو برودل کے جگر کے جان کے

عظیم، مرزا عظیم بیگ

میر حسن علی عشق^۱ اور علی ابراہیم خاں خلیل^۲ نے جس محمد عظیم کا ذکر کیا ہے۔ وہ غالباً یہی ہیں۔ قاسم ان کے بارے میں لکھتے ہیں۔ کابلی الاصل تھے اور دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔ بہت صاحب غیرت و عزت تھے۔ دوست نواز، دشمن گداز، مروت نہاد، فتوت بنیاد، محبت پرور، مودۃ گستر اور ظریف مزاج تھے^۳۔ مصحفی نے انہیں دہلی میں دیکھا تھا۔ انہوں نے لکھا ہے۔ کہتے ہیں ”چند روز فرخ آباد میں فقیری اختیار کر لی تھی۔ اب پھر دنیا دار ہو گئے ہیں۔ فقیر نے انہیں شاہجہاں آباد میں دیکھا تھا۔ چپک رو تھے۔ اکثر مشاعروں میں آتے اور صدر مجلس پر بیٹھتے۔۔۔۔۔ سپاہی پیشہ تھے۔ قاسم نے لکھا ہے کہ عظیم ابتدا میں حاتم سے اصلاح لیتے تھے۔ پھر کچھ عرصہ کے لیے خواجہ میر درد کے شاگرد رہے۔ آخر میں سودا کا تلمذ اختیار کیا۔^۴ کچھ تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ بہت بر خود غلط آدمی تھے^۵۔ لیکن اکثر تذکرہ نگاروں نے عظیم کے فن شاعری کی بھی بہت تعریف کی ہے۔ سرور لکھتے ہیں۔ ”الحق کہ معانی باریک

۱۔ یہ اشعار مجموعہ ”نغز اور تذکرہ شعراے اردو سے لیے گئے۔ آخری دو مطبعہ جن غزلوں کے ہیں وہ غلطی سے کلیات سودا میں شامل ہو گئی ہیں۔ ان کے اصل مصنف شیدا ہی ہیں۔

۲۔ تذکرہ شعراے اردو، ص ۱۰۹۔

۳۔ تذکرہ عشق (دو تذکرے) ص ۱۹۔

۴۔ گلزار ابراہیم، ص ۱۸۰۔

۵۔ مجموعہ نغز، ۲، ص ۱۔

۶۔ میر حسن نے محمد عظیم کے ترجمے میں لکھا ہے۔ ”مذتے در فرخ آباد پہاڑی درویشی بہ سر بردہ۔“ اس سے گمان ہوتا ہے کہ یہ دونوں عظیم ایک ہی ہیں اور ان کا اصل نام مرزا عظیم بیگ ہے۔

۷۔ تذکرہ ہندی، ص ۱۳۹۔

۸۔ مجموعہ نغز، ۲، ص ۲۔

۹۔ مثلاً تذکرہ ہندی، ص ۱۵۰۔ ۱۵۱، گلشن بے خار، ص ۱۳۶، عمدۃ منتخبہ، ص ۳۶۶ وغیرہ۔

و مضامین نازک در اشعار مندرج می کرد..... استادی زبان آو و خوش فکر زمان خود بود، قصائد که در حمد و نعت و منقبت از طبع رسا و موزون شده، پہلو بہ قصائد میرزا رفیع السودامی زند“ ۱۔ قاسم ان کے بہت مداح ہیں۔ لکھتے ہیں۔ ”شعرش چنگلی تمام دارد در خیال بندی و نازک خیالی خیلے ہنر پردازی ہا بروے کار آرد۔ دریں کار استوار ید طولی داشت و بیشتر بہ معانی بندی ہمت می گماشت اکثر غزل در غزل بہ تلاش لفظ و معنی تا سہ چار غزل می گفت و صنائع بدائع بسیار بکاری برد زور طبعش از قصائد ریحۃ طبع و قادش روشن می شود قصیدہ وے بے اغراق بہ قصیدہ سرآمد شعر اے فصاحت آما مرزا محمد رفیع سودامی ماند مختصر کلام دیوانے مختصر در نہایت جود و چنگلی بر صفحہ روزگار از و یادگار است“ ۲۔

یہی وہ عظیم بیگ ہیں جن کا انشاء اللہ خاں انشاء سے ادبی معرکہ ہوا تھا۔ جس کی تفصیل قاسم نے بیان کی ہے۔ مختصر رو داد یہ ہے کہ ایک دفعہ مرزا عظیم بیگ (جو بہت برخود غلط تھے) نے ایک غزل کہی۔ اتفاق سے بحر جز سے بحر رمل میں جا پڑے۔ عظیم اپنے دوست اور مخلص میر ماشاء اللہ (والد انشاء اللہ خاں) کے ہاں یہ غزل سنا رہے تھے۔ اتفاق سے انشاء اللہ خاں بھی وہاں موجود تھے۔ انہوں نے خوب تعریف و تحسین کی۔ دوبارہ پڑھوایا اور غزل یاد کر لی۔ جب امین الدولہ معین الملک ناصر جنگ بہادر عرف مرزا میڈو کے مشاعرے میں عظیم غزل پڑھ رہے تھے تو ان سے تقطیع کرنے کو کہا گیا۔ ظاہر ہے کہ بحر بدل گئی تھی۔ انشاء کا داؤ چل گیا تھا۔ اب جواباً انہوں نے ایک مخمس پڑھی جو عظیم کی جو میں تھی۔ پہلا بند یہ تھا۔

گر تو مشاعرے میں صبا آج کل چلے
کہو عظیم سے کہ ذرا وہ سنبھل چلے
اتنا بھی حد سے اپنی نہ باہر نکل چلے
پڑھنے کو شب جو یا غزل در غزل پڑھے چلے

بحر رجز میں ڈال کے بحر رمل چلے

۱۔ عمدۃ نتجہ، ص ۴۱۶ وغیرہ

۲۔ مجموعہ نغز، ۱، ص ۲۰۱۔

اس کے جواب میں عظیم نے بھی ایک محسوس کہی، جو قاسم نے پوری نقل کی ہے۔ جس کا ایک بند یہ ہے۔

موزونی و معانی میں پایا نہ تم نے فرق
تبدیل بحر سے ہوئے بحر خوشی میں غرق
روشن ہے مثل مہر یہ از غرب تا بہ شرق
شہ زور اپنے زور میں گرتا ہے مثل برق

وہ طفل کیا کرے گا جو گھٹنوں کے بل چلے
عظیم کی حمایت میں قاسم نے بھی انشاء کی جو کہی لیکن بقول قاسم یہ تو وہ مکاتھا جولائی کے
بعد یاد آتا ہے۔ نسخ لکھتے ہیں کہ بارہ سو اکیس ہجری میں ان کا انتقال ہوا۔
کلام:

کل چشم خوں فشاں سے گلزار پیرہن تھا
دامن کا تھا جو تختہ یک تختہ چمن تھا
کچھ عظیم کو بھی یارب غریب رحمت
آوارہ جنوں سا اک صاحبِ سخن تھا
اور معنی بند ایسا ہندی زباں کا صائب
ہندوستان سے لے کر مشہور تا دکن تھا
اک دن جو گھر سے نکلا خط شعاع آسا
بکھرا ہوا بدن پر ہر تار پیرہن تھا
دیکھا جو دفن کرتے جوں شمع پر ہو فانوس
تربت میں دور تن سے بالشت بھر کفن تھا

چوں شمع کب چھپے ہے مرے سوزِ جاں کی بات
 سر کاٹو تو گلے سے ہو روشن زباں کی بات
 بھر عمر تم نے سیدھی نہ اے مہرباں کی بات
 جب کی نہ کی تو کی ہے سدا ہم سے یاں کی بات
 ہر بات میں زالی ہے کچھ تیرے ہاں کی بات
 نکلی سوا نہیں نہ کبھی تجھ سے ہاں کی بات
 جوں تار ساز کب میں کہوں داستاں کی بات
 نکلے ہے اوس کے ہاتھوں یہ میری زباں کی بات
 پیدا کرے جو نام کوئی تو مٹے ہے کھوج
 عنقا کے جی سے پوچھیے نام و نشان کی بات
 ہوں سینہ چاک و چشم تر از بسکہ جوں قلم
 آتا ہے گریہ غیر کے سن کر بیاں کی بات
 بیضا ہوں سر لیے تری تقریر پر عظیم
 جوں شمع سر کے ہاتھ ہے میری زباں کی بات
 پلٹن چشم فرنگی زادہ دل پر باندھ کوٹ
 نت صفِ مرگاں کے سنگینیں چلا کرتی ہے چوٹ
 سر چڑھا جو رونے تیرے شانہ کو ہمت چھٹ کیا
 ہے بجا جو شیخ لے ہے یہ تری داڑھی کھسوٹ
 رس بھری آنکھیں تو مے نوشوں کی ہوتی ہیں عظیم
 چشمِ عاشق کا جو رس دیکھو تو ہے پانی کی پوٹ
 جوہر کے ہوتے دیکھ تہی دست ہے چنار

یعنی ہے یاں کمال پہ رکھنی نظر عبث
 کب سوزِ دل بجھے ہے نہ یہ چشم تر عبث
 چوں شمع پا بہ گل مجھے رو رو نہ کر عبث
 حیرت نے دی نہ فرصتِ نظارہ ایک پل
 جوں آئینہ میں چشمِ سراپا ہوں پر عبث
 جوں برق آکے پاؤں نہ رکھا کہ پھر گیا
 مجھ گرم رو کے مت ہو مقابل شرر عبث

جوں صبح چاک جیب سے ذرہ پھرے نہ آنکھ
 یاں ہے بہ شکل مہر نظر تار تار پر
 ابھرے ہے مثلِ شیشہ ساعت عبث فلک
 اتنا غرور کیجیے نہ مشتِ غبار پر
 فوارہ ساں بلند ہے جن کا کہ حوصلہ
 دریادلوں کو تنکے میں ماریں ہیں دھار پر
 پاسِ سخن یہی ہے یہاں اس کی شان پر
 مانند خامہ دے جو سر اپنا زبان پر
 باقی رہے گا ایک نہ قصہ جہان پر
 آگئے جو ہم بھی اپنی کبھو داستان پر
 غم میں ترے جو یو ہیں اڑالے پھریں گے خاک
 پہنچے گی کوئی دن میں زمیں آسمان پر
 چھاتی تو پڑ تھی اشک سے مایہ آئینہ

افشا کیا نہ چشم نے راز نہان پر
 لاکھوں ہی مردے یار نے یاں تو دیئے جلا
 عیسیٰ بھی داں دھرے ہی رہے آسمان پر
 پاپوس کو بھی یوں کوئی بیٹھے ہے منہ پیار
 رکھو سمجھ کے شمع قدم شمع دان پر
 تاثیر آہ کو غم پیری نہ ہو جو شرط
 ہو منحصر نہ تیر کا لگنا کمان پر
 گھر میں بھی اپنے آئینہ ساں منتظر ترا
 حیراں کھڑا رہوں ہوں سدا آستان پر
 نام آوری جہان میں ہے باعث کلک
 نازاں نہ جوں نگیں ہو تو نام و نشان پر
 جوں شانہ سینہ چاک ہوں لیکن سوائے شکر
 گزرا کبھی نہ شکوہ سر مو زبان پر
 تقریر سرگزشت نہ پوچھو کہ خامہ دار
 آتا ہے گریہ ہر سر حرف بیان پر

.....
 نگاہ یار سے ہو مست یوں ہشیار بیٹھے ہیں
 کہ جوں خورشید ننگے سر سر بازار بیٹھے ہیں
 دکھاوے کے گو سورنگ جوں قارورہ کیا حاصل
 ہم اس میناے گردوں پر تو مارے دھار بیٹھے ہیں
 طلب پر بوسے کے زلفیں لگیں بل کھا کے یوں کہنے

ہم اکثر ایسی باتیں سن کے مونہہ پر مار بیٹھے ہیں
 دماغ اب تو فلک پر ہے بتوں کا جو خدائی پر
 بہ شکل ماہ نو کھینچے ہوئے تلوار بیٹھے ہیں
 جگہ کرتی ہے خاک رہ میان شیشہ ساعت
 دلوں میں گھر بنانے کو سر بازار بیٹھے ہیں
 فلک غرے سے ہے سرکش تو اپنا سر فرو کب ہے
 اس اوندھی کھوپری پر مارے ہم بیزار بیٹھے ہیں

فدا، پچھی رام پنڈت

قاسم نے ان کا نام پچھی رام پنڈت اور شیفتہ نے پچھی رام اور ذکا کے سرور ۵۳ اور نساخ نے
 پچھی رام لکھا ہے۔ قاسم ان کے بارے میں لکھتے ہیں۔ طویل عرصے تک دہلی میں مقیم
 رہے۔ کچھ دن ہوئے لکھنؤ چلے گئے ہیں۔ عبدالرحمن خاں قندھاری جو نواب آصف الدولہ
 کے ملازم ہیں۔ ان کے ہاں وکالت کے عہدے پر فائز ہیں اور بانس بریلی میں متعین ہیں۔
 عہدگی سے زندگی کے دن گزار رہے ہیں۔ بکے ذکا ان کے بارے میں لکھتے ہیں۔ ”مرد قابل و
 زیرک است“

-
- ۱۔ یہ شعر مجموعہ نفز سے لیے گئے۔
 - ۲۔ مجموعہ نفز، ۲، ص۔ ۳۷
 - ۳۔ گلشن بے خار، ص۔ ۱۳۶
 - ۴۔ عیار اشعرا (مائیکرو فلم) ص۔ ۵۷۸
 - ۵۔ عمدہ نتخبہ، ص۔ ۴۸۸
 - ۶۔ سخن شعرا، ص۔ ۳۵۸
 - ۷۔ مجموعہ نفز، ۲۰، ص۔ ۱۳۶
 - ۸۔ عیار اشعرا (مائیکرو فلم) ص۔ ۵۷۸

گزشتہ حسن کا اب تک نشان باقی ہے
 نہ ہو فریفتہ کیوں کر کہ آن باقی ہے
 ہوا ہے قصۂ مجنوں اگرچہ شہر آشوب
 ہمارے عشق کی بھی داستان باقی ہے
 بہار حسن کی جاتی رہی اگر پیارے
 تری بلا سے کہ یہ عز و شان باقی ہے
 کہا جوان نے کہ میں دل تو کر چکا ہوں فدا
 یہ بولے ہنس کے ابھی تجھ میں جان باقی ہے

یک قطعہ بہشت ہے روئے زمین پر
 کشمیر جس کی سیر کے قائل زمین ہے

قائم، قیام الدین

قائم اردو کے اہم ترین شاعروں میں ہیں۔ ان کے متعلق اردو کے صاحبِ نظر اور دیدہ ور نقاد مولانا محمد حسین آزاد نے ٹھیک ہی لکھا ہے کہ ”ان کا دیوان ہر گز میر و مرزا کے دیوان سے نیچے نہیں رکھ سکتے۔ مگر کیا کیجیے کہ قبول عام کچھ اور شے ہے۔ شہرت نہ پائی“۔

قائم پر ہندوستان اور پاکستان میں دو اسکالروں نے کام کیا ہے جو زیرِ طبع ہے۔ ان کا دیوان ڈاکٹر خورشید الاسلام نے مرتب کر کے شائع کر دیا ہے۔ چونکہ قائم شاگردانِ سودا میں ہیں۔ اس لئے خانہ بے ی کے لئے مختصر حالات لکھ رہا ہوں۔

قائم نے مخزن نکات میں اپنا نام قیام الدین لکھا ہے۔ جبکہ اچھے خاصے تذکرہ نگاران کا نام محمد قائم بتاتے ہیں۔ احمد علی خاں یکتا لکھتے ہیں کہ ان کا اصل نام قیام الدین علی اور محمد قائم عرف تھا۔ لیکن امتیاز علی خاں عرچی اس کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ قائم کے والد کا نام محمد ہاشم اور دادا کا محمد اکرم تھا۔ اس لئے قائم کا نام محمد قائم ہوگا اور قیام الدین ان کا لقب ہے۔ جس کسی نے انہیں قیام الدین علی لکھا ہے وہ ان کے خاندان کے ناموں کی وضع سے واقف نہیں ہے۔

قائم چاند پور گینہ کے رہنے والے تھے۔ ہوش سنبھالتے ہی دہلی آ گئے۔ اور طویل عرصے تک یہیں رہے۔

قائم نے لکھا ہے آخر میں امر وہہ کے قاضی مقرر ہو گئے تھے۔ تذکرہ شعراے اردو کی تالیف کے وقت قائم سنبھل مراد آباد میں تھے۔ جیسا کہ میر حسن نے لکھا ہے۔ احمد یار خاں یکتا لکھتے ہیں کہ قائم نے نواب محمد یار خاں اور پھر ان کے لڑکے احمد یار خاں کی رفاقت میں کافی زمانہ گزارا۔ مصحفی کی قائم سے ملاقات نواب محمد یار خاں کے دربار میں ہوئی تھی۔ قائم ہی کے توسط سے مصحفی کی نواب تک رسائی ہوئی تھی اور انہیں کی وجہ سے مصحفی نے قصیدہ پڑھا تھا اور نواب کی ملازمت حاصل کی تھی۔ مصحفی لکھتے ہیں کہ عرصہ قلیل میں ہم دونوں میں بہت ربط و اتحاد ہو گیا۔ قائم کے پاس نواب کی غزلوں کے مسودے آتے تھے وہ قائم مصحفی کو اصلاح کے لئے دے دیا کرتے تھے۔ کٹھیر کی آبادی برہم ہو گئی۔ وہ نواب رہے نہ دربار۔ قائم نواب احمد یار خاں کے ملازم ہو کر رام پور آ گئے۔

۱۔ مخزن نکات، ص۔ ۷۷، اصل نام پر تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہوں: قائم چاند پوری، سعیدی، نگار (اگست ۱۹۲۸ء) حضرت قائم چاند پوری، راز چاند پوری، زمانہ (جولائی ۱۹۲۹ء) اور قائم چاند پوری، پنڈت پدم سنگھ شرما، مترجمہ مسودہ حیات، نقوش (مئی ۱۹۶۱ء)

۲۔ تذکرہ مسرت افزا، بحوالہ معاصر، ص۔ ۷۷، ۱۷۱، نکات اشعار، ص۔ ۱۲۲، تذکرہ ریختہ گویان، ص۔ ۱۲۳، چمنستان شعرا، ص۔ ۵۰۱، تذکرہ شورش (دو تذکرے) ص۔ ۱۴۳، بعض تذکرہ نگاروں نے شیخ محمد قائم لکھا ہے۔ مثلاً تذکرہ مشتقی (دو تذکرے) ص۔ ۱۴۵، گلزار ابراہیم، ص۔ ۱۹۱ وغیرہ

۳۔ دستور الفصاحت، ص۔ ۴۳، قائم (مجموعہ نغز، ص۔ ۸۲)، سرور (عمدہ منتخبہ، ص۔ ۳۹۷) نے قیام الدین علی لکھا ہے۔

۴۔ دستور الفصاحت، ص۔ ۴۳

۵۔ مخزن نکات، ص۔ ۷۷

قاسم نے لکھا ہے کہ وہ پہلے ہدایت اللہ ہدایت کے شاگرد تھے۔ کسی بات پر بگڑی۔ ان سے تعلق ختم کر لیا اور ان کی شان میں ایک ہجو یہ قطعہ کہا۔

شاعری کا اسے آیا ہے بہت سا غزا
جو یہ کہتا ہے وہ استادِ زماں سنتے ہو
امر ہووے تو ہدایت کو کروں میں سیدھا
واں سے ارشاد ہوا یوں کہ میاں سنتے ہو
راست ہوتے ہیں کسی سے بھی کہیں کج طینت
تیر ہوتی ہے کہیں شاخِ کماں سنتے ہو
کچھ دن قائم خواجہ میر درد کے شاگرد رہے اور آخر میں مرزا محمد رفیع سودا کا تلمذ اختیار کر لیا۔
میرزا علی لطفؒ، شیفتہؒ، امیر مینائیؒ اور حافظ احمد علی خاں شوقؒ نے ان کا سالِ وفات
۱۲۱۰ھ لکھا ہے۔ لیکن جرأت نے ان کی جو تاریخِ وفات کہی تھی، اس سے ۱۲۰۸ھ نکلتا ہے۔
جرأت نے یہی رو کے تاریخِ وفات، یکنائی کے ساتھ
قائم بنیاد شعر ہندی نہ رہی، کیا کہئے اب آہؒ

قربان، میر جیون

غیر معروف شاعر تھے۔ بہت کم تذکرہ نگاروں نے ان کا ذکر کیا ہے۔ بظاہر اس کی وجہ یہ

۱۔ مجموعہ نغز، ص ۲، ص ۸۲-۸۳

۲۔ گلشنِ ہند، ص ۱۳۳

۳۔ گلشنِ بے خار، ص ۱۵۳

۴۔ امیر مینائی، انتخابِ یادگار، ص ۳۰۱

۵۔ حافظ احمد علی خاں شوق، تذکرہ کالملاں راجپور، دہلی، ۱۹۲۹ء، ص ۳۲۶

۶۔ مخزنِ نکات، ص ۴

معلوم ہوتی ہے کہ بیس سال کی عمر میں ہی ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ غالباً میر حسن واحد تذکرہ نگار ہیں جنہوں نے ان کے حالات قدرے تفصیل سے لکھے ہیں۔ ”بیس سالہ نوجوان تھے۔ سپاہی پیشہ تھے۔ اس عمر میں بہت اچھے شعر کہتے تھے۔ ایک روز فیض آباد میں فرنگیوں کی فوج صف کشیدہ جا رہی تھی۔ یہ قسمت کا مارا اپنے ایک دوست کے ساتھ درمیان میں آ گیا۔ ان کتوں نے اپنی عادت کے مطابق شور و غل کیا اور برا بھلا کہا۔ ہر چند بلائے ناگہانی میں گرفتار ان لوگوں (قربان اور ان کے دوست) نے عجز و انکسار کیا معافی مانگی اور کہا کہ ہم نادانستہ اس جال میں پھنس گئے ہیں۔ راستہ دے دو لیکن ان مغروروں نے قطعی پر دانہ کی۔ اور گالیاں دیں۔ بہت رڈ و بدل کے بعد شرم و غیرت کی وجہ سے خود کو قسمت کے حوالے کر کے تلوار سنبھال لی۔ آخر ایک زخمی ہوا اور یہ نوجوان ان کا فران سنگ دل کے ہاتھوں شہید ہوا۔ آفریں ہے اس کی ہمت مردانہ پر کہ عزت و آبرو پر اپنی جان قربان کر دی۔ خدا اس کو بخشے۔“

کریم الدین نے لکھا ہے کہ ”یہ شاعر اس لڑائی میں جو انگریزوں سے فیض آباد میں ہوئی تھی دادِ شجاعت دے کر فوت ہوا“ لیکن میر حسن کا بیان زیادہ قرین قیاس ہے۔

کلام:

یوں بندِ قبا کھل گئے جو آن میں گل کے
کیا پھونک دیا تو نے صبا کان میں گل کے
کیا کچھ دلِ بلبل پہ کرے دیکھے یہ عشق
سو چاک دیئے جس نے گریبان میں گل کے

۱۔ تذکرہ شعراے اردو، ص ۱۳۵

۲۔ طبقات شعراے ہند، ص ۱۶۰

۳۔ میر حسن (ص ۱۳۶) اور عشقی (دو تذکرے، ص ۱۵۷) نے یہی دو شعر دیے ہیں۔

لطف، مرزا علی

یہ اردو شاعروں کے تذکرے گلشن ہند کے مولف ہیں۔ تذکرے میں اپنے حالات بہت مختصر بیان کیے ہیں۔ لکھتے ہیں۔ ”اسم گرامی والد بزرگوار کا اس خاکسار کے کاظم بیگ خاں ہے۔ متوطن اسطر آباد (ایران) شجاعت بنیاد کے ہیں۔ ۱۱۵۴ھ گیارہ سو چوں ہجری میں نادر شاہ کے ساتھ شاہجہاں آباد میں تشریف لائے اور ابوالمنصور خاں صفدر جنگ کی وساطت سے، کہ آپس میں معرفت ولایت کی تھی، مصدر عنایات بادشاہی ہوئے..... فارسی غزل کے کہنے میں حضرت کوید طوٹی تھا اور ہجری تخلص آپ کا تھا“۔

سرور نے لکھا ہے کہ لطف دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔ شیفۃ بتاتے ہیں کہ ان کی نشوونما دہلی میں ہوئی تھی۔

بعض تذکرہ نگاروں نے انھیں ساکن لکھنؤ لکھا ہے۔ یہ پتا نہیں وہ کب لکھنؤ پہنچے۔ عشقی کے بیان سے پتا چلتا ہے کہ یہ لکھنؤ سے مرشد آباد گئے۔ وہاں کچھ دن رہ کر کھلتے گئے اور پھر لکھنؤ واپس آ گئے۔ لیکن شیفۃ لکھتے ہیں کہ عظیم آباد کے نواح سے حیدر آباد گئے۔

لطف نے گلشن ہند میں اپنے تلمذ کے بارے میں لکھا ہے۔ ”اصلاح فارسی کی اس ہچمدان کو آپ (کاظم بیگ خاں والد لطف) ہی کی جناب سے ہے اور مشورہ ریختہ کا فقط اپنی ہی طبع ناصواب سے“۔ لیکن یہ بات درست نہیں معلوم ہوتی۔ کیوں کہ اکثر تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ انھیں مرزا رفیع سودا سے تلمذ تھا۔

- ۱۔ گلشن ہند، ص ۱۳۶-۱۳۷
- ۲۔ مجموعہ منتخب، ص ۵۵۰
- ۳۔ گلشن بے خار، ص ۱۶۷
- ۴۔ مجموعہ نفیس، ص ۱۳۸، تذکرہ عشقی (دو تذکرے) ص ۱۷۷، عیار اشعرا (مائیکرو فلم)، ص ۶۳۷
- ۵۔ تذکرہ عشقی (دو تذکرے)، ص ۱۷۷
- ۶۔ گلشن بے خار، ص ۱۶۷
- ۷۔ گلشن ہند، ص ۱۳۷
- ۸۔ مجموعہ نفیس، ص ۱۳۸، سخن شعراء، ص ۴۰۵، تذکرہ عشقی (دو تذکرے) ص ۱۷۷، عیار اشعرا (مائیکرو فلم) ص ۶۳۷، طباق سخن (بحوالہ یادگار شعراء، ص ۱۷۱) انتخاب یادگار، ص ۲۲۸ وغیرہ

صحفی انھیں شاگرد سودا نہیں مانتے۔ انھوں نے لکھا ہے۔ ”مثنوی آبدار بہ سلک نظم کشیدہ او
حجت بر قول مولف است و ازیں جہت خود بہ شاگردی مرزا معتمدی کند“۔ یہ شیفہ نے انھیں
شاگرد میر تقی میر لکھا ہے۔ جو ٹھیک نہیں ہے۔ مولوی عبدالغفور ناسخ نے شیفہ کے اس بیان
کی تردید کی ہے۔

امکان یہ ہے کہ مرزا علی لطف کو سودا سے تلمذ تھا۔ لیکن بعد میں اُن کی شاگردی سے وہ منکر
ہو گئے۔

کلام:

پاس ناموسِ محبت فرض ہے پروانہ وار
شعِ ساں سوزِ شبِ ہجراں زباں پر لائیں کیا
بلبلِ وگل میں جوشِ سروِ قری میں یہ ربط
گلستانِ دہر میں وہ پھر دل کے تئیں الجھائیں کیا
غیرِ لبریزِ شکایت ہے مری جانب سے آج
سُن کے میرے قد رواں اب دیکھیے فرمائیں کیا
سننے تھے طوفانِ نوح آنکھوں سے دیکھا وہ تو لطف
دیکھیے یہ چشمِ گریاں اور اب دکھلائیں کیا

چمن کو کل جو تری سے کشی کا دھیان رہا
ہر ایک پات کے کھڑکے پہ گل کا کان رہا
رہا جو زندہ شبِ تیرہ فراق میں قیس

۱۔ تذکرہ ہندی، ص ۲۰۱۔

۲۔ گلشنِ بے خار، ص ۱۶۷۔

۳۔ سخنِ شعر، ص ۴۰۵۔

سیاہ خیمہ لیلیٰ کا اس کو دھیان رہا
 جو عمرِ خضر ہو شاہِ تو وصل ہوئے نصیب
 یہ زندگی جو تھی اس میں تو امتحان رہا
 نہ آنکھ بھر کے کبھو ڈرے ہم تو دیکھ سکے
 وہ سامنے بھی اگر اپنے ایک آن رہا

.....
 نہ کر اے بلبلِ ذل سوختہ صیاد کا شکوا
 کہ جاں بازوں کے دیں میں کفر ہے جلا د کا شکوا
 نہیں شیریں پہ کچھ موقوف یہ قسمت کی خوبی ہے
 زبانِ تیشہ سے کوئی سنے فرہاد کا شکوا
 میں اپنے سروِ قامت سے ہی کیا شاکی تھا گلشن میں
 تسلی ہو گئی قمری سے سن شمشاد کا شکوا
 نہ تنہا میں ہی اپنی خانہ ویرانی کا شاکی ہوں
 کرے ہے اک جہاں اُس خانماں آباد کا شکوا
 ترے کانوں تک بھی لطف کچھ آواز آتا ہے
 ہے اک عالم کو تیرے نالہ و فریاد کا شکوا

.....
 ایک دن حالِ دلِ زار نہ دیکھا نہ سنا
 سچ تو یہ تجھ سا بھی دلدار نہ دیکھا نہ سنا
 دیکھ کل نبضِ مری رو کے لگا کہنے طیب
 کبھی میں نے تو یہ آزار نہ دیکھا، نہ سنا

وہ مجھے تم نے دکھایا ہے کہ یعقوب نے جو
 کبھی اے دیدہ خوں بار نہ دیکھا نہ سنا
 لختِ دل کرتا ہے کیا کیا صفِ مرگاں پہ نمود
 اس جواں سا بھی نمودار نہ دیکھا نہ سنا
 چشم اور گوش زمانہ ہیں مقرر اس کے لطف
 ثانی حیدر کرآر نہ دیکھا نہ سنا

.....
 ہے اس شدت سے رنگینی کوئے یار کا چرچا
 کہ بھولا عنزیوں کو گل و گلزار کا چرچا
 ڈھکا رہ جائے اسرارِ محبت تو غنیمت ہے
 ہوا ہے اب حکیموں میں مرے آزار کا چرچا
 بہ رنگِ پیکرِ تصویر رہتا ہوں سدا ساکت
 ہے اس پر اس کی محفل میں مری گفتار کا چرچا
 ہمیں ہے یار کے چرچے سے یہ فرصت کہاں ہدم
 کہ اب دن رات بیٹھے کیجیے اغیار کا چرچا
 بیان دردِ دل کس لطف سے کرتے ہزار افسوس
 جو ہوتا بزم میں اس کی کبھی اشعار کا چرچا

.....
 زہے غفلت کہ ہم دنیا کو بزمِ عیش سمجھتے تھے
 کھلی چشمِ حقیقت ہیں تو کام اڑدھا نکلا
 نہ کر اے لطیف ناطق رہروانِ دہر سے حجت

یہی رشتہ تو کھا کر پھیر ہے ، کعبہ کو جانکا

یاروں نے یہ تو کیسے کیا کیا سمجھائیاں ہیں
 بے وجہ کچھ نہیں یہ ہم سے رکھائیاں ہیں
 میں کیا ہوں باختہ رنگ اُس شعلہ رو کے آگے
 مہتاب کے بھی منہ پر چھپتی ہوائیاں ہیں
 اک جوئے شیر بدلے اے آفریں ہے فرہاد
 کیا بے ستوں میں خون کی نہریں بہائیاں ہیں
 کب غنچہ دل اپنا دُشد صبا ہو تجھ سے
 گو سینکڑوں گلوں کی عقدہ کشائیاں ہیں
 طاقت حباب ساں اک نظارہ کی ملی ہے
 ان فرصتوں پہ ظالم یہ خود نمایاں ہیں
 کعبہ سے ہم نہ واقف نہ بتکدے سے آگاہ
 یاں آستانِ دل ہے اور جبہ سائیاں ہیں
 اس قد کا سرو سے ذکر چھوٹا منہ اور بڑی بات
 غنچے کے دل میں بے ڈھب باتیں سمائیاں ہیں
 اے لطف اس غزل پر کہنا بقول سودا
 یہ عاشقی نہیں ہے زور آزمائیاں ہیں

تم ہو بزمِ عیش ہے داں اور صحبت داریاں
 ہم ہیں کنجِ غم میں یاں اور جان سے بیزاریاں

تم کو سیر باغ و گلکش چمن کا واں ہے شوق
یاں بدن پر ہیں ہجوم داغ سے گل کاریاں
دھیان ہے آرائش زلف پریشاں کا تمہیں
یاد ہیں حالی پریشاں کی مرے کچھ خواریاں
تم صفائے ساعد و بازو دکھاتے ہو وہاں
ہم پہ یاں موئے بدن کرتے ہیں نشتر زاریاں
تم نے دکھائی وہاں پیٹ اور چوٹی کی پھین
یاں مری چھاتی پہ ہیں کالے نے لہریں ماریاں
نیک و بد دونوں سے یاں ہم نے تو آنکھیں موند لیں
تم وہاں پختون کی دکھاتے ہو جادو کاریاں
یاں برنگ پیکر تصویر ہم خاموش ہیں
گفتگو کی تم دکھاتے ہو وہاں طراریاں
قیقہ تم مارتے ہو واں باواز بلند
دشمنوں سے یاں چھپا کر ہم ہیں کرتے زاریاں
ہر مریض غم کی جاں بخشی کا ہے تم کو دھیاں
کھینچ گئیں یاں طول شدت سے مری بیماریاں
اضطراب دل سے بے پردہ ہوا یاں راز عشق
سو جھتی ہیں واں تمہیں ہر بات میں تہ داریاں
کس سے کس سے بات کچے بھولتے اک دم نہیں
ان بھلاؤں سے وہ باتوں میں تری عیاریاں

.....
کیوں دل پہ مرے جادو ان آنکھوں کا نہ ٹھن جائے
جس پر کہ پڑے آنکھ سو دیوانہ سا بن جائے

پلکیں وہ نکلیں کہ نظر جب پڑے ان پر
 سینہ میں یہ عالم ہو کلیجہ کا کہ چھن جائے
 بے چین بہت لطف کی ہے کل سے طبیعت
 اللہ کرے آج وہ روٹھا ہوا من جائے

.....

سب کنارہ گیر اپنے اور بیگانے ہوئے
 اب کی فصل گل میں ہم بے طرح دیوانے ہوئے
 شہر میں پایا نہ تیرے جور نے شہر کہ اب
 گھر بہ گھر ظالم مرے مذکور افسانے ہوئے
 بزم میں آیا جو شب وہ گل رخ خوں شمع سے
 بلبلوں کی طرح جی دینے کو پروانے ہوئے
 سنتے ہیں، کی محنت نے بیعت دست سب
 مژدہ سے نوشاں کہ پھر آباد میخانے ہوئے
 تو تو کس کا آشنا ہے ہاں مگر کہنے کو ہم
 آشنا ہو تجھ سے اک عالم سے بیگانے ہوئے

.....

ماہر و فخر، میر فخر الدین

سرورِ لہ اور نساخ نے لکھا ہے کہ یہ اشرف علی خاں فغاں کے صاحبزادے تھے۔ ان دونوں

۱۔ عمدۂ منتخبہ، ص ۷۱۰

۲۔ سخن شعراء، ص ۴۰۷، ذکا نے بھی اُن کے والد کا نام اشرف علی خاں فغاں لکھا ہے۔ عیار اشعرا (مائیکرو

فلم)، ص ۶۵۱

کو غلط نہیں ہوئی ہے۔ یہ اشرف علی خاں وہ بزرگ ہیں جن کے تذکرے پر سودا اور فاخر مکیں کا ادبی معرکہ ہوا تھا۔ ماہر کا فغاں سے کوئی تعلق نہیں۔ قاسم لکھتے ہیں کہ ابتدا میں یہ قلم تخلص کرتے تھے۔^۱ مصحفی ان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ مدتوں ماہر نے مرزا رفیع سودا کے دیوان کی کتابت کی ہے۔ چونکہ بزرگوں کی صحبت کا فیض ضائع نہیں ہوتا۔ خود بھی کچھ اشعار کہہ کر مرزا کی نظر سے گزارے ہیں۔ اسی لئے اکثر اوقات خود کو مصاحبان و مشیران مرزا سودا میں شمار کرتے ہیں اور فریہ کہتے ہیں کہ میں ہر وقت سودا کے ساتھ رہتا تھا۔^۲ مصحفی ماہر سے خوش نہیں ہیں۔ انہوں نے تذکرے میں ان کے کلام کے بارے میں رائے دیتے ہوئے لکھا ہے۔ ”طرفہ تراں کہ باوصف آگاہی فن اگر کلامش نگاہ کنی خالی از سخافت نیست، دریں جا میں مشکل بسیار بہ موقع بہ یاد آمدہ کہ دوران باخبر در حضور و نزدیکیان بے بصر دور“^۳ یہ ماہر نے سودا کی وفات پر قطعہ تاریخ لکھا تھا جو ان کے لوح قبر پر کندہ تھا۔ مصحفی نے اس تاریخ کی بھی مذمت کی ہے۔^۴ قاسم لکھتے ہیں کہ مرزا رفیع سودا نے سفارش کر کے انہیں نواب شجاع الدولہ کے ہاں ساٹھ روپے ماہوار پر ملازم رکھوا دیا تھا۔ آج کل بھی لکھنؤ میں سکونت پذیر ہیں۔^۵ ان کے دیوان کا قلمی نسخہ ڈاکٹر عندلیب شادانی کے پاس ہے اور بقول قاضی عبدالودود ”اس پر دیوان ہوس لکھا ہے اور مقطعوں میں بھی یہی تخلص ہے۔ ہوس اور ماہر ہم وزن نہیں اس لئے مقطعوں میں تبدیل تخلص کے لیے خاص محنت کرنا پڑی ہوگی۔ قرآن اس پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ کام کسی اور شخص نے کیا ہے۔ یہ پتا نہیں کہ اس کا سبب کیا ہے۔“^۶

کلام:

جو اس کے در پہ بیٹھے ہیں سمجھتے ہیں وہ در کس کا

- ۱۔ مجموعہ نغز، ۲، ص۔ ۱۵۳
- ۲۔ تذکرہ ہندی، ص۔ ۲۲۶
- ۳۔ ایضاً، ص۔ ۲۲۶-۲۲۷
- ۴۔ ایضاً، ص۔ ۱۲۶
- ۵۔ مجموعہ نغز، ۲، ص۔ ۱۵۳
- ۶۔ اردو ادب (اکتوبر ۱۹۵۰ء) ص۔ ۱۷۸

ہوے جو اس کے آوارے وہ کہتے ہیں کہ گھر کس کا
 ملی اتنی نہ فرصت بھی کہ اٹھ کر مانگتے پانی
 ہوا تیرنگہ یوں آہ دل میں کارگر کس کا

ہواؤ پڑ سکے جانے کا اس کے گھر کس کا
 فرشتہ پر نہ جہاں مارے واں گزر کس کا

جلا ہے سینے میں دل شمع وار ساری رات
 رہا ہے آنکھوں سے اشکوں کا تار ساری رات
 ہمارے سائے سے چونکے ہے وہ بیت وحشی
 رہے ہے غیر سے جا ہم کنار ساری رات

ہمیں خیر خواہ اپنا جانو نہ جانو
 کہیں گے بھلائی کی مانو نہ مانو
 ہوا کام ماہر کا تیرنگہ سے
 کہاں ابرو کو اپنی تانو نہ تانو

مونہ نہ موڑے گا یہ عاصی گر یہی منظور ہے
 لیجئے سنگ جفا اور شیشہ دل پھوڑیے

ہوا اس زلف کا کیوں بتلا دل
 بلا سے گر بلا میں پڑ گیا دل

محبذوب، غلام حیدر

ان کے حالات سودا کے سوانح کے تحت بیان کر دیئے گئے۔ یہاں صرف اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔
کلام:

چاہوں مدد کسی سے نہ اغیار کے لیے
میں بھی تو یار کم نہیں دوچار کے لیے
ہے درد سر ہی بلبل آزاد کی صفر
موزوں ہے نالہ مرغ گرفتار کے لیے
طوبیٰ کے نیچے بیٹھ کے روؤں گا زار زار
جنت میں تیرے سایہ دیوار کے لیے
محبذوب بہر سبھ ہے منت بھی شیخ سے
پھر برہمن سے عجز ہے زنار کے لیے

رکھے لگائے اس کو گر بس چلے ہمیشہ
دینے پہ دل کے کیجیے آرے بلے ہمیشہ
آتے ملے دلے ہو گھر سے کسی کے اس دم
پھیرا کیے چھری ہو میرے گلے ہمیشہ
محبذوب ان دنوں میں پھر روگ کچھ بسایا
رہتے تھے پیشتر تو اچھے بھلے ہمیشہ

چشم دوری میں تری یار یہ گریاں تھی رات

تھی شب ہجر مرے سر پہ کہ طوفاں تھی رات
 ناز اختر کو مرے تھا فلک ہفتم پر
 زلف سرکش جو تری تابع فرماں تھی رات
 کسی دشمن پہ خدا دن وہ نہ ڈالے جوں کل
 سر پہ مجذوب کے اے گبرو مسلمان تھی رات

عداوت سے تمہاری کچھ اگر ہووے تو میں جانوں
 بھلا تم زہر دے دیکھو اثر ہووے تو میں جانوں
 تمہارا ہم سے جو عہد وفا ہے اس کو تم جانو
 مرے پیماں میں کچھ نورِ دگر ہووے تو میں جانوں
 نہ اندیشہ کرو پیارے کہ شب ہے وصل کی تھوڑی
 تم اپنی زلف کو کھولو سحر ہووے تو میں جانوں

قاصد جو بتاتا ہے تو محبوب کی باتیں
 باور نہیں آتی ہیں اس اسلوب کی باتیں
 تجھ عشق میں رسوا میں ہوا یار جہاں میں
 کیا کیا نہ سنی ہم نے بد و خوب کی باتیں

چمن میں حسن ے جب وہ گلِ اندام لے آیا
 ادھر غنچہ صراحی اور ادھر گل جام لے آیا
 طیش سے مہر کی جب جل گئی اک خلق کو چہ میں

مہ نو وقتِ شام اس کو بہ پشتِ بام لے آیا
عجب قیمت ہے اپنے دل کی بازارِ محبت میں
جو کوئی صبح اس کو لے گیا تو شام لے آیا
گئے تھے ہم ترے کو سے ارادہ کر نہ آنے کا
گریباں کھینچ کر لیکن وفا کا نام لے آیا
میں کافر ہوں گا مجذوب اب کے شیخ کی ضد سے
بتوں کے پاس سے قاصد اگر پیغام لے آیا

.....
بد کہنے کو کسی کے معیوب جانتے ہیں
اپنے تئیں کو یارو ہم خوب جانتے ہیں
قاصد ہزار ڈھب سے باتیں بناوے یارو
ہم تو زباں کی اس کی اسلوب جانتے ہیں
خاطر میں کون لاوے میرا سخن کہ مجھ کو
سودا کا سن کے بیٹا مجذوب جانتے ہیں

.....
بتاں قربانی عشاق کی تمہید کرتے ہیں
لگا مہندی کو ہاتھوں میں یہ ظالم عید کرتے ہیں
طبیعت اس قدر بادی انھوں کی ہے کہ جب دیکھو
وضو کی شیخ جیو بیٹھے ہوئے تجدید کرتے ہیں

.....
جور و جفا پہ یار کی دل مت پگاہ کر

اپنی طرف سے ہووے جہاں تک نباہ کر
نام و نشان رہا نہ جہاں میں تو کیا ہوا
مثل نگلیں تو منہ کو نہ اپنے سیاہ کر

آوے بھی مسیحا مرے بالیں پہ تو کیا ہو
بیمار یہ ایسا تو نہیں جس کو شفا ہو
مہذب ترے عجز و تکبر سے ہوں نالاں
بندہ ہو کبھی بیٹھے ہے تو گاہِ خدا ہو

اے میرؔ سمجھو مت مہذب کو اوروں سا
ہے وہ خلفِ سودا اور اہلِ ہنر بھی ہےؔ

محبت، شیخ ولی اللہ

اکثر تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ یہ دہلی کے رہنے والے تھے۔ مگر خود محبت کا ایک شعر
ہے۔

محبتؔ ہندوستان زادوں کی گویائی کو کیا پہنچے
خن کہنے میں ہو جس کا وطن سرہند انبالہؔ
اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ محبتؔ انبالہ کے رہنے والے تھے اور غالباً بچپن میں دہلی آ گئے۔

۱۔ اشعار طبقات الشعراء (قلمی) مجموعہ نثر اور تذکرہ ہندی سے لیے گئے۔

۲۔ تذکرہ ہندی، ص۔ ۲۲۱۔ عمدۂ منتخبہ، ص۔ ۶۷۳، خن شعر، ص۔ ۶۱۵ وغیرہ

۳۔ محبت، حکیم سید احمد اللہ قادری، زمانہ (جولائی ۱۹۲۹ء)، ص۔ ۳۰

خوب چند ذکا لکھتے ہیں کہ شاہ افضل خدا نما معروف و مشہور بزرگ تھے۔ محبت ان کی اولاد میں ہیں۔ لعلیہ دہلی سے نکل کر فرخ آباد پہنچے۔ وہاں کچھ عرصے نواب مہرباں خاں رند کے ساتھ رہے۔ پھر لکھنؤ آ گئے۔ جہاں مرزا محمد سلیمان شکوہ کے دربار سے متوسل ہو گئے۔ یہ بقول مصحفی یہیں ”مرض مزمن ناسور پا“ میں مبتلا ہو کر وفات پائی۔ مصحفی نے یہ بھی لکھا ہے کہ ان کے انتقال کو دو سال ہوئے۔ تذکرہ ہندی ۱۲۰۹ھ کو پایہ اختتام کو پہنچا۔ جس کا مطلب ہے کہ لگ بھگ ۱۲۰۷ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ کریم الدین نے بھی ان کا سنہ وفات ۱۲۰۷ھ ہی لکھا ہے۔ پیر جلیل میں مدفون ہوئے ۵

کلام:

شاید کہ لکھا یوں تھا تقدیر الہی میں
عاشق کی رہے کشتی امواج تباہی میں
یوں دل کے سویدا میں روشن ہے تری صورت
جوں چشمہ حیاں کا ہے نور سیاہی میں
ہے مشرب رنداں میں بالفعل تو مے رائج
اس امر کو زاہد نے سمجھا ہے مناہی میں
معراج گدائی کا ہوتا نہیں کم ہرگز
پستی و بلندی ہے یاں افرشای میں
دریا میں حباب آسا کیا مظہر وحدت ہے
جو غرق سراپا ہے اسرار الہی میں

۱۔ عیار اشعرا (مائیکرو فلم) ہس۔ ۱۶۶۷ اور مجموعہ نغز، ۲، ۱۶۳۔

۲۔ تذکرہ عشقی (دو تذکرے) ہس ۱۲۳۵ اور تذکرہ شعرا ۱، ۱۵۱۔

۳۔ تذکرہ ہندی، ۲۲۱۔

۴۔ طبقات شعرا ۱، ۳۶۱۔

۵۔ تذکرہ ہندی، ۲۲۱۔

ہر برگ و گل لالہ اک مظہرِ خونی ہے
سینہ کے محبت تیرے داغوں کی گواہی میں

.....
 مے جو گلگونوں کے شیشہ میں بھری رہتی ہے
 چشمِ مستوں میں عجب جلوہ گری رہتی ہے
 نالہ بلبل ہے چمن زار ہے دل داغوں سے
 آہ تا صبح نسیمِ سحری رہتی ہے
 لب و چشم اپنے، ہیں اک عالمِ خشکی و تری
 عشق کی سلطنتِ بحر و بری رہتی ہے
 اشک باری سے غم و درد کی کھیتی باڑی
 لہلہ سی نظر آتی ہے ہری رہتی ہے
 بے نشاں زخم سے اس تیرنگہ کے دل سے
 درد رہتا ہے نہ پیکاں نہ سری رہتی ہے
 دل کو لے ڈوبتی کیونکر نہ نظر آئے محبت
 کشتی چشم تو پانی سے بھری رہتی ہے

.....
 ہزار ماحبِ تدبیر ہو تو کیا حاصل
 موافق اس سے نہ تقدیر ہو تو کیا حاصل
 ملے سے عاشق و معشوق کی بڑی ہے قدر
 جدا کمان سے گر تیر ہو تو کیا حاصل
 نہ حرف ہو نہ حکایت خموش مجلسِ عیش
 بہ شکلِ صفحہ تصویر ہو تو کیا حاصل
 جہاں کو پائے قناعت سے اے محبت کر سیر
 جو دستِ حرصِ گلو گیر ہو تو کیا حاصل

ریختے کے ملک کا سودا کو بخشا تو نے راج
اس مگر میں کون ایسا ناظم و ناثر ہوا

.....
جس طرف تشنہ دیوار ترے جا نکلے
ادھر آنکھوں سے بہاتے ہوئے دریا نکلے
یار آیا نہ کہا ضعف سے میں اتنا بھی
خیریت صاحب من آج کدھر آنکلے
قافلہ پہلی ہی منزل سے دیا ہم نے چھوڑ
سفر ملک عدم کو تن تنہا نکلے
جی جو بے چین ہے کوچہ ہی ترا دیکھ آئے
کیا کریں ایک گھڑی دل وہیں بہلا نکلے
ہم چن میں گئے تھے سیر کو گل دیکھتے ہی
یاد آیا جو وہ گل باغ سے گل کھا نکلے

.....
اُس بت نے گلابی جو اٹھا منہ سے لگائی
شیشہ میں عجب آن سے جھمکے تھی خدائی
عالم میں نشہ کے وہ مہتاب میں تیرے
خورشید سے مکھڑے نے طلسمات دکھائی
مارا ہے اسے چھوڑ ترے تیر نگہ نے
جس ساتھ میاں تو نے ذرا آنکھ لڑائی
گو غیر کے ملنے کی قسم کھاتے ہو پیارے
چھپتی نہیں وہ بات جو ہو دل سے بنائی
واللہ ہمیں عشق کی بھولی ہوئی سب چال
کافر تری رفتار نے پھر یاد دلائی
بردم تو بھرا شیشہ جھکاتا ہے نشہ میں

ڈرتا ہوں کہ تیری نہ موڑک جائے کلائی
 آئینہ نمدپوش ہوا عشق میں تیرے
 چار ابروؤں کی لے کے فقیرانہ صفائی
 ہم جھوٹ کہیں تو نہ ہو دیدار خدا کا
 ہے روزِ قیامت تری اک شب کی خدائی
 عاشق کو محبتِ سلطنتِ ہر دو جہاں ہے
 گر یار کے کوچہ کی میسر ہو گدائی

چشمِ پر آب میں ہے جلوہ قدِ دل جو کا
 دید کرتا ہوں عجب سرو کنار جو کا
 وہِ فرقت میں جو اٹھتی ہیں جگر سے آہیں
 اک جہاں مجھ کو نظر آئے ہے عالم ہو کا
 ہاتھ تب عشق کے میں سب گراں کے ڈالا
 زور فرہاد کے جب تول لیا بازو کا
 باندھنوں پر یہ نیا باندھنوں باندھا ہے محبت
 شوخ نے چہرہ جو سر پر ہے سجا سالو کا

عظیم اور انشا کے ادبی معرکے میں محبت نے عظیم کا ساتھ دیا تھا۔ انہوں نے ایک غزل کہی
 جس میں اس ادبی معرکے کا ذکر ہے۔ ہوا یوں کہ انشا نے بادشاہ کو اس پورے گروہ کے
 خلاف یہ کہہ کر بھڑکا دیا کہ مشاعرے میں فلاں فلاں آپ کی غزل پر قہقہہ مار کر ہنس رہے
 تھے اور غالباً انشا نے بادشاہ سے درخواست کی تھی کہ وہ اس ادبی معرکے میں انشا کا ساتھ
 دیں۔ لب وہ غزل ملاحظہ ہو۔

سرسبز خط فرماں رہے تحریر کے آگے
 ہو لال زباں داں مری تقریر کے آگے
 دل ہے سونگہ تیرے کے ہے تیر کے آگے
 سر ہے جو خمیدہ دم شمشیر کے آگے
 تدبیر پڑی ٹھوکریں کھاتی رہی پیچھے
 یاں حضرت انساں تری تقدیر کے آگے
 ہوتا ہے ہمیں محوِ خدائی کا بھی آداب
 جانکے ہیں جب اس بہت بے پیر کے آگے
 شیطان جسے کہتے وہ اے شیخ مزور
 پیچھے ہی رہے ہے تیری تدویر کے آگے
 کیا معنی ہے آئینہ نہ پانی ہو بہ صد رنگ
 اس بو قلموں شوخ کی تصویر کے آگے
 کس طرح نہ ہو سلسلہ زنجیر کا بر پا
 دیوانوں سے اس زلفِ گرہ گیر کے آگے
 بحث میں چکے چاہیے قضیہ شعرا کا
 اس فن کے کسی صاحبِ توقیر کے آگے
 ہے نقص جو شاعر ہوئے فریادی و دادی
 اکبر کے حضور اور جہانگیر کے آگے
 نیزے پہ ہدف کر کے رکھیں ہم سر حاسد
 اور تیر قلم اپنے کے سر تیر کے آگے
 ہو رستم۔ میداںِ سخن کے بھی ہمارا

یک مصرع - و مصرع شمشیر کے آگے
جو عرض مطالعہ کرے مقصد ہی کو پہنچے
باصدق محبت حضرت شمشیر کے آگے

معین، شیخ محمد معین الدین

سرور نے باشندہ الہ آباد لکھا ہے۔ مجبور دست نہیں۔ یہ بدایوں کے رہنے والے تھے۔ البتہ
الہ آباد میں کافی دن رہے تھے۔ شورش نے لکھا ہے کہ الہ آباد میں جو بادشاہ کے لیے باغ
تیار ہوا تھا اور ”رواق افزا“ جس کا نام رکھا گیا تھا معین نے اس باغ کی مدح کی تھی۔ اسی
مدح کے وسیلے سے انہیں سرکار عالی میں ملازمت مل گئی۔ اس قصیدے کا ایک شعر یہ بھی
ہے۔

اے فلک تیرے ستاروں میں کہاں ایسی بہار
باغ حضرت میں جو کچھ جلوۂ داؤدی ہے۔ (کذا)
الہ آباد سے یہ لکھنؤ آ گئے تھے۔ قاسم نے لکھا ہے کہ مدت سے عظیم آباد میں ہیں۔ میری
نظر سے کوئی اور تذکرہ نہیں گزرا جس میں ان کے قیام عظیم آباد کا ذکر ہو۔ البتہ میر حسن نے
لکھا ہے کہ آج کل خیر آباد میں ہیں۔
میر حسن ان کے بارے میں لکھتے ہیں۔ ”اکثر اپنے معاصر شاعروں سے جھگڑتے تھے۔“

۱۔ یہ اشعار زمانہ جولائی ۱۹۲۹ء، مجموعہ نغز اور تذکرہ ہندی سے لیے گئے۔

۲۔ عمدۂ منتخب ص ۸۶۰

۳۔ تذکرہ عشق (دو تذکرے) ص ۲۳۱، گلزار ابراہیم ص ۲۳۵ اور گلشنِ سخن (قلمی) ورق ۹۲ ب

۴۔ تذکرہ شورش (دو تذکرے) ص ۲۳۰

۵۔ ظلیل نے لکھا ہے اس وقت کہ ۱۱۹۶ھ ہے معین لکھنؤ میں رہتے ہیں۔ گلزار ابراہیم ص ۲۳۵

۶۔ مجموعہ نغز، ص ۲۰۱

۷۔ تذکرے شعرائے اردو ص ۱۶۵

چنانچہ ایک دفعہ مجھ فقیر کے شعر پر بے جا اعتراض کیا۔ ہر چند سمجھایا نہ سمجھے۔ مرزا رفیع کی سند دی۔ نہیں مانے۔ کہنے لگے میرے پاس مرزا کے دیوان کا صحیح نسخہ ہے۔ اس میں تو اس طرح نہیں ہے۔ غرض جس جگہ ایسا لفظ پاتے ہیں۔ استاد کے دیوان کو اپنی مرضی کے مطابق درست کر لیتے ہیں۔^۱ اس سب کے باوجود میر حسن نے ان کے کلام کی بہت تعریف کی ہے۔ لکھتے ہیں۔ ”لیکن اس تمام خود آرائی اور خود پسندی کے باوجود ان جیسا صاحب طبع کوئی نہیں ہے۔ مثنوی، قصیدہ اور ہجو خوب کہتے ہیں“^۲۔ ”سرور انہیں ”بسیار شیریں کلام“ لکھتے ہیں۔^۳

کلام:

اے بادِ صبا باغ میں مت جایو تڑکے
سوتا ہے وہ گل پات مبادا کہیں کھڑکے
جوں یثیم کی تختی اگر اس راحت جاں کو
چھاتی سے لگا رکھیے تو دل کا ہے کو دھڑکے
آتے ہی نہیں گر کے سوئے چشم پھر آنسو
اس گھر سے مگر روٹھ کے نکلے ہیں یہ لڑکے
قمری ہے فدا باغ میں شمشاد کی دھج پر
ہم صدقے ہیں اے سرو رواں تیری اکڑ کے
قصہ ہی کرو مختصر اب جانے دو یارو
کیا لینا ہے تم کو مرے قاتل سے جھگڑ کے
سر رشتہ رو عشق کا ہرگز نہ کروں گم

۱۔ تذکرہ شعرائے اردو، ص ۱۶۵۔

۲۔ ایضاً

۳۔ عمدۂ منتجبہ، ص ۶۸۔

سو کلڑے اگر سبجہ نمط ہوں مرے دھڑکے
اے ابر بہاری شب ہجراں میں خبردار
دامن ترا اس آہ کے شعلے سے نہ بھڑکے
ہوں میں وہ دوانا کہ بہار آنے سے پہلے
زنجیر میں رکھتا ہے معین مجھکو جکڑ کے

.....
دیں جگہ تیری جفا کو دلِ صد چاک میں ہم
دیکھیں گر کچھ بھی وفا تجھ بت بے باک میں ہم
نقش پا کی نمط اے راحت جانِ عاشق
تیرے قدموں سے جدا ہو کے طے خاک میں ہم
لحنتِ دل نہیں ہے جو لے نکلے ہے نت قاصدا شک
پر زے حال اپنے کے بھیجے ہیں تجھے ڈاک میں ہم
خوش ہم عریانی سے اپنی ہیں بہ رنگ بوے گل
نکلے جاتے ہیں ٹھہرتے نہیں پوشاک میں ہم
پھرے نالوں سے نہ راتوں کو معین دن اپنے
آہ کب تک رہیں گے گردشِ افلاک میں ہم

.....
غیر تجھ دستِ ستم سے گو پھریں بھاگے ہوئے
ہم تو ہیں جیوں سایہ قدموں سے ترے لاگے ہوئے
پھر رہی ہے نیند آنکھوں میں چھپاتے ہو عبث
نک ادھر تو دیکھنا دو رات کے جاگے ہوئے

.....

رباعی

جب سے تجھ ساتھ دل لگایا ہم نے
کیا کیا اندوہ و غم اٹھایا ہم نے
تقصیر نہیں ہے اس میں تیری باللہ
جیسا کہ کیا تھا ویسا ہی پایا ہم نے

دیگر

دل کے ہاتھوں ہمارا جینا معلوم
خوں پیتے ہیں اب تو عے کا پینا معلوم
گر جیب پھٹا ہو تو رفو ہو ناصح
یہ چاک جگر ہے اس کا سینا معلوم۔

ممتاز، حافظ فضل علی

دہلی کے شیخ زادوں میں سے تھے۔^۱ بقول میر حسن حافظ قرآن تھے۔^۲ قدرت اللہ شوق کے
آنولے میں اُن سے ذاتی تعلقات رہے تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ دکن جاتے ہوئے رہزنوں
کے ہاتھوں شہادت پائی۔^۳ میر حسن ان کے بارے میں لکھتے ہیں۔ ”شاعر دردمند و
گداز..... سر رشید طرز کلامش استوار و گل فکر بیانش رنک لالہ زار، سخنش شاعرانہ و طرزِ ش

۱۔ یہ اشعار تذکرہ شعراے اردو، مجموعہ نفیر، تذکرہ ہندی اور تذکرہ شورش سے لیے گئے۔

۲۔ تذکرہ عشقی (دہلی کرے)، ص ۱۸۹۔

۳۔ تذکرہ شعراے اردو، ص ۱۶۰۔

۴۔ طبقات الشعرا (قلمی)، ورق ۱۰۵۔ اب

استادانہ شوق لکھتے ہیں۔ ”طبع سلیم و جولاں داشت، رسائی فکرش از مذاق بخش پیدا و استعداد قلمی از صفائے گفتگویش ظاہر و ہویا“^۱۔

ممتاز کا قلمی دیوان سالار جنگ لائبریری حیدرآباد میں محفوظ ہے۔ یہاں اس سے انتخاب پیش کیا جاتا ہے۔

یاد نہیں عمر تھی یا خواب تھا بے ہوشی کا
تا کجا شکر بجا لاؤں فراموشی کا
لُحْظِ دل مونہہ سے نکلتے تھے ابھی بات کے سات
پوچھ مت راز صبا غنچہ کی خاموشی کا
کان میں گل کے صبا کہتی رہی راز اور ہم
آہ پائے نہ مزہ عمر میں سرگوشی کا

.....
ڈھونڈے ہے قدر مرتبہ جس کے کمال کا
پہونچے کب اس کو حوصلہ میرے خیال کا
جب سے نظر پڑا ہے ترا حسن بانمک
کچھ پوچھ مت بیاں دل شوریدہ حال کا
دنیا کے بیچ وہ بھی کوئی آدمی ہے یار
اندیشہ ہوے جس کو نہ اپنے ہی مال کا
نیکی بھی وہ زیادہ نہ چاہے بدی تو کیا
جس شخص کو ملا ہو مرا اعتدال کا

۱۔ تذکرہ شعراے اردو، ص ۱۶۰۔

۲۔ طبقات الشعرا (قلمی) ورق ۱۰۵ اب

روؤں میں کس لیے رنجش سے پیار میں کیا تھا
 میں اب خزاں کو جو روؤں بہار میں کیا تھا
 جھائے یار نے کس طرح کر دیا مایوس
 اور اپنے خاطر اُمیدوار میں کیا تھا
 ترے ہی واسطے آئے عدم سے ہم یاں تک
 دگر نہ ہستی ناپائیدار میں کیا تھا

دشمن نہ ہو دیدہ تو ہمارا
 پامال نہ کر لہو ہمارا
 رسوا ہوئے ہم اتنے ہم کہ صد شکر
 مذکور ہے کہ بہ کو ہمارا
 اے نالہ نہ ہو بلند خاموش
 بھڑکے نہ وہ شعلہ خو ہمارا

پوچھے اگر ترے سے کوئی کیوں کر اٹھے گا حشر
 اپنی جگہ سے اٹھ کے تو اس کو بتا کہ اس طرح

ہے یار کے لئے ہمیں اغیار سے غرض
 ہوئی ہے جیسے گل کے سبب خار سے غرض
 کیا جاپے کدھر ہے ترا بدگماں خیال
 مجھ کو تو ہے فقط ترے دیدار سے غرض
 ممتاز سب کو اپنے ہی مطلب سے یاں ہے کام
 مقصد نہ دشمنی ہے ہے نہ پیار سے غرض

عشق میں تیرے جہن اپنے ہمیں کام سے کام
نہ ہمیں کفر سے مطلب ہے نہ اسلام سے کام

فرصت کا جو وقت پائیں گے
احوال تیرا سنائیں گے
اے ساقی برنگ جام و شیشہ
رو رو کے تجھے ہمائیں گے
لا دیں گے اور لاکھ مضمون
پھر ایسی غزل بنائیں گے
قائم رکھنا وفا کا ممتاز
جیتے جی تو کر دکھائیں گے

تیری نگہ سے زلفِ سیہ کے نقاب میں
بجلی چمک کے رہ گئی پیارے سحاب میں

اٹھایا جب جہن مکھ سے نقاب آہستہ آہستہ
لگا بادل میں چھپنے آفتاب آہستہ آہستہ
تو شاید سیر کر آیا کہ مونہہ پر اہل گلشن کے
چھڑکتی ہی رہی شبنم گلاب آہستہ آہستہ
مری کم اضطرابی پر خفا مت ہو جیو پیارے
نیا ہوں سیکھتا ہوں اضطراب آہستہ آہستہ

برسات میں جب تو ہو آرام کی بارش ہے
 گر تو نہ نظر آوے کیا کام کی بارش ہے
 دلدار سے اب اپنے اوقات کیے ہے یوں
 یک بوسہ اگر چاہیں دشنام کی بارش ہے

ہمارے جی میں جو کچھ ہے سو یا کیا جانے
 وہ حالتِ دل بے اختیار کیا جانے
 نہ پوچھو دلِ عاشق سیتی رموزِ نشاط
 یہ بلبلِ قفسی ہے بہار کیا جانے

ابھی تلک مری آنکھوں سے اشک جاری ہے
 تمہارے خنجر مڑگاں کی آبداری ہے
 بہ شکلِ آئینہ ہے آنکھ اوس کی چشمِ براہ
 کسو کی زکسِ شہلا کو انتظاری ہے
 اکیلے جینا بھی اے خضر کچھ رکھے ہے مزا
 یہ زندگی ہے تری یا نفسِ شماری ہے

موسمِ عیش ہے جوانی ہے
 یہی کچھ لطفِ زندگانی ہے
 مجھ کو پوچھو تو دوست کا ملنا
 یہی شادی ہے شادمانی ہے

مجھ سے تو پوچھتا ہے ہنس ہنس کر
کیوں ترا رنگ زعفرانی ہے
حالِ دل تیرے روبرو کہنا
جانِ من یہ بھی اک کہانی ہے

.....
شمیم گل جو قفس تک نسیم لائی ہے
کوئی خبر دے مجھے کیا بہار آئی ہے
تجھے نگاہِ مروت اگر نہیں تو نہ ہو
ہمیں تو مدِ نظر پاسِ آشنائی ہے
ہم آگے ہاتھ پیاریں ترے معاذ اللہ
ہمارے پاس دعا مانگنا گدائی ہے
پیونچ سکے نہ کو دل تک تو کیا ممتاز
اگرچہ تا بہ فلک آہ کی رسائی ہے

.....
کیا مرا عشق ہے بہانہ ہے
ناصحو یہ عجب زمانہ ہے
اپنے عاشق سے تو برا مت مان
اس کی کیا بات وہ دیوانہ ہے
غم کو فرہاد و عیش کو پرویز
یہ خدائی کا کارخانہ ہے

.....
اے بت تجھے ہم اپنا کریں رام تو سہی

تجھ سے نکالیں دل کا اگر کام تو سہی
دکھادیں جو رقیبوں کو غربت وطن کے بیچ
ہم دشمنوں کی صبح کریں شام تو سہی
شامی سے لے کے تا بخدا ہی کائنات
جو دل کہے سو کر دیں سر انجام تو سہی

نالائے، میر احمد علی

دہلی کے رہنے والے تھے۔ عظیم آباد چلے گئے۔ صاحب دیوان شاعر تھے۔^۱ لیکن خلیل لکھتے
ہیں کہ نالائے خود کو شاگردان سودا میں شمار کرتے ہیں۔ میں نے مرشد آباد میں انہیں دیکھا۔
بالکل استعدا نہیں رکھتے تھے۔^۲

کلام:

غیر سے کیا امید کیا شکو
اپنا اپنا ہی دل اگر نہ ہوا

یہ میری آستیں جل جائے ہے پونچھوں ہوں جب آنسو
اثر رکھتا ہے میرے اشک کا یہ آب آتش کا

اگرچہ حسن لائانی بجن مہتاب رکھتا ہے
ولے ہو رو برو تیرے کہاں یہ تاب رکھتا ہے

۱ تذکرہ شورش (دو تذکرے) ص ۲۷۶

۲ تذکرہ عشقی (دو تذکرے) ص ۲۷۷

۳ گلزارِ ابراہیم ص ۲۴۴

حسرت دل کے سوا یاں سے نہ لے جاویں گے
ایک دن دست تہی ہم بھی چلے جاویں گے
شب کو مے نوش مرا کیفی ہو بولا نالاں
گوشتے میں ہیں پر اب گھر کو چلے جاویں گے

.....
میں کہا ہنس کے کہ کیا سچ ہی سدھا رو گے اب
مسکرا کر وہ لگا کہنے بلے جاویں گے

.....
دل سوزاں کو یارو یوں نہاں رکھتا ہوں پہلو میں
کہ اٹھر جیسے خاکستر میں کوئی ڈھانپ رکھتا ہے!

نثار، منشی سدا سکھ

بشاش نے ان کے بارے میں لکھا ہے۔ ”خلف سیتل پرشاد، باشندہ دہلی، قوم کا ستھ، مقیم الہ آباد، شاگرد سودا صاحب دواوین اردو و فارسی و بھاکا و مثنوی گزرے ایک واسوخت بھی کہا ہے“ یہ بہت غیر معروف شاعر ہیں۔ اکثر تذکرے ان کے ذکر سے خالی ہیں۔

کلام:

کیا سنگار رجھانے کو کس کے تم نے چشم
کہ بال بال دُرِ اشک جو پردیں ہیں

.....

۱۔ یہ اشعار تذکرہ شورش اور تذکرہ عشقی سے لیے گئے۔

۲۔ دہلی پرشاد بشاش، آثار شعراے ہنود، دہلی، ۱۸۸۵ء، ص ۱۳۱۔

ہمارا ہی دل جب ہمارا نہیں ہے
تو شکوہ ہمیں کچھ تمہارا نہیں ہے

نظیر

ان کے نام کا پتا نہیں چل سکا۔ بہت غیر معروف شاعر تھے۔ قاسم نے لکھا ہے کہ محمد آباد بنارس کے رہنے والے تھے۔ شیفہ لکھتے ہیں۔ نظیر ایک شخص کا تخلص ہے جو خود کو شاگرد سودا بتاتا ہے۔

کلام:

جب ترے کوچے سے ہم اُدھ کے چلے جاتے ہیں
شعلہ آہ کی گرمی سے جلے جاتے ہیں

تاریک نظر دیکھے تھے اے مہر تاباں
رہتا ہے سدا مہر درخشاں ہمہ تن چشم

وحشت، میر ابوالحسن

اشپر گرنے قائم اور علی ابراہیم کے حوالے سے لکھا ہے۔ ”..... ساکن مینو متصل دہلی، تیر انداز خاں کے پوتے اور سودا کے شاگرد تھے۔ ۱۱۶۸ھ سے پیشتر یہ انتقال کر چکے تھے“ قائم

۱۔ یہ اشعار سخن شعرا اور تذکرہ عشق سے لیے گئے۔

۲۔ مجموعہ نغز، ص ۲۰۸۔

۳۔ گلشن بے خار، ص ۲۳۲۔

۴۔ یادگار شعرا، ص ۲۱۳۔

نے لکھا ہے کہ کچھ عرصہ ہوا ان کا انتقال ہو چکا^۱۔ علی ابراہیم نے انھیں تیر انداز خاں کا پوتا اور شاگرد سودا بتایا ہے۔^۲

مطبوعہ نسخوں میں ان کے وطن کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں دی گئی۔ پتا نہیں اشر نگر کو کہاں سے ملی۔ ممکن ہے اس کے پیش نظر ان تذکروں کے ایسے قلمی نسخے رہے ہوں جن میں وحشت کے وطن کا ذکر کیا گیا ہو۔ عشقی لکھتے ہیں۔ ”جو انے اہلیت شعار، سپاہی پیشہ“^۳ عشقی نے لکھا ہے کہ میر غلام حسن کے تذکرے اور گلزار ابراہیم سے یہ معلوم ہوا کہ محمد حسن حسن اور ابوالحسن وحشت ایک ہی شخص کے دو نام ہیں۔ میر تقی میر نے ان کا ذکر میر حسن حسن کے نام سے کیا ہے۔ ممکن ہے ابوالحسن کا لقب محمد حسن بھی ہو اور وحشت و حسن دونوں تخلص کرتے ہوں۔^۴

کلام:

میں تو شروع نزاع سے کی تھی تجھے خبر
پہنچا تو گھڑی گھڑی کہ مرا کام ہو چکا

گم گریہ شب ، گاہ میں آہ سحری ہوں
جو کہیے سو ہوں پر گرد بے اثری ہوں
جس پاس میں جاتا ہوں سونہ پھیرے ہے مجھ سے
گویا کہ میں گردِ قدم رہ گزری ہوں

۱۔ مخزن نکات، ص ۶۱۔

۲۔ گلزار ابراہیم، ص ۲۵۲۔

۳۔ تذکرہ عشقی (دو تذکرے)، ص ۳۰۹۔

۴۔ ایضاً، ص ۳۰۹۔

قاتل اگر کہے کہ سکتا ہی چھوڑیو
خنجر تو ایک دم کے لیے منہ نہ موڑیو
شیشہ نہیں جو مول لیا دیں گے پھر اُسے
پیارے یہ دل ہے اس کو سمجھ کر کے توڑیو

.....
کروں گا اس دوانے دل کی میں تدبیر آنکھوں سے
لگی ہے بہنے موج اشک کی زنجیر آنکھوں سے
مثال عکس آئینہ نکل جاتا ہے جی میرا
جب ہی (کذا) نکل دور ہوتے ہی تری تصویر آنکھوں سے

.....
کہیں یہ جھوٹ دیکھا ہے تجھے جب میں بلاتا ہوں
صریحا تو چلا جائے مجھے کہتا ہے آتا ہوں

.....
نسترن ہے گل ہے سون ہے گل اورنگ ہے
اے بہار باغ بے رنگی یہ کیا کیا رنگ ہے

.....
بید مجنوں کی طرح جتنی بڑھی تھکتی ہے
شجر عمر کی بالیدگی معکوسی ہے

ہاشمی، میر ہاشم علی

مصطفیٰ نے ان کا نام میر ہاشمی لکھا ہے جو غالباً سہو کا تب ہے۔ لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔
مصطفیٰ لکھتے ہیں۔ میں نے انھیں لکھنؤ میں دیکھا ہے۔ ان کی عمر ساٹھ سال سے اوپر ہوگی۔

کلام:

مرا سوار اُس تک نامہ پُر آرزو پہنچا
اُدھر سے پر جواب صاف پہنچا جب کبھو پہنچا
کیا افشا تھیں نے رازِ عشق اے دیدہ گریاں
بگوشِ خلق ورنہ کس طرح بے گفتگو پہنچا
دماغِ آشفقہ ہوتا ہے مباحثت سے سنبل کی
مشامِ آرزو میں تو کسی کا کل کی بو پہنچا
ابھی چھوٹا ہے موجِ رشک کی زنجیر سے قمری
نہ پھر گوشِ دل دیوانہ تک آوازِ ہو پہنچا
یہ دعوے سب کے باطل محکمہ میں ہاشمی ہوں گے
اگر حاکم تلک وہ شوخ باردے نکو پہنچا

آہ و نالہ کے دو مصرع جو کہے میں موزوں
صاحبِ درد اُسے شعرِ فغانی سمجھا
وہ برہمن بچہ افسوس کہ اے ہم نفساں
قصہٗ دردِ مرا رام کہانی سمجھا

کچھ کفر و دیں میں شاید رشتہ ہوا برہمن
 تسبیح شیخ کی، جو زنار درمیاں ہے
 غیرت یہ چاہتی ہے ہم آئینہ کو توڑیں
 پر کیا کریں کہ روے دلدار درمیاں ہے^۱

کچھ تذکرہ نگاروں نے میر حسن، صغیر علی مراد اور گنا بیگم منتظر کو بھی شاگردانِ سودا میں شمار
 کیا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ ان لوگوں کو سودا سے تلمذ نہیں تھا۔ یہ محض بعض تذکرہ نگاروں کی
 غلط فہمی ہے۔

عاصل سخن

مرزا محمد رفیع سودا نے جب ہوش سنبھالا تو مغل حکومت کی شکست و ریخت ہو رہی تھی۔ مرہٹے، جاٹ، سکھ، روہیلے اور انگریز اس عظیم الشان عمارت کی بنیادیں ہلا رہے تھے۔ ان میں سے ابتدائی تین طاقتیں خود مغلوں کی سیاسی اور اقتصادی پالیسی کی وجہ سے پیدا ہوئی تھیں۔ مغل حکومت کے جاہ و حشم کا دار و مدار اُس کثیر دولت پر تھا جو لگان کی صورت میں حاصل ہوتی تھی۔ جاگیردار زیادہ سے زیادہ لگان وصول کرنے کے لیے کاشتکاروں پر ظلم کرتے تھے۔ ظلم و تشدد سے تنگ آ کر یہ کاشتکار بغاوت کرتے۔ خود اکبر کے عہد سے بغاوتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا جو جہانگیر اور شاہ جہاں کے زمانے میں بھی جاری رہا۔ عہد اورنگ زیب میں بغاوتیں کثرت سے ہونے لگیں اور اب یہ پہلے سے کہیں زیادہ منظم تھیں۔ مرہٹے، جاٹ اور سکھ ایسے زمیندار اور کاشتکار ہیں جنہوں نے مغل حکومت کے خلاف منظم بغاوتیں کیں۔ روہیلوں اور انگریزوں نے صرف مغلوں کے سیاسی انتشار اور فوجی کمزوری سے فائدہ اٹھایا۔

دہلی پر نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ قلعے کے خزانے خالی ہو گئے۔ امر اور دوسا بھوکے مرنے لگے اس بے بسی اور لاچارگی نے لوگوں کو فرار پر مجبور کر دیا۔ کچھ لوگ عیش و عشرت میں ڈوب گئے اور کچھ نے خانقاہوں میں پناہ لی۔ سودا ایک ذہین اور حساس شاعر تھے۔ خود ان کے سر سے بارہا سوچ خوں گزری تھی۔ انھوں نے خود قتل و غارت گری کے بھیانک مناظر دیکھے تھے۔ انھیں حکمران طبقے کی بے زری کا پورا پورا احساس تھا۔ اُن کے شہر آشوب اُس عہد کے سیاسی و سماجی انتشار کی سچی تصویریں ہیں۔ اٹھارویں صدی پر کام کرنے والے مورخین کے لیے ان شہر آشوبوں کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

اکثر تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ سودا کے آباؤ اجداد کا بل سے ہندوستان آئے تھے مگر یہ درست نہیں۔ ان کا وطن اصلی بخارا تھا جیسا کہ بارغ معانی میں نقش علی نے لکھا ہے۔ مرزا کے خاندانی حالات کا زیادہ پتا نہیں چل سکا۔ قیام الدین قائم نے مخزن نکات میں ان کے چچا کا ذکر کیا ہے لیکن نام نہیں بتایا۔ بعض تذکرہ نگاروں نے سودا کو ”پیر دستر نعمت خان علی“ لکھا ہے۔ شاہ کمال نے لکھا ہے کہ سودا کی والدہ عالی کی بہن تھیں۔ یہ بیانات درست نہیں۔ امکان صرف یہ ہے کہ سودا کی والدہ خاندان عالی سے ہوں۔ یعنی سودا کا عالی سے دُور کا رشتہ ہو۔ عنایت خاں راسخ نے ”ذکر مغنیان ہندوستان بہشت فشان“ میں مرشد قلی خاں کو سودا کا نانا بتایا ہے۔ ممکن ہے راسخ کا بیان درست ہو۔ سودا کے والد مرزا شفیع کے بارے میں قیاس ہے کہ وہ دہلی میں پیدا ہوئے۔ قائم نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ پیشہ تجارت میں مشہور تھے۔

محمد حسین آزاد نے سودا کا سن ولادت ۱۱۲۵ھ لکھا ہے اور غالباً بعد کے تذکرہ نگاروں نے ان ہی کی تقلید میں ۱۱۲۵ھ لکھا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ وہ ۱۱۱۸ھ میں پیدا ہوئے جس پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ سودا کم عمر تھے۔ جب ان کے والد کا انتقال ہوا۔ اور بقول قائم سودا کو جو کچھ ترکہ ملا تھا انھوں نے بہت جلد دوستوں میں اُڑا دیا۔

سودا کی اولاد میں غلام حیدر مجذوب کا نام ملتا ہے۔ جنھیں بعض تذکرہ نگاروں نے ان کا حقیقی بیٹا اور بعض نے جمنی لکھا ہے۔ قیاس یہی ہے کہ وہ حقیقی بیٹے تھے۔ خوب چند ذکا نے سلیمان نامی ایک شاعر کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ سودا کے جمنی تھے۔ محمد حسین آزاد مدعی ہیں کہ لکھنؤ میں ان کی ملاقات سودا کے نواسے سے ہوئی تھی۔

سودا نے ۱۱۴۰ھ اور ۱۱۵۰ھ کے درمیان ریختہ گوئی کا آغاز کیا اور ۱۱۵۴ھ کے لگ بھگ نمایاں ہونے شروع ہوئے۔ شعر گوئی کی ابتدا انہوں نے فارسی سے کی تھی مگر بہت جلد ریختہ کی طرف متوجہ ہو گئے۔

تذکرہ نگاروں نے سودا کے چار استادوں کا ذکر کیا ہے۔ سلیمان قلی خاں دوداد، نظام الدین احمد صالح، شاہ حاتم اور خان آرزو۔ ہمارا خیال ہے کہ سودا کو خان آرزو سے باقاعدہ تلمذ

نہیں تھا۔ البتہ ان کی صحبت سے ضرور فیض اٹھایا تھا۔ اکثر تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ سودا کو ملک الشعرا کا خطاب ملا تھا۔ کچھ لکھتے ہیں کہ شاہ عالم نے دیا تھا۔ کچھ کا خیال ہے کہ نواب آصف الدولہ سے ملا تھا۔ اور کچھ کا بیان ہے کہ شیخ علی حزیں کی عنایت تھی۔ حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ سودا کو کسی نے یہ خطاب نہیں دیا تھا۔ میر نے سب سے پہلی بار نکات الشعرا میں لکھا ہے کہ ”سودا ملک الشعرا کے لائق ہیں۔“ بعد کے تذکرہ نگاروں نے انہیں ملک الشعرا ہی بنا دیا۔

سودا بہت مہذب، بااخلاق، ہنگفتہ مزاج، زندہ دل اور یار باش تھے۔ اس سلسلہ میں بعض معاصر تذکرہ نگاروں نے ان کی بہت تعریف کی ہے۔ تذکروں میں کچھ لطیفے بھی ان سے منسوب کیے گئے ہیں۔

سودا علم موسیقی میں بھی ماہر تھے۔ عشقی لکھتے ہیں۔ ”سودا..... در علم موسیقی دستار نوازی دستگاہ ہے معقولے داشت۔“ مصحفی کا بیان ہے کہ ”بہ سبب آگاہی علم موسیقی مرثیہ و سلام کہ گفتہ بر سوز نہادن آں نیز قادر۔“ انھیں کتے پالنے کا بھی شوق تھا۔ میر نے اسی سلسلے میں ان کی ہجو کہی تھی۔ جس کا جواب کلیات سودا میں موجود ہے۔

دہلی کی تباہی و بربادی سے اہل ہنر ترک وطن پر مجبور ہو گئے۔ اکثر اہل فن دکن، فرخ آباد، اودھ اور دوسرے مقامات پر چلے گئے جہاں متاع فن کی قدر ہو سکتی تھی۔ خان آرزو، عارف علی خاں عاجز، قیام الدین قائم، احسن اللہ خاں بیان، محمد فقیہ صاحب درد مند، ہدایت اللہ ہدایت، قلندر بخش جرات، مصحفی، میر، منت، ہیبت قلی خاں حسرت وغیرہ وہ شاعر ہیں جنہیں حالات سے مجبور ہو کر دہلی چھوڑنی پڑی۔

سودا لگ بھگ ۱۱۷۴ھ میں دہلی سے نکل کر عماد الملک کے پاس متھرا پہنچ گئے۔ ۱۱۷۴ھ اور ۱۱۷۶ھ کے درمیانی زمانے میں عماد الملک کے ساتھ فرخ آباد آگئے جہاں نواب مہرباں خاں رند کے دربار سے متوسل ہو گئے۔ ۱۱۸۵ھ میں فرخ آباد کے نواب احمد خاں بگیش کا انتقال ہو گیا جس کی وجہ سے مہرباں خاں رند کے حالات خراب ہو گئے اور سودا کو مجبوراً فیض آباد آنا پڑا۔ یہاں نواب شجاع الدولہ کی سرکار میں معقول تنخواہ پر ملازم ہو گئے۔ نواب

شجاع الدولہ کے انتقال کے بعد آصف الدولہ مسند نشین ہوئے اور سودا آصف الدولہ کے دربار سے متوسل ہو گئے۔ جب آصف الدولہ نے فیض آباد کو خیر باد کہہ کر لکھنؤ کو اپنا مسکن بنایا تو سودا بھی لکھنؤ آ گئے۔ مرزا علی لطف نے لکھا ہے کہ آصف الدولہ نے سودا کے لیے چھ ہزار سالیانہ کی جاگیر مقرر کر دی تھی۔ یہ درست نہیں۔ نواب شجاع الدولہ نے ان کے دو سو روپے ماہوار مقرر کیے تھے۔ آصف الدولہ نے بھی یہی تنخواہ برقرار رکھی۔ بعض قصیدوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سودا کو تنخواہ وقت پر نہیں ملتی تھی اور انھیں پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ایک دن سودا نے آم زیادہ کھا لیے تھے۔ جس سے ان کی وفات ہو گئی۔ شاہ محمد حمزہ نے تاریخ وفات ماہ جمادی الثانی ۱۱۹۵ھ لکھی ہے۔

سودا ایک عظیم شاعر تھے۔ لیکن عظیم غزل گو نہیں۔ اگر ان کی متاع فن غزل اور صرف غزل ہی ہوتی تو اُن کا شمار اپنے دور کے دوسرے درجے کے شاعروں میں ہوتا۔ ان کی شہرت و مقبولیت اور شاعرانہ عظمت کی اصل بنیاد قصیدہ گوئی اور ہجو گوئی کے ساتھ ساتھ اس حقیقت پر بھی ہے کہ ان کے کلیات میں تقریباً جملہ اصنافِ سخن کے کامیاب نمونے موجود ہیں۔

صفِ اول کے غزل گو نہ ہونے کے باوجود انھوں نے غزل کو بہت کچھ دیا ہے اور غزل میں خارجیت، زورِ بیان اور نشاطِ آمیز لب و لہجہ انھیں کی دین ہے۔ سودا کا مزاج اور ذہن اُس غزل کو اس نہیں آسکتا تھا جس کی بنیاد داخلیت پر ہوتی تھی۔ ان کی شوخی چنچل اور طرار سے بھرتی ہوئی یہ رنگِ طبیعت اس دردِ مندی، سوز و گداز اور برہنگی و محنت کی مستحکم ہی نہیں ہو سکتی تھی جو غزل کی خصوصیات ہیں۔ اُن کے ہاں جذبات کی وہ صداقت و معصومیت، خلوص، خود سپردگی اور دردِ مندی نہیں ہے جو لب و لہجے میں نرمی و گھلاوٹ اور اندازِ بیان میں سادگی و بے تکلفی پیدا کر کے شعر کو تیر و نشتر بنا دیتی ہے۔ اُردو قصیدہ نگاری کے سودا امام ہیں۔ بعض تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ سودا کے قصائدِ عربی، خاقانی اور انوری کے پہلو بہ پہلو ہیں۔ اور بعض کا خیال ہے کہ سودا اکثر میدانوں میں فارسی قصیدہ گو شعرا سے آگے نکل گئے ہیں۔ اس حقیقت سے انکار مشکل ہے کہ قصائدِ سودا اُردو نظم کے اعلیٰ ترین نمونے ہیں۔ سودا الفاظ کے بادشاہ ہیں۔ ان کے پاس الفاظ کا بہت بڑا خزانہ ہے اور وہ ہر لفظ کے مزاج اور اس کے استعمال سے بخوبی واقف ہیں۔ طرح طرح کی تشبیہات اور استعارات کے سہارے ایک

ہی بات کو سوانداز سے کہہ سکتے ہیں۔ مشکل اور سنگلاخ زمینوں کو پانی کر دینا ان کا ہی کام ہے۔ بعد کے قصیدہ نگار سودا سے متاثر ہیں اور اکثر شعرا نے ان کی زمینوں میں قصیدے کہے ہیں۔

قصیدے کی طرح فن ہجو گوئی میں بھی سودا کی حیثیت امام اور خاتم کی ہے۔ وہ اس فن کو جس بلندی پر پہنچا گئے تھے۔ اس سے آگے اور کوئی نہ جاسکا۔ سودا کی ہجوؤں میں نہ صرف اس عہد کی معاشرت، تہذیب، سیاسی اور سماجی حالات کی جھلکیاں ملتی ہیں بلکہ ایسا بھی کافی مواد حاصل ہوتا ہے جس سے سودا کی شخصیت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ان ہجوؤں سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ سودا کن اخلاقی قدروں پر ایمان رکھتے تھے۔ سودا کا مشاہدہ بہت تیز ہے۔ وہ جب کسی منظر کو دیکھتے ہیں تو پہلی ہی نظر میں ان کا ذہن منظر کی معمولی سے معمولی تفصیل کو محفوظ کر لیتا ہے۔ اسی لیے جب وہ اس منظر کو الفاظ کے سانچے میں ڈھالتے ہیں تو کوئی گوشہ تشنہ رہنے نہیں پاتا۔ اصل منظر میں جو کمی رہ جاتی ہے، سودا اُسے اپنے زورِ تخیل سے پورا کر دیتے ہیں جو مصوری اور شاعری کا حسین ترین امتزاج ہے۔

سودا نے ایک واسوخت، مرہے، مثنویاں اور شہر آشوب بھی کہے ہیں۔ جن پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

اشعارِ سودا کا انگریزی ترجمہ

جان گلکرسٹ کو سودا سے بہت عقیدت تھی۔ اُس نے لکھا ہے کہ میں نے اُردو کلیاتِ سودا سے سیکھی ہے۔ گلکرسٹ نے اپنی کتاب ہندوستانی زبان کی گرائمر، مطبوعہ کروئیکل پریس، کلکتہ، ۱۷۹۶ء (انگریزی) کے سرورق پر سودا کے یہ اشعار دیے ہیں۔

اب سامنے میرے جو کوئی پیر و جواں ہے
دگوے نہ کرے یہ کہ مرے منہ میں زباں ہے
میں حضرتِ سودا کو سنا بولتے یارو
اللہ ہی اللہ کہ کیا نظم و بیاں ہے

اسی کتاب میں اُردو شاعروں کے بہت سے اشعار مثال کے طور پر دیے گئے ہیں پہلے یہ اشعار روکن رسم خط میں لکھے گئے ہیں۔ اور پھر ان کا انگریزی میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ اشعار سودا کے ہیں۔ میں نے یہاں پہلے اُردو اشعار اور پھر اُن کا ترجمہ ترتیب دیا ہے۔ اُردو شعر یا بند کا جو نمبر ہے وہی اس کے ترجمے کا ہے۔

GRAMMAR,
OF THE
HINDOOSTANEE LANGUAGE,
OR PART THIRD
OF
VOLUME FIRST,
OF A SYSTEM OF
HINDOOSTANEE PHILOLOGY.

By JOHN GILCHRIST.

اپ سامنی میری جو کہ تھی پیر و خان ہی دھوئی کیری کی۔ کہ میری سو نہ میں نہ میں ہی میں حضرت سودا کو سنا جو لہی یادو امد ہی امد کہ کیا تقسم و بیان ہی	<i>Let former more in hope part is joined by</i> <i>Drawn on here full of more more to not asked by</i> <i>Myth better i Souda he filling hope part</i> <i>Which has which he says more a by full by.</i>

ہر جا کہ سہنی و دھانی و انج پڑھتیں کرم
 پیدائش و قلم اصنع ہر ان جاری دارند

* Wherever there shall arise an Objection or Error, leave it only to the Reader's Conscience.
 * And hold the Art of Grammar nothing more than a *

DR. BALFOUR'S REVISION.



گلکریسٹ کی ایک کتاب کا سرورق

ہجو حکیم غوث

۱۔ ہو کے کسلند جو وہ بے حیا اپنے تئیں آپ کرے ہے دوا
مردہ شو و مولوی تابوت گر گھیرتے ہیں آن کے سب اس کا گھر
دیں ہیں دہائی وہ بصد قیل و قال ان میں سے ہر ایک کرے ہے سوال
اپنی دوا آپ تو ظالم نہ کر ہم بے کسوں کی بھی طرف نظر کر
خوب جو کرتا ہے تو اپنی دوا اور کوئی آپ سا مجھ کو بتا
روزی سے خاطر ہو مری تاکہ جمع بھیجوں تری گور پہ گل اور شمع

۲۔ اُن نے کہا تو نے اے زشت رو دیکھا صدیدی کو نہ قانون کو
ساتھ حکیموں کے تو اے بے تمیز بنشتی ہے ڈیڑھ روپے کی کینر
اس میں کہا ایک نے شوخی کی راہ سنتے ہی مانا نہیں ان کا کہا
بی بی تیری پردے میں اور یہ ادھر لقوہ و فالج سے ہو کیونکر خبر
سمجھو نیک لوٹنے کی ہے یہ جا کہتا ہے پھر آپ بھی ہاں اور کیا
سنتے ہی اس حرف کے کھاچ و تاب تھوک کے ڈاڑھی پہ کیا یہ خضاب
لاتو صدیدی کو تو، اے میرے پوت کھول تو قانون کو اے بھڑوے اوت
بات کا اپنی تو، مجھے دے نشان میں بھی تو دیکھوں ہے یہ اُس میں کہاں

لقوہ و فالج ہو جسے یا صرع دیجیے اُس کے تئیں ماء القرع
 پھر تو یہ جس وقت بڑھی آگے بات اُن نے جڑی دھول اُسے اُن نے لات
 اُن نے قلمدان سے کی اُس پہ چوٹ اُن نے لیا ڈاڑھی کو اُس کے کھسوٹ
 چوٹی غرض اس کی ہوئی اس کے ہاتھ ٹھپے پکڑ لوٹ گئی وہ بھی ساتھ
 زور جب آپس میں دھا دھم ہوئے مار کٹائی سیتی بے دم ہوئے
 دوڑ کر لوگوں نے چھڑایا انھیں منت و زاری سے اٹھایا انھیں
 کرنے لگے وے جوتھے معقول ہیں اُس کے تئیں لعن اُسے آفریں
 تھا غرض اس نقل سے یہ مدعا تاکہ تو اب اس کی نہ کھاوے دوا
 اپنے لیے گور نہ تو آپ کھود سُن تو لیا ایسا ہے یہ بیٹی چود

۳۔ سودا سے کہا میں کہ ترے شہرے کو سن کر
 دیکھا جو تجھے آکے تو اے بے سرد پاچ
 بولا کہ تجھے یاد ہے وہ مصرعہ بیدل
 عالم ہمہ افسانہ ما دارد و ماچ

۴۔ مصرع کو یقیں تیرے سودا نے سنا تھا کل روتا ہے وہ تب سے ہی بر سے ہے گویا بدل
 ہے رعدنم نالاں بجلی کی طرح بے کل پھر پھر کے وہ پڑھتا ہے ہاتھوں کے تئیں بل بل
 کیا کام کیا دل نے دیوانے کو کیا کیسے

۵۔ اس جینے سے بہتر ہے اب موت پدل دھریے جل تجھیے کہیں جا کر یا ڈوب کہیں مرے
کس طور کے تیں راتیں کس طرح سے دن بھرے کچھ بن نہیں آتی ہے حیران ہوں کیا کرے
کیا کام کیا دل نے دیوانے کو کیا کہیے

- ۶۔ کم ہے ناصر علی سے نعمت خاں اس سے مشہور تر ہے اس کا خیال
۷۔ مونے جائے کا مجھ کو ذوق نہیں چھوٹے چیرے کا دل میں شوق نہیں
۸۔ ظالم نہ میں کہا تھا کہ اس خوں سے درگزر سودا کا قتل ہے یہ چھپایا نہ جائے گا
۹۔ سنو اے لڑکو ہو نہ راہ سے گم اس فصاحت کو گوش و جاں سے تم
۱۰۔ باپ کے گھر کی چاٹ کر چٹنی کرو گذران یارو تم اپنی
۱۱۔ کس کس طرح سے دیکھیں اس باغ کی فضا ئیں کیدھر گئے وہ ساقی، بے ابروے ہوائیں
۱۲۔ لب و لہجہ ترا سا کس کو ہے خوبانِ عالم میں یہ غلا العام ہے جگ میں کہ سب معری کی ہیں ڈلیاں
۱۳۔ تبسم یوں نمایاں ہے ہنسی آلودہ ہونٹوں سے نہ ہوا برسیہ میں اس طرح بجلی کی لچلیاں
۱۴۔ قاضیوں کی بزم میں ہوتے ہو جا کے شعر خواں شاعروں پاس آپ کو کہتے ہوں نہ ہو صرف داں
۱۵۔ سالہا ہم نے صنم نالہ شکیر کیا آہ اک روز تیرے دل میں نہ تاثیر کیا
۱۶۔ نہ غرض کفر سے رکھتے ہیں نہ اسلام سے کام مدعا ساقی سے اپنے ہمیں اور جام سے کام
۱۷۔ ذکر میرا جا کے تو کرتا ہے غیروں کے حضور اب تلک یہ لب نہیں شکوے سے تیرے آشنا
۱۸۔ لازم نہیں ہے پیار سے اتنا غرور کرنا مجھ ناتواں کی حالت سن کر سرور کرنا
۱۹۔ احوال سے تمہارے واقف میں ہو رہا ہوں کیا فائدہ ہے شخی میرے حضور کرنا
۲۰۔ مذکور جانے بھی دو ہم دل طہید گاں کا احوال کچھ نہ پوچھو آفت رسید گاں کا

- ۲۱۔ کیا کروں گالے کے دواغظ ہاتھ سے حوروں کے جام میں ہوں ساغر کش کسی کی زگس مخمور کا
- ۲۲۔ گل پھینکے ہیں اوروں کی طرف بلکہ ٹمڑ بھی اے خانہ براندازِ چمن کچھ تو ادھر بھی
- ۲۳۔ ہستی سے عدم تک نفسِ چند کی ہے راہ دنیا سے گذرنا سفر ایسا ہے کہاں کا
- ۲۴۔ ساقی سیمیں کو تری دیکھ کے گوری گوری شرم سے شمع ہوئی جاتی ہے تھوری تھوری
- ۲۵۔ سریرِ سلطنت سے آستانہ یار بہتر تھا ہمیں ظنِ ہما سے سایہ دیوار بہتر تھا
- ۲۶۔ موجِ نسیم آج ہے آلودہ گرد سے دل خاک ہو گیا ہے کسی بے قرار کا
- ۲۷۔ سودا شرابِ عشق نہ کہتے تھے ہم نہ پی کھینچا نہ تو نے درِ ویراں کے خمار کا
- ۲۸۔ سودا چمن دہر سے یہ چشم نہ رکھو وہ گل نظر آوے کہ جسے خار نہ ہو دے
- ۲۹۔ اب خدا حافظ ہے سودا کا مجھے آتا ہے رحم ایک تو تھا ہی دیوانہ نس پہ آتی ہے بہار

۳۰۔ میں نے کہا کہ شیخ جی تم بیاہ مت رچاؤ

نوے برس کی عمر تمھاری ہے باز آؤ

کہنے کو دوستوں کے بھی خاطر میں اپنے لاؤ

ایسے لگو گے جو رو کے تم وقت داؤ چاؤ

گویا کہ اپنی پوتی کھلاتے ہیں شیخ جی

گاتی تھیں بیٹی ڈونیاں گرد یہ سہاگ

دولھا نمک بھرا ہے کہ جوں لوپے کا ساگ

دولہن شتاب آ کے پہنچ گھر سے اپنے بھاگ

نوشہ نگھڑ ہے لگے سرے کے گھر کو آگ؟

سر کو تو تال دسر سے ہلاتے ہیں شیخ جی

اے اچلی دھن تری شوخی ہے یہ زبوں
 تو نے ہمارے شیخ کو کیا کیا فسوں
 یاں تک ہے تیری شرم سے چوکی پہ سرنگوں
 مان کہے ہے بار خدایا میں کیا کروں
 تختوں سے سرکا سہرا بندھاتے ہیں شیخ جی

۳۱۔ معاش اہل چمن جائے رشک ہے سودا کہ زندگی کا انھوں نے مزا تمام لیا
 کسی کا ان میں نہ محسوس ہے نہ دالی روم حسد کسی کو نہ اس پر کہ جس نے شام لیا
 کہیں نہ واسطے منصب کے ہیں یہ بھرائی سلام کر کے کسی سے نہ لاکھ دام لیا
 کہوں نہ ان کو میں دیکھا تلاش خدمت میں کبھی نہ فکر تردد سے کوئی کام لیا
 ادھر شروع کیا صبح نغمہ بلبل نے ادھر بہار سے ہر ایک گل نے جام لیا

۳۲۔ بلبل چمن میں کس کی ہیں یہ بدشرایاں ٹوٹی پڑی ہیں غنچوں کی ساری گلابیاں
 تجھ کھ پہ تا غار کرے مہر و ماہ کی لبریز سیم و زر سے ہیں دونوں رکابیاں
 صیاد کہہ تو کن نے کبوتر کو دام میں سکھلایاں ہیں دل کی مرے اضطرابیاں
 فرہاد و قیس دوں گئے سودا کا ہے یہ حال کیا کیا کیا میں عشق میں خانہ خرابیاں

۳۳۔ سادوں کے بادلوں کی طرح جل بھرے ہوئے
یہ دے نین ہیں جن سیتی جنگل ہرے ہوئے
اے دل یہ کس سے بگڑی کہ آتی ہے فوج اشک
لختِ جگر کی لاش کو آگے دھرے ہوئے
پلکیں تری کہاں نہ صف آرا ہوئیں کہ داں
افواجِ قاہرہ کے نہ نیزے کھڑے ہوئے
آنکھس کو تیری کیوں کہ میں باندھوں کہ یہ غزال
جاتے ہیں میرے دل کی زراعت چرے ہوئے
بوندوں کی جمدھروں سے یہ لڑتے ہیں اک دگر
لڑکے مجھ آنسوؤں کے پیٹ منگرے ہوئے
خالی ٹھیں کر اٹھ گئے اس بزم سے حریف
بیٹھے ہیں ایک شیشہٴ دل ہم بھرے ہوئے
نزدیک اپنے رہنے سے مت کر ہمیں تو منع
ہیں لاکھ کوس جب ترے دل سے پرے ہوئے
انصاف اپنا سوچے کس کو بجز خدا
منصف جو بولتے ہیں تو تجھ سے ڈرے ہوئے
مجلس میں چھو کروں کی جو حجرے سے شیخِ جی
آویں تو پھر خدا نے کہا مسخرے ہوئے

سودا نکل نہ گھر سے کہ اب تجھ کو ڈھونڈتے
لڑکے کھڑے ہیں پتھروں سے جھولی بھرے ہوئے

۳۴۔ ساقی ہماری توبہ تجھ پر ہے کیوں گوارا
منت نہیں تو ظالم ترغیب یا اشارا
اک بار ہی جھکادے ساقی کہ فصل گل کو
عرصہ کہاں کہ دے تو ساغر ہمیں دوبارا

۳۵۔ غیر کے پاس یہ اپنا ہی گماں ہے کہ نہیں
جلوہ گر یار مرا، ورنہ کہاں ہے کہ نہیں
۳۶۔ مہر ہر ذرہ میں مجھ کو تو نظر آتا ہے
تم بھی نکل دیکھو کہ صاحب نظراں ہے کہ نہیں
۳۷۔ دل کے ٹکڑوں کو بغل بچ لیے پھرتا ہوں
کچھ علاج ان کا بھی اے شیشہ گراں ہے کہ نہیں
۳۸۔ پاس ناموس مجھے عشق کا ہے اے بلبل
ورنہ یاں کون سا اندازِ فغاں ہے کہ نہیں
۳۹۔ آگے شمشیر تہاری کے بھلا یہ گردن
موسے باریک تر اے خوش کمر اں ہے کہ نہیں

- ۴۰۔ جرم ہے اس کی جفا کا کہ وفا کی تقصیر
کوئی تو بولو میاں منہ میں زباں ہے کہ نہیں
- ۴۱۔ پوچھا سودا سے میں اک روز کہ اے آوارہ
تیرے رہنے کا معین بھی مکاں ہے کہ نہیں
- ۴۲۔ یک بہ یک ہو کے بر آشفہ لگایوں کہنے
کچھ تجھے عقل سے بہرہ بھی میاں ہے کہ نہیں
- ۴۳۔ دیکھا میں قصر فریدوں کے در اوپر اک شخص
حلقہ زن ہو کے پکارا کوئی یاں ہے کہ نہیں

.....

- ۴۴۔ کم بولنا ادا ہے ہر چند پر نہ اتنا
مند جائے چشم عاشق تو بھی وہ لب نہ کھولے
- ۴۵۔ جیوں غنچہ تو چمن میں بند قبا جو کھولے
پھر گل سے اے پیارے بلبل کبھو نہ بولے
- ۴۶۔ آدے گا وہ چمن میں تڑکے ہی مے کشی کو
شبیم سے کہہ دے بلبل پیالے لگلوں کے دھولے
- ۴۷۔ باغ جہاں میں آکر کچھ ہم نے پھل نہ پایا
اک دل ملا کہ جس میں ہیں سینکڑوں ملولے

- ۴۸۔ اتنا جو جاؤں جاؤں کرتے ہوئے تو سدھارو
اس دل پہ کل جو ہوگی سو آج ہی وہ ہو لے
- ۵۰۔ چشم پر آب ہوں میں جیوں آئینہ حبابی
رک رک کے پڑ گئے ہیں چھاتی میں سب پھپھو لے
- ۵۱۔ کون ایسا اب کہے یہ سودا گلی میں اوسکی
آ تجھ کو لے چلیں ہم دل کھول کر تو رو لے

- ۵۲۔ باتیں کدھر گئیں وہ تیری بھولی بھالیاں
دل لے کے بولتا ہے جو تو اب یہ بولیاں
- ۵۳۔ ہر بات ہے لطیفہ و ہر یک سخن ہے رمز
ہر آن ہے کنایہ و ہر دم ٹھٹھولیاں
- ۵۴۔ حیرت نے اس کو بند نہ کرنے دی پھر کھو
انکھیاں جس آرسی نے ترے مونہہ پہ کھولیاں
- ۵۵۔ اندام گل پہ ہو نہ قبا اس مزے سے چاک
جیوں خوش چھوٹوں کے تن یہ مسکتی ہیں چولیاں
- ۵۶۔ کن نے کیا خرام چمن میں کہ اب صبا
لاتی ہے بوے ناز سے بھر بھر کے جھولیاں

- ۵۷۔ ساقی پہنچ شتاب کہ تجھ بن اس ابر سے
 پڑ۔ تے نہیں مگرگ برستی ہیں گولیاں
- ۵۸۔ کیا چاہیے تجھے سرانگشت پر حنا
 جس بے گنہ کے خون میں چاہیں ڈبولیاں
- ۵۹۔ جیوں برف ہو گئے ہیں خشک اب بتاں ہند
 نسبت انھوں کے گرم ہیں کابل کی لولیاں
- ۶۰۔ سودا کے دل سے صاف نہ رہتی تھی زلف یار
 شانے نے بیچ پڑ کے گر ہیں اس کی کھولیاں

- ۶۱۔ لے دیدہ تر جدھر گئے ہم ڈبرے جو تھے خشک بھر گئے ہم
 میں اور عندلیب ازل سے ہیں بے نصیب مجھ پر تراستم ہے نت اوپر جھائے گل
- ۶۲۔ چین دینے کا نہیں زیر میں بھی نالا
 سوتوں کی نیند میں کرنے کو ظلم جاؤں گا
- ۶۳۔ تقدیر کے لکھے کو امکان نہیں دھونا
 تقصیر نہیں دل کی میں فرض کیا ہونا
- ۶۴۔ قطرہ اشک ہوں پیارے مرے نظارے سے
 کیوں خفا ہوتے ہو پل مارتے ڈھل جاؤں گا
- ۶۵۔ عشق کے بیمار کی تشخیص میں ہوا علاج
 بھول سب قانون حکمت بوعلی بھی رو گیا
- ۶۶۔ دوزخ مجھے قبول ہے اے منکر و نیکر
 لیکن نہیں دماغ سوال و جواب کا
- ۶۷۔ سودا کبھی بہار میں وضع زمانہ دیکھ
 اے وائے بلبل اوہائے ہائے گل
- ۶۸۔ کیا کروں گا میں تو سلامت رہ
 تیرے دروازے کا ہوں خاک نشیں

- ۷۰۔ سودا یہ کرے گانت اس قدر کا رونا عالم کو اے دیوانے مت ساتھ لے ڈبونا
- ۷۱۔ لٹی سے اٹھ گیا ساقی میرا نہیں پر یو پیانا الہی کس طرح دیکھوں میں ان آنکھوں سے میخانہ؟
- ۷۲۔ بنا ہی اٹھ گئی یار و غزل کے خوب کہنے کی گیا مضمون دنیا سے رہا سودا سودیوانہ
- ۷۳۔ اے باد مبا تو دم صبح کے تر کے سوتا ہو وہ گل رو تو کہیں پات نہ کھڑ کے
- ۷۴۔ نہ بچے طائر مضمون نظر انداز میرا فکر عالی کی ہے شاہیں میری راہ نوال
- ۷۵۔ کشش غلق اس کا غرض اکام ہے مرگ و قضا مفت میں بدنام ہے

۶۱۹

TRANSLATION OF
SOUDA'S VERSES



By

J.B. GILCHRIST



Jamal Printing Press, Jama Masjid, Delhi-6

SOUDA'S SATIRE ON DOCTOR GHOU

1. When the blockhead gets sick, he administers; medicines to his self, and then all the undertakers, pall-bearers and mourners, surround his house, where they lament with many exclamations, and every one among them supplicates thus: "Take not thy self, O barbarian, thy own physick, but have some mercy on us, poor wretches' however if thou still persist in swallowing your own drugs, first recommend me says. each, to any other person, like your worship, that my mind may be easy about my daily bread, and I shall then furnish thy grave with tapers and flowers."
2. He (the doctor) replied, thou has neither, O hag, seen the Sudeedee, nor the Qanoon, and canst thou impudent worthess slave argue with physicians; on which, one who listening, did not regard the doctors speech, and wittily observed: Tey mistress concealed within, and he without, how can he know anything of having a palsy or convulsions, consider a little, is not this a good joke, on which his worship (Ghou) also said, yes it is to be sure. The woman hearing this remark, and being enraged, spit on his beard and thus addressed him- well bring thou the Sudeedee now my Cock, come open the Qanoon Cuckoldy wight, and give me a proof of your own doctrine, as I wish to see where this is written in it, that you must prescribe pompion juice for the palsy, convulsions, or epilepsy; after this when the altercation encreased, he gave her a slap, and she kicked him, he hit her a blow with the standish, and she toused his beard, in short her tail got twisted in his fist, and she seizing his cods, tumbled also on the ground, where they had a rare scrabmle among themselves, and being breathless with beating each other, the bystanders running up, separated and lifted them with much entreaty. Those who judged rightly, cursed him, and praised her. In fact the intention of this story is, that thou mayest not take his medicines, nor thou thyself dig thy own grave, now you have learned what a caitiff he is."

3. I thus addressed Souda : having heard of thy renown I came,
O wight, but saw nothing. On which he said, Dost thou
recollect that verse of Bedil, "The universe is full of my fame
though I be nobody."
4. Souda heard the verse repeated yesterday, Yaqeen, and weeps
ever since as a surcharged cloud that dissolves in streams: He
at one time is murmuring like the distant thunder, and at
another more restless than its volatile messenger, wringing his
hands, he again and again repeat " what made you cherish this
passion, O my soul! but, alas! how can (or shall) I (or one)
reason with a distracted mind."
5. It will be better for me resolutely to embrace death, than to
lead such a life, let me depart and perish in the flames, or
drown myself somewhere; for how shall I pass the cheerless
night, or where can I spend my lonely days; Alas! What must I
distracted do, when there is no end of my woes Oh my soul,
what hast thou done? but why do I reason with a frantic mind?
6. Is Neamut Khan inferior to Nasir ulee ? the fancy ? of the
former is more famous than the latter's.
7. I have no desire for a coarse robe, nor feel any inclination to a
small turband.
8. Did I not bid thee refrain, O! tyrand, from this murder, it is
the assassination of Souda, and never can be concealed.
- 9/10. Hear me, O! children, depart not from virtue, but listen to this
counsel with an attentive ear, and always be contented, O ! my
friends, with whatever the board your father affords.
11. Ah ! how shall we enjoy the flower beds of this garden, where
are now the cup bearers, the vernal clouds, and the zephyrs of
spring.
- 12/13. Who among the beauties of the univers, have mouth and
words like thine ? It must be an error of the vulgar that in

this world any others can be sweet as chrystals of sugar. A smile has more lustre on thy lips, obscured with missee than the flashes of lightning have in a sable cloud.

14. When you go into an assembly of qazees you pretend to be judge or poetry, and in a circle of poets you call you self a grammarian.
15. For years, O my beloved ! have I wasted the nights with my plaints; but alas! without ever once exciting thy compassion.
16. We esteem not Paganism, nor do we venerate the Faith; but we adore our beloved, while a flowing bowl is the alter for us, (and our libations).
17. Thou Talkest of me when in the presence of strangers, though this lip knows not how to complain of thee.
- 18/19. It is not becoming, O my beloved, to affect such pride; or when you hear the distress of wretched me, to rejoice. I am perfectly acquainted with your condition; for what purpose then assume air in my presence (or before me).
20. Forbear even the mention of us lovers, and ask not an account of the forlon.
21. What shall I do, O preacher, with a bowl from the damsels of Paradise, who am here intosicated with the wanton eye of any one.
22. You throw flowers and fruits even to others; do plunderer of the garden, then fling a few also this way.
23. There are but a few moments between existecne and annihilation; where then is there so expeditious a journey as our pasaage from this world ?
24. When the candle beholds thy fair polished limbs, it gradually burns with shame away.
25. My lover's threshold was better to me than an imperial throne

and his humble roof more desireable than the shade of the royal eagle.

26. Since you do thus this repeat, I am going, I shall go, pray depart, and let that betide me today which must happen to-morrow.
27. O Souda ! did we not say, do not drink the wine of desire; and hast thou not at last experience the anguish after such intoxication.
28. Cherish not the hope, O ! Souda, in this terrestrial abode, that a rose will ever blossom here without producing a thorn.
29. May God preseve Souda, I really pity him; He was distracted enough before, and now season of love is again approaching.

SOUDA'S SATIRE ON SHEKH JEE

30. I said, Reverend sage meddle not with marriage, but refrain now that you are ninety years of age, and mind the counsel of freinds' lest when dallying with a wife, you seem to be dandling your own grand daughter. The female musicians sat in a circle singing this nuptial song. " The Bridegroom is leep, but sedative as the leaves of purslane, come with speen, O bride, and leave thy former home, a busband is the proper man, and you may now make a bonfire of his father-in-law's house; see the old gentleman himself even nods approbation to the chorus." Ah! wanton bride, thy pranks art baneful indeen, for thou hast enchanted, and abashed our master to stoop on the bench so much, that gardener's wife exclaims, Good Lord! what can I do, when his worship inclines to make the boardsagah ifdrsloranhead.

PART OF A HINDOOTSANEE ODE FROM SOUDA

31. Souda, observe the garden's" state!
 What gifts the flowry people bless!
 Each earthly sweet, allowed by fate,
 In full perfection they possess.
 To them, ambition, is unknown:
 No heart corroding envy bears;
 The King of Room or Syrias throne,
 In them excites no jealous cares.
 Never did guileful flattery's bate
 For these, disgraceful honor's gain:
 Ne'er did the homage of the great
 For these, unearth wealth obtain
 Ne'er did they creep from man to man,
 And beg for slaver's galling yoke;
 Ne'er did the deep-concerted Plan
 In them the pangs of doubt provoke.
 But, hark! the birds their wild notes sing,
 To greet at morn this happy tribe
 While they with goblets, hail the spring,
 And freely, purest juice unlike.

(Translated by H.H)

32. O ! Philomel whose drunken frolicks have polluted the garden,
 and left the capsules of the rose buds thus deflowered and
 torn-that the sun and moon may devote their offering to thy
 charms; lo ! they both revolve as untensils resplendent with
 silver and gold-Say ! O ! flower, who hath taught the captive
 dove the emotions of my bosom ? Furhad and Qys perished so,
 and such is Souda's condition now-Alas, what devastation hath
 not love produced!
33. These eyes of mine ae surcharged with streams, like the clouds
 of the rains, with which the wilds are cloathed in their deepest
 green. O ! my soul, what contest in this to which an ocean of

bring tears stained. with salughtered hearts seems advancing
apace ?

They eye brows, my beloved, never were marshalled for a battle, without displaying the parts of conquering armies. Why not arrest the rays of those destructive orbs, that like wanton fawns crop the tender buds of my dearest hopes? These pearly drops are contending with each other to issue forth to the fight but, alas ! the damsels are not at all dismayed at the sight of my feeble tears. Though my rivals have drained the goblets, and are with-drawn from the banquet still I with a tender and over-flowing heart remain; do not therefore forbid my enjoying thy company, since being estranged by their affection, I am virtually a myraid of miles away. From whom except God can I expect justice, when the judges who decide are themselves smitten by thee ? Should a hermit from his cell intrude on the assembly of the fair, he would surely become a laughing stock there: leave not thy house O ! lunatic, for at present the youth of the village are waiting with their pockets full of stones in expectations of thee.

34. How O ! cup bearer my vows of sobreity be agreeable to thee ? Though much solicitation was not expected on thy part, still, why not wheedle me back, ah! heedless youth to the banquet ! come drain the generous bowl, my boy, at once, for alas ! the vernal season lasts not long enough to keep me to the cup a second time.

FREELY TRANSLATED

35. I often wonder, whether the radiant object of my adoration smiles upon others or not, yet where is the spot that God is not there ?
36. You glorious orb to me appears in every beem : do you also, O ye enlightened ! pray behold if this be really so or not.
37. I am wandering about with the fragments of a broken heart in

- my hand ; say o doctors, if there be any balm for the cementing them or not ?
38. Songstress of the night, I also the mild influence of divine love, were it other wise, what degree noisy praise is there that may voice could not reach.
39. Before thy falchi, this neck of mine indeed is more slender than the finest hair : is so or not O ye daughters of genuine devotion!
40. Is the justice of Providence to blame of is it the fault of my way-ward fate ? do let some people say here, if a tongue be in their head or not.
41. I one day asked of Souda, O wanderer ! hast thou any fixed residence on earth ?
42. All at once becoming enraged, he began to say silly body, is there one atom of sense in thy possession or not ?
43. I have long since with my mind's eye espied a weary wight at the palace gate even of the mighty Fureedon who knocking, rears out" is there any one here or not".

CLOSELY TRANSLATED

35. In my foolish imagination; conceived another possessed not the radiant object of my love-else where is he not ?
36. The sun of the universe in every atom shines to my perception ; look ye enlightened, for a moment and see if he be there or not.
37. A broken heart, I wandering carry within my bosom! have you a cure for this, ye skilful in art ? or have you not ?
38. O nightingale ! I feel the reverence due to love, else what is thy cause of lamentation that I have not ?
39. Before the sword divine, this little neck is smaller than a hair-say, angel, is it not ?
40. Say is my love to blame ? or my hard fate ? tell me who can, is there a tongue to speak or not ?

41. I one day enquired of Souda the pilgrim "hast thou a fixed dwelling place or not ?""
42. Empassioned at the question, abruptly answered "hast thou one particle of reason, friend, or not ?""
43. "Behold ! at the palace gate of the (late) monarch Fureedon, a man calls aloud-is any one here or not?"

PARAPHRASE

35. What else, I oftentimes pensive ween, can various creeds and tenets mean, whence flow the ordent pray'r , but that of mooslim, pagan, jew, must, as the christian's, each be true : for God is everywhere.
36. Thus is one circle we divine, the radii from its bounding line, concentric still unite ; so from the wide extended round of all religions, will be found only lord of lighth.
37. Your solar orb in every ray shines forth the glorious God of day, oft with refracted beam ; on shifting clouds does he retire ? or can the quench his awful fire ? sdeak, sages ! do I dream ?
38. With broken heart and wounded soul, I wandering search from pole to pole, for balm to heel my woes: still not one doctor can I find, like death, to cure my tortur'd mind O come and bring repose.
39. Sweet bird of eve, thy plaintive note could never drown my louder throat, if rev'rence due to love did not silence my moans and sighs, and me turn these streaming eyes, to the great God above.
40. Before whose dreedful sword, this neck is like the cobweb's finest wreck, that floats upon the air, look, agnles ! tell me ay or nay, ye surely can the truth display, and will the whole declare.
41. That providence is just I own, though fortune sternly on me flown ; the fault perhaps is mine ; come cherubs ! teach the soothing plan of calm content to wayward man, and let me not repine.

42. Once I the pilgrim Souda spied, and then in earnest to him
cried, "hast thou no fix'd retreat ?" enraged, responsive, thus
he spoke, "sure, silly friend, you only joke, ? " or never heard
of fate.
43. With reasons eye here take a glance- "through time and space's
vast expanse," (nor blink it with a tear) "at one, by Cesar's
palace doors, " Who knocking there incessant roars, "is any
body here ?"
44. To speak little is becoming, but still never to this degree, that
when a lover's eyes are closing, even than not to open thy
mouth.
45. Like the rose, dearest maid, If thou wantonly show ;
Each charm which those blushes betray,
To thy bosom, from flowers wont the nightingale go;
And there, his fond heart give away.
46. At the dawn see ! my fair her sweet banquet renew, Hark !
Philomel sings from the grove ;
"Fly ye zephyrs and wash with the purest of dew,
"You blossoming cups for my love."
47. Not a grape can I find in this vineyard below,
With one drop of celestial wine.
Nay the heart which I have, is so soured with woe. I wish it had
never mine.
48. Why thus pceevishly threat, "fare you well, I go hence"
My fairest-at once disappear;
The morn's wretchedness now, is less sel-suspence,
(illegible)
Whose train, are hope, passion and (illegible)
49. That meek silence becomes thee we dare not deny,
Yet still may the Fair sympathise ;
Surely none of the sex, can muse, sullen stand by Her lover, when
closing his eyes.

50. Wo is me ! What dire anguish this bosom assails ?
 Dray fountains :- With tears flow amain,
 Ere my heart like those orbs tossed on waves before gales,
 Bursts hapless a bubble of pain.
51. Has not Souda one friend that will kindly enjoin,
 "Go with thy goddess to nigh,
 "And wash every sorrow away, as her shrine,
 "With floods thou wilt shed in her sight.
52. Where are thy kind innocent expressions now, that having
 captivated my heart, thou talkest to me thus? All thy words are
 gibes, and every sentence is raillery.
53. Not a moment without sarcasm, and each breath has become a
 taunting joke.
54. Admiration hath not yet allowed the mirror to sleep, that
 opened its eyes on thy countenance.
55. The capsule of the flower doth not burst with such charms as
 when the garment of the fair gives way.
56. Who hath been walking in the garden, that now the zephyrs
 come over-loaded with the perfumes of blandishment.
57. Come quickly, my beloved, for without thee the clouds are not
 discharging hail, but bullets.
58. Why shouldst thou die the tips of thy fingers with hina, while
 thy can be dipped in the blood of victims (to thy love).
59. The damselss of India have become as cold as ice, and are
 rivalled in affection by the maids of Kabool.
60. The tresses of my love were not in concord with Souda, till the
 comb interposing unravelled their (prejudices) contortions.

PARAPHRASE OF THE ABOVE VERSES

52. Was thy innocent prattle divested of art ?
 That formerly ravish'd my ear,
 With the view of insidiously stealing this heart;

Ah ! whence these harsh words I now hear ?

53. Why thus constantly poison whate'er you express,
With scoffs, gibes, and taunting, unkind ?
Can satire or wit on a lover's distress,
Become a benevolent mind ?
54. Since the morn I beheld thee so lovely and gay,
These eyes have been stangerss to sleep ;
All the night for my fairest I ravingly pray,
Whole days, can do nothing but weep.
55. Not a but where the lily just peers do I see,
So charms its admirer above ;
As the muslim receding can fascinate me,
To gaze on thy snow balls of love.
56. When Aurora from Phoebus comes tripping it by,
Her shape, breath ambrosial, and air,
Are so much my dear nymph's I distractedly cry,
Whence ! Whither ! thus early my fair ?
57. Though you clouds burst with peals we have nothing to fear
Since the skies will relenting avert,
While such innocence, beauty and goodness, are near,
Each shaft but thy own from my heart.
58. If kind nature, not art, lilies, roses, can grace,
With pencil and colours divine,
Shall paint sacrilegiously beauties deface,
Each bloom sees with envy in thine.
59. How Ye damsels of Hind prove more frigid and cool
Than hills cover'd over with snow,
As our genial warm plains, while the maids, of Kabool,
With love amid icicles glow-
60. Are those locks not intended to rivet thy chain !
Fly Souda ! enchantement is there !

What comb hath the power to release thee agian ?
From jetty fell ringlets of hair.

61. Where ever I carried these gushing eyes of mine, I filled the puddles that were drying up, with my tears.
62. I and the nightingale are from the first unfortunate, thy frown is ever on me, and over her is the roses thorn.
63. My complaints think not of giving me rest even in the grave, where I shall probably go to disturb the sleep of thousand.
64. It is impossible to wash out the decrees of fate, my heart is not to blame, and I must submit to whatever may happen to me.
65. Why my mistress be offended at my admiration of thee, I am but a solitary tear, that in the twinkling of an eye, must trickle away.
66. In the definition of a love-sick patient's complaint, Avicenna himself being baffled, and forgetting the whole rules or art (or his own institutes of physic) departed weeping.
67. Hell I can bear, O Moonkir and Nukee, (the two sepulchral catechists) but I have not patience for question and answer (examination)
68. Souda may well say, behold the words condition ! even in spring the nightingale sings, oh alas! alas! and the rosebud sighs ah ! wo is me !
69. What shall I do with such things ? be there preserved, and I remain the humble dust of thy threshold.
70. What will this constant weeping of your's come to, Souda ? Deluge not the world with thy tears, O mad man !
- 71/72. The wind is exhausted, the cup-bearer fled, and my glass is not full ; O heavens, how can I behold the banquet room with these eyes ; the source of elegant composition is dried up, fancy has forsaken the world, and Souda the lunatic alone remains'.

73. Go thou gentle breath of the morning at the earliest dawn of the day, and if my fair one be asleep, let not a leaf rustle (to disturb her).
74. The muses daring wing when invoked, can not escape me, as the soaring falcon of my brilliant fancy is the guide thereof.
75. In short the slaughter of mankind is his employment, so that fate and death are falsely accused.

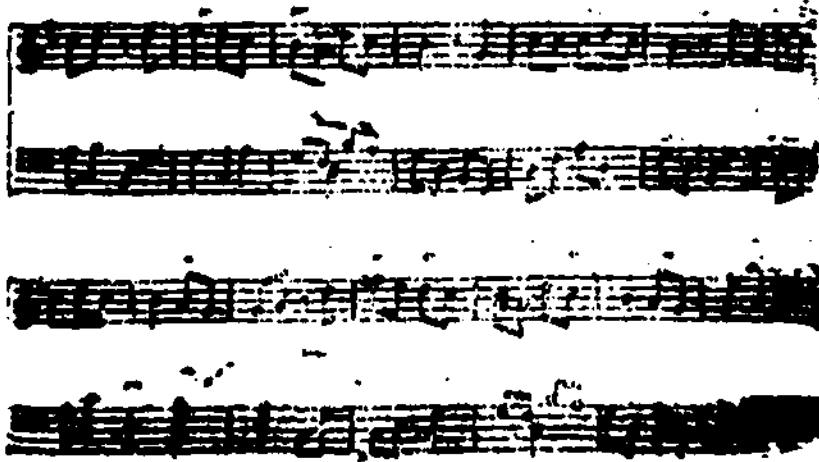
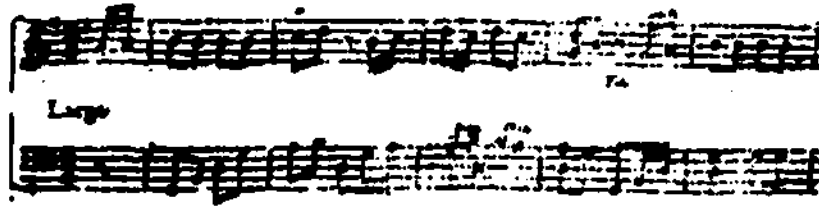
HINDOOSTANE MUSIC.

— — — — —

R. A. 1111. 1111

Rep. from large sheet. On page 155. 9. 11.

کتاب کا نام کیا ہے



سودا کی کہی ہوئی تفسیر کی طرز جو گلکرسٹ نے اپنی کتاب "دی اورینٹل لنگوسٹ" میں دی ہے۔

کتابیات

مائیکرو فلم اور فوٹو سٹیٹ

- ۱۔ آزرده، مفتی صدرالدین، تذکرہ آزرده (فوٹو سٹیٹ) مملوکہ ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو۔
- ۲۔ حیدر بخش حیدری، گلشن ہند (فوٹو سٹیٹ) مملوکہ ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو۔
- ۳۔ ذکا، خوب چند، عیار الشعرا (مائیکرو فلم) دہلی یونیورسٹی لائبریری۔
- ۴۔ سودا، مرزا محمد رفیع سودا، کلیات سودا "نسخہ رچہ ڈیو سن" (مائیکرو فلم) دہلی یونیورسٹی لائبریری۔
- ۵۔ سوز، محمد میر، دیوان میر سوز (مائیکرو فلم) دہلی یونیورسٹی لائبریری۔
- ۶۔ شورش عظیم آبادی، تذکرہ شورش (مائیکرو فلم) دہلی یونیورسٹی لائبریری۔
- ۷۔ عشقی عظیم آبادی، تذکرہ عشقی (مائیکرو فلم) دہلی یونیورسٹی لائبریری۔
- ۸۔ بتلا، غلام محی الدین، طبقات سخن (مائیکرو فلم) خدا بخش لائبریری پٹنہ۔
- ۹۔ بصیم سین، دلکش، (مائیکرو فلم) ہسٹری ڈیپارٹمنٹ، دہلی یونیورسٹی، دہلی۔

قلمی (فارسی)

- ۱۰۔ ابوالحسن امیرالدین (امیر اللہ آبادی) تذکرہ مسرت افزا، خدا بخش لاہوری، پٹنہ۔
- ۱۱۔ ابوالحسن امیرالدین (امیر اللہ آبادی) تذکرہ مسرت افزا، بحوالہ معاصر حصہ ۶
- ۱۲۔ احمد علی سندیلوی، مخزن الغرائب، رضا لاہوری، رام پور۔
- ۱۳۔ احمد علی سندیلوی، مخزن الغرائب، دار المصنفین، اعظم گڑھ
- ۱۴۔ حیرت، قیام الدین، مقالات الشعراء، رضا لاہوری، رام پور
- ۱۵۔ ذکا، خوب چند، عیار الشعراء، انجمن ترقی اردو، علی گڑھ۔
- ۱۶۔ راسخ، عنایت خاں، ذکر مغنیان ہندوستان، بہشت نشان، خدا بخش لاہوری، پٹنہ۔ بحوالہ معاصر حصہ ۶
- ۱۷۔ سلطان علی حسینی صفوی، معدن السعادت، جلد ۴، ایشیا نیک سوسائٹی آف بنگال، کلکتہ
- ۱۸۔ سید ولی اللہ فرخ آبادی، تاریخ فرخ آباد، رضا لاہوری، رام پور۔
- ۱۹۔ حمزہ مارہروی، شاہ محمد، نص الکلمات، رضا لاہوری، رام پور۔
- ۲۰۔ شاکر خاں پانی پتی، تذکرہ شاکر خاں، بحوالہ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات۔
- ۲۱۔ شفیق، کچھی نرائن، گل رعنا، آصفیہ لاہوری، حیدر آباد۔
- ۲۲۔ شوق رام پوری، مولوی قدرت اللہ، طبقات الشعراء، رضا لاہوری، رام پور۔
- ۲۳۔ شوق رام پوری، مولوی قدرت اللہ، طبقات الشعراء، آصفیہ لاہوری، حیدر آباد۔
- ۲۴۔ عبدالقادر چیف رام پوری، روزنامہ، رضا لاہوری، رام پور۔
- ۲۵۔ عاشق عظیم آبادی، حسین قلی خاں، نشتر عشق، رضا لاہوری، رام پور۔

- ۲۶۔ فتوت، عنایت اللہ، ریاض حسنی، سنٹرل ریکارڈ آفس، حیدرآباد۔
- ۲۷۔ کمال، شاہ کمال الدین، مجمع الانتخاب، انجمن ترقی اردو، علی گڑھ۔
- ۲۸۔ کمال، شاہ کمال الدین، مجمع الانتخاب، سالار جنگ میوزیم، حیدرآباد۔
- ۲۹۔ بتلا، مردان علی خاں، گلشن سخن، رضا لاہیری، رام پور۔
- ۳۰۔ واصف، محمد مہدی، معدن الجواہر، آصفیہ لاہیری، حیدرآباد۔
- ۳۱۔ وامق، میر بہادر علی، قصر المظائف، رضا لاہیری، رام پور، بحوالہ نقوش ۱۹۵۸ء
- ۳۲۔ نقش علی، باغ معانی، خدا بخش لاہیری، پٹنہ۔

اُردو (قلمی)

- ۳۳۔ بیان، احسن اللہ خاں، دیوان بیان، آصفیہ لاہیری، حیدرآباد۔
- ۳۴۔ بیان، احسن اللہ خاں، دیوان بیان، سالار جنگ میوزیم، حیدرآباد۔
- ۳۵۔ حاتم، شاہ ظہور الدین، دیوان زادہ حاتم، آزاد لاہیری، علی گڑھ۔
- ۳۶۔ حاتم، شاہ ظہور الدین، دیوان زادہ حاتم، رضا لاہیری، رام پور۔
- ۳۷۔ حسن، میر حسن، دیوان میر حسن، رضا لاہیری، رام پور۔
- ۳۸۔ خلیق انجم، مرزا مظہر جانجاناں (تحقیقی مقالہ) دلی یونیورسٹی لاہیری
- ۳۹۔ ضیفم، محمد عبداللہ، یادگار ضیفم، ادارہ دیات اردو، حیدرآباد۔
- ۴۰۔ رند، مہربان خاں، دیوان رند، ایشیا ٹک سوسائٹی آف بنگال کلکتہ۔
- ۴۱۔ سودا، مرزا محمد رفیع، کلیات سودا، (حبیب سیکشن) آزاد لاہیری، علی گڑھ۔
- ۴۲۔ سودا، مرزا محمد رفیع، کلیات سودا، ادارہ ادبیات اردو، حیدرآباد۔

- ۳۳۔ سودا، مرزا محمد رفیع، قصائد سودا، آصفیہ لائبریری، حیدرآباد۔
- ۳۴۔ سودا، مرزا محمد رفیع، کلیات سودا، خدا بخش لائبریری، پٹنہ۔ بحوالہ نوائے ادب جولائی ۱۹۶۱ء (نسخہ خدا بخش)
- ۳۵۔ سودا، مرزا محمد رفیع، کلیات سودا، خدا بخش لائبریری، پٹنہ، بحوالہ نوائے ادب، جولائی ۱۹۶۱ء (نسخہ نرائن)
- ۳۶۔ سوز، شاہ محمد میر، دیوان سوز، ۵۵۱ء، ۱۸۹۱ء، انجمن ترقی اردو۔ علی گڑھ
س ۳۲ دس
ن ۱
- ۳۷۔ سوز، شاہ محمد میر، دیوان سوز، ۵۵۱ء، ۱۸۹۱ء، انجمن ترقی اردو، علی گڑھ۔
س ۳۲ دس
ن ۲
- ۳۸۔ سوز، شاہ محمد میر، دیوان سوز، ۵۵۱ء، ۱۸۹۱ء، انجمن ترقی اردو، علی گڑھ۔
س ۳۲ دس
ن ۳
- ۳۹۔ مہدی علی خاں، تاریخ لطیف، رضا لائبریری، رام پور۔
- ۵۰۔ ناصر لکھنوی، سعادت خاں، تذکرہ خوش معرکہ زیبا، لکھنؤ یونیورسٹی لائبریری۔
- ۵۱۔ ناصر لکھنوی، سعادت خاں، تذکرہ خوش معرکہ زیبا، آزاد لائبریری، علی گڑھ۔
- ۵۲۔ مولف نامعلوم، قصہ حقیقت برآمدن نادر شاہ بہ شاہجہاں آباد، رضا لائبریری
رام پور

فارسی مطبوعہ

- ۵۳۔ ابوالفضل، اکبر نامہ، مرتبہ عبدالرحیم، جلد سوم، ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال،
کلکتہ، ۱۸۸۶ء

- ۵۴۔ آزاد بلگرامی، میر غلام علی، سرو آزاد، مطبع دہلی رفاه عام، لاہور، ۱۹۵۹ء
- ۵۵۔ آزاد بلگرامی، میر غلام علی، خزانہ عامرہ، مطبع نول کشور لکھنؤ ۱۸۷۱ء
- ۵۶۔ انشاء، انشاء اللہ خاں، دریائے لطافت، انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد۔ ۱۹۱۶ء
- ۵۷۔ تمنا اورنگ آبادی، اسد یار خاں، گل عجائب، مرتبہ مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو۔ اورنگ آباد ۱۹۳۶ء
- ۵۸۔ ٹارنس، سر ہنری، تاریخ نادری، ناقص الاول (نذیریہ لائبریری۔ دہلی)
- ۵۹۔ جگناتھ پرشاد، گلزارِ سخن، نول کشور لکھنؤ ۱۳۳۶ء
- ۶۰۔ حسن، میر حسن، تذکرہ شعراے اردو، مرتبہ مولانا محمد حبیب الرحمن خاں شیروانی، انجمن ترقی اردو، دہلی۔ ۱۹۳۰ء
- ۶۱۔ حمید اورنگ آبادی، خولجہ خاں، گلشن گفتار، مرتبہ سید محمد، سلسلہ مطبوعات مکتبہ ابراہیمیہ، ۱۳۳۹ف
- ۶۲۔ حمید الدین خاں، منچہ عالم گیری، احکام عالم گیری، مرتبہ جادو ناتھ سرکار، ایم۔ سی۔ سرکار اینڈ سنز، کلکتہ، ۱۹۱۲ء
- ۶۳۔ خلیل، علی ابراہیم خاں، گلزارِ ابراہیم، مرتبہ سید محی الدین قادری زور، مطبع مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ ۱۹۳۳ء
- ۶۴۔ خوش گو، بندرا بن داس، تذکرہ خوش گو، مرتبہ سید شاہ محمد عطاء الرحمن عطا کاکوی، سلسلہ انتشارات ادارہ تحقیقات عربی و فارسی، پٹنہ۔ ۱۹۵۹ء
- ۶۵۔ درگاہ قلی خاں، (نواب ذوالقدر) مرتفع دہلی، تاج پریس، حیدر آباد۔
- ۶۶۔ دولت یار جنگ نصر اللہ داستان ترک تازان ہند، جلد اول و دوم، مطبع دت پرشاد، بمبئی۔ ۱۳۱۰ھ

- ۶۷۔ سرور، میر محمد خاں بہادر، عمدہ منتخبہ، مرتبہ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، دہلی یونیورسٹی، دہلی۔ ۱۹۶۱ء
- ۶۸۔ شاہ غلام علی، مقامات مظہری، مطبع مجتہائی، دہلی۔ ۱۳۰۹ھ
- ۶۹۔ شاہ نواز خاں (نواب مصصام الدولہ) ماثر الامراء، مرتبہ مولوی عبدالرحیم، جلد اول، ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، کلکتہ۔ ۱۸۹۱ء
- ۷۰۔ شفیق، کچھی نارائن، چمنستان شعراء، مرتبہ عبدالحق، انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد۔ ۱۹۲۸ء
- ۷۱۔ شورش عظیم آبادی، تذکرہ شورش، (دو تذکرے) مرتبہ کلیم الدین احمد (دو جلدیں) لیبل لیتھو پریس۔ پٹنہ، پہلی جلد ۱۹۵۹ء دوسری جلد ۱۹۶۳ء
- ۷۲۔ شیفہ، نواب مصطفیٰ خاں، گلشن بے خار، مطبع نول کشور، لکھنؤ۔ ۱۸۷۳ء
- ۷۳۔ صدیق حسن خاں، شمع انجمن، سیر المطالع شاہجہانی، بھوپال۔ ۱۲۹۳ھ
- ۷۴۔ عبدالقادر بدایونی، منتخب التواریخ، جلد دوم، ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، کلکتہ۔ ۱۸۶۴ء
- ۷۵۔ علی احمد خاں، مرات احمدی، مرتبہ سید نواب علی، جلد اول، اورینٹل انسٹی ٹیوٹ، بڑودہ۔ ۱۹۲۸ء
- ۷۶۔ عشق عظیم آبادی، تذکرہ عشق، دو تذکرے، مرتبہ کلیم الدین احمد، (دو جلدیں) لیبل لیتھو پریس پٹنہ، پہلی جلد ۱۹۵۹ء دوسری جلد ۱۹۶۳ء
- ۷۷۔ غلام حسین طباطبائی، سیر المتاخرین، جلد دوم و سوم، مطبع نول کشور، لکھنؤ۔ ۱۸۹۷ء
- ۷۸۔ فتح علی حسینی گردیزی، (سید) تذکرہ ریختہ گویاں، مرتبہ مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد۔ ۱۹۳۳ء

- ۷۹۔ فرائی، کنور پریم کشور، وقائع عالم شاہی، مرتبہ مولانا امتیاز علی خاں عریقی، کتب خانہ رامپور۔ ۱۹۴۹ء
- ۸۰۔ قاسم، شیخ محمد قیام الدین، مخزن نکات، مرتبہ مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو اورنگ آباد۔ ۱۹۴۹ء
- ۸۱۔ قاسم، حکیم قدرت اللہ، مجموعہ نغز، مرتبہ محمود شیرانی، سلسلہ نشریات کلیہ پنجاب، لاہور۔ ۱۹۳۳ء
- ۸۲۔ کنور درگا پرشاد، بوستان اودھ، احمد پریس لکھنؤ۔ ۱۸۹۲ء
- ۸۳۔ محمد کاظم (منشی)، عالم گیر نامہ، مرتبہ مولوی خادم حسین و مولوی عبدالحق، ایشیا ٹک سوسائٹی آف بنگال، کلکتہ۔ ۱۸۶۸ء
- ۸۴۔ محمد ساقی مستعد خاں، آثار عالم گیری، مرتبہ آغا احمد علی، ایشیا ٹک سوسائٹی آف بنگال، کلکتہ۔ ۱۸۷۱ء
- ۸۵۔ محمد ہاشم خانی خاں، منتخب اللباب، مرتبہ مولوی کبیر الدین احمد، ایشیا ٹک سوسائٹی آف بنگال، کلکتہ۔ ۱۸۷۴ء
- ۸۶۔ مصطفیٰ، غلام ہمدانی، عقد ثریا، مرتبہ عبدالحق، انجمن ترقی اردو، دہلی۔ ۱۹۳۴ء
- ۸۷۔ مصطفیٰ، غلام ہمدانی، عقد ثریا، مرتبہ عبدالحق، انجمن ترقی اردو اورنگ آباد۔ ۱۹۳۴ء
- ۸۸۔ میر، میر تقی، نکات اشعرا، مرتبہ عبدالحق، انجمن ترقی اردو اورنگ آباد۔ ۱۹۳۵ء
- ۸۹۔ میر، میر تقی، ذکر میر، مرتبہ مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو اورنگ آباد۔ ۱۹۲۸ء
- ۹۰۔ نعیم اللہ بہراچکی، معمولات مظہریہ، مطبع نظامی، کانپور۔ ۱۲۷۵ھ
- ۹۱۔ ہندی، بھگوان داس، سفینہ ہندی، مرتبہ محمد عطاء الرحمن عطا کاکوی، ادارہ تحقیقات عربی و فارسی، پٹنہ۔ ۱۹۵۸ء

- ۹۲۔ حکیم احمد علی خاں، دستور الفصاحت، مرتبہ امتیاز علی خاں عرشی، سلسلہ مطبوعات کتاب خانہ ریاست رام پور۔ ۱۹۴۳ء

اُردو مطبوعہ

- ۹۳۔ اثر، سید امداد امام، کاشف الحقائق، جلد دوم، مکتبہ معین الادب، لاہور۔ ۱۹۵۶ء
- ۹۴۔ اثر کا کوری، عبدالرفیع علوی، نیرنگ سودا، لالہ رام نرائن لعل بک سیلر الہ آباد، ۱۹۳۵ء
- ۹۵۔ اثر لکھنوی، مرزا جعفر علی خاں، انیس کی مرثیہ نگاری، دانش محل، لکھنؤ۔ ۱۹۵۱ء
- ۹۶۔ احمد علی خاں شوق (حافظ) تذکرہ کاملان رام پور، ہمدرد پریس، دہلی ۱۹۲۹ء
- ۹۷۔ ادیب، سید مسعود حسن رضوی، روح انیس، کتاب نگر، دین دیال روڈ، لکھنؤ۔ ۱۹۵۶ء
- ۹۸۔ آرزو، مختار الدین احمد (مرتب)، احوال غالب، انجمن ترقی اردو، علی گڑھ۔ ۱۹۵۲ء
- ۹۹۔ آزاد، محمد حسین، آب حیات، رفاہ عام اسٹیم پریس، لاہور، بار ہشتم، ۱۹۱۳ء
- ۱۰۰۔ اسلم پرویز، انشا اللہ خاں انشا، مکتبہ شاہراہ، دہلی، ۱۹۶۱ء
- ۱۰۱۔ اشپرنگر، یادگار شعرا، مترجمہ طفیل احمد، ہندوستانی اکیڈمی، الہ آباد۔ ۱۹۴۳ء
- ۱۰۲۔ امیر بینائی، مفتی امیر احمد، انتخاب یادگار، رام پور، ۱۲۹۰ھ
- ۱۰۳۔ بشاش، دبی پرشاد، آثار شعراے ہندو، مطبع رضوی، ۱۸۸۵ء
- ۱۰۴۔ بے خبر، پنڈت برج کشن کول، بہار گلشن کشمیر، جلد اول، انڈین پریس لمیٹڈ، الہ آباد۔ ۱۹۳۱ء

- ۱۰۵۔ تنہا، محمد یحییٰ، مرآۃ شعراء، عالم گیر الیکٹریک پریس، لاہور
- ۱۰۶۔ ثابت رضوی، حیاتِ دبیر، مطبع سیوک اسٹیم پریس، لاہور، ۱۹۱۳ء
- ۱۰۷۔ جرأت، شیخ قلندر بخش، کلیاتِ جرأت، مطبع کارنامہ لکھنؤ ۱۸۸۳ء
- ۱۰۸۔ جان شیکسپیر، منتخباتِ ہندی، جلد دوم، لندن ۱۸۲۵ء
- ۱۰۹۔ جلال الدین جعفری، تاریخ قصائد اردو، مطبع انوار احمدی، الہ آباد
- ۱۱۰۔ حالی، الطاف حسین، مقدمہ شعر و شاعری، مرتبہ تنویر احمد علوی، مسلم ایجوکیشنل پریس، علی گڑھ
- ۱۱۱۔ خواجہ احمد فاروقی، میر تقی میر، حیات اور شاعری، انجمن ترقی اردو علی گڑھ۔ ۱۹۵۷ء
- ۱۱۲۔ رام بابو سکسینہ، تاریخ ادب اردو، مترجمہ مرزا محمد عسکری، راجہ رام کمار پریس، لکھنؤ۔ ۱۹۵۲ء
- ۱۱۳۔ رشید احمد صدیقی، طنزیات و مضحکاتِ اردو، ہندوستانی اکیڈمی، الہ آباد۔
- ۱۱۴۔ رفعت، ابوالفضل محمد عباس، تذکرہ ماہور خشاں، مطبع شاہجہانی، ۱۸۹۲ء
- ۱۱۵۔ رنگین، سعادت یار خاں، مجالس رنگین، مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب، نظامی پریس لکھنؤ، ۱۹۲۹ء
- ۱۱۶۔ زور، سید محی الدین قادری، سرگزشتِ حاتم، ادارہ ادبیاتِ اردو، ۱۹۴۴ء
- ۱۱۷۔ سری رام (لالہ) خم خانہ جاوید، جلد چہارم، ہمدرد پریس، دہلی، ۱۹۲۶ء
- ۱۱۸۔ سلام سندیلوی، رباعیاتِ اردو، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ، ۱۹۶۳ء
- ۱۱۹۔ سودا، مرزا محمد رفیع، کلیاتِ سودا، مرتبہ میر عبدالرحمن آہی، مطبع مصطفائی دہلی، ۱۲۷۲ھ

- ۱۲۰۔ سودا، مرزا محمد رفیع، کلیات سودا، مطبع نول کشور، کانپور، ۱۹۱۶ء
- ۱۲۱۔ سودا، مرزا محمد رفیع، کلیات سودا، مرتبہ عبدالباری آسی، مطبع نول کشور لکھنؤ، ۱۹۳۲ء
- ۱۲۲۔ سید عبداللہ، بحث و نظر، مکتبہ اردو، لاہور، ۱۹۵۲ء
- ۱۲۳۔ سید عبداللہ، تقدیر میر، جہانگیر بکڈ پو، دہلی
- ۱۲۴۔ سید عبدالحی (حکیم) گل رعنا، مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۳۴۰ھ
- ۱۲۵۔ شاہ ولی اللہ، شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات، مرتبہ و مترجمہ خلیق احمد نظامی، سلسلہ تصانیف مشائخ، دہلی، ۱۹۵۰ء
- ۱۲۶۔ شبلی نعمانی، موازنہ انیس و دبیر، شیخ مبارک علی اینڈ سنز، لاہور۔
- ۱۲۷۔ شبلی نعمانی، شعر العجم، جلد پنجم، شیخ مبارک علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۴۴ء،
- شوق، احمد علی خاں دیکھیے احمد علی خاں
- ۱۲۸۔ شیخ چاند، سودا، انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد، ۱۹۳۶ء
- ۱۲۹۔ صابر علی خاں، سعادت یا رخاں رنگین، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۵۶ء
- ۱۳۰۔ عبدالرزاق قریشی، مرزا مظہر جانجاناں اور ان کا کلام، ادبی پبلشرز، ممبئی، ۱۹۶۱ء
- ۱۳۱۔ عبدالسلام ندوی، شعر الہند، (جلد اول)، مطبع معارف اعظم گڑھ، ۱۹۴۹ء
- ۱۳۲۔ غالب، اسد اللہ خاں، خطوط غالب، مرتبہ غلام رسول مہر، کتاب منزل، لاہور
- ۱۳۳۔ قازدہلوی، نواب صدر الدین خاں، قازدہلوی اور اس کا دیوان، مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب، انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی، ۱۹۴۶ء
- ۱۳۴۔ فراق، ناصر نذیر، میخانہ درد، جید برقی پریس، دہلی، ۱۳۴۴ھ
- ۱۳۵۔ فراق گورکھپوری، اندازے، ادارہ انیس اردو، الہ آباد، ۱۹۵۹ء
- ۱۳۶۔ قائم، قیام الدین، دیوان قائم، مرتبہ ڈاکٹر خورشید الاسلام، جمال پریس، دہلی

- ۱۳۷۔ قاضی عبدالودود، عیارستان، سلسلہ مطبوعات ادارہ تحقیقات اردو، پٹنہ ۱۹۵۷ء
- ۱۳۸۔ کیفی، پنڈت برج موہن دتاتریہ، کیفیہ، انجمن ترقی اردو، دہلی ۱۹۴۲ء
- ۱۳۹۔ کیفی جریا کوٹی، محمد مبین، جواہر نخن، جلد دوم، ہندوستانی اکیڈمی، الہ آباد ۱۹۳۵ء
- ۱۴۰۔ گارساں دتاسی، تاریخ ادبیات، (فرانسیسی) جلد سوم، بحوالہ معاصر حصہ ۲
- ۱۴۱۔ لطف، مرزا علی، گلشن ہند، مرتبہ مولوی شبلی اور مولوی عبدالحق، رفاہ عام شمیم پریس، لاہور ۱۹۰۶ء
- ۱۴۲۔ محمد ابواللیث صدیقی، لکھنؤ کا دبستان شاعری، سلسلہ مطبوعات مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۱۹۳۴ء
- ۱۴۳۔ محمد عتیق صدیقی، گلکرسٹ اور اس کا عہد، انجمن ترقی اردو، علی گڑھ، ۱۹۶۲ء
- ۱۴۴۔ مظہر مرزا مظہر جانجاناں، مرزا مظہر جانجاناں کے خطوط، مترجمہ و مرتبہ خلیق انجم، مکتبہ برہان، دہلی ۱۹۶۲ء
- ۱۴۵۔ میر، میر تقی، کلیات میر، مرتبہ عبدالباری آسی، مطبع نول کشور، لکھنؤ ۱۹۴۰ء
- ۱۴۶۔ میر تقی میر، میر کی آپ بیتی، مترجمہ ثارا احمد فاروقی، مکتبہ برہان، دہلی ۱۹۷۵ء
- ۱۴۷۔ نجم الغنی، بحر الفصاحت، نول کشور، لکھنؤ ۱۹۲۶ء
- ۱۴۸۔ نجم الغنی، تاریخ اودھ، نول کشور، لکھنؤ ۱۹۱۹ء پہلی تین جلدیں
- ۱۴۹۔ نساخ، مولوی عبدالغفور، گنج تواریخ، مطبع نول کشور، ۱۹۷۵ء
- ۱۵۰۔ نساخ، مولوی عبدالغفور، سخن شعرا، نول کشور، ۱۲۹۱ھ
- ۱۵۱۔ نور الحسن ہاشمی، دلی کا دبستان شاعری، انجمن ترقی اردو (ہند)
- ۱۵۲۔ یقین، انعام اللہ خاں، دیوان یقین، مرتبہ فرحت اللہ بیک، مطبع مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ۱۹۳۰ء

اردو رسالے

- ۱۵۳۔ اردو ادب، علی گڑھ، اکتوبر ۱۹۵۰ء
- ۱۵۴۔ اردوئے معلیٰ، غالب نمبر، دہلی یونیورسٹی، دہلی ۱۹۶۰ء

- ۱۵۵۔ اورینٹل کالج میگزین، لاہور، نومبر ۱۹۴۳ء
- ۱۵۶۔ دلی کالج میگزین، دلی نمبر
- ۱۵۷۔ سب رس، حیدرآباد، نومبر ۱۹۶۰ء
- ۱۵۸۔ سویرا، لاہور، خاص نمبر، ۲۹
- ۱۵۹۔ علی گڑھ میگزین، طنز و طعنت نمبر، ۱۹۵۳ء
- ۱۶۰۔ معاصر حصہ۔ ۱
- ۱۶۱۔ معاصر حصہ۔ ۲
- ۱۶۲۔ معاصر حصہ۔ ۱۵
- ۱۶۳۔ معاصر حصہ۔ ۱۸
- ۱۶۴۔ معاصر جولائی، ۱۹
- ۱۶۵۔ معارف، اعظم گڑھ، جولائی ۱۹۵۲ء
- ۱۶۶۔ مجلہ عثمانیہ، دکنی ادب نمبر، ۱۹۶۳ء
- ۱۶۷۔ نقوش، لاہور، اکتوبر ۱۹۵۸ء
- ۱۶۸۔ نقوش، لاہور، مئی ۱۹۶۱ء
- ۱۶۹۔ نقوش، لاہور، دسمبر ۱۹۶۱ء
- ۱۷۰۔ نقوش، لاہور، طنز و مزاح نمبر
- ۱۷۱۔ نگار، لکھنؤ، اگست ۱۹۲۸ء
- ۱۷۲۔ نگار، لکھنؤ، جنوری و فروری ۱۹۵۷ء
- ۱۷۳۔ نوائے ادب، بمبئی، جنوری ۱۹۵۲ء
- ۱۷۴۔ نوائے ادب، بمبئی، اپریل ۱۹۵۶ء
- ۱۷۵۔ نیا دور، لکھنؤ، نومبر ۱۹۶۱ء
- ۱۷۶۔ ہماری زبان، علی گڑھ، یکم مارچ ۱۹۵۹ء
- ۱۷۷۔ ہماری زبان، علی گڑھ، ۸ مارچ ۱۹۵۹ء

179. Bal Krishan, Commercial Relation Between India and England. George Routledge & Sons, Ltd. London, 1924

180. **Bernier F. Travels in the Mogul Empire, tr. A. Constable, 2 Ed, London, 1916**
181. **Fraser James, History of Nadir Shah. 2.Ed. A Miller London, 1742.**
182. **Gilchrist J., The Stanger's Infallible East India Guide, London, 1820.**
183. **Gilehrist J., Grammer of the Hindoostanee Language, Etc, Chronicle Press, Calcutta 1796**
184. **Gilehrist J, The Oriental Linguist, Chronicle Press, Calcutta, 1798.**
185. **Irfan Habib, The Agrarian System of Mughal India (1556-1707) Deptt. of History, Aligarh Muslim University, 1963**
186. **Kalinker Datt. Survey of India's Social Life and Economic Condition in the 18th Century, Firma K.L. Mukhpadhyay, Calcutta, 1961**
187. **Majumdar R.C., An Advance History of India, MacMillan & Co. Ltd. London, 1960**
188. **Manrique, F.S., Travels, 1629-43, tr.C.E. Luard, Vol. II, Hakluyt Society London, 1927**
189. **Manucci N. Storia Do Mogor, Vol.II, tr. W. Irvine, John Murray, Albemarle Street, London, 1907**
190. **Ralph Fitch, Narrative, ed. J.H. Ryley, Ralph Fitch, England's Poineer to India and Burma, London, 1899**
191. **Sarkar, J.N., Fall of Mughal Empire, Vol. I, M.C. Sarkar & Sons, Calcutta.**

192. Sarkar, J.N. Studies in Aurangzib's Reign, M.C. Sarkar & Sons Ltd. Calcutta, 1933
193. Satish Chandra, Parties & Politics at the Mughal Court, Deptt. of History, Aligarh Muslim University, 1959
194. Shelvankar K.S., The Problem of India, Penguin Books Limited, Newyork, 1940
195. Thompson E. and G.T. Garratt, Rise and Fulfilment of British Rule In India, Central Book Depot, Allahabad, 1962
196. Williamms M., Sanskrit-English Dictionary Clarendon Press, 1899.
१९६. धीरेन्द्र वर्मा, हिन्दी साहित्य कोश, बनारस, १९५८।
१९७. रामधन शर्मा, कूटकाव्य, दिल्ली, १९६३।
१९८. कृष्णलाल हन्स, निमाड़ी और उसका साहित्य, इलाहाबाद, १९६०।

اشخاص

- ابوطالب، مرزا : ۷۲، ۷۱، ۷۰-
 ابو الفضل : ۲۸-
 ابن انشا : ۱۳۳-
 ابن زیاد : ۳۰۷-
 ابن نشاطی : ۳۵۵-
 اثر : ۱۶۷-
 احسن، مرزا احسن علی : ۲۹۱، ۵۲۸، ۵۳۱-
 احسن، احسن اللہ : ۱۴۹-
 احمد شاہ : ۴۱-
 احمد، کلیم الدین : ۲۵۷، ۲۵۸، ۴۱۲-
 ادیب، مسعود حسن رضوی : ۳۴۲-
 ارسطو : ۱۴۸-
 اسد، میر اسد علی : ۵۳۳-
 اسد، میرامانی : ۳۱۹، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵-
 اسلم پرویز، ڈاکٹر : ۲۰، ۴۸-
 اشتیاق، شاہ ولی اللہ : ۱۴۹-
 اشپرنگر : ۷۰، ۸۲، ۱۱۸، ۵۳۷، ۵۹۶، ۵۹۷-
 ۵۹۷-
 اصلح الدین : ۳۲۶-
 اعظم خاں : ۵۱، ۵۲-
 اعلا علی، میر : ۳۱۹-
 افسری : ۲۹۰-
 افسوس، میر شیر علی : ۴۲۳-
 اکبر : ۲۳، ۲۵، ۲۹، ۲۳۶، ۶۰۱-
 اکسیر : ۲۳۷-
 الفت : ۵۲۷-
 امام اصغر : ۲۸۷-
 امام باقر : ۱۴۶، ۲۳۵-
 امام تقی : ۲۳۵-
 امام جعفر صادق : ۲۳۵-
 امام حسین : ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۴۱-
 امام رضا : ۴۶۱-
 امام، سید امداد : ۱۶۷-
 امام ضامن : ۲۳۵، ۲۵۱، ۵۰۷-
 امام عسکری : ۲۳۵، ۴۶۲-
 امام مہدی : ۲۳۵، ۲۳۳، ۲۵۲، ۲۵۴-
 ۲۵۴-

- امام کاظم: ۲۳۵۔
امید، قزلباش خاں: ۱۳۶۔
امیر الدین
دیکھیے:
ابوالحسن، امیر الدین
امیر، محمد یار خاں: ۱۱۳۔
امیر مینائی: ۵۶۵، ۵۲۵۔
امین الدولہ: ۵۵۷۔
انتظام الدولہ، نواب: ۱۱۱۔
انسان، اسد یار خاں: ۱۳۶۔
انشاء، انشا اللہ خاں: ۲۶۰، ۲۲۰، ۱۷۳، ۱۰۴، ۲۶۰، ۲۲۰، ۱۷۳، ۱۰۴، ۲۶۰، ۲۲۰، ۱۷۳، ۱۰۴۔
اندر داؤ: ۴۵۔
انور، منوہر سہائے: ۱۳۶۔
انوری: ۱۶۵، ۱۶۶، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۵، ۲۳۴، ۲۳۳، ۱۶۶، ۱۶۵۔
۲۵۸۔
انیس: ۳۳۱، ۳۲۲۔
اودھم بائی: ۵۱، ۵۰۔
اورنگ زیب: ۳۲، ۳۱، ۲۷، ۲۶، ۲۳، ۳۲، ۳۱، ۲۷، ۲۶، ۲۳۔
- ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۱۳۳، ۱۳۴۔
۶۰۱، ۳۳۲۔
ایاخی: ۲۳۰۔
ایرانی، سعادت خاں: ۴۷۔
بابر، مرزا: ۵۳۹۔
باسط، خواجہ: ۱۵۸۔
بحری: ۲۳۰۔
بدایونی، عبدالقادر: ۲۵۔
برہان الملک: ۱۱۰۔
برنیئر: ۲۶، ۲۵۔
برہمن، چندر بھان: ۱۴۱۔
بکشل، مرزا ابچو بیگ: ۵۳۷۔
بسنت، اسد خوانی، خواجہ: ۵۳۔
بسنت خاں، نواب: ۲۳۶، ۲۳۵۔
بشاش: ۵۹۵۔
بقا: ۲۷۵، ۲۷۴، ۱۲۳۔
بلگرامی، مرتضیٰ حسین: ۳۵۔
بگلش، نواب احمد خاں: ۱۱۲، ۱۱۰، ۹۸۔
۶۰۳، ۱۱۵، ۱۱۴، ۱۱۳۔

- بہار، فیک چند: ۱۳۶۔
 بھٹ، ڈاکٹر محمد حمید اللہ: ۱۹، ۱۵۔
 بھیم سین: ۲۸۔
 بیان، احسن اللہ خاں: ۱۵۵، ۱۵۲، ۴۷۔
 ۵۲۶، ۴۸۳، ۴۸۲، ۴۸۱، ۴۸۰، ۴۸۴۔
 بیتاب، محمد اسماعیل: ۱۴۸۔
 بیدار: ۲۳۰۔
 بیدل، مرزا عبدالقادر: ۱۳۶، ۱۳۵، ۱۰۲۔
 ۴۲۸، ۴۹۰، ۲۲۳، ۱۶۵۔
 بیرنگ، دلاور خاں: ۱۴۸۔
 پرشاد، جگ ناتھ: ۸۶۔
 پرورش: ۵۴۰۔
 پلیسیرٹ: ۳۰۔
 تاباں، عبدالحی: ۳۶۷۔
 تسلیم، محمد انوار حسین: ۸۶۔
 تمکین: ۸۸۔
 تنہا، اسد علی خاں اورنگ آبادی: ۳۹۶۔
 تنہا، مولوی محمد یحییٰ: ۴۱۰۔
 تھامس رو: ۲۵۔
 ٹکلیٹ رائے، راجا: ۴۲۲، ۴۲۱، ۴۶۰۔
 ثابت رضوی، سید افضل حسین: ۳۲۳۔
 ثاقب، شہاب الدین: ۱۴۸۔
 ثاقب، سید شمس الدین: ۱۴۷۔
 ثناء، شیخ آیت اللہ: ۲۹۰۔
 جاٹ، سورج مل: ۱۱۳، ۱۱۲، ۱۱۱۔
 جاتی، مولوی: ۲۹۰، ۲۸۴، ۱۶۲۔
 جان برستو: ۱۲۰۔
 جانیاناں، مرزا مظہر: ۵۷، ۵۵، ۴۹۔
 ۸۷، ۱۰۳، ۱۱۳، ۱۳۳، ۱۳۲، ۱۳۷، ۱۶۹۔
 ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۶۲، ۱۷۱، ۲۶۰، ۲۷۳۔
 ۴۸۰، ۵۲۶، ۵۲۸، ۵۴۳۔
 جان گلکرسٹ: ۱۸، ۴۲۳، ۶۰۶۔
 جانم، برہان الدین: ۳۵۵۔
 جاوید رحمانی: ۲۰۔
 جرأت، قلندر بخش: ۷۳، ۷۲، ۱۶۰، ۱۷۳۔
 ۲۲۰، ۴۰۵، ۴۸۰، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۳۸۔
 ۶۰۳، ۵۶۵۔
 جسونت سنگھ: ۶۹، ۶۷۔
 جعفر زٹلی، میر: ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۴۲۔

- حضرت قاسم: ۳۴۱۔
 خاں، اسٹیل قلی: ۶۷۔
 حکیم آفتاب: ۲۶۹، ۶۱۔
 خاں، اشرف علی: ۲۸۹، ۹۵، ۲۹۰، ۲۹۱،
 حکیم غوث: ۶۰۸، ۴۵۶۔
 ۲۹۲، ۲۹۴، ۵۷۴۔
 خارجی، مولوی ساجد: ۴۶۴، ۴۶۵۔
 خاٹائی: ۲۳۳، ۲۳۵، ۲۵۸، ۳۹۰،
 خاں، تیر انداز: ۵۹۶، ۵۹۷۔
 ۳۹۹، ۴۰۵، ۴۱۰، ۴۰۴۔
 خاں، جاں نثار: ۶۸۔
 خاکسار: ۹۷۔
 خاکی: ۱۴۰۔
 خالص، امتیاز خاں: ۲۹۱۔
 خاں، جمید الدین: ۶۸، ۵۳۸۔
 خان آرزو: ۴۷، ۴۳، ۵۲۵، ۵۲۶، ۶۰۲،
 خاں، خواجہ حمید اورنگ آبادی: ۳۲۱،
 ۶۰۳۔
 ۳۹۳۔
 خان، ماشاء اللہ: ۲۶۹۔
 خان، محمد راغب: ۲۹۴۔
 خان، مرشد قلی: ۶۳، ۶۵، ۶۶، ۶۷،
 خان، سید محمد یونس: ۵۲۸۔
 خان، دو راں: ۲۶۔
 خان، رشید حسن: ۲۰۔
 خان، سرفراز الدولہ حسن رضا: ۱۲۰، ۱۲۲،
 خان، ابرارہیم علی: ۸۹۔
 ۲۳۵، ۲۵۱، ۲۵۶، ۵۲۸، ۵۲۹۔
 خان، ابوالمصور صفدر جنگ: ۵۶۷۔
 خان، امجد علی: ۲۴۷۔
 خان، امجد علی: ۵۶۴۔
 خان، امجد علی: ۵۶۴۔

- خاں، شاہ عالم: ۲۹۔
 خاں، شرف الدین علی: ۱۳۶۔
 خاں، شیدی فولاد: ۳۵۲، ۳۶۵، ۳۶۴۔
 ۳۵۶، ۳۵۴، ۳۵۳۔
 خاں، عبدالباقی: ۵۳۸۔
 خاں، عبدالرحمن قندھاری: ۵۶۲۔
 خاں، علی ابراہیم: ۸۶۔
 خاں، علی مردان: ۶۸، ۶۷، ۶۵، ۶۴۔
 خاں، غازی الدین: ۱۱۰، ۱۱۶، ۲۳۵، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۵۰، ۲۵۳، ۲۵۵، ۲۵۶۔
 ۵۴۰، ۲۹۷۔
 خاں، غلام حسین: ۵۵۳۔
 خاں، غلام داؤد: ۲۹۔
 خاں، غلام عسکری: ۱۱۳۔
 خاں، فتح علی: ۴۷۹۔
 خاں، فولاد
 دیکھیے:
 خاں، شیدی فولاد۔
 خاں، قمر الدین: ۵۵۔
 خاں، کاظم بیگ: ۵۶۷۔
 خاں، کاظم علی، ڈاکٹر: ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴۔
 ۲۲۳، ۲۲۲، ۲۱۹، ۱۲۹۔
 خاں، ماشاء اللہ: ۲۶۹۔
 خاں، محمد راغب: ۲۹۴۔
 خان: مرشد قلی: ۶۳، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸۔
 ۶۰۴، ۶۹۔
 خان، معالج: ۳۰۰۔
 خان، منصور علی: ۳۴۵۔
 خان، مہربان: ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۸۶۔
 خان، نجف: ۳۱۱۔
 خان، نواب احمد علی خاں: ۱۰۵، ۱۰۶۔
 ۲۵۵۔
 خان، نواب افضل: ۵۳۳۔
 خان، نواب درگاہ قلی: ۵۱، ۵۶۔
 خان، نواب ذوالفقار: ۱۰۱۔
 خان، نواب ضابطہ: ۳۱۱۔
 خان، نواب علی محمد: ۲۹۔
 خان، نواب محمد یار: ۵۶۴۔

- خاں، نواب نصیر الدین: ۴۰۲۔
 خاں، نور علی: ۱۲۲۔
 خسرو: ۸۱، ۸۰، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۱، ۱۶۲، ۲۵۸، ۲۹۰۔
 خضر: ۱۷۰۔
 خلیق انجم، ڈاکٹر: ۱۷، ۱۸، ۲۰، ۱۲۲، ۳۲۲۔
 خلیل علی ابراہیم خاں: ۵۹۴، ۵۵۶۔
 خنجر خاں: ۶۸۔
 خوش حال خاں: ۶۶۔
 خورشید الاسلام، ڈاکٹر: ۵۶۳۔
 داراشکوہ: ۶۵، ۶۷، ۶۸، ۶۹۔
 داغ: ۵۲۵، ۴۳۱۔
 داتا، فضل علی: ۱۴۷، ۹۷۔
 دبیر: ۳۳۱، ۳۲۲۔
 در، خواجہ میر: ۳۵، ۴۹، ۵۵، ۸۶، ۸۸، ۹۳، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۶، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۶۷، ۱۷۸، ۱۹۹، ۲۲۰، ۲۷۹، ۳۱۵، ۳۱۶، ۵۶۵، ۵۵۶، ۴۰۵۔
 دردمند، محمد فقیہ: ۱۵۲، ۴۷، ۶۰۳۔
 دیتی: ۲۵۸۔
 دل: شاہ فتح محمد: ۱۳۹۔
 دیال داس، جبالہ: ۶۹۔
 ذکا، اولاد محمد خاں: ۱۱۴، ۹۴۔
 ذکا، خوب چند: ۳۳، ۵۳۲، ۵۳۷، ۵۳۹، ۵۶۲، ۵۸۰، ۶۰۲۔
 ذوق، شیخ محمد ابراہیم: ۷۸، ۲۳۱، ۲۳۲، ۱۶۰۔
 ذوقی: ۴۷۷۔
 راج، عنایت خاں: ۶۴، ۶۷، ۳۵۶، ۶۰۲۔
 راقم، بندر ابن: ۴۸۲، ۵۴۲، ۵۴۸، ۵۴۹۔
 رتن راٹھور: ۶۹۔
 رچرڈ جونسن: ۱۸، ۳۰، ۱۲۲، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۳۱، ۴۳۸، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۶، ۴۶۰، ۴۷۵، ۴۷۷، ۴۷۹، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۳، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۲، ۵۰۴، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۲، ۵۱۳۔
 رستی، بکمال خاں: ۲۳۰۔

- رضا، مرزا احسن رضا: ۵۵۱، ۵۴۹۔
 رفعت، ابو الفضل محمد عباس: ۵۳۹۔
 رند، لالہ کھیم نرائن: ۹۴۔
 رند، مہربان خاں: ۱۱۰، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۲۳۵، ۲۵۶، ۲۸۸، ۳۲۲، ۳۲۵، ۳۲۶۔
 سردار پٹیل: ۴۵۔
 سرکار، جادو ناتھ: ۳۲۔
 سرفراز الدولہ، نواب: ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۵۱، ۲۵۵، ۲۵۶، ۵۲۸۔
 سرہنری ٹارنس: ۳۸۔
 سری رام شرما: ۲۹، ۷۷، ۷۸۔
 سری رام، لالہ: ۴۰۹۔
 سعادت علی: ۵۲۵۔
 سعدی: ۸۱، ۱۳۸، ۱۶۲، ۱۵۷، ۲۲۳، ۲۸۶، ۲۹۰، ۴۰۶، ۴۱۷۔
 سعدی کا کوروی: ۱۴۰۔
 سکندر: ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۲۴، ۳۲۵۔
 سکینہ، رام بابو: ۱۵۹، ۴۰۹۔
 سلیم، محمد قلی: ۱۶۶، ۲۹۱۔
 سلیمان شکوہ، مرزا: ۳۰۱، ۳۶۷، ۶۰۲۔
 رضا، مرزا احسن رضا: ۵۵۱، ۵۴۹۔
 رفعت، ابو الفضل محمد عباس: ۵۳۹۔
 رند، لالہ کھیم نرائن: ۹۴۔
 رند، مہربان خاں: ۱۱۰، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۲۳۵، ۲۵۶، ۲۸۸، ۳۲۲، ۳۲۵، ۳۲۶۔
 سردار پٹیل: ۴۵۔
 سرکار، جادو ناتھ: ۳۲۔
 سرفراز الدولہ، نواب: ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۵۱، ۲۵۵، ۲۵۶، ۵۲۸۔
 سرہنری ٹارنس: ۳۸۔
 سری رام شرما: ۲۹، ۷۷، ۷۸۔
 سری رام، لالہ: ۴۰۹۔
 سعادت علی: ۵۲۵۔
 سعدی: ۸۱، ۱۳۸، ۱۶۲، ۱۵۷، ۲۲۳، ۲۸۶، ۲۹۰، ۴۰۶، ۴۱۷۔
 سعدی کا کوروی: ۱۴۰۔
 سکندر: ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۲۴، ۳۲۵۔
 سکینہ، رام بابو: ۱۵۹، ۴۰۹۔
 سلیم، محمد قلی: ۱۶۶، ۲۹۱۔
 سلیمان شکوہ، مرزا: ۳۰۱، ۳۶۷، ۶۰۲۔
 سادات بارہہ: ۳۲۔
 سامان، میر ناصر: ۱۳۸۔
 سبحان: ۱۳۷۔
 سجاد، میر سجاد: ۸۸، ۱۳۷۔
 سرور، آل احمد: ۱۸، ۱۹، ۴۷۶، ۴۷۷، ۵۴۹، ۵۲۸، ۵۵۳، ۵۵۶، ۵۶۲۔

- عماد الملک، نواب: ۲۲، ۷۷، ۹۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۹، ۲۳۵، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۴۰
 ۶۰۲۔
 عمر خیام: ۳۸۴۔
 عندلیب شادانی، ڈاکٹر: ۵۷۴۔
 عیسیٰ: ۴۳۵۔
 غالب: ۱۳۷، ۵۲۵، ۵۳۲۔
 غلام احمد: ۴۲۵۔
 غلام حسن، میر: ۵۹۷۔
 غمگین: ۳۲۰۔
 غنی: ۲۲۳، ۲۹۰۔
 غواصی: ۱۴۳، ۲۳۰، ۳۵۵، ۳۸۴۔
 فاروقی، خواجہ احمد: ۱۵۶، ۲۳۲۔
 فاروقی، ثار احمد: ۲۸۴۔
 فاطمہ: ۶۳۶، ۳۳۱، ۳۳۸، ۳۸۷۔
 فائز دہلوی، نواب صدر الدین: ۱۴۵، ۱۴۹، ۳۵۶۔
 فتوت، خواجہ عنایت اللہ خاں: ۸۶، ۳۹۴۔
 فخر الدین، مولانا: ۴۹، ۵۴۱۔
 قد، کچھی رام پنڈت: ۵۶۲۔
 فدوی خاں: ۵۱، ۱۰۸، ۱۲۳۔
 فدوی، شاہ محسن: ۱۲۷۔
 فدوی، پنجابی: ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۸۳۔
 ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶۔
 فدوی لاہوری: ۴۲۲، ۴۵۵، ۴۵۶، ۵۵۵۔
 فراغ، میر مہدی حسن: ۳۰۱۔
 فراق گورکھپوری: ۱۹۹۔
 فراق، مرزا مرتضیٰ قلی: ۱۴۶۔
 فراق، ناصر نذیر: ۸۶۔
 فراق، کنور کشور: ۴۵۔
 فرخ سیر: ۱۰۲۔
 فرہاد: ۴۰۴، ۶۱۲۔
 فضل، شاہ فضل علی: ۱۴۹۔
 فطرت، مرزا معزز: ۱۴۶۔
 فقیر، میر شمس الدین: ۸۱، ۱۳۸، ۱۴۶، ۳۹۰۔

قتل، مرزا: ۱۶۵، ۱۳۷۔	فولادخاں
قدسی، حاجی محمد جان: ۱۰۳، ۸۳۔	دیکھیے:
قدوائی، صدیق الرحمن: ۳۲۵۔	خاں، شیدی فولاد۔
قربان، میر جیون: ۵۶۵۔	فیاض الدین، افسر الدولہ: ۲۹۳۔
قطب رازی: ۲۳۰۔	فیروز: ۳۵۵۔
قطب، شاہ محمد علی: ۳۸۴، ۱۴۳۔	فیضی: ۲۹۰، ۲۴۷، ۱۳۸، ۸۱، ۸۰۔
قطب مشتری: ۳۵۵۔	قاسم، قدرت اللہ: ۸۳، ۸۹، ۹۸، ۱۰۳، ۱۴۸، ۱۵۸، ۲۶۷، ۲۶۹، ۲۷۵، ۲۷۷، ۳۱۸، ۳۱۷، ۳۹۸، ۴۷۸، ۵۳۲، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۵۳، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۵، ۵۹۶، ۵۸۵، ۵۷۴۔
قیس: ۶۱۲، ۵۶۸، ۴۰۴۔	قاسم، قیام الدین: ۶۳، ۵۰، ۴۷، ۴۴، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۶، ۸۲، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۶، ۱۱۰، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۴۵، ۱۵۲، ۱۵۰، ۱۴۹، ۴۵، ۱۴۷، ۱۱۴، ۱۶۷، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۳۲۱، ۳۵۶، ۳۷۰، ۳۹۳، ۴۷۵، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۵، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۹۶، ۶۰۲، ۶۰۳۔
کاظم، امام موسیٰ: ۲۵۱، ۲۴۹۔	
کاظم، حکیم محمد میر: ۲۴۳، ۳۲۵۔	
کالینگر، ڈاکٹر: ۲۳۔	
کریم الدین: ۸۳، ۲۶۷، ۵۳۷، ۵۸۰، ۵۶۶۔	
کسل سنگھ: ۵۳، ۵۲۔	
کلاونت: ۶۶۔	
کلیم: ۱۶۶، ۱۰۶، ۸۸۔	
کمال اصفہانی: ۲۵۹۔	
کمال، شاہ کمال الدین: ۱۲۵، ۹۰، ۷۳۔	
۵۵۳، ۵۴۹، ۵۴۱، ۵۲۹، ۵۲۶۔	

محمد حسن: ۱۷-

محمد حمزه، شاه: ۱۲۶، ۱۵۶، ۶۰۴-

محمد رضا: ۳۱۹، ۳۱۷-

محمد ساجد: ۲۰-

محمد شاه: ۵۵، ۵۰، ۳۱، ۱۶۲-

محمد سلیمان مرزا: ۵۸۰-

محمد هاشم: ۲۶، ۵۶۴-

مختار الدوله: ۲۹۴-

مخلص، اندرام: ۱۴۶-

مرتضی قلی: ۹۷-

مرزا احسن: ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹-

مرزا ابابکر: ۱۱۰-

مرزا بهلول: ۳۰۰-

مرزا جان: ۵۴۹-

مرزا شفیع: ۴۹، ۷۰، ۷۶، ۷۰۲-

مرزا علی: ۳۰۰، ۳۸۲-

مرزا گرامی: ۱۴۶-

مرزا منو: ۵۲-

مروت، صغیر علی: ۶۰۰-

مسکین، میر عبداللہ: ۳۲۰، ۳۳۵-

میر سوز: ۱۸، ۷۳، ۷۴، ۸۶، ۱۱۰، ۱۱۳،

۱۵۵، ۲۸۹، ۳۶۰، ۴۰۵، ۴۳۷،

۴۶۸، ۴۸۶، ۵۵۴-

مشتاق: ۲۳۰-

مصطفی: ۴۷، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۱۰۷، ۱۱۳،

۱۲۴، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۹، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۳،

۱۴۴، ۲۶۰، ۲۷۵، ۲۹۱، ۳۱۲، ۳۱۳،

۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۵۶،

۳۹۹، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۲۳، ۴۸۱، ۵۲۷،

۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۴۰،

۵۴۱، ۵۵۶، ۵۶۴، ۵۶۸، ۵۷۴،

۵۸۰، ۵۹۹، ۶۰۴-

مصدر: ۲۶۹-

مضمون، شرف الدین: ۱۲۳، ۱۴۴، ۱۴۵،

۱۴۷، ۱۴۸، ۱۵۱، ۱۵۳، ۲۱۱، ۵۲۶-

معز اللہ، نواب: ۲۹۴-

معین: ۵۸۷-

مقبول، مقبول نبی خاں: ۹۸-

مکند سنگھ، ہاؤس: ۶۹-

- نظیری، نیشاپوری: ۱۳۳، ۲۱۸، ۱۶۳، ۲۶۹، ۶۱: ہاتف، میر علی: ۲۶۹، ۶۱۔
 ۴۰۸، ۲۳۷۔
 نفعت خاں: ۶۱۰۔
 نقش علی: ۶۱، ۷۴، ۷۵، ۹۲، ۹۳، ۶۰۲۔
 نور جہاں: ۳۰۔
 نوری: ۲۳۰۔
 نول کشور: ۸۶، ۱۰۶۔
 وارستہ بل: ۱۳۶۔
 وامق، میر بہادر علی: ۱۲۳۔
 وجہی
 دیکھیے:
 ملا وجہی۔
 وحشت، رضی علی: ۱۳۷۔
 وحشت، میر ابوالحسن: ۵۹۶، ۵۹۷۔
 وداد، سلمان قلی خاں: ۸۴، ۸۵، ۶۰۲۔
 ولا، مظہر علی خاں: ۸۵۔
 ولی اورنگ آبادی: ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۳۸۴، ۲۳۰، ۱۴۵، ۱۴۳۔
 ولی اللہ، شاہ: ۲۸، ۴۱، ۴۷، ۴۹، ۳۰۵، ۳۰۶۔
 ہاتف، میر علی: ۶۱، ۲۶۹۔
 ہاشمی، میر ہاشم علی: ۵۹۹۔
 ہدایت بخش، مرزا: ۱۱۰۔
 ہدایت، ہدایت اللہ: ۴۷، ۸۵، ۲۷۹، ۵۶۵، ۶۰۳۔
 ہندی، بھگوان داس: ۶۱، ۱۱۸، ۱۵۷، ۱۶۳۔
 ہوس: ۵۷۴۔
 یکم، حکیم احمد علی خاں: ۹۳، ۱۰۷، ۱۵۷، ۱۶۳، ۲۶۶، ۴۰۰، ۵۶۴۔
 یکم، احمد یار خاں: ۵۶۴۔
 یکرنگ، غلام مصطفیٰ خاں: ۱۴۸، ۳۱۹، ۵۲۶۔
 یکر، عبدالوہاب: ۱۴۷۔
 یزید: ۳۰۷۔
 یقین، انعام اللہ خاں: ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۸، ۱۵۲، ۱۵۵، ۱۵۶، ۳۹۳، ۳۹۵، ۴۷۸، ۵۲۶، ۵۲۸، ۶۰۹۔

مقامات

ایران : ۴۱، ۷۹، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۶۳،

۲۳۰، ۲۳۱، ۵۲۵، ۵۶۷۔

بحر اوقیانوس : ۳۰۔

بخارا : ۶۱، ۶۲، ۶۰۲۔

بدایوں : ۵۸۵۔

بدخشاں : ۶۸۔

برہنگم : ۲۰۔

برہان پور : ۶۸۔

بریگی : ۵۳۸، ۵۶۲۔

بسولی : ۱۱۴۔

بلخ : ۶۸۔

بنارس : ۵۹۶۔

بنگل : ۳۰، ۳۱۔

بہار : ۳۳۔

پاکستان : ۵۶۳۔

پانی پت : ۴۲، ۱۱۱۔

پٹنہ : ۲۸۸۔

پنجاب : ۲۸، ۳۱۔

پیرس : ۵۶۔

آگرہ : ۳۳، ۴۷۔

اٹاودہ : ۹۸۔

احمد نگر : ۲۸۔

اڑیسہ : ۳۰، ۳۲۔

استنبول : ۳۶، ۳۹۔

اسطرآباد : ۵۶۷۔

اصفہان : ۳۶، ۳۹۔

افغانستان : ۴۱۔

اکبر آباد : ۵۳۳۔

الہ آباد : ۱۱۳، ۵۸۵، ۵۹۵۔

امروہہ : ۵۶۳۔

امین آباد : ۱۲۳۔

انبالہ : ۵۷۹۔

انگوری باغ : ۵۰۔

اودھ : ۲۰، ۴۷، ۸۷، ۹۶، ۱۱۰، ۱۱۱،

۱۱۷، ۱۱۹، ۱۲۳، ۲۲۰، ۲۲۲، ۶۰۳۔

اورنگ آباد : ۶۸۔

- ترکستان: ۳۱۔ ۵۶۴، ۵۶۲، ۵۵۶، ۵۵۳، ۵۴۴
- ٹانڈہ: ۱۱۴۔ ۵۶۴، ۵۸۸، ۵۸۰، ۵۷۹، ۵۶۷
- جنگلی گنج: ۱۲۳۔ ۶۰۳، ۶۰۲، ۶۰۱، ۵۹۶، ۵۹۵
- چاند پور: ۵۶۴۔ درجہ گڑھ: ۳۳۔
- چاندنی چوک: ۳۵۔ ڈھاکہ: ۳۰۔
- چمپور: ۳۰۔ رام پور: ۵۶۴، ۴۸۴، ۱۴۴، ۳۲۔
- چوک سعد اللہ خاں: ۳۳۔ سرائے بانکر مو: ۵۳۳۔
- حبیب گنج: ۴۲۰، ۱۸۔ سمت برج: ۵۰۔
- حیدر آباد: ۵۸۹، ۵۶۷۔ سنجلی: ۵۶۴، ۲۹۔
- خالصہ: ۳۸، ۳۱۔ سندھ: ۳۳۔
- خراسان: ۴۱۔ سوزگاؤں: ۳۰۔
- خوارزم: ۵۴۹۔ سہارنپور: ۵۴۰۔
- خیر آباد: ۵۸۵۔ شاہ آباد: ۲۹۔
- دہلی: ۳۶، ۳۵، ۳۴، ۳۳، ۳۲، ۳۱، ۲۰، ۱۱۸، ۷۲، ۵۰، ۳۳، شاہجہاں آباد: ۱۱۸، ۷۲، ۵۰، ۳۳، ۳۹۳، ۳۵۶، ۳۵۲، ۲۶۴، ۱۴۳، ۱۴۱
- ۳۶، ۳۵، ۳۴، ۳۳، ۳۲، ۳۱، ۲۰، ۱۱۸، ۷۲، ۵۰، ۳۳، ۳۹۳، ۳۵۶، ۳۵۲، ۲۶۴، ۱۴۳، ۱۴۱
- ۵۶۷، ۵۶۴، ۵۵۶، ۵۵۳، ۵۴۴، ۵۴۱، ۵۳۳، ۵۳۰، ۵۲۷، ۵۲۴، ۵۲۱، ۵۱۸، ۵۱۵، ۵۱۲، ۵۰۹، ۵۰۶، ۵۰۳، ۵۰۰، ۴۹۷، ۴۹۴، ۴۹۱، ۴۸۸، ۴۸۵، ۴۸۲، ۴۷۹، ۴۷۶، ۴۷۳، ۴۷۰، ۴۶۷، ۴۶۴، ۴۶۱، ۴۵۸، ۴۵۵، ۴۵۲، ۴۴۹، ۴۴۶، ۴۴۳، ۴۴۰، ۴۳۷، ۴۳۴، ۴۳۱، ۴۲۸، ۴۲۵، ۴۲۲، ۴۱۹، ۴۱۶، ۴۱۳، ۴۱۰، ۴۰۷، ۴۰۴، ۴۰۱، ۳۹۸، ۳۹۵، ۳۹۲، ۳۸۹، ۳۸۶، ۳۸۳، ۳۸۰، ۳۷۷، ۳۷۴، ۳۷۱، ۳۶۸، ۳۶۵، ۳۶۲، ۳۵۹، ۳۵۶، ۳۵۳، ۳۵۰، ۳۴۷، ۳۴۴، ۳۴۱، ۳۳۸، ۳۳۵، ۳۳۲، ۳۲۹، ۳۲۶، ۳۲۳، ۳۲۰، ۳۱۷، ۳۱۴، ۳۱۱، ۳۰۸، ۳۰۵، ۳۰۲، ۲۹۹، ۲۹۶، ۲۹۳، ۲۹۰، ۲۸۷، ۲۸۴، ۲۸۱، ۲۷۸، ۲۷۵، ۲۷۲، ۲۶۹، ۲۶۶، ۲۶۳، ۲۶۰، ۲۵۷، ۲۵۴، ۲۵۱، ۲۴۸، ۲۴۵، ۲۴۲، ۲۳۹، ۲۳۶، ۲۳۳، ۲۳۰، ۲۲۷، ۲۲۴، ۲۲۱، ۲۱۸، ۲۱۵، ۲۱۲، ۲۰۹، ۲۰۶، ۲۰۳، ۲۰۰، ۱۹۷، ۱۹۴، ۱۹۱، ۱۸۸، ۱۸۵، ۱۸۲، ۱۷۹، ۱۷۶، ۱۷۳، ۱۷۰، ۱۶۷، ۱۶۴، ۱۶۱، ۱۵۸، ۱۵۵، ۱۵۲، ۱۴۹، ۱۴۶، ۱۴۳، ۱۴۰، ۱۳۷، ۱۳۴، ۱۳۱، ۱۲۸، ۱۲۵، ۱۲۲، ۱۱۹، ۱۱۶، ۱۱۳، ۱۱۰، ۱۰۷، ۱۰۴، ۱۰۱، ۹۸، ۹۵، ۹۲، ۸۹، ۸۶، ۸۳، ۸۰، ۷۷، ۷۴، ۷۱، ۶۸، ۶۵، ۶۲، ۵۹، ۵۶، ۵۳، ۵۰، ۴۷، ۴۴، ۴۱، ۳۸، ۳۵، ۳۲، ۲۹، ۲۶، ۲۳، ۲۰، ۱۷، ۱۴، ۱۱، ۸، ۵، ۲، ۱، ۰
- شمس آباد مو: ۵۵۴۔ صفدر جنگ: ۱۱۰، ۴۷۔
- عظیم آباد: ۵۹۴، ۵۸۵، ۵۶۷، ۵۶۴، ۵۶۱، ۵۵۸، ۵۵۵، ۵۵۲، ۵۴۹، ۵۴۶، ۵۴۳، ۵۴۰، ۵۳۷، ۵۳۴، ۵۳۱، ۵۲۸، ۵۲۵، ۵۲۲، ۵۱۹، ۵۱۶، ۵۱۳، ۵۱۰، ۵۰۷، ۵۰۴، ۵۰۱، ۴۹۸، ۴۹۵، ۴۹۲، ۴۸۹، ۴۸۶، ۴۸۳، ۴۸۰، ۴۷۷، ۴۷۴، ۴۷۱، ۴۶۸، ۴۶۵، ۴۶۲، ۴۵۹، ۴۵۶، ۴۵۳، ۴۵۰، ۴۴۷، ۴۴۴، ۴۴۱، ۴۳۸، ۴۳۵، ۴۳۲، ۴۲۹، ۴۲۶، ۴۲۳، ۴۲۰، ۴۱۷، ۴۱۴، ۴۱۱، ۴۰۸، ۴۰۵، ۴۰۲، ۳۹۹، ۳۹۶، ۳۹۳، ۳۹۰، ۳۸۷، ۳۸۴، ۳۸۱، ۳۷۸، ۳۷۵، ۳۷۲، ۳۶۹، ۳۶۶، ۳۶۳، ۳۶۰، ۳۵۷، ۳۵۴، ۳۵۱، ۳۴۸، ۳۴۵، ۳۴۲، ۳۳۹، ۳۳۶، ۳۳۳، ۳۳۰، ۳۲۷، ۳۲۴، ۳۲۱، ۳۱۸، ۳۱۵، ۳۱۲، ۳۰۹، ۳۰۶، ۳۰۳، ۳۰۰، ۲۹۷، ۲۹۴، ۲۹۱، ۲۸۸، ۲۸۵، ۲۸۲، ۲۷۹، ۲۷۶، ۲۷۳، ۲۷۰، ۲۶۷، ۲۶۴، ۲۶۱، ۲۵۸، ۲۵۵، ۲۵۲، ۲۴۹، ۲۴۶، ۲۴۳، ۲۴۰، ۲۳۷، ۲۳۴، ۲۳۱، ۲۲۸، ۲۲۵، ۲۲۲، ۲۱۹، ۲۱۶، ۲۱۳، ۲۱۰، ۲۰۷، ۲۰۴، ۲۰۱، ۱۹۸، ۱۹۵، ۱۹۲، ۱۸۹، ۱۸۶، ۱۸۳، ۱۸۰، ۱۷۷، ۱۷۴، ۱۷۱، ۱۶۸، ۱۶۵، ۱۶۲، ۱۵۹، ۱۵۶، ۱۵۳، ۱۵۰، ۱۴۷، ۱۴۴، ۱۴۱، ۱۳۸، ۱۳۵، ۱۳۲، ۱۲۹، ۱۲۶، ۱۲۳، ۱۲۰، ۱۱۷، ۱۱۴، ۱۱۱، ۱۰۸، ۱۰۵، ۱۰۲، ۹۹، ۹۶، ۹۳، ۹۰، ۸۷، ۸۴، ۸۱، ۷۸، ۷۵، ۷۲، ۶۹، ۶۶، ۶۳، ۶۰، ۵۷، ۵۴، ۵۱، ۴۸، ۴۵، ۴۲، ۳۹، ۳۶، ۳۳، ۳۰، ۲۷، ۲۴، ۲۱، ۱۸، ۱۵، ۱۲، ۹، ۶، ۳، ۰

کتابیں اور رسالے

- آب حیات: ۲۲۳، ۹۸، ۲۸۷، ۳۲۳، ۳۰۷۔
- ابراہیم نامہ: ۳۵۵۔
- اردو ادب: ۴۲۱۔
- ارشاد نامہ: ۳۵۵۔
- اورنگ زیب: ۳۵۶۔
- باغ معانی: ۶۰۲، ۹۲، ۷۳۔
- بدیع الجمال: ۳۵۵۔
- بہارِ عجم: ۱۳۵۔
- پدم راؤ کدم: ۳۵۵۔
- پنج رقعہ: ۲۲۳۔
- پھول بن: ۳۵۵۔
- تاریخ ادب اردو: ۴۰۹۔
- تاریخ عالم گیر ثانی: ۴۲۔
- تاریخ فرخ آباد: ۱۱۲۔
- تاریخ لکھنؤ: ۱۲۳۔
- تذکرہ: ۳۱۷۔
- تذکرہ خوش معرکہ زیبا: ۲۸۷۔
- تذکرہ شعراے اردو: ۵۶۴، ۹۰، ۷۳۔
- تذکرہ قائم: ۶۲۔
- تذکرہ گردیزی: ۸۹۔
- تذکرہ مجمع الانتخاب: ۶۳، ۴۶۔
- تذکرہ مسرت افزا: ۹۰، ۸۸۔
- تذکرہ ہندی: ۴۰۶، ۴۰۵، ۲۷۵۔
- تلاذہ غالب: ۵۲۶۔
- توصیف نامہ میراں محی الدین: ۳۵۵۔
- چمنستان شعرا: ۳۲۱، ۱۵۵۔
- چندراں: ۳۵۵۔
- چہار باغ: ۹۴۔
- حجت البقا: ۳۵۵۔
- خزانہ عامرہ: ۱۱۲۔
- خوش نامہ: ۳۵۵۔
- خوش نغمہ: ۳۵۵۔
- دریاے لطافت: ۴۰۱۔
- دستور الفصاحت: ۴۰۰۔
- دیوان زادہ: ۵۲۶، ۱۵۲، ۱۴۵، ۱۳۳۔
- دیوان سوز: ۲۸۹۔
- دیوان ضاحک: ۳۰۲۔
- دیوان قائم: ۴۸۴۔
- دیوان مرزا رفیع سودا: ۴۲۲۔
- دیوان میر حسن: ۳۰۲۔

- دیوان ولی : ۱۳۹، ۱۳۳، ۱۳۳، ۱۳۵،
-۳۳۰
طوطی نامہ: ۳۵۶، ۳۵۵۔
ظفر نامہ: ۳۵۶۔
دیوان یقین ۴۳۰، ۴۲۸، ۴۲۹۔
ذکر مغنیان ہندوستان بہشت نشان :
-۶۴
عبرت الغافلین : ۷۰، ۷۸، ۹۵، ۱۶۲،
۱۹۳، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۳۱۹، ۳۲۲۔
عقد ثریا: ۱۳۹، ۳۱۲، ۴۰۵۔
ذکر میر: ۵۲۵۔
غرائب اللغات: ۱۳۵۔
ریاض حسنی: ۳۹۳۔
غیاث اللغات: ۱۳۵۔
سبیل ہدایت: ۷۸، ۱۹۴، ۲۶۸، ۲۷۵،
۲۷۶، ۳۱۹۔
فص الکلمات: ۱۵۶۔
سکندر نامہ: ۳۵۵۔
قرآن شریف: ۲۲۲، ۳۰۹، ۵۸۸۔
قصر اللطائف: ۱۲۴۔
سودا: ۱۹۔
قصہ حقیقت برآمدن نادر شاہ بہ شاہجہاں
آباد: ۳۲۔
سیر المتاخرین: ۵۵۔
قول فیصل: ۱۳۷۔
سیف الملوک: ۳۵۵۔
کلیات سودا: ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۸۶، ۱۰۶،
۱۰۷، ۱۱۳، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۳۸، ۱۵۵، ۱۷۳،
۲۱۱، ۲۶۹، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۵، ۲۸۰،
۲۸۳، ۲۸۵، ۲۸۹، ۳۰۰، ۳۰۲، ۳۰۵،
۳۰۷، ۳۱۱، ۳۱۳، ۳۲۱، ۳۲۵، ۳۵۷،
۳۶۹، ۳۹۲، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳،
۴۲۴، ۴۲۵، ۴۳۰، ۴۶۸، ۴۷۵،
۴۷۶، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۲، ۴۸۴،
۵۱۸، ۵۲۹، ۶۰۳، ۶۰۶، ۶۸۰۔
کلیات میر: ۷۰، ۱۰۷، ۲۸۰۔
شاه نامہ: ۳۵۵۔
شریں خسرو: ۳۵۵۔
شعلہ عشق: ۴۱۸، ۴۱۹۔
شکار نامہ: ۳۶۱۔
شہادت التحقیق: ۳۵۵۔
شہادت الحقیقت: ۳۵۵۔
صبا: ۴۲۱۔
طویر کلیم: ۲۳۳۔

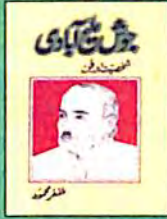
- گل عجائب: ۳۹۶۔
 گلزار ابراہیم: ۵۹۷۔
 گلستاں: ۲۲۳۔
 گلشنِ بے خار: ۲۲۳۔
 گلشنِ عشق: ۳۵۵۔
 گلشنِ گفتار: ۳۹۳۔
 گلشنِ ہند: ۵۶۷، ۱۱۸، ۹۱، ۹۰۔
 گلکرسٹ اور اس کا عہد: ۲۲۳۔
 گنجِ تواریخ: ۱۲۸۔
 لودک: ۳۵۵۔
 لیلیٰ مجنوں: ۳۵۵۔
 مثنوی گلزارِ نسیم: ۵۲۸۔
 مثنوی مولانا روم: ۳۵۵۔
 مجالسِ رنگین: ۴۰۲، ۱۰۳۔
 مجموعہ نغز: ۳۱۸، ۳۱۷، ۲۶۶، ۱۰۳۔
 مخزنِ نکات: ۶۰۲، ۵۶۴، ۹۷۔
 مرغوب القلوب: ۳۵۵۔
 مصطلحات: ۱۳۵۔
 مطلع السعدین: ۱۳۶۔
 معاصر: ۲۹۳۔
 معدن السعادت: ۲۰۰۔
 مقالات الشعراء: ۱۱۱۔
 منفعت الایمان: ۳۵۵۔
 نسیم الکلام: ۳۵۵۔
 نشر عشق: ۱۵۶، ۱۱۱، ۷۹۔
 نقوش: ۳۳۲۔
 نکاتِ اشعرا: ۸۳، ۸۷، ۹۵، ۹۷۔
 ۶۰۲، ۵۴۲، ۴۷۹، ۳۹۳، ۲۷۸۔
 نوسر ہار: ۳۵۵۔
 نوائے ادب: ۴۸۸۔
 وصیت الہادی: ۳۵۵۔
 یوسف زلیخا: ۳۵۵۔



قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کی چند مطبوعات

نوٹ: طلبہ و اساتذہ کے لیے خصوصی رعایت۔ تاجران کتب کو حسبِ ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

جوش ملیح آبادی شخصیت اور فن



مصنف:
ظفر محمود
صفحات: 108
قیمت: -/38 روپے

انیس (سوانح)



مصنف:
نیر مسعود
صفحات: 472
قیمت: -/174 روپے

ابوالکلام آزاد



مرتب:
رشید الدین خان
صفحات: 684
قیمت: -/58 روپے

حیات جاوید



مصنف:
مولانا الطاف حسین حالی
صفحات: 908
قیمت: -/167 روپے

پریم چند با تصویر سوانح



مرتب:
کمل کشور گوپیناث
مترجم
ڈاکٹر اے جے مالوی
صفحات: 103
قیمت: -/54 روپے

ڈاکٹر ذاکر حسین شخصیت و معمار



مرتب:
ڈاکٹر فہمیدہ بیگم
صفحات: 400
قیمت: -/70 روپے



قومی کاؤنسل برائے فروغِ اردو زبان

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

National Council for Promotion of Urdu Language
West Block-1, R.K. Puram, New Delhi-110066